کُلّیاتِ راجندر سنگھ بیدی

جلد دوم

مرتب

وارث علوی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

کُلّیاتِ راجندر سنگھ بیدی

جلد دوم

ناولٹ، ڈرامے، مضامین، خطوط

مرتب

وارث علوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔

کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید

ڈائریکٹر

فہرست

عرضِ مرتب

ایک چادر میلی سی کا متن مکتبہ جامعہ، نئی دہلی کی دوسری اشاعت جولائی 1975 پر مبنی ہے۔ پہلا ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے 1962 میں شائع کیا۔ اس سلسلے میں بیدی کے نامور محقق شمس الحق عثمانی لکھتے ہیں "مکتبہ جامعہ سے شائع شدہ ناولٹ کا وہی متن معتبر ترین اور ایمائے مصنف کے مطابق ہے جس کی کتابت ایس۔ احمد علی بھوپالی نے اکتوبر 1961 میں مکمل کی اور مکتبہ نے بیدی صاحب کی زندگی میں ہی اس کتاب پر مبنی کئی ایڈیشن شائع کیے۔ دوسرا ایڈیشن جولائی 1975 کا 1962 کے ایڈیشن کے عین مطابق ہے۔

ڈرامے:

بیدی کے کل بارہ ڈرامے ملتے ہیں۔ ڈراموں کی متن ان کی ڈراموں کی پہلی کتاب "بے جان چیزیں" مطبوعہ منظور امین، لاہور کی اولین اشاعت 1943 اور بیدی کے ڈراموں کی دوسری کتاب "سات کھیل" مطبوعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی جون 1981 پر مبنی ہے۔

مضامین اور خاکے:

بیدی کے مضامین، خاکوں، پیش لفظ اور خطوط کے متنوں کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔
1۔ کتابوں سے فلموں تک 2۔ سوانحی اور تاریخی فلمیں 3۔ فلم بنانا کھیل نہیں 4۔ ترک غمزہ زن 5۔ باقر مہدی 6۔ میرا یار کرشن 7۔ وجینتی مالا

8۔ پیش لفظ دانہ ودام 9۔ پیش لفظ گرہن 10۔ پیش لفظ جالے 11۔ پیش لفظ اپنے آپ کا قیدی 12۔ افتتاحیہ گائے جاہندوستان 13۔ دیباچہ دانہ و دام اشاعت اول 14۔ پیش لفظ سات کھیل اشاعت اول 15۔ علی گڑھ میں خطاب: قلم اور کاغذ کا رشتہ 16۔ سچ نہ کسی کے حلق سے اترا ہے نہ اُترے گا۔
یہ سب تحریریں شمس الحق عثمانی کی گرانمایہ تصنیف ''باقیات بیدی'' مطبوعہ اردو اکادمی، دہلی 2001 سے لی گئی ہیں۔

بیدی کا مضمون افسانوی تجربہ اور اظہار کے مسائل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتاب ''اردو افسانہ، روایت و مسائل''، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی اشاعت اولین 1981 سے مستعار ہے۔

خطوط:

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے رسالے ''عصری آگہی'' کا ایک خصوصی شمارہ ''راجندر سنگھ بیدی'' 1982 میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس شمارے میں وہ تمام خطوط شامل ہیں جو راجندر سنگھ بیدی نے اوپیندر ناتھ اشک کے نام لکھے تھے۔ سردست بیدی کے کل خطوط کی کائنات یہی ہے۔ ممکن ہے انھوں نے دوسرے لوگوں کو بھی خطوط لکھے ہوں۔ لیکن تا حال انھیں جمع کرنے اور طبع کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ ہمارے ریسرچ اسکالرز اور تحقیقی اداروں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

وارث علوی

ایک چادر میلی سی

تعارف

راجندر سنگھ بیدی کا تصور حیات جو اُن کے افسانوں سے ابھرتا ہے، یک رُخا، یک آہنگ اور سطحی نہیں ہے بلکہ پیچیدہ، گہرا اور پہلودار ہے۔ ان کی نظر میں زندگی بہ یک وقت اتنی سادہ اور پُر اسرار، اتنی دلفریب اور الم ناک ہے کہ کوئی ایک نقطۂ نظر چاہے وہ رومانی ہو یا حقیقت پسندانہ، قنوطی ہو یا کلبی، المیہ ہو یا طربیہ، زندگی کو اس کی ہمہ رنگی، تہہ داری اور کثیر الجہتی کے ساتھ فنی تخلیق کا روپ عطا کرنے میں ثمر آور ثابت نہیں ہوسکتا۔ خود بیدی نے ایک جگہ کہا ہے کہ اُن کے افسانہ کو کیوبک آرٹ کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ کردار کی پیشکش میں اُن کا قلم بہ یک وقت تین چہرے تراشتا ہے۔ ایک تو وہ جو بستی یا گانو کے لوگوں کو روزانہ نظر آتا ہے۔ ایک وہ جو خود کردار کا چہرہ ہے لیکن خود کردار اس سے واقف نہیں اور ایک وہ جو صرف افسانہ نگار کی تیسری آنکھ کو دکھائی دیتا ہے۔ اسی چہرے میں کردار کی پوری شخصیت اور معنویت رہی ہوتی ہے۔ اسی چہرے کو دیکھنے میں اکثر ہم سے کوتاہی ہو جاتی ہے اور ہم کردار کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ اگر سامنے کی مثال پیش کرنی ہو تو افسانہ "ایک سگریٹ میں" سنت رام کی بیوی کا کردار ہے۔ شوہر سنت رام اُسے دھوبن کہتا ہے کیونکہ اب ادھیڑ عمر میں اسے صفائی اور کپڑے دھونے کا خبط ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کی نظر میں وہ ایک متمول گھرانہ کی کام کے بوجھ، شوہر کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کی ماری ایک

چڑچڑی پریشاں حال گرہستن ہے۔ لیکن بیدی اس کا اصل چہرہ اس وقت دکھاتے ہیں جب ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کی عادت کے مطابق بڑبڑا رہی ہے۔

''پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے، لڑتے جھگڑتے رہے۔ پھر دوست مجھ پر لاد دیے۔ ایک ہاتھ سے بچہ کھلا رہی ہوں، دوسرے ہاتھ سے روٹیاں پکا رہی ہوں اِن حرکتوں کے لیے۔ اب قصائی اولاد کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی پیسے کپڑے کی جس سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب اور اب بیٹے کی یہ ہمت کہ وہ تمھارے ہوتے ہوئے مجھے آنکھیں دکھائے۔''

دیکھیے موئے قلم کی چند جنبشوں نے کردار کو کیسا سہ سمتی بنا دیا۔ دراصل بیدی کے تخیل کا خلائی جہاز چاند کی دوسری طرف کی تصویر بھی لیتا ہے۔

محولہ بالا مثال تو بہت واضح تھی۔ اب ذرا ایک پیچیدہ اور مرموز مثال لیجیے۔ ''کچھمن'' بیدی کا ایک بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جسے بہت معمولی سمجھا گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ افسانہ کا کردار کچھمن بہت معمولی کردار ہے۔ سیاہ فام بھی ہے اور منہ میں دانت بھی نہیں۔ فاتر العقل بھی ہے۔ گانو کی عورتیں اس سے ہنسی مذاق کرتی ہیں، اس کے لیے دُلہن تلاش کرنے کا وعدہ کرتی ہیں اور اپنے کام نکلوا لیتی ہیں۔ اِن عورتوں میں گانو کی گوری سب سے زیادہ حسین ہے۔ بیدی نے گوری کے حسن کا جادو صرف کچھمن تک محدود نہیں رکھا بلکہ خود قاری کو بھی اس کے نشہ سے سرشار کر دیا ہے۔ قاری اب افسانہ کے باہر نہیں افسانہ کے اندر ہے اور گوری کے حسن سے مسحور ہے۔ گوری کی پرنالی میں مرا ہوا کتا پھنس گیا ہے اور ایسے ہی کاموں کے لیے تو کچھمن بنا ہے۔ کتے کو پرنالی سے نکالتے نکالتے کچھمن اوپر سے گرتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔ بارات تو نہیں نکلی، جنازہ نکلا اور عاشق کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے نکلا۔ عورتیں اور گوری ماتم کناں اور ارتھی دُلھا کی بارات کی طرح نکلی۔ ارتھی تو ارتھی ہی تھی لیکن بیدی کے بیانیہ نے اسے بارات کا روپ دے دیا۔

اب دیکھیے دنیا والوں کی نظر میں تو کچھمن ایک معمولی سیاہ فام فاتر العقل آدمی ہے۔ خود کی نظر میں وہ ایک جوان، خوب رُو، جفاکش آدمی ہے کیونکہ گانو کی عورتیں اسے چاہتی ہیں اور انھی عورتوں کی باتوں نے اس میں بیاہ کی ایک مبہم خواہش پیدا کر دی ہے۔ اس خواہش کے مضمرات

سے وہ خود واقف نہیں۔گانو کی گوری کے حسن کے تصور نے اس خواہش کو ایک ایسی جوت میں بدل دیا ہے جو گانو کے کھنڈر جیسے مندر کو اندر سے روشن کیے ہوئے ہو۔ یہ مشاہدہ افسانہ نگار کی تیسری آنکھ کا ہے۔ اس مشاہدے نے پورے افسانہ کو رنگین، پُرنور اور معنی خیز بنا دیا ہے، ورنہ وہ ایک معمولی فاتر العقل آدمی کے خاکہ کے سوا کیا ہوتا۔

''ایک چادر میلی سی'' کا مرکزی کردار رانو ہے۔ رانو بہت معمولی عورت ہے۔ بالکل اَن پڑھ، تمدن کی نعمتوں سے بے بہرہ۔ گھر کی مفلوک الحالی اور شوہر کی بدچلنی، شراب نوشی اور مار پیٹ کا شکار رانو کی ساس جنداں بھی ستم شعار بڑھیا ہے اور رانو کے لیے ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں رکھتی۔ رانو کا شوہر تلوکا جب شراب پیتا ہے تو جنداں کہتی ہے کہ اپنی کمائی کا پیتا ہے۔ لیکن رانو شراب کو سوت سے بھی زیادہ خراب چیز سمجھتی ہے۔ دوسری عورت کے پاس سے تو مرد اپنا تھوڑا بہت بچا لاتا ہے، لیکن شراب میں تو اس کا کچھ بھی نہیں رہتا۔ رانو جب اپنی ساس کو کوستی ہے تو کہتی ہے ''تو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی پھاپھاں۔ بیچ میں میرا مردہ کیوں نکال بیٹھی۔ شرم ہے تو کچھ کھا مر۔ ہے دیوی ماں، یہ جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب ڈوب مرے۔ اوپر سے آنے والی مشین ٹوٹو کرے۔''

اِن جملوں میں پچھڑے ہوئے طبقہ کی ایک عورت کے ذہن کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ بھلا ایسی معمولی عورت کو ناولٹ کا مرکزی کردار بنا کر فن کار اس سے کیا کام لے سکتا ہے۔ لیکن بیدی کو جو کام لینا تھا اس سے لیا اور یہ کام تھا نامساعد حالات میں جینے، مصائب کے ٹوٹتے پہاڑوں کو برداشت کرنے اور اپنے بچوں کو تباہی سے بچانے کا کام۔ رانو ناولٹ میں ایک عام عورت کی طرح ہی جیتی ہے۔ تلوکا جب شراب کی بوتل نکالتا ہے تو رانو اس سے بھڑ جاتی ہے، حالانکہ وہ جانتی ہے کہ تلوکا کتنا غیظ و غضب والا مرد ہے۔ تلوکا اسے اس بری طرح مارتا ہے کہ بڑی بیٹی کی چیخ نکل جاتی ہے ''مار ڈالا مار ڈالا''۔ اپنے شوہر کو قابو میں رکھنے کے لیے اڑوس پڑوس کی عورتوں کی مدد سے وہ بابا ہری داس کے پاس سے تعویذ لاتی ہے۔ تلوکا کے قتل کے بعد جب اپنے دیور منگل کے ساتھ شادی کی بات چلتی ہے تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے۔ بھوکی ہوتی ہے تو ایک مرتبہ ہانڈی میں سے کورے چاول بغیر نمک ڈالے سب کے سب کھا جاتی ہے۔ بچوں کا بھی خیال نہیں کرتی۔ منگل

سے شادی ہو جاتی ہے لیکن رانو اس سے دور ہی دور رہتی ہے۔ گویا اس کا کردار معمولی ہونے کے علاوہ آزمائشوں میں منفی رُخ بھی اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس کے کردار کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہر آزمائش سے وہ اپنے منفی برتاؤ سے بلند ہو کر وہی رویہ اپناتی ہے جو زندگی کے حق میں ہے۔ اس کا دل صاف ہے اور وہ کردار کی کھری ہے۔ وہ سراپا محبت ہے۔ ماتا اور ایثار نفسی کا مجسمہ۔ اس کے دل میں حسد، لوبھ، خود غرضی اور انتقام کا کوئی جذبہ نہیں۔ یہی وہ جذبات ہیں جن سے من میں میلا پن پیدا ہوتا ہے۔ وہ شوہر اور ساس سے بے انتہا دُکھ اور ستم برداشت کرتی ہے، اس کے دل میں غم و غصہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن نفرت اور کدورت کے نہیں۔ سب راہیں بند پا کر اسے جسم فروشی کا خیال آتا ہے تو زناٹے کا چانٹا خود اپنے منہ پر مارتی ہے۔ بھنور میں گھری ناؤ کی مانند اس کی زندگی میں تھپیڑے ہی تھپیڑے ہیں اور کوئی قرار نہیں۔ لیکن وہ اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتی ہے۔ اعصاب زدگی، انتشار اور خلفشار کا شکار نہیں ہوتی۔ کردار کی یہ صلابت اسے ایک مثالی عورت بنانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن فنکاری کا کمال یہ ہے کہ رانو مثالی عورت نہیں بنتی، معمولی ہی رہتی ہے۔ اگر مثالی عورت نظر آنے لگتی تو ناولٹ ایک سبق آموز معمولی چیز بن جاتی کیونکہ مثالی اور آدرش وادی کردار، کردار نگاری کا اسفل نمونہ ہوتے ہیں۔ بیدی مثالی کردار سے بھی آگے کی چیز دیکھ رہے تھے، ایک ایسا کردار جس کے عمل کا سرچشمہ گنگوتری کے شیتل جل کی مانند ہو۔ پانی کا یہ سرچشمہ چاہے اتنے سنگلاخ نشیب و فراز سے گذرے، اس میں دُکھ اور یاتناؤں کے نکیلے پتھر آ کر گریں، اس کے پانیوں کے اُجلے پن میں کوئی کمی نہیں آتی۔

''ایک چادر میلی سی'' بہ یک وقت تین سطحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مذہبی اساطیر کی سطح، انسانی فطرت اور عظیم فطرت کی سطح اور روز مرّہ کے ارضی واقعات کی حقیقت پسندانہ سطح۔ ان تینوں منطقوں سے مستعار دھاگوں سے ناول کی بنت کا کام اوّل تا آخر جاری رہتا ہے۔ ناولٹ کا ہر اہم کردار اپنا سماجی مکھوٹا بھی رکھتا ہے، چہرے کا وہ عکس بھی جو گندی فطرت کے جوہڑ یا پاک صاف پانی میں نظر آتا ہے اور وہ دھندلا دھندلا سا پنسل سکیچ بھی جو ہر ٹائپ کے پسِ پشت آرکی ٹائپ کے ریکھا چتر کی مانند اُبھرتا ہے۔ کردار نگاری کا یہ عمل پوری ناولٹ میں اوّل تا آخر چھایا رہتا ہے، گو ظاہر بیں آنکھوں کو کردار، حقیقت نگاری کے کنواس پر اُبھرتے مٹتے دکھائی دیتے ہیں اور نظریں

رنگوں کی اس پھوار کو نہیں دیکھ پاتیں جو بے حد تخیلی استعاروں سے پھوٹتے ہیں اور اسلوب کو حقیقت نگاری، فطرت نگاری اور اسطور سازی کے رنگوں کا ایسا مرغولہ بنا دیتے ہیں کہ ایک رنگ کا دوسرے سے الگ کرنا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا ہو جاتا ہے۔ ناول کا آغاز ہی پیچ در پیچ استعاروں کے ایسے جال سے ہوتا ہے جس میں جکڑی تصویر ناولٹ کی معنوی تعلیقات کا نقشِ اولین بن گئی ہے۔

''آج شام سورج کی ٹکیا بہت ہی لال تھی۔ آج آسمان کے کوٹلے میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے، ڈبو منہ اُٹھا کر رو رہا تھا۔''

ناولٹ کا مقام کوٹلہ گانو ہے جہاں دیوی کا ایک مندر ہے۔ بھیروں کی ستائی ہوئی دیوی بھاگ کر کوٹلہ گانو آئی، تھوڑی دیر وِشرام کیا اور پھر سامنے سیال کوٹ جموں وغیرہ کی پہاڑیوں میں گم ہو گئی۔ کوٹلہ گانو سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور افق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے...... وہی ویشنو دیوی کا پہاڑ ہے۔ دونوں جگہ کوٹلہ گانو کے مندر میں اور ویشنو دیوی کی پہاڑیوں میں دیوی کا مثبت روپ ہے، جو پاروتی یا امایا گوری کے روپ میں حسین و جمیل اور مادرانہ شفقت کا مرقع ہے۔ وہ بھیروں کی ستائی ہوئی ہے جن کی رعایت سے وہ بھیروی بھی کہلاتی ہے۔ بھیرو، شکتی کے رکشک ہیں اور پاروتی کے ہر مندر میں ان کی بھی مورتی ہوتی ہے۔ لیکن اپنی ناولٹ میں بیدی نے نہ جانے کون سے اسطور کی بنیاد پر رکشک کو بھکشک کا روپ دیا اور بھیرو کو رُودر کے سروپ میں پیش کیا جو شیو کی ایک شان ہے۔ ناولٹ کے بھیرو، غصہ ور شیو کا روپ ہیں۔

بہر حال اگر کوٹلہ گانو میں دیوی کا مندر ہے تو مندر سے قریب ہی چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشیام کی حویلی بھی ہے۔ حویلی کے بغل میں ایک دھرم شالا بھی ہے جو دونوں بھائی چلاتے ہیں۔ دونوں بھائی اور لوہے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کے لیے دھرم شالا وِدے بھی چار اور عیاشیوں کا مرکز ہے۔ جاترا کو آئی ہوئی عورتوں کو دھرم شالا تک پہنچانے کا کام رانو

کا شوہر تلوکا ہی کرتا ہے جو تانگہ چلاتا ہے۔ یہ سب لوگ بھیروں ہی کا ایک روپ ہیں۔ مندر اور دھرم شالا بھی اسی طرح ساتھ لگے ہوئے ہیں جیسے دن کے ساتھ رات، اُجالے کے ساتھ اندھیرا، نیکی کے ساتھ بدی، گویا خیر و شر کا ایک چکر ہے جس میں انسانوں کی مایا نگری اور دیولوک سبھی گھرے ہوئے ہیں۔ ناولٹ میں شر کا شعلہ کس طرح بلند ہوتا ہے، اس کے بیان میں فنکارانہ تخیل کے جوہر کھلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''تلوکے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چودھری کی دھرم شالا میں چھوڑا تھا وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ دیوی کے پاس تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ترشول تھا جس سے اس نے بھیروں کا سر کاٹ کے الگ کر دیا لیکن اس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی ہاتھ تھے جنھیں وہ بھیروں کے سامنے جوڑ سکتی تھی، ان سے مدافعت نہ کر سکتی تھی، پھر بدن — جیسے تربوز کے گودے کے بنا ہوا جو مہربان کی چھری سے بچ نہ سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اُس دن کا سورج غصّے میں لال اپنے رتھ کے گھوڑوں کو اِدھر چھانٹا، ادھر چابک، اُدھر چھانٹا، ادھر چابک لگاتا ہوا سامنے والے خانقاہ کے پاس، فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہوگیا تھا اور اوپر آسمان پر دوج کے نازک چاند کو نچڑنے، پیلا ہونے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔''

پیچ در پیچ استعاروں سے بنا ہوا یہ صاف ستھرا بیانیہ بہ یک وقت تین منطقوں کا احاطہ کرتا ہے۔ بھیرو، ترشول دیوی اساطیر کی دنیا سے متعلق ہیں۔ غصّہ میں لال سورج اور دوج کا نچڑا ہوا پیلا چاند، فطرت اور اساطیر کی دنیاؤں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ نازک گلابی ہاتھ اور تربوز کے گودے کا بنا ہوا بدن، فطرت سے مستعار استعارے ہیں اور گھنشیام کی چھری، خانقاہ والا کنواں اور فارم کی کپاس زمینی حقائق ہیں۔ بیدی بظاہر تو ٹھوس حقیقت پسندانہ اور ارضی ناولٹ لکھ رہے ہیں، لیکن اپنے بیانیہ میں استعاروں اور اشاروں کے ذریعہ اس میں ایسے ڈائمنشن پیدا کرتے ہیں کہ ناولٹ کی کھردری بے رنگ زمین پر دھنک کے سات رنگ بکھر کر اسے ایک ماورائی حسن عطا کرتے ہیں۔

اسی طرح بیدی بظاہر تو عام گرے پڑے معمولی انسانوں کی کہانی ہی بیان کرتے ہیں لیکن یہاں بھی ان کی فنکارانہ بصیرت محض انسانی اعمال کو نہیں دیکھتی بلکہ ان اعمال کے پنہاں، پُراسرار سرچشموں کا سراغ پانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ عام انسان لوبھ اہنکار، کرودھ، انتقام، خودغرضی اور نفسانی خواہشات کا ادنیٰ شکار ہے۔ ٹیلیویژن کے سبب سے اب تو ہمارے لیے غریب پچھڑے ہوئے دیہاتوں کے اُن مرد اور عورتوں کے چہرے بہت عام ہو گئے ہیں جن پر بے درد زمانہ نے دُکھ کی لکیریں کھینچ دی ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ عام انسانیت کا مقدر چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پسنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن ایک چادر میلی سی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان میں سے چند لوگ ایسے نکل آتے ہیں جو بے حد غریب اور معمولی ہیں لیکن اپنے کردار کی صلابت کے زور پر اپنے پورے پریوار کو ایوالانش کی کچل دینے والی یلغار سے بچا لے جاتے ہیں۔ یہاں حالات میں کوئی مادّی تبدیلی نہیں آتی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خیال کی سطح پر ہوتا ہے۔ قوتِ ارادی، صبر و تحمل اور تحفظ ذات کی سطح پر ہوتا ہے۔ یہی عنصر بیدی کے ہیومنزم کو محض مادّی اور انسانی سطح سے بلند کر کے اسے برگزیدہ ہستیوں کے اعمال کے قریب کر دیتا ہے۔ بیدی کا ہیومنزم بظاہر تو نہیں لیکن اپنی سرشت میں مذہبی ہے اور اس سرّیت، حیرت اور حسن کا حامل جو روحانی تجربہ کا وصف ہے۔ یہ تجربہ بیدی کے یہاں اس وقت جنم لیتا ہے جب نفسیات فلسفہ میں اور فلسفہ مابعد الطبیعیات میں جذب ہوتا ہے اور مابعد الطبیعیات پھر اپنا پردہ کھینچ لیتی ہے کہ فنکارانہ تخیل حقیقت کا مشاہدہ براہِ راست کر سکے اور اس صداقت کو پا سکے جو علوم کی دسترس میں نہیں آتی۔ بیدی نفسیات اور فلسفہ کے دھندلکوں کے بیچ رہتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا علم انھیں انسانی فطرت کے بھید بھرے منطقوں کی آگہی بخشتا ہے۔ انسانی فطرت، عظیم فطرت کا ایک جزو بن جاتی ہے جو اپنی اصل میں تحیر خیز بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ فطرت کی تخلیقی قوتوں کی کارفرمائی جب وہ عورت میں دیکھتے ہیں، خصوصاً اس کے ماتا کے جذبہ میں، تو وہ خود کو ایک ایسی عظیم حقیقت کے سامنے پاتے ہیں جو منطقی فکر اور سائنسی علوم سے ماوراء ہے اور جسے صرف فنکار کا تخلیقی تخیل اپنی گرفت میں لے سکتا ہے کیونکہ کہانی، کردار اور اساطیر کی شکل میں اس کی دسترس میں اظہار کے وہ وسائل ہیں جو اُن حقائق اور کیفیات کے بیان پر قادر ہیں جن کا انکشاف فنکارانہ بصیرت کی تیسری آنکھ ہی سے ممکن ہے۔

صدیوں سے ایک غریب ہندستانی عورت کا جو مقدر رہا ہے، وہی رانو کا ہے۔ وہ ماں باپ کے گھر میں بھی غریب تھی اور شوہر کے گھر میں بھی غریب ہے۔ بس اسے اس بات کا اطمینان ہے اور تلوکے کے ساتھ لڑائی میں وہ ہمیشہ اس بات کو فخر یہ انداز میں پیش کرتی ہے کہ شادی کے وقت ماں باپ نے اتنا ہی کیا کہ کچھ دیا نہیں تو کچھ لیا بھی نہیں۔ جب رانو کی ساس جنداں، رانو کی بڑی بیٹی کا سودا کرتی ہے تو رانو ایک مرغی کی طرح اپنے بچوں کو شکارے کے حملے سے بچانے کے لیے پل پڑتی ہے۔ اسے یہ احساس کھائے جاتا ہے کہ وہ خود پیسے دے کر خریدی نہیں گئی تب بھی اس کی یہ دُرگت بنی ہے، تو بڑی زر خرید لونڈی کی طرح ہوس خوروں کا شکار ہو جائے گی تو اس کے ساتھ کیسا بھیانک سلوک ہوگا۔ وہ جو جی چاہے گا اس سے کام لیں گے۔ کہیں گے مفت تھوڑی لائے ہیں پیسے دیے ہیں۔

اتنے دُکھ، اتنی تکالیف کے باوجود رانو میں خود اعتمادی ہے کیونکہ اسے شادی کے بندھن کی سماجی اہمیت پر پورا اعتماد ہے۔ تلوکا چاہے ایسا وحشی سہی لیکن اس کے ہونے سے ایک شوہر اور سر پر ایک چھت اور بچوں کے لیے ایک باپ کا سہارا تو ہے۔ تلوکے کے قتل کے بعد یہ سہارا اس سے چھن جاتا ہے۔ ایک ازلی سوال کہ عورت کا اپنا گھر کون سا، یہاں پھر اُبھر کر آتا ہے۔ جنداں اچھی ساس نہیں ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جو بہو کو بیٹی نہیں سمجھتیں۔ پاس پڑوس کی عورتیں رانو سے کہتی ہیں کہ تلوکے کے مرنے کے بعد اب جنداں تجھے اس گھر میں رہنے نہ دے گی۔ جنداں میں اپنائیت نہیں ہے۔ اپنائیت اس ناولٹ کی بڑی تھیم ہے۔ غریب سے غریب پریوار سکھی ہوتا ہے جس میں اپنائیت ہوتی ہے۔ جہاں نہیں ہوتی وہاں طنز طعنے تشنے جھگڑے لڑائیاں اور دُکھ ہوتے ہیں۔ تلوکے کے قتل کے بعد رانو کا بیاہ اس کے دیور منگل سے کر دیا جاتا ہے۔ رانو کے لیے منگل اس کا بیٹا ہے اور منگل کے لیے رانو اس کی ماں ہے۔ بیاہ میں بھی منگل کو بے دردی سے مار مار کر میلی سی چادر کے نیچے بٹھایا جاتا ہے۔ بیاہ تو ہو جاتا ہے لیکن رانو اور منگل میں میاں بیوی کا رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو دونوں کو زوج الحرمین یعنی Incest کے Taboo پر قابو پانا پڑتا ہے جو دونوں کے درمیان حقیقی نہیں، محض رسمیہ ہے۔ یعنی رانو جب تلوکے سے بیاہ کر آئی اور اس کے بچے ہوئے تو خود منگل ایک بچہ تھا اور جب رانو بچوں کو دودھ پلاتی تو منگل بھی دودھ

پینے کے لیے مچل جاتا۔ رانو کے دل سے اس ٹیبو کو دور کرنے میں پڑوس کی عورتوں کی سمجھاوٹ بلکہ ڈانٹ ڈپٹ بہت کام آئی ہے۔ بہرحال ایک طویل اجنبیت، تناؤ اور کشمکش کے بعد رانو اور منگل ایک دوسرے کو اپنا لیتے ہیں۔ بیاہ اب گھر سنسار میں بدلتا ہے۔ رانو کو شوہر، بچوں کو باپ اور گھر کو کماؤ مرد ملتا ہے۔ پہلی بار اس گھر سے دُکھ دلدّر دور ہوتے ہیں، کوٹھیوں میں اناج بھرتا ہے اور تن پر نئے کپڑے نظر آتے ہیں۔ رانو سے منگل کے بیاہ پر رانو کی بڑی بیٹی بہت ناراض تھی۔ ماں کا منھ نوچ لیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ وہ بھی اس رشتہ کو اپنا لیتی ہے۔ لیکن اپنائیت کی سب سے بڑی آزمائش تو اس وقت آتی ہے جب جاترن کا بھائی، وہ نوجوان جس نے تلوکا کا قتل کیا ہوتا ہے، جیل سے رہا ہو کر آتا ہے اور رانو کی بیٹی بڑی سے شادی کا خواستگار ہوتا ہے تاکہ اس کے جرم کی تلافی ہو سکے۔ بڑی اپنی ماں سے کہتی ہے کہ وہ اس رشتہ کو قبول کر لے ورنہ وہ زندگی بھر کے لیے کنواری رہ جائے گی۔ یہ اپنائیت کی سب سے کٹھن منزل ہے۔ دیوی کی شان میں بھجن گاتے ہوئے اور رقص کرتے ہوئے جاتریوں کی گردش میں رانو بھی گھومنے لگتی ہے اور ایک وجدانی کیفیت کے عالم میں وہ اس رشتہ کو قبول کر لیتی ہے۔ گویا اپنائیت، قبولیت، محبت، معافی دیوی اور ایشوری صفات ہیں اور نفرت، دشمنی، انتقام، خوں ریزی اور تشدد اسوری طاقتیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ دیوی صفات کے حامل صرف تپسوی، سنت اور اوتار ہوں۔ ایک مفلوک الحال، ٹھکرائی ہوئی، دُکھ کے پہاڑ میں دبی ہوئی عورت میں بھی وہ پیدا ہو سکتی ہیں اگر وہ کڑی آزمائشوں کے دنوں میں صبر و تحمل اور ایثار نفسی سے کام لے اور ہر آن میلی ہوتی ہوئی، اپنے جذبات کی گنگا کو گنگوتری کی طرح شدھ اور شیتل رکھنے کی حوصلہ شکن کوشش کرتی رہے۔ رانو دیوی نہیں بنتی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں وہ ایک معمولی عورت ہی رہتی ہے اور خاطر نشاں رہے کہ Saintliness کا وصف کسی آدمی کو غیر معمولی نہیں بناتا۔ وہ معمولی ہی رہتا ہے اور صرف صاحبِ نظر فنکار کی آنکھ ہی اس کی معمولی شخصیت میں سنت کی پرچھائیوں کو پہچان لیتی ہے۔ اس کی مثالیں بیدی کے افسانے ''من کی من میں'' کا مادھو، ''کوارنٹین'' کا بھاگو اور منٹو کا افسانہ ''باسط'' کا کردار باسط ہیں۔ انہی معمولی لوگوں میں جب زبردست تیاگ کی بھاؤنا پیدا ہوتی ہے، جب دوسروں کے غم کا لہو اُن کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتا ہے، تو اُن کے اندر رہے ہوئے ایک سنت آدمی کے درشن

ہوتے ہیں۔

بیدی اگر رانو کو دیوی بنا دیتے تو اس کا کردار بلندی پر پہنچنے کی بجائے غارت ہو جاتا۔ ناولٹ میں انھوں نے بھیروں کی ستائی ہوئی دیوی کے اسطور کا استعمال کیا ہے۔ ناولٹ کے انجام میں وہ اسی اسطور کی روشنی سے معنویت کے گہر کو چمکاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اسے منور کر رہا تھا۔''

یہ تنویر، صاحبِ نظر فنکار کو ہی نظر آتی ہے، ناولٹ میں اور کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ خود رانو بھی اس سے بے خبر ہے۔ اسی لیے وہ معمولی عورت رہ کر اسی طرح سے زندگی جیے گی جس طرح جیتی آئی ہے۔ ایک اچھی ملازمت مل جانے پر، یا عہدے میں ترقی ہو جانے پر، یا کوئی انعام حاصل کر لینے پر، آدمی میں خودی کی آگہی اور اکثر خودی کا پندار پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو دوسروں سے مختلف اور برتر محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ بالکل فطری ہے۔ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور دنیا کا دستور ہے، لیکن رانو کے یہاں خود آگہی کا ایسا کوئی احساس نہیں۔ اس کے یہاں تو یہ احساس بھی نہیں کہ اس نے اپنی جھاڑ جھنکار زندگی کی چمن بندی کی ہے۔ ایک بے حد سنگلاخ زمین میں وہ جڑوں سے اکھڑا ہوا پودا تھی جو پُر تشدد آندھیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ تشدد گھر کے اندر تلوکا کی مار پیٹ تھی اور گھر کے باہر کم سن لڑکیوں کا بلات کار اور خود تلوکا کا قتل تھا۔ اس اُکھڑے ہوئے پودے کو تھوڑی سی ایسی زمین کی ضرورت تھی جس میں وہ اپنی جڑیں پیدا کر سکے۔ ایسی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا مل جاتا ہے تو یہ پودا ہرا بھرا درخت بن جاتا ہے۔ پوری ناولٹ، جڑیں پیدا کرنے کی ایسی ہی جدوجہد کی داستان ہے۔ یہ پودے کا فطری عمل ہے اور فطری عمل سماجی عمل کی مانند خود آگہی اور پندار کا کوئی شائبہ نہیں رکھتا۔ منگل سے اختلاط کا رشتہ قائم کر کے بطور شوہر کے اسے اپنانے میں کوئی فتح مندی کا تمغہ نہیں دیا جاتا۔ یہ تو فطری عمل ہے۔ لیکن یہ نہ ہوتا تو گھر آباد نہ ہوتا اور زندگی برباد ہو جاتی۔ اس کے ہونے ہی میں اس کا حاصل ہے اور اُکھڑے ہوئے پودے کو زمین فراہم کرنے کا کام بھی سماج اپنے سر لیتا ہے، جو ایک میلی سی چادر کے نیچے دھوم دھام سے نہیں بلکہ رانو کی بے ہوشی اور منگل کی مار پیٹ کے سبب زخمی حالت میں بیاہ کی رسم ادا کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں پاس پڑوس کی عورتوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ عورتیں بھی بہت معمولی، اکثر فحش زبان اور جنس

زدہ ہیں، لیکن وہ رانو کا گھر بسا دیتی ہیں۔ اس معنی میں یہ ناولٹ ایک اجتماعی ناولٹ ہے، بیاہ کی کہانی ہے، سنسار قائم کرنے اور چلانے کا سماجی قصہ ہے۔ اس سماج کا قصہ جس میں شر پسند ہوسناک لوگ بھی بستے ہیں، جہاں دیوی کا مندر ہے لیکن دھرم شالاؤں میں ہولناک بلاتکاروں کی وارداتیں بھی ہیں۔ شیطان صفت لوگوں کے اسی سماج میں ایک عورت کو جینا ہے، کیونکہ وہ محض ایک عورت نہیں ایک ماں بھی ہے اور جینے کی طاقت کا سرچشمہ ماتا کا یہی جذبہ ہے جو اسے پھر ایک نئے مرد کو اپنانے اور اس کے بچوں کی ماں بننے پر رضامند کرتا ہے۔ یہی تقاضائے فطرت ہے۔ بھولا کی ماں بیوہ ہوتی ہے تو تیاگ مُرتی بن جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس بھولا ہے اور بھولا کے دادا جیسا مہربان سُسر بھی اور بہن کو چاہنے والا بھائی بھی اور زمین اور کھیت کی صورت زندہ رہنے کے تھوڑے بہت وسائل بھی۔ بھولا کی ماں نے بھولا کی محبت میں سب کچھ بُھلا دیا۔ جنس کا جذبہ بھی ماتا کے سمندر میں ایک گم شدہ موج بن گیا۔ رانو ایثار نفس عورت ہے۔ بیوگی میں اگر اُسے وہ وسائل میسر ہوتے جو بھولا کی ماں کو تھے تو وہ بھی تیاگ مُرتی بن جاتی۔ لیکن منگل کے ساتھ اس کا بیاہ ہو جانے کے بعد اسے بیوی کا دھرم تو نباہنا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ منگل سے کھنچی رہی کہ اس کی شادی مجبوری کی ہے جس میں جنس کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن جب فطرت نے دونوں کو قریب لانے کا کام شروع کیا تو اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ ایک جوان بھری پُری عورت کا کردار بھی نباہتی ہے۔ وہ سنت اور دیوی کی خوبیوں کے ساتھ ہی ایک عورت ہی رہتی ہے۔ ایک ایسی عورت جو طوفانوں اور آندھیوں کے تھپیڑے کھا کر لچک جاتی ہے لیکن ٹوٹتی نہیں۔

وارث علوی

ناولٹ

ایک چادر میلی سی

1

آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی ...... آج آسمان کے کوٹلے میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا اچھینکتے تھے، ڈبّو منہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا ——

دوپہر کے قریب، بڑی ذیل کے کارندے جب کتّوں کو گولی ڈالنے کے لیے آئے تو ڈبّو بچ گیا۔ وہ تلوکے کے ہاں کہیں صحن میں بڑی گھڑونچی کے نیچے سو رہا تھا۔ اوپر ملتانی مٹی کے گھڑے رس رہے تھے اور نیچے کچی زمین کو ٹھنڈا اور خوش بودار بنا رہے تھے۔ اور ڈبّو اس ٹھنڈک اور بُو باس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا...... تھوڑی دیر میں وہ اُٹھ کر اکڑا، منہ کھول کر جماہی لی اور پھر باہر چلا آیا۔ جب تک اُس کی چہیتی کُتیا بوڑی کی آنکھیں کانچ ہو چکی تھیں۔ بوڑی کے پاس پہنچ کر ڈبّو نے نے اسے ایک دو بار سونگھا اور پھر اچانک ایک سمت چل دیا، جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ تلوکے کی بیوی رانو اور اس کی پڑوسن چنّوں ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں۔ چنّوں نے اپنی کوکے والی ناک پر انگلی دھری، پھر ایک لمبی سانس بھری، اور بولی۔

"ہا! مرد کی جات...... سب ایک ہی سی ہوتی ہے......"

رانو کی غلافی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کوئی کپڑے کو دھو ہتا کر چھانٹ رہا ہو۔ پھر کچھ سنبھلتے مگر آنکھیں پونچھتے ہوئے رانو نے چنّوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی——

"اِیئے! تیرا ڈبّو تا ایسا نہیں——؟"

اس پر چنّوں نے رانو کو ایک مردوں والی گالی دی جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا لگی۔ شام کے وقت جب وہ رات کی آہ اور دن کی واہ کا کوڑا پھینکنے کے لیے باہر آئی تو دوپہر کے سارے واقعات بھول چکی تھی۔ جس ہاتھ سے اس نے کوڑا پھینکا، اسی سے جھاڑو چھانٹتے ہوئے وہ منھ اٹھا اٹھا کر رونے والے ڈبّو کو بھگانے لگی۔

ہات!...... ہات مُردے...... یہاں دھرا ہی کیا ہے، تیرے رونے کو؟——رونا ہی ہے تو جا سامنے چودھریوں کے گھر جا کر رو، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں، مردوں کی لام لگی ہے......"

چودھری مہربان داس کے ساتھ رانی خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید اس لیے کہ تلوکے، رانی کے گھر والے کو، بدمعاشی کی لت مہربان داس کے ہاتھوں لگی تھی، پھر گانو کی عورتوں کی عجیب بات——اپنے مرد کا کچھ پتا نہیں، دوسریوں کے مردوں کا کھایا پیا سب معلوم۔ رانو، اپنے تلوکے کے بارے میں جب نواب اِکّے والے یا گورداس کی بیوی سے سنتی تو جل بھن کر راکھ ہو جاتی۔ شاید راکھ نہیں، کوئلہ۔ کیوں کہ اندر سے رانو بہت پکّی تھی۔ تلوکا گھر لوٹتا تو وہ اس سے لڑتی، اُسے نوچتی کاٹتی اور پھر خود ہی مار کھاتی ہوئی ایک طرف جا بیٹھتی اور سوچتی۔ "ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو باہر ہی غصہ نکال آتا ہے اپنا...... میرے جی کا جنجال تو نہیں ہوتا......"

ان، صرف ان باتوں سے رانو کو تلوکے کے مرد ہونے کا پتا چلتا اور وہ ایک ضد کے ساتھ اسے اپنا بنانے کی کوششوں میں لگ جاتی۔ کوششیں کیا؟——کنڈے پیپل کے نیچے ایک سائیں بابا تھا——جتی ستی! جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا ہے اور اب تک نہیں جانتا، عورت کیا چیز ہے، حالاں کہ چوبیس گھنٹے، آٹھوں پہر اس کے گرد عورتوں ہی کا جمگھٹا رہتا—— کوئی بیٹا مانگتی، کوئی اٹھرا کی دوائی...... اکثر تو اپنے مردوں کو بس میں کرنے کے ٹوٹکے ہی پوچھنے آتیں۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے اس نے پورن دئی مصرانی کو ٹوٹکا دیا جس سے نہ

صرف وہ پیٹ والی ہوگئی بلکہ گیان چند، اس کا مرد پاگلوں کی طرح اس کے ارد گرد چکّر کاٹنے لگا۔ رانو بھی تلوکے کی مار سے بچنے کے لیے باوا ہری داس سے ایک ٹونا لے آئی اور اس تاک میں لگ گئی، کب تلوکا کچّا دودھ مانگے اور تو نے کو اس میں گھول کر پلا دے اور پھر پاس نہ آنے دے۔ ہاں، جب منّتیں کرے، پاؤں پڑے، ناک رگڑے —— تب...... لیکن، ہفتوں تلوکے نے کچّا دودھ مانگا، نہ پیا ——

تلوکا روز نہیں تو دوسرے تیسرے ضرور میٹھے مالٹے کی ایک بوتل چودھری مہربان داس کے ہاں سے لے آتا تھا۔ رانو دنیا بھر کے عیبوں کو معاف کرسکتی تھی لیکن شراب کو نہیں۔ وہ سمجھتی تھی —— شراب ایسی سوت نہیں دنیا میں۔ مرد چاہے اپنا سب کچھ کسی دوسری پر لٹا آئے، پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اپنے لیے تو بچ ہی رہتا ہے لیکن شراب ——؟ ماں ری ماں! اس سے تو اتنی بو آتی ہے کہ انسان منہ بھی قریب نہیں کرسکتا۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ہی کچھ لٹ گیا......تلوکا دن بھر نواب، اسمٰعیل، گورداس وغیرہ کے ساتھ اکّا ہانکتا لیکن شام کے وقت، نصیبوں والے اڈّے پر پہنچ کر اس تاک میں کھڑا ہو جاتا کہ کوئی بھولی بھٹکی سواری مل جائے اور وہ اسے اچھے کھانے، نرم اور گرم بستر کے لالچ میں لے جا کر، مہربان داس کی دھرم شالہ میں چھوڑ دے۔ دراصل تلوکا یہ سب مہربان اور اس کے بھائی گھنشام ہی کے لیے کرتا تھا لیکن اس پر بھی بدنامی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس کے حصّے میں آتی بھی تو ایک آدھ چانپ اور میٹھے مالٹے کی بوتل ——

کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی۔ چودھری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیروں کے چنگل سے بچتی بچاتی، اس گاؤں میں آنکلی تھی اور اُس جگہ جہاں اب ایک مندر کھڑا تھا، گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیال کوٹ جموں وغیرہ کی پہاڑیوں میں گم ہوگئی تھی......اب بھی کسی ڈھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دُور، اُفق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا تھا —— وہی ویشنو دیوی کا پہاڑ ہے۔

تلوکے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چودھری کی دھرم شالہ میں چھوڑا، وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ دیوی کے پاس تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ترشول تھا جس سے اس

نے بھیڑوں کا سر کاٹ کے الگ کر دیا۔لیکن اس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی سے ہاتھ تھے جنھیں وہ بھیڑوں کے سامنے جوڑ سکتی تھی،ان سے مدافعت نہ کر سکتی تھی۔پھر بدن—— جیسے تربوز کے گودے کا بنا ہوا،جو مہربان کی چھری سے بچ نہ سکتا تھا۔شاید اسی لیے اس دن کا سورج،غصّے میں لال،اپنے رتھ کے گھوڑوں کو اِدھر چھانٹا،ادھر چابک،اُدھر چھانٹا،اِدھر چابک لگاتا ہوا سامنے خانقاہ والے کنوئیں کے پاس،فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہو گیا تھا اور اوپر آسمان پر،دوج کے نازک سے چاند کو نچڑنے،پیلا ہونے کے لیے چھوڑ گیا......

دھرم شالے کے پاس ٹھیکے والوں کے مکان کو نئی ٹیپ ہوئی تھی۔سیاہیوں کے پرے،دیواروں کے چہرے پہ چھپٹ چکے تھے۔اینٹوں کا گیرا تو دکھائی نہ دیتا تھا،البتہ ان کے بیچ کا چونا،اتنے اندھیرے کے باوجود،سامنے ہنستا،منہ چڑاتا ہوا نظر آرہا تھا۔پُروا میں کوٹلے کے سارے پھر داتھیہ،جامن اور بکائن سنسنا رہے رہے تھے اور جوہڑ کے کنارے،باوا ہری داس والے لُنڈ ے پیپل کے گنے چُنے پتے ایک بے ہنگم سی آواز پر تال دے رہے تھے۔ ....جس راستے پر تلوکا جارہا تھا وہ گانو کے ایک ہی بازار اور بازار میں ایک ہی آٹے دانے کی دکان کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا،جہاں اتفاق کی بات،ایک ہی عورت—— جہلم ارائین،اپنی ترکاری دے کر،اس کے بدلے گیہوں لے رہی تھی۔اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تلوکے نے آواز دی——

''کیوں جہلمیں—پھر کیا مرضی ہے؟''

گانو بھر میں،ایسے آوازوں کی عادی،غریب کی جورو سب کی بھابھی،جہلم نے تلوکے کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا اور جھولی اناج سے بھرتی ہوئی بولی ——''جو تیری ماں کی ہے،تلوکا!ہائے تجھے پیدا ہونے سے کسی نے نہ روکا؟''

——اور تلوکا ہنستا ہوا نکل گیا۔

گھر پہنچا تو اس کے جڑواں بیٹے ابھی تک بکائن کے نیچے،کوئلے سے لکیریں ڈال آپس میں 'بارہ گٹاں' کھیل رہے تھے۔ایک نے غلط ہی دوسرے کی کنکری مار لی اور مہا بھارت شروع ہو گئی۔وہ بنا سمجھے بوجھے،بڑوں کی ٹھیٹ زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے،بال نوچنے لگے۔باپ کی آہٹ پاتے ہی وہ ایک دم اپنے اپنے اُردو کے قاعدے لیے،دِیے کی روشنی میں

بیٹھ گئے۔ اُدھر باپ نے آواز دی —— "پڑھواوئے پڑھو۔" اِدھر بڑے بچّے نے پڑھنا شروع کیا —— "وہ دیکھو، اُلّو بولا۔"

تلوکے نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا "میں سب جانتا ہوں، حرامیو!" جس پر چھوٹا زور زور سے کہنے لگا "بک بک مت کر، بک بک مت کر" ...... اور تلوکا اس نئی تعلیم کو ایک نا قابلِ علاج بیماری سمجھ کر سٹک گیا۔

ان جڑواں بچّوں، ہنتے اور سنتے سے بڑی، پہلونٹی کی ایک لڑکی تھی جس کا نام تلوکے اور رانو نے ہمیشہ کی سہولت کے لیے بڑی ہی رکھ دیا تھا۔ وہ دن بھر کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور جب کچھ نہ ہوتو سب سے چھوٹے، سال بھر کے مُنّوں کو کھلانے لگتی —— "ویر آیا کھیل کے، میں من پکاواں ویل کے" ...... وہ محلّے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گیند بھی کھیلتی جب بھی وہی بھیّا اور وہی بھابی۔

"کوٹھے اُتے کتا، ویر میرا لمّاں —— بھابو میری پتلی، جھدے نک مچھلی" اور ایسی ہی آس پاس کی چیزیں —— کتا، ویر، بھابی، ناک کی مچھلی، لنڈا پیپل، توریاں جیٹھ ...... اس کی کائنات ابھی جیٹھ کے تصوّر تک ہی پھیلی تھی، لیکن ابھی سب کچھ مہمل مہمل ہی تھا۔ البتہ گھر میں ایک اور تھا جو تیزی سے سمجھدار ہو رہا تھا —— بڑی کا چاچا، تلوکے کا چھوٹا بھائی، رانو کا دیور —— منگل —— بیکار اور بدکار —— دن بھر اسے چھیڑ، اسے چھیڑ، بار بار اپنے تہ بند کو کس —— گھر آتا تو یوں کھانا مانگتا جیسے سب اسی کی کمائی کا ہو اور بھابی رانی اندر سے خوش، باہر سے غصّے میں کہتی —— "دیتی ہوں مشٹنڈے! ...... تیرے ہی لیے تو سب پکا ہے۔"

منگل پانچ چھے برس کا بچّا تھا جب تلوکا رانو کو بیاہ کے، اس کے مائیکے سے لایا۔ رانی کے ماں باپ بے حد مفلس تھے، شاید اسی لیے انھوں نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ دیا تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی، بپھری تو روٹی کپڑے کے وعدے پر اس کے ماں باپ نے اس کا ہاتھ تلوکے کے ہاتھ میں دے دیا اور خود عدم آباد کی طرف نکل گئے۔ رانو کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کا آگا تو جیسا تیسا بھی ہے لیکن پیچھا کوئی نہیں۔ کبھی تو ایسا وقت آجاتا ہے جب ہر عورت، گر کر پیچھے دیکھتی ہے اور جو نہ دیکھ سکے تو اسے آگے بھی نظر نہیں آتا ...... رانی جب سے کوٹلے میں آئی تھی

اسے ماں کے روپ میں ساس جنداں مل گئی اور باپ کی شکل میں سسر حضور سنگھ، اور دیور منگل، جو اتنا چھوٹا تھا کہ بڑی کے پیدا ہونے پر اس کے ساتھ دودھ پینے کے لیے مچل گیا۔ کچھ ہنستی، کچھ شرماتی ہوئی رانو نے اکیلے میں جب اسے پاس بٹھا کر کرتے میں سے چھاتی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھاگ نکلا...... منگل کو رانی ہی نے پالا۔ دنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا۔ لیکن رانی کی نگاہوں میں، اس کا سب سے بڑا بچہ۔ منگل بھی رانی کو ماں ہی سمجھتا تھا ورنہ وہ سگی ماں کو تائی کیوں کہتا؟ جب تو رانی اس کے کان بھی امیٹھ لیتی تھی، دھول دھپہ بھی کر لیتی لیکن اب پچھلے چند برسوں سے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نہ صرف بچے بڑے ہو گئے بلکہ منگل بھی آنکھیں دکھانے لگا اور تلوکا شراب پینے، اور جنداں روایتی ساس کی شکل اختیار کرتے ہوئے بات بات پر کاٹنے لگی ۔اس کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے تھے ادھر تلوکا ہفتے میں تین دن گھر ہی میں پڑا رہتا، اُدھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے، صبح جوہڑ میں نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے۔

چھٹی کے دن ایک روز شام کے قریب تلوکے نے رانو کے پاس جا کر اپنے اَریب کرتے کی جیب میں سے ایک ٹماٹر نکالا اور اسے رانی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لے، ایک پیاز ڈال کے کاٹ دے اسے۔''

رانی جو ترکاری پکا رہی تھی، تھم گئی۔ ہاتھ کی کڑچھی دیگچی میں ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، بولی ــــــ ''پھر لے آئے میری سوت کو؟''

تلوکے نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''روز تھوڑے ہوتا ہے رانو؟''

''روز ہو یا نہ ہو۔'' رانی کڑک کر بولی۔ ''میں نہ پینے دوں گی۔ کہاں ہے تمھاری بوتل؟ آج میں تو دیکھ لوں، اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔''

تلوکا اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ شور نہ مچے لیکن رانو نے وہی بات کی۔ دانت پیستے اور جھلاتے ہوئے تلوکے نے ایک نامردانہ سی کوشش کی۔ ''کُتیے، کنجریے!...... میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کر رہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئی؟''

''ہاں—'' رانی بولی'' بے شک گھوڑے پر تو ہی سوار ہو سکتا ہے دوسرا نہیں؟......آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی۔ آج اس گھر میں یہ رہے گی یا میں رہوں گی۔''

اور رانو بوتل ڈھونڈنے دوڑی۔ آناً فاناً تلوکے کی آنکھ کا پانی مر گیا۔ اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس کے اڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا پٹڑا کر دیا...... دِیے کی لو ایک بار بجھنے کے قریب ہوئی اور پھر سیدھی ہو کر کانپنے لگی۔ بکائن پر بیٹھے ہوئے تلیر اڑ گئے۔ ڈبُو تن کے کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھونکنے لگا۔ بڑی چلائی——''بابو''! بچے اندھیرا ڈھونڈنے اور چھپنے لگے۔ ایک تو موقع پا کر گھر سے بھاگ گیا، دوسرا ایک کونے میں جا لگا، دہشت کے عالم میں کانپتا ہوا وہ ماں کے بجائے ''آں آں'' کہہ رہا تھا—— حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا، فریاد کے سے انداز میں گالیاں دیتا ہوا۔ ''اوئے پاپیا، اوئے بے شرما، اوئے بے حیادا''......
اور تنور پر گر کر جھلس گیا......

پہلے ہلّے میں رانی باہر آئی۔ اس نے اپنی بتیسی تلوکے کے ہاتھ میں گاڑ دی۔ تلوکے نے اور غضب ناک ہو کر، اسے بار بار دیوار کے ساتھ مارا اور وہ گالیاں دیں جو اس نے کبھی اپنے جانور کو بھی نہ دی ہوں گی——

''مار ڈالا، ماں کو مار ڈالا۔'' بڑی چلّا رہی تھی اور جب دادی باہر سے آئی تو بڑی کی شلوار گیلی ہو چکی تھی۔ جنداں آتے ہی بولی—— ''جانتی تھی......میں جانتی تھی، ایک دن یہ چاند چڑھنے والا ہے......ہائے! یہ پٹری[1] داسوں کی اولاد—— جانے کہاں سے ہمارے گھر میں آ گئی——؟''

''تو بیچ میں مت بول۔'' منگل ماں سے کہہ اٹھا۔ وہ میاں بیوی کی لڑائی میں کسی کا بھی آنا ٹھیک نہ سمجھتا تھا اور خود ایک طرف کھڑا اپنے آپ کو روکنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''کیوں نہ بولوں؟'' بڑھیا کہے جا رہی تھی۔ ''اپنی کمائی سے پیتا ہے، اس کے باپ کمینے سے تو مانگنے نہیں جاتا؟ خود تو کھپ گیا، یہ کلنج[2] چھوڑ گیا ہمارے لیے......''

ماں کی شہ پا کر تلوکا اور بھی تند ہو گیا۔ اس نے رانی کے کپڑے پھاڑ دیے اور اسے یوں کر

---

1 خانہ بدوشوں 2 چیل

دیا جیسے ابھی پیدا ہوئی ہو۔ وہ زور زور سے چلّا رہا تھا۔ ''نکل جا، نکل جا میرے گھر سے۔''

رانو بے دم سی ہو کر کہے جا رہی تھی۔ ''میں نہیں رہوں گی، میں آپ ہی نہیں رہوں گی۔'' ......
کچی دیوار کے پاس کچھ اجنبی سے چہرے اُمڈے، اوپر کوٹھے پر کچھ عورتوں کے سائے سے رینگے ـــــ ''مار ڈالا اڑیو مار ڈالا ـــــ ہائے نی کرئی بچاؤ، ہائے نی یہ راکھشش ـــــ''

ـــــ ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں، سبھی اوپر کلیجا تھامے کھڑی تھیں، نیچے آنے، رانو کو چھڑانے کی ہمت کسی کو نہ پڑتی تھی۔ جب ہی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی جہلم ارائین، اس کی بیٹیاں، پورن دئی برہمنی، نواب کی بیوی عائشہ، چنوں، ودّیا، سرو پو سب ہی پہنچ گئیں لیکن ان سب میں صرف چنوں چلّا رہی تھی۔ ''چھڑاؤ وے، وے کوئی چھڑاؤ۔''

''کھبر دار جو کسی نے چھڑایا'' رانو اوپر دیکھتے ہوئے چلّائی۔ ''تم سب جاؤ..... جاؤ تم..... کیا تم کو نہیں پڑتیں؟'' اور پھر بولی۔ ''آج جو ہونا ہے، ہو جائے، ہو جانے دو، ایک بار..... آج دیوی کے کوٹلے میں بڑا پُن ہوگا۔ آج میں اس کے ہاتھوں مروں گی، سورگ کو جاؤں گی..... آج میرے بچّے مجھے روئیں گے... ''

ـــــ رانوں عورتوں کو بھگا رہی تھی، بُلا بھی رہی تھی۔

کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کہاں اب ایکا ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹی سی ماں کی ایک گالی دیتے ہوئے بالا۔ ''لا ـــــ اب لا ہاتھ نیچے، کہ ایک عورت پر ہی ختم ہوگئی شہ زوری؟ ... ہل ..... ہل اب، اپنے باپ کا ہے تو؟''

تلوکے نے منگل کی آہنی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ کچھ بولنے بکنے لگا لیکن منگل کی نگاہوں میں قتل دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ منگل نے اسی پر بس نہ کی۔ آگے بڑھ کر اس نے زور سے بوتل کو ٹھوکر ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔ شراب کی بُو لپکی اور اوار منڈیر پر کھڑی عورتیں، چھی چھی کرتی، ناک پر کپڑا رکھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ دیر کے بعد چلی گئیں۔ پھر تلوکے کو یوں ٹھس ہوتے ہوئے دیکھ کر منگل نے، خود ہی اُسے چھوڑ دیا، اور وہ ـــــ تلوکا، بکتا جھکتا ہوا اندر کوٹھری کی طرف چل دیا۔ اب اس کی گالیوں میں پتھر نہیں، بنولے تھے جو ہَولے ہَولے دماغوں پر لگ رہے تھے۔ ان میں پہلی سی بے تکلفی نہ تھی۔ اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان سے

نہیں، کسی کتاب سے کچھ پڑھ کے سنا رہا ہے۔

رانو اندر جا کر ایک ٹرنک میں کپڑے ڈالنے لگی۔ وہ جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ وہ بس، جا رہی تھی...... ''بیٹی تو کسی دشمن کے گھر بھی نہ ہو بھگوان! ذرا بڑی ہوئی، ماں باپ نے سسرال ڈھکیل دیا، سسرال والے ناراض ہوئے، مائیکے لڑھکا دیا۔ ہائے یہ کپڑے کی گیند، جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی......''

کپڑے تھے ہی کتنے؟ پل بھر میں ٹرنک تیار ہو گئی اور پھر ایک دم رانو کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ خود روتی، دوسروں کو رلاتی ہوئی بولی۔ ''لو جی، سنبھالو اپنا گھر۔ یہاں ایک میں ہی مہمان تھی نہ، سو جا رہی ہوں۔ تم لے آنا کسی اور کو جو کرے مرے بھی اور تمھاری گالیاں بھی سُنے۔ مار بھی کھائے اور ہڈیاں بھی تڑوائے۔'' پھر رانو کو سامنے بچّے نظر آ گئے۔ غم اور غصّے میں اندھی ہو کر جنھیں وہ بھول ہی چکی تھی۔ ''بچّے؟''...... وہ خود ہی بول اُٹھی۔ ''میں سمجھوں گی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ سمجھوں گی مر گئے......''

''بڑی نے پاس آ کر دوپٹے کا پلّو تھامتے ہوئے کہا—— ''ماں!'' رانو نے ایک دم جھٹکے سے پلّو کو چھڑا لیا اور بولی۔ ''پرے ہٹ مُر دیئے! ایک دن تیرا بھی یہی حال ہوگا۔

اور وہ باہر کی بہت ہی وسیع و عریض دنیا کی طرف چل دی۔ اندھیرے کے کارن آسمان کے تاروں کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُدھر ایک ایک ستارہ اپنی زمین جتنا بڑا تھا اور کئی زمین سے بھی بڑے...... جو سامنے کھڑے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ بیچ میں کالی بدلی آ جانے کی وجہ سے دوج کا چاند دو چھانک ہو چکا تھا۔ ..

منگل نے بھاگتے ہوئے رانو کا بازو تھام لیا اور بولا۔ ''بھابی! کہاں جائے گی؟'' اور پھر دہشت کے عالم میں پیچھے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے روکو تائی۔''

جنداں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''جائے گی کہاں؟—— آ گا نہ پیچھا۔''

حضور سنگھ چلّایا۔ ''دھیئے! رانیئے!'' اور پھر اندازے ہی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے، پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کرتا اُٹھا لیا اور وہ چھالے جو تنور پر گر کر جھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا پنڈا تو دیکھ بیٹا۔''

رانو اُبل پڑی۔ منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی۔ ''باپو!'' جب تک تلو کے کا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ ایک یتیم لاوارث کی طرح وہ اندر سے آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اُکھڑی سی آواز میں بولا — ''جا...... جا نہ، دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟''

''کہیں بھی جاؤں تجھے اس سے کیا؟'' رانی روتے ہوئے بولی۔ ''جہاں بھی جاؤں گی، محنت مجوری کرلوں گی، اپنا پیٹ بھرلوں گی...... دو روٹیوں کے لیے مہنگی نہیں کسی کو۔ گانو بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لیے، دھرم شالہ تو ہے......''

''دھرم شالہ'' تلو کا چونک اٹھا...... ایک دم آگے بڑھتے ہوئے اس نے رانی کی ٹرنکی پکڑ لی اور بولا۔ ''چل مَر پیچھے —''

پیچھے؟ — آگے؟............ رانو، خود دار رانو بہت کچھ چھینی جھپٹی لیکن تلو کے کی طرح اب اس کی باتوں میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا۔ وہ کوئی بہانہ ہی چاہتی تھی جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی — اور اب جانے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ — بوتل تو ٹوٹ ہی چکی تھی!

2

حضور سنگھ کے جلتے ہوئے بدن پر رال لگا کر رانو لوٹ آئی۔ تلوکا ٹانگیں پھیلائے پڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ سونے سے پہلے ننھا ایک بار رویا لیکن ماں کی چھاتی منہ میں دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ تلوکے کے دماغ میں آج کے ہنگامے کی بجائے وہ جاترن گھسی ہوئی تھی، اور رات بھر گھسی رہی۔ اندھیرے میں وہ خود مہربان داس تھا اور رانو جاترن۔ تلوکے نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رانو نے ہاتھ جھٹک دیا۔

''ہی، بچی!—— بالکل بچّی!'' تلوکے نے کچھ کھسیانا ہو کر کہا۔ ''تُو تو بالکل ایک بارہ تیرہ برس کی بچّی کی طرح کرتی ہے۔ ویسے ہی دولتّی جھاڑنے لگتی ہے......''

پھر تلوکا منّت سماجت پر اُتر آیا۔ وہ بھی اُن مردوں میں سے تھا۔ اندھیرا ہوتے جن کی ساری اکڑ جاتی رہتی ہے۔ پھر اُس نے اُٹھ کر شیو جی کی تصویر نکالی جس میں وہ پاروتی کو پاس بٹھائے ہوئے تھے اور سر کی جٹاؤں میں سے گنگا بہہ رہی تھی۔ رانو کے پاس تصویر رکھ کر تلوکے نے شیووں کا واسطہ دیا۔ پاروتی کے امر پیار کی باتیں کیں لیکن رانو اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ پھر اس نے رادھے کرشن کی تصویر چوکھٹے میں سے نکالی...... وہ چوکھٹے سمیت بھی لا سکتا تھا۔ لیکن وہ ہر تصویر کو چوکھٹے میں سے نکالے دے رہا تھا، جیسے وہ پیے ہوئے ہو یا ایسے اس کے دماغ میں کوئی فاسد مادّہ اڑ گیا ہو۔ کچھ دیر بعد چوکھٹے ہی چوکھٹے رہ گئے تصویریں بیچ سے غائب ہو گئیں۔

رانو صبح اٹھی تو اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ وہ اٹھنا نہ چاہتی تھی لیکن گھر کا سارا کام کاج پڑا تھا۔ شام کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا، اس لیے روٹی کی بھی جلدی تھی، پھر گھوڑے کے لیے دانہ

بھگونا، اس کا ساز نکالنا تھا۔ تلوکا ہمیشہ کی طرح اُدھ موا پڑا تھا۔ آنکھیں بھی آدھی کھلی، آدھی بند، منہ پورا کھلا ہوا...... رانو اس کے پاس سے اٹھ کر دِیے کے پاس گئی اور اور اسے ہاتھ میں لیے پھر تلوکے کے پاس چلی آئی ــــــ اسی جذبے سے جس سے انسان مرے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے لیے لوٹ آتا ہے۔

جب تلوکا اٹھا تو رانو گھر کا آدھا کام کر چکی تھی۔ اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل شام کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے ہاتھوں سے ساز لیتے ہوئے تلوکے کے ماتھے پر پھر سے تیوری چڑھ گئی۔ اسے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات اس نے معافیاں مانگی تھیں، نہ کان پکڑے تھے اور نہ ناک سے زمین پر لکیریں کھینچی تھیں۔ یوں بھی سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی اس کی مردانہ اکڑ لوٹ آئی تھی۔ ساز کے تھامتے ہی، اس کے گھنگھرو چھن چھن کر اٹھے۔ گھوڑی کی پروں والی کلغی میں ہوا کی ایک لہر دوڑ گئی اور تلوکا بولا۔ ''یہ نہ سمجھنا میں تجھ سے ڈر گیا ہوں۔''

''میں کب کہتی ہوں؟'' رانو نے ٹالتے ہوئے کہا۔

تلوکا اُس پر بھی چپ نہ ہوا ــــــ ''عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں...... آج میں پھر لاؤں گا مٹھے مالٹے کی بوتل، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے؟''

رانی کچھ نہ بولی...... البتہ دل ہی دل میں اس نے سوچا۔ آج یہ لایا مٹھے مالٹے کی بوتل، تو میں گلے کی ہولدلی چبا لوں گی۔ بارہ سنگھے کا پورا سینگ پیٹ میں گھوپ لوں گی، کتے کی گولی کھا مروں گی جو اس دن بوڑی نے کھائی تھی...... پھر یہ کمینہ بھی ڈبّو کی طرح ایک نظر مجھے دیکھ کے چھوڑ دے گا؟ ایک آدھ ڈھاڑ تو مارے گا ہی۔ میرے لیے نہیں تو اپنے بچّوں کی خاطر...... نہیں نہیں...... کسی کا کیا جائے گا؟ ــــــ مر جائے گی ماں باپ کی بیٹی۔ پر، ماں باپ کہاں ہیں؟...... آگا نہ پیچھا...... میں نہیں مروں گی۔ ساس خوش ہوگی، کہے گی ــــــ ستے ہی میں جان چھوٹی......

جب ہی منگل اپنے البیلے پن میں پاس سے گزر گیا، بھائی کے پاس پہنچا تو دونوں مغائرت کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھنے، غرّانے لگے۔

''تیار ہو گیا ہے پتھا'' تلو کے نے کہا اور خود ہی دُم دبا کر اندر بھاگ گیا۔

منگل نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ بڑی، ماں باپ کو ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھ کر صحن کی طرف سِرک گئی اور چھوٹے بھائیوں کو مدرسے کے لیے تیار کرنے لگی۔ دوسری کوٹھری میں رات بھر کراہتا، جاگتا ہوا حضور سنگھ کہیں پچھلے پہر سو گیا تھا۔ جنداں دبی زبان میں جپ جی کا پاٹھ کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکا سواریوں سمیت گھر کے سامنے کھڑا تھا اور رانو ہمیشہ کی طرح چار موٹی موٹی روٹیاں ایک میلے، روغن میں بسے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر تلو کے کو دے رہی تھی ۔ رانو نے ایک نظر اِکّے کی طرف دیکھا جہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اور چودھری مہربان داس کے ''کامے''[1] اسے تھامے ہوئے تھے اور شہر لے جا رہے تھے۔ رانو نے حیرانی سے پوچھا—— ''کون ہے؟...... کیا ہوا اسے؟''

''مرگی!'' تلو کے نے جواب دیا۔ وہ گھوڑے کی پیٹی کا بکلس لگا رہا تھا۔

رانو نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''مرگی؟''

''ہاں!—— '' تلو کا بولا۔ ''مرگی—— جو ہر عورت کو پڑتی ہے...... رات تجھے بھی تو پڑی تھی...... اور جس کا علاج جُوتا ہے۔'' اور پھر اندر طاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یا وہ چھانٹا جو آج میں لوٹ کر تجھ پر توڑوں گا۔ کل ہی نِھّو نے اس پر شام[2] چڑھائی ہے۔''

رانو کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ تلو کے کے جاتے، نظروں سے غائب ہوتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ چھانٹے کو طاق پر سے اٹھا کر بھنڈارے میں لے گئی اور اسے بھڑولی میں گیہوں کے نیچے، بہت نیچے کر کے چھپا دیا۔

ابھی دو پہر بھی نہ ہو پائی تھی کہ سامنے، شاملات کی طرف سے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے آئے جن میں نواب اور اسماعیل، اِکّے والے بھی تھے۔ گیان چند—— پورن دئی کے شوہر اور دیوانا، چکّی کے مالک کے پاس پہنچتے ہوئے نواب نے کہا۔ ''اوئے پنڈتا! سنا تو نے؟......'' اور پھر اپنا منہ پنڈت کے کان کے پاس کر کے کچھ کہا اور پھر سب مل کر چہ میگوئیاں کرنے، تلو کے کے گھر

---

[1] کارندے [2] لوہے کی مونٹھ

کی طرف دیکھنے لگے...... جب ہی جہلم کا داماد، مراد بخش دکان پر سے ایک ہاتھ میں ترازو اور دوسرے میں دوسیری پکڑے ہوئے آیا اور شاہی — جاٹ کو خانقاہ والے کنوئیں پر جانے سے روکنے لگا۔ پھر اس نے شاہی کے قریب ہوتے ہوئے کچھ کہا اور آخر وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر تلوکے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے...... رانو، دروازے میں کھڑی ان سب کے دیکھنے کو دیکھنے لگی......

چنوں، جو رانو سے رات کی صلح کے بارے میں پوچھنے آئی تھی، اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ''بتا، بتا پھر کیا ہوا۔''

رانو نے اس کی توجہ سامنے ہونے والی سرگوشیوں کی طرف دلائی اور بولی ''ہائے نی — آج ان مردوں کو ہوا کیا ہے؟...... سب کے سب اسی طرف دیکھ رہے ہیں......''

''ہاں!'' چنوں نے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہے کیوں؟''

''کیوں؟''

''رات مار کے ہڈیاں تڑوا کے تُو اور بھی نکھر گئی نا۔''

''رنڈیے — کھسم کھانیے!'' رانی نے چنوں کو چوٹی سے پکڑتے کھینچتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے کولھوں میں چٹے دینے، کلکاریاں مارنے لگیں۔

رانو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنشام کو ہتھکڑیاں لگے بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا، لیکن...... ساتھ اٹھارہ انیس برس کا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے کپڑے خون سے تر بتر تھے۔ اس کے منہ، سر، ہر جگہ پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ ہوش، کچھ بے ہوشی کے عالم میں حولدار جہان خان اور نمبردار تارا سنگھ کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ مہربان داس کا رنگ ایک دم سیاہ ہو جانے سے اس کے کانوں میں پڑی نتیاں چمکنے لگی تھیں۔ گھنشام کے ماتھے پر بڑے بڑے نیل دکھائی دے رہے تھے اور صافہ یوں گلے میں پڑا تھا، جیسے اسے باندھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو اور یا پھر لڑائی جھگڑے میں کھل گیا ہو —

''شکر ہے۔'' رانو بولی۔ ''میں آج گُڑ بانٹوں گی چنّی!............ ہر کسی کے بننے کی

بجائے یہ آج سرکار کے جنوائی بنے ہیں۔"

چنوں نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو نے ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔"میں تو آج ناچوں گی، بِکڑ ھا[1] ڈالوں گی ——" اور پھر دروازے ہی میں سے مندر کے کلس کی طرف دیکھتے، اس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بول اٹھی —"شکر ہے دیوی ماں...... آج تو نے سُن لی میری...... آج کا دن تو دھنیہ ہو گیا میرے لیے............"

جب ہی تلو کے کا اکا دکھائی دیا لیکن اسے گورداس چلا رہا تھا............"ہائے نی!" رانو نے چنوں سے کہا اور پھر اسی طرف دیکھنے لگی۔

اکے کے اندر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ رانو نے سوچا —— شاید اس مرگی والی لڑکی کو کچھ ہو گیا؟ پھر سب سواریاں مل کر اس لڑکی کو اتارنے لگیں۔ جب اسے پاس لائے اس کے منہ پر سے کپڑا اٹھایا گیا تو رانو ایک دم سے چلاّئی —— "نہیں" .... اور پھر اندر کی طرف بھاگ گئی اور چنوں سر اور چھاتی پیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف —— تلو کا قتل ہو گیا تھا!............ خانقاہ والے چاہ کے قریب اس نوجوان جاترن کے بڑے بھائی نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی شہ رگ میں دانت گاڑ دیے............ اور اس وقت چھوڑا جب اس کے بدن میں خون کا ایک بھی نمکین قطرہ نہ رہا............

جس وقت لوگوں نے اسے پکڑا وہ نوجوان وحشت کے عالم میں آنکھیں پھیلائے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے، مندر کے کلس کی طرف دیکھتا ہوا، ایک مذہبی غیظ و غضب ایک جنون کے عالم میں چلاّ رہا تھا —"تیرے نِمت — ہے دیوی ماں! تیرے نِمت......" اور لوگ اسے مارتے دھاڑتے ہوئے لے جا رہے تھے، اور وہ ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا ——

ماتا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں

میّا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں

—— ماتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں! میّا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں!...... اور ان جوتوں کی چمک اس کی پھیلتی، کانچ ہوتی ہوئی آنکھوں میں چلی آتی تھی۔ بیچ میں

---

1. پنجابی عورتوں کا ناچ جس میں تالی کو بہت دخل ہوتا ہے۔

اس کا رنگ ایکا ایکی پیلا پڑ جاتا اور پھر ایک دم لال، کیسری ہو اُٹھتا۔ جب ہی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ وہ مندر کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اُس نے کُود کُود کے، لپک لپک کے گانا شروع کر دیا۔

ہے میّا! تسیں ستے بھیناں گوریاں

سر لال پھلّاں دیاں جوڑیاں

میّا رانی دے دربار—— جوتاں جگدیاں

اے میّا! تم ساتوں بہنیں گوری ہو۔ تمھارے سر پر لال پھولوں کی جوڑی ہے...... اور وہ اپنے خون میں بسے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کر لہو اپنے سر پر مل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیوی کی روح اس میں چلی آئی ہے اور ایک انتقامی جذبے سے اپنا روپ کروپ اور آنکھیں آگ بھبھوکا کیے، بھیروں یا تلوکے کی طرف دیکھ رہی ہے............

پھر وہ ڈنڈوت کے انداز میں مندر کے دروازے پر لیٹ گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا............ لوگ ڈر سے کانپتے ہوئے اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ وہ چاہتا تو اسی جنون کے عالم میں چلاّتا، بھینٹیں گاتا ہوا کہیں بھی نکل جاتا، لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو نمبردار تارا سنگھ کے حوالے کر دیا............ یہ بھی اس کے جنون ہی کا ایک حصّہ تھا۔

آس پاس کے پندرہ بیس گانو سناٹے میں آ گئے۔ کوٹلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے موسم کے بادلوں نے سورج کی آب و تاب کم کر دی اور وقت سے بہت پہلے اندھیرا چھا گیا۔ ویشنو دیوی مندر کے کلس تلوکے کے گھر میں جھانکنے لگے۔ بکائن نے پتّیاں سمیٹ لیں اور ڈبّو نے رونے، بھونکنے کی بجائے اپنی دُم ٹانگوں میں سکیڑ لی۔

حضور سنگھ کی آنکھوں میں پرماتما نے ایکا ایکی روشنی دے دی—— بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے!...... جنداں غش کھا کر دس بارہ گھنٹے کے لیے، بچّوں کی، چچلاہٹ سے گزر گئی۔ رانو باہر دوڑی، پھر اندر چلی آئی، پھر باہر اُٹھ دوڑی...... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ نہ معلوم اسے کیوں گھر کے سب زیور، سب کپڑے پہننے کا خیال چلا آیا۔ وہ یہ سب کرنے والی تھی کہ چنوں نے پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ دیوار سے مار مار کر چوڑیاں توڑنے لگی۔ پورن دئی باہر سے مٹّی کی مٹھیاں

بھر کر لائی اور رانو کے سر پر خالی کر دیں لیکن رانی اب تک کچھ نہ سمجھی۔ وہ پھر اندر لپکی اور بھنڈارے میں جا کر گیہوں کے ڈھیر میں یوں ہاتھ مارنے لگی جیسے حاملہ کتیا چونہہ چونہہ کرتی ہوئی پنجوں سے زمین کے پُڑے تک کھود ڈالتی ہے......رانی نے وہی شام لگا چھانٹا نکال لیا اور اسے لے کر باہر سب کے سامنے چلی آئی اور کسی اندھے جوش سے اسے تلوکے کو دکھاتے ہوئے توڑ دیا تیرا چھانٹا............ بڑا مجھ پر توڑنے آیا تھا............''

سب سمجھے رانی پاگل ہو گئی ہے۔ رانی پاگل ہو گئی تھی اور نہیں بھی۔ بڑی دیوار کے ساتھ کھڑی، پہلے ہی چیخ پکار رہی تھی، اس پر رانو نے اس کے پاس جا کر ایک دو ہتڑ جڑ دیا اور بولی۔''سب پہ گڑے [1] پڑتے ہیں، سب کو سیتلا نکلتی ہے، سب مرتی ہیں، ایک تو نہیں مرتی......''وڈیا نے بیچ میں آ کر بڑی کو چھڑا لیا......اس غریب کا کیا قصور تھا؟ قصور کیوں نہیں؟ کیوں وہ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوئی تھی جو اس کا رہن چھڑائے بغیر ہی چلتا بنا......پھر چوکھٹ پر کھڑی رانو کو ایک پل کے لیے خیال آیا— ''رو دے، رو دے کشتیے؟ نہیں تو جمانہ تجھ پر ہنسے گا— ہنسے گا!'' لیکن رونا تھا جو کسی طور نہیں آ رہا تھا۔ ایکا ایکی رانو کو اپنے بچے کسی کے بچے معلوم ہونے لگے۔ اپنا گھر، کسی کا گھر...... وہ پھر اندر گئی تا کہ پیاز ہی کُوٹ کر اس کا پانی آنکھوں میں ڈال لے اور رو دے...... رو دے!......آخر اس کی ضرورت نہ پڑی — سامنے رکابی میں وہ ٹماٹر پڑا تھا جو تلوکا رات میٹھے مالٹے کے ساتھ کھانے کے لیے لایا تھا۔

——اب رانی کے بندھ ٹوٹے۔ وہ رو رہی تھی، بین کر رہی تھی——اور سر پر دو ہتڑ مار رہی تھی اور گانو بھر کی عورتیں زار زار روتی ہوئی اسے روک رہی تھیں............رانی کے بینوں نے ساتوں آسمانوں میں چھید کر دیے۔ منگل چلاّ اُٹھا ''ماں!'' پھر دیواروں کے ساتھ اپنا سر پھوڑنے لگا۔ رانی چلاّ رہی تھی—— ''رانی بندیے! تیرا پیچھا نہ آ گا............ ہائے رنڈیے! تیری شکل تو اب باجار بیٹھنے والی بھی نہیں، اب تو تُو پیشی کرنے جوگی بھی نہیں............''

---

1. اولے

3

چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنشام اور باوا ہری داس ـــــ سب کو سات سات سال قید سخت کی سزا ہو گئی تھی۔ ساتھ جاترن کے بڑے بھائی، اس لڑکے کو بھی اتنی ہی، کیوں کہ لوگ مقتول کی لاش کو نمبردار تارا سنگھ اور حوالدار جہان خاں کے پہنچنے سے پہلے، موقع پر سے لے جا چکے تھے، اور وکیل صفائی قاتل کے سلسلے میں ناگہانی اشتعال ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن ــــ باوا ہری داس کو اتنی لمبی سزا کیوں؟...... اسے اس لیے کہ اس کا لوہے کا لنگوٹ بوسیدہ سے کپڑے کا نکل آیا تھا۔

باوا ہری داس کو ایسی عبرت ناک سزا سن کر، کوٹلے کی سب عورتیں چپ ایک دوسری کے منہ پر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ پکڑی گئی تو پورن دئی براہمنی، جو سب سے زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی اور جس کے منہ سے ایکا ایکی ہا، نکل آئی تھی اور آنکھوں سے آنسو...... لوگ کہتے تھے جب تک گاؤں پر مندر کی چھتر چھایا ہے، اور دیا دھرم والے لوگ، جوہڑ کے کنارے اُڑ کر آ بیٹھنے والے کبوتروں کو دانہ دُنکا ڈالتے ہیں، کوٹلے میں کوئی پاپ نہیں ہو سکتا۔ ہو گا بھی تو اس کی پوری سزا ملے گی جیسی کہ بھیروں کو ملی تھی۔

چودھریوں کی حویلی، جائیداد، زمین وغیرہ سب مقدمے میں گئے۔ دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی آئی۔ اس سانحے کے بعد لوگ اتنے چوکنے ہو گئے کہ ان میں سے کسی کی بھی ہمت عورت کو سامنے سے دیکھنے کی نہ پڑتی تھی، البتہ گاؤں کی گج گامنیاں جب اپنی مستی میں نکل جاتیں تو سب انھیں پیچھے کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھتے اور نظروں سے ان کے اُٹھتے، گرتے کولھوں

کے ساتھ تال دیتے اور کچھ دیر میں تال تک دینے کی ہمت نہ رہتی۔

حضور سنگھ کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا، بڑھیا کی گالیاں سُنا کرتا۔ جنداں اسے ایک دن رو بیٹھنے کی منتظر تھی۔ کوئی زمانہ تھا جب حضور سنگھ نے اس عورت کو راج کرایا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے چڑیا گھر اور تو تاج محل دکھائے تھے لیکن اب وہ بیکار، بے یار و مددگار، گھر میں پڑا گرنتھ صاحب کے نویں محل کے شبد گنگنایا کرتا جو دنیا کے بے ثباتی کی تفسیر میں لکھے گئے تھے اور حضور سنگھ کو ایک عجیب طرح کا حوصلہ اور ہمت دیتے تھے۔ جنداں رات دن کے چوبیس گھنٹے چیکا کرتی۔ رانی کو تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تکلے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنے گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی —— ''رنڈیے! ڈاینے! چڑیلے!...... میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لیے منھ پھاڑے ہوئے ہے؟...... چلی جا...... جدھر منھ کرنا ہے کر لے، اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے۔''

رانو ایک پل کے لیے بھی وہاں نہ رہتی لیکن —— پاپی من، جو ایک جالے کی طرح بچوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، اسے کچھ بھی نہ کرنے دیتا۔ جتنا جنداں اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی، اتنا ہی رانو اس کے پانو پکڑتی۔ زندگی میں یوں ایکا ایکی بے قیمت ہو جانے سے وہ تیزی سے ڈھلنے لگی۔ جو چیزیں اس کے بدن میں کم ہو رہی تھیں، وہی بڑی کے جسم میں بڑھنے لگیں۔ وہ پر پھل —— جنگل کے پھول کی طرح اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سب طرف بے تحاشا کھلنے لگی۔ کبھی اس پھول کی ایک پتی گر بھی جاتی تو اس کی جگہ دو اور نکل آتیں۔ اپنے آپ سے بے خبر وہ اچھلتی کودتی، چاندنی رات میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نکل آتی۔ دیر سے گھر لوٹنے پر دھان کی طرح پھٹک دی جاتی، لیکن اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ کچھ غریبی کی وجہ سے اور کچھ جان بوجھ کر رانو اسے پھٹے پرانے، تیل اور بساند میں رچے بسے ہوئے کپڑوں میں رکھتی۔ بال بنانے کی بجائے بکھیر دیتی تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ بڑی گوری چٹی تھی اور یُو رو کے الفاظ میں اس پہ کسی ''رنگیج''[1] کی اولاد ہونے کا شبہ پڑتا تھا۔ جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکار اٹھتی ——

---

1. انگریز

گورا رنگ نہ دئیں دے ربّا

سارا پنڈ وَیر پے گیا

گورا رنگ نہ دیجو پرماتما! سارا گانو بیری ہو گیا........ رانو جتنا بڑی کو چھپانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس کا جوبن ان میلے اور بوسیدہ کپڑوں میں سے پھٹ کر سامنے چلا آتا۔ وہ اس معصوم اور متحیر بچّے کی طرح تھا جو باجے کی آواز سنتے ہی بے اختیار کھڑکی میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ بڑی کو یوں انجان اور بے خود دیکھ کر رانو سر ہلا دیتی اور کہہ اٹھتی —— اس بے باپ کی بیٹی کا انت بُرا ہے۔ جس دن کسی دشمن کی نظر اس پر پڑ گئی یہ کہیں کی نہ رہے گی......اور مارے ڈر کے رانو کانپنے لگتی۔ اسے سیلان کی بیماری ہو گئی اور بدن کی چربی یوں گھلنے لگی جیسے تپتے توے پر مکھن کی ڈلی گھلنے پگھلنے لگتی ہے۔

رانو کے حساب سے بڑی دن بدن اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ پچھلے ماگھ کی سنکرانت سے رانو کو بڑی کے 'نہانے' کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اس سے عجیب طرح کے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتی۔ ''تیسرے پہر کو تو کہاں تھی؟ پھر ایشراں کے ہاں سے کہاں گئی؟ مندر میں کون کون تھا؟ کیوں تو پر دہت سے گور دمنتر لینے بیٹھ گئی؟ جانتی بھی ہے۔ یہ منتر تجھے کہاں پہنچائے گا؟ بھول گئی باداہری داس کو......؟'' پھر وہ احتیاطاً گھر میں کاڑھا لا رکھتی —— جھوٹ اور کفر کو اُبال پھینکنے کے لیے —— جب کہیں دھڑکتے پھڑکتے ہوئے انتظار کے بعد اس بلوغ کے بوٹے پہ کوئی نیا گلِ انار کھِل اُٹھتا تو رانی کی جان میں جان آتی اور بڑی کو جلدی جلدی گھر سے باہر نکال دینے کی سوچ میں لگ جاتی۔ لیکن گھر میں تو بیس کوڑیاں نہ تھیں اسے رخصت کرنے، اپنے گھر بھیج دینے کے لیے —— پھر رانو سوچتی —— وہ خود بھی تو روٹی کپڑے کے وعدے پر چلی آئی تھی لیکن —— پاپی پرماتما نے جب اس کی بچّی کو زندگی کی سسرال میں بھیجا تو روٹی کپڑے کا بھی وعدہ نہ کیا!......گانو کے نوجوان لڑکے، ہر دوسرے تیسرے شام ڈسکے جا کر سنیما دیکھنے والے حرامی، بہن اور عورت میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ اتنا تو انھیں سمجھنا چاہیئے تھا کوٹلے کی سب لڑکیاں ان کی بہنیں ہیں اور عورتیں مائیں......اس پر بھی رانو اُن میں سے کسی کے ہاتھ میں بڑی کا ہاتھ دے دیتی اور خود اس سارے حساب کتاب، اس ڈر سے

چھٹی پا لیتی۔ لیکن وہ لُچے، بدمعاش، سب کے سب مہر کرم دین کے باغ میں سے کھٹے توڑ، کچھ کھا، کچھ پھینک کر بھاگ اُٹھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا...... جانے بڑی کی قسمت میں ویرووال تھا یا ڈسکہ بڈھا گورایا یا جامکی ـــ یا دور لاہور، پشاور، ؟ ـــ رانو بیٹھی سوچ کے گزوں سے جدائیوں کے فاصلے ناپتی اور پھر ایک عجیب عمل سے کھینچ کھنچا کر انھیں سکیڑتی، چھوٹا کر لیتی ـــ اس پر بھی اسے جھرجھریاں آتیں۔ بڑی کی مدد سے وہ اس کے دیج کا کشیدہ کاڑھتی ہوئی گنگنانے لگتی۔

سبھناں ساہورے چلنا، سبھ مکلا دن ہار

......ایک دن سب کو اپنی سسرال چل دینا ہے۔ ایک دن سب کا گونا ہوگا۔ لیکن اس کا اپنا گونا؟......اس کی اپنی سسرال؟ ـــ جواب مانگے ہو چکی تھی...... دماغ اور کشیدے کی اسی اُدھیڑبُن میں رانو یہ بھی بھول جاتی، وہ گیت زندگی کا نہیں موت کا تھا!

...... پھر جیسے اپنے آپ، ایکا ایکی رانو کی صحت ٹھیک ہونے لگتی۔ بدن میں ایک عجیب طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا جو اس کے دماغ تک کی طنابیں کھینچ ڈالتا اور رانو کا من سسرال جانے کے لیے تڑپنے لگتا۔ رانو جب سے کوٹلے میں آئی تھی تلوکے نے اسے سسرال کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ سسرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دُلہن کا، اس کے سواگت کے لیے گھر کی گھر کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل گرانے کا، پیچھے باجوں، آگے نظروں کے ٹھٹھے کا، ساس کے چاؤ کا، سسر کے ملہار کا، ''گانی'' کھیلنے، برتن بدلنے کا، منہ دکھائی اور پھر رات موتیا یا کرنے کے پھولوں کا، دیے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر کھل جانے کا، ایک بہیمیت کے ساتھ ساتھ ایک اتھاہ مادریت کا ـــ لیکن تلوکا جہاں اسے ہر روز دلتا، روندتا ہوا لے جاتا تھا، وہ تو سسرال نہ تھی جس میں ہر لڑکی شادی کے بعد جانا چاہتی ہے۔ ہر عورت بیاہ کے برسوں بعد بھی جانا چاہتی ہے......رانو ایکا ایکی سسرال اور گونے کے لیے جاگ اٹھی لیکن سسرال اور گونا تو اس کی بیٹی کا ہونے والا تھا۔ نہ معلوم اپنا یا بیٹی کا ـــ بیٹی کا ـــ اپنا ـــ اور رانو کا وہی گیت ایک نوحے میں ڈھل جاتا۔ جنداں کی گالیاں اور دُردُر جسے اور دل دوز بنا دیتیں اور وہ گانے لگتی ـــ ''بچھڑ دستے سہیلڑی، بچھڑ و ساتھی نال'' ـــ سہیلی اس وقت تک بس سکے گی جب تک ساتھی اس کے ساتھ

ہوگا۔ جسم اس وقت تک کام کرے گا، جب تک روح اس کی رفاقت کرے گی............

اس پردہ اوباش ـــــ منگل، اور وہی اس کا نصیبوں والا اڈہ، منگل نے تکّی پر ساز لادنا تو سیکھ لیا تھا لیکن خود پر گھر کی ذمّے داری کا جوا نہ پڑنے دیا۔ آمدنی پہلے سے بھی کم ہوگئی۔ زندگی میں ایکا ایکی، چونک کر جاگا ہوا منگل، جذبات و شہوانیات کے جنگل میں کھو گیا۔ ابھی وہ زندگی کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف نہ ہوا تھا "جا اینجا است" کا احساس ضرور تھا۔ جب بھی کوئی کنواری سامنے سے گزر جاتی تو جیسے اپنے آپ یہ بول اس کے ہونٹوں پر چلے آتے ـــــ

نشے دیے بند بوتلے، تینوں پین گے نصیباں والے

...... اے نشے کی بند بوتل! تجھے نصیبوں والے پئیں گے............ اور نصیبوں والے اڈے پر اکا ہانکنے والا منگل یہ بھول ہی جاتا، گھر کی طرف سے بھی اس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے جہاں سب لوگ اب ایک ہی وقت کھانا کھانے لگے ہیں ـــــ

انہی دنوں منگل کی جہلم ارمین کی چھوٹی بیٹی، سلامتے سے راہ و رسم ہوگئی۔ سلامتے نے نہ صرف ترکاری ـــ بھنڈی بینگن اور توری ہی پر ہاتھ پیر نکال لیے تھے بلکہ اس کا پورا بدن بیل پر لگی ہوئی لوکی کی طرح ہرا بھرا اور نرم تھا، اس پر بھی وہ ہوا کے معمولی جھونکے کے ساتھ جامن اور بکائن تو ایک طرف، کانٹے دار ببول سے لپٹتی پھرتی تھی۔ ایک دن اس نے راہ جاتے منگل کو ٹوکا ـــــ

"اڑیا[1] منگا! ـــــ"

منگل جو اکا لے کر نکل رہا تھا، گھوڑی کی باگ کھینچ کر رک گیا اور سلامتے کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ سلامتے نے پاس آکر آنکھیں مٹکائیں اور بولی

"ہائے ہائے دے انیاں! ـــ ایک بار ہمیں بھی سیر کروادے ـــــ"

"کیوں نہیں سلامتیے!" منگل نے حامی بھری۔ "گوتی[2] کس کی اور گہنے کس کے؟"

"کب کرائے گا؟"

"جب تو کہے ـــــ"

سلامتے آگے پیچھے دیکھ بولی ـــــ "آج ہی رات ـــــ"

1۔ ارے 2۔ باندی

''ہی'' منگل نے کہا۔ ''میرا اِنکار رات کو نہیں چلتا۔''

——اور وہ چلی—— اپنی گھوڑی کو چابک لگا کر چل دیا۔ جب وہ ستراہ کے راستے پر دو تین کوس نکل گیا، تب سلامتے کی بات کے معانی اس کی سمجھ میں آئے۔ وہ گانو کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ سواریاں الف ہوگئیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ ابھی تو رات ہونے میں آٹھ دس گھنٹے باقی ہیں، وہ ستراہ کے راستے پر چل دیا۔ گھوڑی کو چابک لگاتے اور کہتے ہوئے—— ''چل میری بکیے، شہر دشہر......''

شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اس چھوٹے سے دمشق کی قحط سالی دیکھ کر سارا عشق بھول گیا۔ صبح سے کھانا نہ پکا تھا۔ بڑی نے کچھ چاول اُبالے تھے لیکن بھوکی رانو نے انھیں طباق پہ ڈالا اور بنا نمک مرچ کے کھا گئی، سوکھے ہی نگل گئی۔ ساس سسر تو ایک طرف، اس نے اپنے بچوں کو بھی نہ پوچھا تھا اور اب جنداں اسے دھکے دے دے کر باہر نکال رہی تھی...... اور رانی پتھر بنی مار کھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک ہی ہاتھ سے بوڑھی جنداں کے جسم کا رشتہ اس کی روح سے علاحدہ کر دیتی لیکن وہ چُپ تھی اور ایک اَن جانے ڈر سے کانپے جا رہی تھی............ منگل اس منظر کو دیکھ کر ایک مجرمانہ احساس سے بکائن کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آج اس نے صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے جو گھر کے نون تیل کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ اُسے اُلٹی طرف کی ایک سواری ملی تھی جو روپیہ سوا روپیہ دینے کو تیار تھی لیکن سلامتے کے لالچ میں وہ جلدی ہی گانو لوٹ آیا——

منگل نے جنداں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا—— ''تائی!............ کیوں تو تو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہے۔ آخر کہاں جائیگی بے چاری؟''

رانو، جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا، ایک دم بلک اٹھی، اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑ سکنے جوگی بھی نہ رہی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی—— ''میں کیوں جاؤں؟............ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟............''

منگل بولا—— ''قصور بھابی کا نہیں، میرا ہے۔''

''تیرا خواہ مخواہ ہی؟'' جنداں کڑکی ـــــ ''جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کس کی ہوگی؟'' اور پھر رانو کی طرف منہ کرتے، ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولی۔ ''گرو کے واسطے، بھگوان کے واسطے، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا ـــــ دفان ہو جا۔ جو اندھا کانا ملتا ہے، کر لے............ یہاں سے مر لے............''

رانو اُٹھی، مُڑتی ہوئی اس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ـــ تُو تو جننی ہے ماں! ـــــ جگت ماتا ہے، تُو تو مجھے مت دھتکار، جیسے تیسے بھی ہے مجھے رکھ لے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں'' ......اور اسی ڈر سے وہ سب کے حصّے کا کھا گئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ـــــ اس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچّے اب پل چکے تھے، بڑے ہو چکے تھے اور قاعدے سے اب وہ تلوکے کے تھے، اس کے تھوڑے ہی تھے؟ ساس، سسُر، گانو میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے تو وہ ان کو لے کر کہاں جاتی؟ خود بھیک مانگتی؟ ان سے بھیک منگواتی؟ پھر ـــــ بنتا، سنتا اور بڑی، ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی۔ اب بھی وہ اس کی دیکھ ریکھ کے محتاج تھے۔ ایک کو چھوڑنے کا خیال کرتی تو دوسری پسلی میں درد ہونے لگتا، اور وہ سب، اتنے چھوٹے نہ تھے کہ ساتھ لے جا سکتی، اتنے بڑے نہ تھے کہ چھوڑ سکتی......ساس کے اٹھتے جوتا، بیٹھتے لات کے عمل میں رانو بھی اب یہی سمجھنے لگی تھی، جس عورت کا پتی مر جائے اسے اس کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر، ایک صبح چنوں آئی اور گلے میں بانہہ ڈال کر اپنے گھر لے گئی۔ ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کھلائی جو رانو نے اس ڈر سے تھوڑی کھائی کہ پھر نہ ملے گی اور پھر چنوں مونڈھا سرکا کر رانو کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ ''دیکھ بی بی! میں تجھ سے ایک بات کہتی ہوں، جو مانے تو ـــــ؟''

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا۔

چنوں شروع ہوئی۔ ''یہ جنداں بندی، یہ ساس تجھے جینے نہ دے گی۔ اس گھر میں بسنے نہ دے گی ـــــ یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے ـــــ''

''کیا طریقہ؟'' رانو نے جاننے سے پہلے ہی ڈھارس پاتے ہوئے کہا۔

''وہ یہ کہ تو ـــــ منگل سے شادی کر لے، چادر ڈال لے اس پہ''

''نہیں'' رانو ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے چنوں؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں ـــــ جب بڑا بھائی پورا ہو جائے تو............''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' رانو نے کہا اور اس پہ ایک لرزہ چھانے لگا۔ ''منگل ـــ بچہ ہے۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے... عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ سال چھوٹا ہے...... نہیں نہیں، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔''

اور رانو گھر بھاگ گئی... ....

منگل بکی کے لیے دانا لے جا رہا تھا، جب رانو گھر پہنچی۔ اندر جاتے ہوئے رانو نے مڑ کر ایک نظر منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی، اپنے آپ ''نہیں نہیں..... نہیں نہیں۔'' کہتی ہوئی چل دی۔ خود کو جھلنگے میں گرا، منہ چھپا کر رونے لگی۔

گھڑی بھر کے بعد منگل ساز لینے کے لیے اندر آیا۔ آج وہ جلدی نکل جانا چاہتا تھا کہ گھر میں چاول ہی نہیں، گیہوں بھی آئیں اور موٹی سی روٹی پکے جیسی کہ پکا کرتی تھی اور جس سے اصل میں پیٹ بھرتا تھا۔ چاولوں کا کیا ہے؟ وہ تو سیدھے پیشاب کے راستے سے نکل جاتے ہیں۔ اور پھر پیٹ خالی، رب والی...... ہو سکے تو ایک آدھ ترکاری بھی ہو جائے، جس کے سواگت کے لیے منہ کی سڑک پر ابھی سے چھڑکاؤ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کچھ نہ ہو تو روٹی کے ساتھ پیاز ہی سہی یا پھر لہسن کی کچھ ٹریاں۔ وِدّیا کے ہاں سے لسی آ ہی جائے گی اور اس نمک اور لال مرچ ڈال کر روٹی کھالی جائے گی...... ان سب باتوں سے زبان اور تالو مل کر ابھی سے چٹاخ چٹاخ کرنے لگے...... ایک ہاتھ سے ساز کا گورکھ دھندا سمیٹ کر منگل نے رانو کی طرف دیکھا اور بولا ـــــ

''کلغی کہاں ہے گھوڑی کی؟''

رانو! ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی۔ پہلے تو اس نے سیدھے منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی گھبرا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے بولی ـــــ ''بچے تو گئے مدرسے۔''

منگل نے حیرانی سے رانو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''حد ہو گئی بھئی۔ میں چتر، متری بکی کی بات کر رہا ہوں اور تو بچوں کی!...... اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ رانو کو ہوا کیا ہے، اس نے آگے

بڑھ کر اسے چھو دیا۔ رانو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو کر چلا دی۔

''مت ہاتھ لگا مجھے۔''

منگل نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے کلغی مل گئی جسے ساز میں لگاتے ہوئے بولا ''اتنی سیانی، اتنی سمجھ دار ہو کر، اب تک رات کی بات لیے بیٹھی ہے؟''

—— اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

رانو اٹھ کر دروازے تک گئی اور پیچھے سے منگل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی ...... کوئی دیر میں گلی کے نکڑ نے لپک کر منگل کو چھپا لیا۔ اب ہیر گاتے ہوئے اس کی صرف آواز آ رہی تھی۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون رُٹھڑے یا رمنا وندا اے
ایسا کوئی نہ ڈھٹا میں ڈھونڈ تھکی، جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا اے

ہیر نے کہا، اے جوگی! تو جھوٹ کہتا ہے۔ روٹھے یار کو منانے کون جاتا ہے؟ ...... میں ڈھونڈتے تھک گئی، ایسا کوئی نہ دیکھا جو جانے والوں کو واپس لے آئے ......

4

چنوں نے پورن دئی سے بات کی۔ پورن نے اپنے شوہر گیان چند سے، جو گانو کا سرپنچ تھا اور اس وقت کوٹلے کی متنازعہ فیہ زمین کے ٹیلے بٹے کھدوا کر، نیچی زمین پر مٹی ڈلواتے ہوئے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ اس نے جورو سے منگل کے گھر کی حالت سُنی تو بولا—— "ہاں ہاں، ٹھیک ہے......رانی بچاری اور کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟" اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھا— "مگر منگل تو رانی سے بہت چھوٹا ہے............"

"تو کیا ہوا؟" پورو بولی—— "اسے کون سی ہیر مل جائے گی؟............گھر میں کھانے کو نہیں، بدن پر کپڑا نہیں۔ دونوں کا کام ہو جائے گا۔ دونوں سُکھی ہو جائیں گے۔" اور پھر گانو کے سرپنچ کو ڈرانے کے لیے وہ کچھ اور بھی اپنے شوہر کے قریب چلی آئی اور کہنے لگی "تم نے سُنا، سلامتے سے اُس کا؟"

"نہیں نہیں—— نہیں تو۔"

"میں تو کہتی ہوں— ان اراعیوں، ان سُلتوں کو گھر سے نکال ہی دینا چاہیے......یہ جہلم اور تینوں بیٹیاں اس کی، جو بیاہی ہوئی ہے، وہ بھی اور جو نہیں، وہ بھی، وہ سب ایسے گھومتی ہیں جیسے کُتیا............"

"تو کہے جائے گی یا مطلب کی بات بھی بتائے گی؟" گیان چند نے بے صبری سے کہا —— اور بولا۔ "کچھ ہوا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں—— ہاں ہو جائے گا۔"

گیان چند کیا امید لے کر سننے آیا تھا لیکن سب مزا کرکرا ہو گیا ـــــ وہ بولا'' کچھ ہوا تو ـــــ وہی حال ہوگا اس کا جو چودھری مہربان داس کا ہوا ـــــ لوہے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کا ہوا۔''

پورن دئی نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

گیان چند معنی خیز نگاہوں سے اس طرف دیکھتے ہوئے بولا'' مت یہ سمجھنا اب کے مقدمے میں صرف مرد ہی بھگتیں گے...... جب تک عورتیں برابر کا حق نہیں مانگتی تھیں، ٹھیک تھا ـــ اب لیں برابری کا حق۔''

'' میں ایک بات پوچھتی ہوں۔'' پورن دئی نے کہا'' تم نے جہلم کو دھرم شالہ میں کیوں بلوایا ہے؟'' ـــــ وہ اندر ہی اندر ہری داس کے نام کی بِس گھول رہی تھی!

'' دھرم شالہ میں کہاں بلوایا ہے؟ ـــــ وہ تو مہر کرم دین کے باغ میں............'' گیان چند نے کچھ ہکلاتے، پھر فوراً ہی راستہ پاتے ہوئے کہا'' مسلمانی ہو کر وہ دھرم شالہ میں کیسے آسکتی ہے؟''

'' اچھا ـــــ اب دھرم شالہ کی جگہ کرمو کے باغ نے لے لی؟''

'' ارے نہیں رے سودائن!............ اس نے باغ کے سب کیلے توڑ لیے۔''

'' تمہارے باغ کے تو نہیں توڑے؟''

'' باڑ مضبوط تھی'' گیان چند نے مسکراتے ہوئے کہا'' نہیں تو وہ کیا کمی کرتی؟''

'' باڑ مضبوط تھی یا پہلے ہی آتے جاتوں نے توڑ لیے ـــــ ؟''

گیان چند کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ـــ پورو سے نظریں بچاتے ہوئے وہ بولا ـــ '' اچھا، اچھا ـــــ تو بات کرنے آئی تھی منگل کی۔'' پورو نے تردید کی۔

'' رانی کی سہی'' گیان چند بولا۔'' میں تو سمجھتا ہوں، اسے منگل کے ساتھ چادر ڈال ہی لینی چاہیے ـــ یوں بھی گانو میں آئی ہوئی عورت باہر کیوں جائے؟ اِدھر اُدھر کیوں جھانکے؟ ـــــ اس میں گانو کے ہم سب مردوں کی بدنامی ہوتی ہے............''

اور پھر مزدوروں کی طرف منہ کرتے ہوئے گیان چند نے بلند آواز سے کہا

''کامیو۔۔۔۔ گھبردؤ!۔۔۔۔ سب زمین برابر کردو، کہیں بھی اونچ نیچ نہ رہے.........''

اور تن آور جوان کسیتوں اور کدالوں سے کام میں لگ گئے۔۔۔۔ ان کے جسموں پر تیل لگے، کسے ہوئے پٹھے دور دور تک ہوا میں جلوتیاں مارنے، روشنی میں چمکنے لگے.........اور گیان چند سوچنے لگا۔ ہمارے دیش پنجاب میں جہاں عورتوں کی کمی ہے، کیوں مردوں سے ان کا حق چھینا جائے؟ کیوں ایک عورت کو بے کار جلنے سڑنے دیا جائے؟ پھر وہ گاؤں کی پنچایت سے الگ اور حضور سنگھ کی بھابیہ برادری سے الگ ملنے کے لیے چلا گیا.........

منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے آئے تھے۔ بڑی معصوم کچھ نہ جانتی تھی۔ دادی کے کہنے پر مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے دوڑ کر چنوں کے وہاں سے برفی لے آئی جس مین ماوا کم تھا اور شکر زیادہ۔ نفع گیر دوکانداروں نے ایک سیر ماوے سے پانچ سیر برفی بنائی تھی اور شہر کی یہ بیماری گاؤں تک چلی آئی تھی...... ...وہ تین آدمی تھے، ایک ادھیڑ عمر کا تقریباً بوڑھا۔۔۔۔ اور باقی کے دو۔۔۔۔ جوان۔۔۔۔ ایک تو صاف اس بوڑھے کا بیٹا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا شاید اس کا دوست تھا۔ ہوسکتا تھا بھائی ہی ہو، لیکن شکل باپ پر نہ گئی ہو۔۔۔۔ دادی کے اشارے پر وہ بڑی کو اٹھتے بیٹھتے، اندر آتے، باہر جاتے دیکھ رہے تھے۔ نگاہوں سے تول رہے تھے ۔نوجوان کی نگاہیں تو پھر اُچٹ کر پڑتی تھیں، لیکن بوڑھے کی سیدھی۔۔۔۔ اور جہاں پہنچتیں وہیں چپک جاتیں۔۔۔۔ آخر جب بڑی نیچے گھڑے میں سے پانی ڈالنے کے لیے بیٹھی اور پھیلی تو بوڑھے نے ہنکارتے ہوئے کہا۔ ''ہاں!''

اور پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔''

اسی وقت بڑی کے ماتھے پر سے کسی خیال کی پرچھائیں گزری اور اس سے پہلے کہ دادی جنداں اسے باہر جانے کا اشارہ کرتی، بڑی ایک ہی زقند سے باہر بھاگ گئی اور اپنے پیچھے ایک ایسی خوشبو چھوڑ گئی جو نوخیز لڑکیوں ہی کے بدن سے آتی ہے.........

ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا۔ اس پر جنداں کو سوچنے کا موقع دے کر، اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے گئے۔ جرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا جب کہ رانو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چننے گئی تھی۔ جنداں اب سوچ رہی تھی۔۔۔۔ یہ رقم

ان لوگوں سے لے گی کیسے؟ لڑکی انھیں دے گی کیسے؟............رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا۔ لیکن اسے تو اپنے دل سے، اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ کر چکی تھی۔

رانی لوٹی تو جنداں اس سے لیپو پوتیاں کرنے لگی اور جب اسے پاس بٹھا کر، جنداں نے اس کی بغل میں اپنی بوڑھی ــــ جھرّیوں ماری بانہہ ڈالتے ہوئے کہا ــــ "تو جنم جنمانتر کی بہو میری۔" تو رانو کا ماتھا ٹھنکا۔ جب ہی بڑی نے باہر سے آتے ہوئے ماں کو اندر آنے کا اشارہ کیا، جسے جنداں کی تقریباً اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ رانو اٹھ کر اندر گئی تو بڑی نے اپنی ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا۔ ساڑھے پانچ سو کی بات بھی سنا دی.......... وہ دروازے کے پیچھے سے سب سنتی رہی تھی۔

رانو، بڑی کے منع کرنے پر بھی لپک کر باہر چلی آئی۔ وہ اپنی اوقات، اپنی ہمت، اس گھر میں اپنا درجہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔ "آج کون آیا تھا یہاں؟............کس کی ہمت پڑی یہ دہلیز پھاندنے کی؟ میری بیٹی کا سودا کرنے کی؟............"

جنداں ایک "ناعورت" قسم کی مدافعت پر اُتر آئی ــــ "نہیں دھیئے! رانیے ــــ وہ تو ایسے ہی بات کر رہے تھے۔ اب ہر کسی کا منہ تھوڑا پکڑا جا سکتا ہے؟"

"ہاں! پکڑا جا سکتا ہے، جھلسا جا سکتا ہے۔" رانو کوئی سُن تھوڑے رہی تھی۔ "اُن حرام جادوں کی جبان کاٹ دینا تھی۔ منہ میں کٹ کٹ کرتا ہوا چو[1] ٹھونس دینا تھا ــــ میری بیٹی جس کی ایک ایک بانہہ، ایک ایک انگلی، ایک ایک پور لاکھ لاکھ کی، اس کی ایک ایک تکنی[2] میں سو سو موکھاں[3]۔ لوگوں کی ایک ایک نجر میں عمر قید..........."

"تیری بیٹی ہے۔" جنداں بولی۔ "میری بھی تو کچھ ہوتی ہے، میری بھی تو پوتی ہے۔"

"پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں تو پھر پوتی کیسی؟"

اور پھر ایک لمبی سی، گھسٹتی ہوئی "کھمر دار" کہتے، ہاتھ لپکاتے ہوئے رانو اندر چلی گئی، آخر ــــ وہی جھلنگا، وہی رونا ــــ ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی؟ میں تو صرف کچھ لے

1۔ جلتی ہوئی لکڑی 2۔ نظر 3۔ موکش

کے نہیں آئی تھی تو یہ وروشا ہوئی ـــــ یہ تو بک جائے گی!...........اور وہ بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے، نوچ نوچ کے کھائیں گے۔ کہیں گے تجھے ایسے ہی تو نہیں خرید کے لائے ہیں، دام دیے ہیں.........تلو کے مرحوم کے زمانے میں آخری یہی حربہ تھا زانی کا ـــــ "دیا تو نہیں دیا ـــــ لیا تو کچھ نہیں؟ بیاہ کر لائے ہو، کھرید کے تو نہیں لائے؟"..........اور بیٹی میری بک جائے گی؟..........!"......گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ بیاہ ہوگا بھی تو کیسے، ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا ـــــ آج مہربان داس چودھری ہوتا، ایک ہی رات میں بیٹی کا جہیز تیار کر لیتی اور پھر اسے اپنے سامنے طوطیاں بجاتی، ناچتی گاتی ہوئی برات، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی اور جب ڈولی اٹھتی تو دور کھڑی دیکھتی، روتی، دیکھتی ـــــ لیکن کبھی نہ کہتی ـــــ "بیٹی! تیرے سہاگ کے لیے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا..........!"

پھر......پانچ ساڑھے پانچ سو ملیں گے تو یہ پھاپھاں مجھے کچھ دے گی تھوڑے ہی ـــــ؟ آخر ـــــ بیچنا ہی ہے تو ایک ہی بار ساڑھے پانچ سو میں کیوں، کیوں نہ میں اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں؟ لاہور میں سینکڑوں ہزاروں بابو لوگ پھرتے ہیں جو کچھ دیر کے دل بہلاوے کے لیے پندرہ پندرہ بیس بیس روپے دے جاتے ہیں۔ کھانے کو چنگی چوکھی ملے گی، پہننے کو ریشم ـــــ کھین کھاب[1]..........تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق بھر جائیں گے..........

جب ہی زناٹے کے ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی جو رانو نے خود ہی اپنے منھ پر مار لیا تھا..........اور اَب ہمیشہ کی طرح ایک انجانے خوف سے کانپنے لگی تھی۔

"جنداں رانو کا آخری فقرہ سوچ رہی تھی ـــــ "پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں تو پوتی کیسی؟" اسی وقت گیان چند، کیسر سنگھ، جگو، وُلاّ، کرم دین اور گانو کے دوسرے آدمی چلے آئے اور آ کر حضور سنگھ کے پاس بیٹھ گئے۔ جنداں کو بھی بلوا لیا اور رانی کے چادر ڈالنے کی بات یوں چھیڑ دی جیسے یہ بھی کوئی جھگڑا ہے جس کا فیصلہ پنچایت کو کرنا چاہیے۔ چادر کی رسم کی بات شروع ہو گئی۔ حضور سنگھ نے سمجھا ـــــ اس عمر میں جب کہ وہ مرنے کے قریب ہے،

---

1. کمخواب

پنچایت، برادری کے لوگ اس کی بے عزّتی کرنے ،اسے آخری ٹھوکر مارنے آئے ہیں ۔لیکن جنداں،عورت کی سریع الفعلی سے یکا یک بات کی تہہ تک پہنچ گئی، بلکہ اس سے بھی کہیں دور آگے، بہت آگے نکل گئی۔ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا۔۔۔۔۔اتنا نزدیک، اتنے قریب کا خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا؟ پھر اسے یاد آیا۔۔۔۔۔ہاں،ہاں! آیا تھا لیکن جب بڑی کتنی چھوٹی تھی ۔اب رانو پھر اس کی بہو ہو سکتی ہے اور بڑی اس کی پوتی۔۔۔۔۔اور.......... جب حضور سنگھ نے پنچوں کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھڑ پھڑائیں تو بوڑھی دانت نکال کر اس کی طرف بڑھی ۔ڈبّو کی بوڑی مری تھوڑی تھی؟۔۔۔۔۔وہ تو زندہ تھی۔۔۔۔۔جنداں!..........جنداں بولی۔''تو بیچ میں مت بولا کر، بڈھے! نہ مرے نہ جان چھوڑے..........جانتا بھی ہے کیا کیا انصاپھ ہو رہے ہیں اِس دنیا میں؟۔۔۔۔۔ کہ اس جنم کا اندھا تو اگلے جنم کا بھی اندھا..........''

پنچ موجود تھے جنھوں نے بڈھے بڈھی کا بھی فیصلہ کرا دیا اور آخر حضور سنگھ اور جنداں دونوں کی منظوری لے کر چلنے لگے۔ان کے جانے سے پہلے، بزرگ ہونے کے ناطے جنداں نے سب کو اشیر واد دی..........ان سب کے پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ رانی بھری، بپھری ہوئی منظر پہ چلی آئی۔۔۔۔۔ ''تُو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جارہی تھی، پھاپھاں! بیچ میں میرا مردہ کیوں نکال بیٹھی؟''..........اور وہ بکے جارہی تھی۔۔۔۔۔''شرم ہے تو کچھ کھا مر..........گھر میں بیسیوں ہولدالیاں پڑی ہیں وافر..........ہے دیوی ماں! یہ جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب ڈوب مرے۔اوپر سے آٹے والی مشین ٹُو ٹُو کرے..........تو میرے پتوں سے کیوں نہیں کر لیتی؟ بنتے کے ہاں کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟ سُنتے پہ کیوں نہیں چادر ڈال لیتی؟ میں اس سے بیاہ کرنے جاؤں گی جسے میں نے چھاتی نکال نکال کر..........''

جب ہی کوئی ہاتھ رانی کے بالوں پر پڑا اور وہ اُلٹی ہوئی دیوار کے پیچھے، کوڑے کی ڈھیر پر جا گری۔اٹھی ،نظریں صاف ہوئیں تو سامنے چنوں کھڑی تھی اور دانت پیس رہی تھی۔۔۔ ''رنڈیے! کھسم کھانیے اُیدھر مَر''..........اور پھر اسے مکان کے پیچھے ''کھولے'' میں جہاں گانو کے لڑکے لڑکیاں رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اور یا چور سیندھ لگاتے تھے، لے جاتے ہوئے بولی۔۔۔۔۔''ہم تیرے بھلے کی کریں کُتیے!۔۔۔۔۔اور تُو پھیلتی جائے؟۔۔۔۔۔''

''نہیں چنوں، نہیں۔'' رانو نے اُس کے سامنے دُکھڑا روتے، پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔
''وہ بچہ ہے...... میں کبھی اسے ان نظروں سے نہیں دیکھا۔۔۔''

چنوں بولی۔ ''دیکھ۔۔۔ تجھے اس دنیا میں رہنا ہے کہ نہیں رہنا؟ اس پیٹ کا نرک بھرنا ہے کہ نہیں بھرنا؟ اس اپنی شرم کو ڈھانپنا ہے کہ نہیں ڈھانپنا؟ بڑی آئی ہے نجروں والی.......... کہا نہیں بُلھے شاہ نے؟۔

بُلھیا رب دا کیہہ پاتا!
ایدھروں پُٹنا۔۔ اُودھر لانا

۔۔۔ بس اِدھر سے اُدھر ڈال دینے کی بات ہے.......... پہلے اسے ان نجروں سے نہیں دیکھا تو اب دیکھ مُر دیے۔۔۔''

رانو اپنے تصویر میں منگل کو دیکھ رہی تھی!

چنوں بولتی چلی گئی۔۔۔ ''سوچ تو موئیے! دو شادیاں یہاں کس ماں جائی کو ملتی ہیں کرنے کو؟ جس کے ساتھ ہو گئی سو ہو گئی۔ بیچ میں دو چار ہو جاتے ہیں لیکن وہ کوئی اچھی بات ہے؟ ہر بکت ڈر سے جان نکلی رہے۔۔۔ ہاں! مردوں کی بات الگ ہے.......... یہ دُنیا ان کی۔۔۔ کوئی پوچھتا بھی ہے؟ کوئی جو باہر سے آکر تیرے منگل سے کرے گی، تو کیوں نہ کرے؟.......... سلامتی کی سنی ہے نا تُو نے؟.......... کھیر، وہ سب باتیں چھوڑ، تجھے اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے کہ نہیں کرنا۔۔۔؟''

رانو پھر چونک گئی.......... اپنا بیاہ کہ بیٹی کا؟۔۔۔ اپنا.......... وہ بچوں کی طرح نہ نہ کی ضد کرتے چلی گئی اور گھر پہنچ کر دن بھر بیٹھی سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ جب ہی ایک اور ہی آگ اس میں لپک آئی جس کا تعلق نہ بڑی سے تھا، نہ چھوٹے دو بچوں سے۔۔۔ اور نہ چنوں سے..... کوئی اور ہی ناپید بچے اس کے پیٹ میں مچلنے لگے تھے۔

شام کے قریب پُورو آئی تو رانو بیمار پڑی تھی۔ ایک پٹی سی سر کے گرد باندھ رکھی تھی۔ بڑی، چنوں موسی کے گھر جا کر آٹے کی چڑیاں سی بنوا کر لے آئی تھی اور رانو نے انھیں اپنی کنپٹیوں پر چپکا رکھا تھا اور وہ چڑیاں دانہ دانہ کر کے رانو کی ساری گرمیاں چن رہی تھیں۔ پُورن دئی نے

تھوڑی مزاج پرسی کی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔" کیوں نی ـــــ کیسا بکھار ہے؟" اور رانو منھ موڑ کر مسکرا دی ـــــ

اس پر پوری کائنات ایک مخدوش سے طریقے پر کھل اُٹھی۔ پُورو ہنسی۔ بڑی کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہنسی کے اس اِکا دُکا موقع سے فائدہ اٹھا کر کھلکھلا اُٹھی .... نہ معلوم کب اور کیسے سنتوں، مہاتماؤں، رادھے کرشن اور شیو پاروتی کی تصویریں اپنے آپ چوکھٹوں میں جا ٹکی تھیں اور ان دیوی دیوتاؤں کے چہروں پر دنیا بھر کی محبت کا نقش دوام ہو گیا تھا۔ بڑی کی کھلی سے بکائن پہ آئے ہوئے توتے چہچہاتے ہوئے اُڑ گئے۔ مندر کے سنہری کلسوں پر سورج نے اپنا آخری گلال کھنڈ دیا ـــــ اور گھنٹیاں بجنے لگیں ....

ایک دم ـــــ ایک دم کہیں سے منگل آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ خوش تھا، بہت خوش۔ آج اس نے سات روپے کمائے تھے جو اس نے معمول کی طرح، آتے ہی رانو کے ہاتھ میں تھما دیے اور پورن دئی بول اٹھی ـــــ " لے، یہ پہلی کمائی، وہ کمائے تُو کھا" اور رانی نے گھبرا کر پیسے ہاتھ سے چھوڑ دیے۔ نوٹ بھنڈارے کی طرف اڑنے لگا اور سکّے کچے فرش پر گر کر کونے کھدرے تلاش کرنے لگے۔ منگل نے حیران ہوتے ہوئے کہا ـــــ " ہنس کیوں رہی ہو چاچی؟"

چاچی بولی ـــــ " یہ تُو اپنی اس سے پوچھ۔" اور پھر اسے گھبرائی ہوئی رانی کے پاس، اکیلے میں چھوڑ کر، بڑی کو باہر گھسیٹتی ہوئی پورن دئی چل دی۔

منگل، بیچھے، بے وقوفوں کی ایک مخصوص، پُر مخصوص ہنسی ہنسا اور کہنے لگا۔" کوٹلے کی سب عورتیں اس قابل ہیں کہ ـــــ"

رانو نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔" مرد کم ہیں؟"

منگل کچھ نہ سمجھا...... دونوں اپنے اپنے جال اور اس کی گھنڈیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ منگل نے اپنی ٹرنکی میں سے کُرتی اٹھائی جو کبھی بھلے زمانے میں اس نے پشاور سے منگوائی تھی، جس کے گلے پر اون کا کشیدہ تھا اور لوکاٹھ کے پھول سے بنے تھے۔ اسے ہاتھ میں لے کر، لہراتا ہوا وہ باہر نکلنے لگا ـــــ کہتے ہوئے ـــــ " کم سے کم مردوں کی بات سمجھ میں تو آتی ہے ـــــ"

"مردوں کی مردوں کو سمجھ میں آتی ہے۔" رانی بولی۔" اور عورتوں کی عورتوں کو" اور پھر اس نے آنکھیں مٹکائیں، جوفن اسے لاکھوں کروڑوں صدیوں سے آتا تھا۔ منگل نے جی ہی جی میں سوچا——رانی ٹھیک کہتی ہے۔ کیا اسے معلوم تھا، آج ڈھارے کے گھپ اندھیارے میں جہاں چودھری کے مکان کا ملبہ پڑا ہے، شہتیر کے پیچھے میں اور سلامتے ایک نئی ہی عمارت کی نیو رکھ رہے ہوں گے؟ اس نے دروازے میں سے مڑ کر رانی سے کہا۔" یہ تو آج کیا مرد عورت کا جھگڑا لے بیٹھی ہے؟"

"وہی تو جھگڑا ہے سارا۔"

"کُرکھیتر [1] کی لڑائی ہے؟"

"اس سے بھی پُرانی۔" رانی نے جواب دیا اور پاس آتے ہوئے بولی۔" جس میں جیتا ہوا بھی ہارا اور ہارا ہوا بھی ہارا——"

منگل رک گیا اور رانی کی بات کا کوئی گہرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے، لیکن وہ سماں تھا جب کوئی بھی بات کرو تو مطلب بن جاتا ہے اور کبھی کچھ بھی کہو مطلب کچھ نہیں بنتا۔ اس وقت مطلب تھا یا نہیں، اس کے لیے دماغ چاہیے تھا یا وقت، اور دونوں کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں .... رانو تینتیس چونتیس برس کی بھرپور عورت تھی جس میں نسائیت انگڑائی لے کر جاگی تھی۔ اس میں نوعمر نوخیز لڑکی جیسی رعونت تو نہ ہوسکتی تھی، البتہ عورت پنے کا پورا غرور تھا جو برسوں، صدیوں حالات کے ردّے در ردّے کے نیچے دب کر رہ گیا تھا اور اس وقت ابل کر، اچھل کر نکلتا جب اوپر کی سطحیں کمزور ہو کر راستہ چھوڑ دیتیں...... بہ خلاف اس کے منگل، چوبیس پچیس برس کا جوان، گھبرو، شروع ہی سے دریا اور آخر دریا، جو منبع کا محتاج تھا، دہانے کا اور نہ کناروں کا——

باہر آکر رانو نے یوں ہی برتن ٹکرانے شروع کر دیے، جو وہ چاہتی تھی وہی ہوا— منگل سلامتے کے پاس جانے سے رہ گیا۔ ماں جنداں نے بیٹے کو آواز دی اور جب وہ پاس آیا تو اسے بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ رانی مصلحتاً سنک گئی۔ بڑی کو اور جڑواں بچوں کو کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا

---

1. کورو کشیتر

گیا۔ رانی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی جو ہماری دنیا کی اکثر عورتوں کی جگہ ہے۔

جنداں نے ابھی بات چلائی ہی تھی کہ منگل سمجھ گیا۔ پگڑی میں سے اس کے بال جیسے اپنے آپ باہر آنے لگے اور وہ انھیں ایک ہاتھ سے اٹھا، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اندر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیے کی مٹ میلی روشنی میں اس کا چہرہ، خون کے ایکا ایکی دورے سے لال ہوتا ہوا دکھائی دینے............

رانی نے کواڑ کے پیچھے چھپ کر، دیوار کا سہارا لیتے ہوئے، دل پر ہاتھ رکھ دیا، منہ سے جس کی دگڑ دگڑ سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خونی، اوپر کی منزل پر کسی کا خون کر کے اب بھاگنے کے لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ کوئی دیکھتا وہ کیسے ایک دم توریے کے بے بہارے پھول کی طرح پیلی، کمھلائی اور مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دیوان شاہ کی دکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکڑ چکے تھے، اور گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے جیسے محبت یا خوف کے ایک بارگی حملے سے لرزتے ٹکراتے ہیں............

منگل نے اٹھ کر اندر کی طرف دیکھا جہاں اس کے قیاس کے مطابق رانی گئی تھی —

"نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ کبھی نہیں ہوگا۔" اس نے بائیں ہاتھ کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا، جیسے وہ چھانٹے کو دیا کرتا تھا جب گھوڑی، بکی کو ڈبکی میں ڈالتا ہو۔ پھر وہ بولا۔ "میں ماں کی گالی نہیں کھاتا — ان پنچوں کی ماں کا............ یہ تو کیا لاٹ ارون، جارج پنجم بھی آ جائے تو میں یہ کبھی نہ کروں۔ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے............ میں سر اس کے پانو پر رکھ سکتا ہوں، پانو سر پر نہیں............"

اور وہ بکتا جھکتا، اِدھر اُدھر تبرّے سناتا، ہوا کو گالیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اوپر منڈیر پر ایک سایہ سا لہرایا اور پیچھے ہٹ گیا — "ہائے نی!............ نی............" جنداں نے چلّاتے ہوئے کہا — "رانیے! انھیّے![1] .... دیکھ کہیں اپنے آپ کو کچھ کر ہی نہ لے............ کہہ کے گیا ہے، گھر میں ایک اور تلوکے کی لاش آئے گی............"

رانو لپکی، گری، پھر لپکی، حتیٰ کہ — دروازہ کے پاس جا پہنچی جہاں چنوں، پورن دئی،

---

1. اندھی

وڈّیا وغیرہ نے اسے جکڑ لیا——

رانی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''ہائے نی، ہائے نی ....'' اور اس نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ نہیں کرے گا۔'' چنوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''ہائے! کچھ کر لیا اس نے تو میں مر جاؤں گی..........ہم سب مر جائیں گے۔ سب کا ٹھیکرا[1] مجھی پر ٹوٹے گا۔''

''تو مر رہ نا۔'' وڈّیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیکرا توڑنے والی اور کون ہیں، ہم ہی ہیں نا؟''

''ہے دیوی ماں—— میرا تو سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' رانو اپنے تشنجی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر، پورو کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

چنوں، رانی کے ہاتھ دباتے، اُسے ہوش میں لاتے ہوئے بولی۔ ''تجھے ہی تو گرم کرنے کے لیے یہ ساری مصیبت کی ہے..........کیا برف ہوئی جا رہی تھی۔''

''مجھے بچا لو چاچی!'' رانی نے پورن دئی کے پَیر پکڑتے ہوئے کہا۔

پورو نے اپنے پیر چھڑا لیے اور بولی۔ ''مری کیوں جا رہی ہے؟..........کچھ ہونے ہُوانے والا نہیں۔ ان موئے مردوں پر جب لادی ڈالی جاتی ہے، سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم عورتیں یہ نہ کریں تو سب کی سب دھری رہ جائیں..........تُو تو جانتی ہے——''

رانو کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بدستور لرزتی، کانپتی ہوئی چنوں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''وہ کیا کرے گا؟''

''جو تُو نے کیا۔'' چنوں نے کہا۔

''کیا سوچے گا؟''

''جو تُو نے سوچا——''

بڑی پاس کھڑی سُن رہی تھی اور اب تک معاملے کو کچھ کچھ سمجھ چکی تھی۔ وہ ایک دم بولی——

---

1. الزام لگے گا

''ماں نے یہ سب کیا تو میں کچھ کھا مروں گی۔''

اس پر سب عورتوں نے اپنی اپنی ناک پر انگلی دھرتے ہوئے، ایک لمبی، گھسٹتی ہوئی ''ہو، ہائے۔۔۔۔'' کی اور پھر چنوں نے بڑی کی چوٹی کھینچ ڈالی اور باقیوں نے دھکے دے کر اسے اندر بھیج دیا...... بڑی جب اندر گئی تو شرم، نفرت اور کدورت سے اس کا چہرہ سُوج رہا تھا......

5

منگل ڈھارے میں پہنچا۔ سلامتی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی منگل کے گھر جا کر جھگڑا ہوتے سُن آئی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اب وہ لوٹ کر منگل کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ''بولی'' تھی جسے وہ منگل کو سنانا چاہتی تھی ـــــ

ہسدّی نے چند منگ لیے، یار چھڈ گیا گلی دا آنا

ہنسی ہنسی میں جھومر کیا مانگ لیا کہ یار نے گلی میں آنا ہی چھوڑ دیا!

جب ہی سامنے منگل دکھائی دیا.......... وہ غصّے سے ہانپ رہا تھا۔ ایک پل ٹھٹھکنے کے بعد وہ آکر سلامتی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔ سلامتی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور منگل کی خاموشی میں ہزار مطلب تلاش کرنے لگی۔ اور پھر ہزار مطلب میں ایک ہی مطلب ...... وہ آج بن ٹھن کے آئی تھی۔ اپنی بڑی، بیاہی ہوئی بہن عنایتی کا دوپٹہ اُڑا لائی تھی، جس پر مقیش لگی تھی جو کہیں دور سے آتی ہوئی روشنی میں چمک چمک جاتا تھا۔ شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سلامتی کے بدن پر لپٹا ہوا دوپٹہ یوں کانپ رہا تھا جیسے پیٹھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے ـــــ

منگل کی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود ایک مشعل کی طرح جلتی، ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سلامتی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا پانو ملبے کے پاس پڑے ایک شہتیر پہ رکھ دیا جس کا بہت سا حصّہ لوگ کاٹ کر جلانے کے لیے لے جا چکے تھے۔ آہستہ مگر مظبوط آواز میں منگل پکارا ـــ

''سلامتیے!''

''ہوں!'' ـــــ سلامتی ایک بیٹھی سی آواز میں بولی۔

''اِدھرآ!'' وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آگئی، رُک گئی۔ ....

''اتار دے دوپٹا۔'' منگل بولا۔

سلامتے نے دوپٹا الگ پھینک دیا۔

''نکال دے قمیص۔''

سلامتی نے قمیص اتار دی.... ....ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات، لیکن اس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی سلامتی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی۔ دایاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی۔

شاید وہ کچھ کہتی لیکن منگل نے اندھیرے میں، کہیں دور سے، اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اسی وزنی آواز میں بولا —— ''ہوگئی سیر —— اب چلی جا......''

سلامتے نے بھونچکی ہو کر اپنے کپڑے اٹھائے۔ جلدی جلدی قمیص گلے میں ڈالی اور پھر گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں آگے دیکھتی، پیچھے مڑتی ہوئی چل دی۔

اسی وقت کوئی پاس سے گزرا اور جیسے خاموشی کا منہ پاٹنے کے لیے بول اٹھا۔ ''کون ہے اوئے؟'' منگل نے ایک دم تاؤ میں آتے ہوئے نتھنے پھلا لیے اور بولا۔ ''تو کون ایں اوئے ماميا؟'' اور وہ آدمی لمحے بھر کے لیے ٹھٹھک کر اپنی راہ پہ ہولیا —— وہ مقتول نہ تھا!

منگل کچھ دیر وہیں کھڑا ارد گرد کی فضا کو سونگھتا رہا اور پھر ایکا ایکی بائیں ہاتھ کو چھانٹا لگانے کے انداز میں جھٹک کر، سلامتے کے گھر کی طرف، ساہسیوں کی ٹھٹھی میں کہیں غائب ہو گیا —— ساہسیوں کی ٹھٹھی جو ہمیشہ گانو کے ایک ہوتی ہے، جہاں ارائیں چھینبے[1]، چمار، مصلّی وغیرہ رہتے ہیں اور جس کی طرف گانو کی گندی موریوں اور بدروؤں کا نکاس ہوتا ہے ——

1۔ دھوبی

6

پنچوں کی مقرر کی ہوئی تاریخ آ پہنچی۔ پورو، چنوں اور ودیا نے مل کر رانو کے ہاتھوں پر مہندی لگا دی اور کنگھی کر کے اس کی مینڈھیاں گوندھ ڈالیں اور سر پر خوبصورت سا ڈاک بنگلہ، بنا دیا............ اتنا دلاسا دیے جانے کے باوجود رانو کانپ رہی تھی، رو رہی تھی............

بچے ناسمجھی کے عالم میں چپ تھے اور سوچ رہے تھے ـــــ آج ان کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ بڑی ان کے گلے میں اپنی لانبی لانبی باہیں ڈالتی ہوئی، چپ کرانے کے بہانے انھیں رُلا رہی تھی اور پھر ـــــ جیسا کہ بندوبست کیا گیا تھا، سب بچوں کو چنوں موسی کے گھر بھیج دیا گیا۔

آنگن میں پینسی کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے............ ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اور ان سب پر سیندور مچل رہا تھا۔ رانو کو لا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دل دوز چیخ ماری ـــــ ''مرنے والے! آ دیکھ، کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ............''

پروہت نے کہا ـــــ ''لڑکا کہاں ہے؟''

پنڈت گیان چند، کیسر سنگھ اور دوسرے لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تو اسے زبردستی پکڑ کر لائے تھے اور چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا ـــــ مہر کرم دین جو اس رسم رواج سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا تھا، ڈھونڈتا ہوا اندر گیا اور انھیں پیروں لوٹتے ہوئے بالا۔ ''منگلو تو اندر نہیں ہے!''

اس دن اُتر سے آنے والی ہوا، طنابوں کی مدد سے ایک طرف بکائن اور دوسری طرف روشن دان کی سلاخوں سے بندھی ہوئی چادر کو پھڑ پھڑا رہی تھی، مفت کی دف بجا رہی تھی۔ چادر کے نیچے رسّیوں کے ساتھ ساتھ بندھی ہوئی کاٹھ کی چڑیاں لہراتی ہوئی چُوں چُوں کرنے لگیں۔ کچھ دور تنور کے پاس اس کی ٹھٹھل میں لیٹے ہوئے ڈبّو نے اپنی ٹانگوں میں دبائی ہوئی گردن اٹھائی اور مشکوک انداز میں اس پورے منظر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب تک بوڑھا اور نحیف ہو چکا تھا۔ نہ زیادہ روشنی برداشت کر سکتا تھا اور نہ شور۔ وہ گانو کے مرد عورتوں کی بے طور حرکتیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اندازے ہی کے ساتھ دشمن پہ بھوں بھوں کرنے لگا——

''میں تو جانتا ہوں، وہ نطفہ——'' حضور سنگھ نے کہنا شروع کیا۔

''دُر..........دُر...... ......'' جنداں حضور سنگھ کو پھٹکارتے ہوئے بولی۔ ''سوائے بکتے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔'' اور وہ اپنی مُردہ، بے نور سی آنکھوں سے اس جمگھٹے کی طرف دیکھنے اور سنسنانے لگی۔ وہ نہ جانتی تھی اب آسمان سے اگلی کون سی بلا نازل ہونے والی ہے؟ چوں کہ اس کی آنکھیں دھندلی تھیں اس لیے اپنے مقتول بیٹے کی شکل اور بھی کھل کر اس کے سامنے آ رہی تھی۔

''ٹھہر اوے باہمنا!'' نمبردار تارا سنگھ نے پروہت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا——

''میں لاتا ہوں اس ماں کے یار کو پکڑ کے۔''

''ہاں!'' کیسر سنگھ نے حامی بھری——''اس کی میں بہن کے بیاہ میں جوتے کھاتا پھروں۔''

''ہم سب چلتے ہیں۔'' جگّو بھی تیار ہو گیا۔

دیوانا بولا——''اتنے جوتے پڑے اس پر بھی بھاگ گیا!''

گویا اس سے پہلے، اسے ''ٹھیک کرنے'' ''سیدھے راستے پر لانے'' کے سلسلے میں گانو کے لوگ اس سے ''ٹیڑھے'' ہو چکے تھے۔ وہ تو چاہتے تھے اس کی ایک آدھ ٹانگ ہی توڑ دی جائے تا کہ چادر کے نیچے آ کر بیٹھے تو پھر ہل ہی نہ سکے، چھ سات آدمی ہاتھ میں لٹھیں اور گنڈاسے لیے ہوئے باہر لپکے اور گیان چند سرپنچ، قانون کا سرسری محافظ، صرف دکھاوے کے لیے منع کرتا، شور مچاتا

ہوا سب سے پیچھے............وہاں صرف عورتیں ہی رہ گئیں جن میں مُسر ما دائی بھی تھی جو منگل کو اس دنیا میں لائی تھی۔

مردوں کو یوں نکلتے دیکھ کر رانو واویلا کرنے لگی ـــــ ''چھوڑ دو ـــــ ہائے نی! مجھے چھوڑ دو، میں نہیں بچوں گی۔'' اور یہ سب ٹھیک ہی معلوم ہو رہا تھا۔ رانو پیچھے کی طرف گری اور بے ہوش ہوگئی۔ عورتیں اسی شادی کے لیے رکھے ہوئے گھڑوں میں سے پانی انڈیل انڈیل کر رانو کے منہ پر چھینٹے دینے، اسے ہوش میں لانے لگیں۔ گویا وہ کہہ رہی تھیں، اس نے موت دیکھی ہے تو اب شادی بھی دیکھے............

منگل کو لوگوں نے فارم کی ساتویں کپاس میں جا پکڑا۔ وہ پہلے ہی بہت سی مار کھا چکنے کے بعد نڈھال ہو چکا تھا، اب دہشت سے اور بھی نیم جان ہو گیا۔ وہ چاہتا تو اکا لے کر ہمیشہ کی طرح ستراہ یا ستو کی کی طرف نکل جاتا لیکن شومیِ قسمت'' اس مرزے کی بکی کو بھی استہزا کی صاحبان نے ''ڈھنگ'' دیا تھا۔ بکی اپنی بندھی ہوئی اگاڑی کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی ہری ہری چری اور موٹھ کھا رہی تھی اور موقع پڑنے پر ساتھ والے کھیت میں لہلہاتی ہوئی گوار کو بھی منہ مار لیتی۔ گانو والوں نے ممکنات کا خیال رکھتے ہوئے بکی کے پانو میں لوہے کا یہ بڑا، موٹا سا سنگل ڈال دیا تھا اور اس پر علی گڑھ کا تالا............اور اب وہ بے فکر ہو چکے تھے۔ منگل کا خیال تھا اس کے یارِ غار ـــــ نواب، اسماعیل اور گور داس وغیرہ اسے اس سانحے سے بچائیں گے، لیکن اسے کیا معلوم کہ وہ بے غیرت بھی کوٹلے کے باقی لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے اور بار بار یہی کہیں گے ـــــ ''آخر عورت ہی کی بات ہے نا، یار! ـــــ کوئی موت کی تو نہیں............''

منگل جہاں چھپا تھا وہاں سے دو ہاتھ دور خانقاہ والا کنواں تھا، جہاں آج سے چند ہی برس پہلے منگل کے بڑے بھائی تلو کے کا قتل ہوا تھا۔ جب شام کے وقت، سمے سے پہلے ہی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا اور ایک دن پہلے سورج نے زمین کی بکائن پر خون کے چھینٹے پھینک دیے تھے...... اس مٹی سے اب بھی خون کی بو آ رہی تھی............

منگل کپاس کے بغل میں ایک تنگ و تاریک ''کُرڈھ'' میں بیٹھا شک اور وسوسے میں بٹا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا، جب کہ گانو کے لوگ پہنچ گئے۔............سردیوں کے موسم

میں کبھی کبھی، کوٹلہ گانو میں کوئی بھیڑیا یا جنگلی سوٗر آ نکلتا تھا اور لوگ، اسی طرح لاٹھیاں اور چھویاں، ٹوکے اور گنڈاسے لے کر اسے گھیرنے، مارنے کے لیے نکل جاتے تھے............اور آخر اسی وقت دم لیتے جب گھرے ہوئے جانور کے پرخچے اُڑ جاتے............

لوگ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ منگل کوٹھری میں دو ہاتھوں کے بل جھکا، دہشت کے عالم میں سب کو دیکھتا ہوا سچ مچ ایک جنگلی سوٗر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہتا تھا اور باقی سب کے سب مسلح۔ کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور کہاں وہ اب آ کر سامنے کھڑے ایکا ایکی چپ ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے، گھور رہے تھے ——— دیکھیں پہلا وار کون کرتا ہے؟ شکار کس طرف لپکتا ہے............؟

منگل کا نرخرہ کانپنے لگا اور لوگوں اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہو کر خالی زمین ہی پہ لاٹھیاں برسانی اور ٹوکے چلانے شروع کر دیے............ایک شدید ڈر نے ان میں ایسا جوش، ایسی طاقت بھر دی کہ زمین میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے۔

ایک بار پھر وہ ایکا ایکی چپ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکار اور شکاری! منگل کے اپنے دوست، اپنے ساتھی۔ اٹّے والے گورداس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا ———

"دیکھتا ہوں یار، کون ساجگّا ہے؟"

گورداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ، جگّو، نواب، اسماعیل سب جھپٹ پڑے۔ ان کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ منگل نرغے میں سے نکلنے کے لیے لپکا۔ پھر متداول، ہراول اور قلب سب طرف سے لوگوں نے اسے آلیا۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، لاٹھی، جس کے ہاتھ میں جوتا تھا، جوتا، منگل پر برسانے لگا۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈاسے اور ٹوکے بھی تھے............

شور شرابا سُن کر راہ گیر جمع ہو گئے............منگل کو بالوں سے پکڑ کر بیچ کھیتوں اور کھلیانوں کے گھسیٹا جا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناطے نمبر دار تارا سنگھ یا کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کو بےحرمتی سے بچاتے لیکن یہ سب کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں ایک مزا اور انتقام لے رہے تھے۔ گھسیٹے جانے کی اذیّت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی

سے ساتھ چل لیتا، لیکن پھر پیچھے کی طرف کھینچنے لگتا جیسے کسی اڑیل ٹٹو کو پانی پلانے لے جا رہے ہوں .... اس کے بدن، پھٹے ہوئے کپڑوں، لمبے لمبے کیسوں اور ڈاڑھی میں دھرکونے کی جھاڑیاں، کپاس کی من چھٹیاں، مکئی کے ٹانڈے، خشک آک میں سے اُڑنے والی بڈھی مائیاں اور نہ جانے کیا کچھ گھسٹتا آ رہا تھا۔

جوہڑ اور دھرم شالہ کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس خاصا بڑا ہو گیا۔ مسافر سڑک کے ایک طرف رُک کر حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیکر کی باڑ کے پیچھے سے اچک کر ایک راہ گیر عورت نے گانو کی ایک مُیار[1] سے پوچھا ـــــ

''ہائے ہائے نی سُکھو ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

سُکھو نے عورت کی طرف اس نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ـــ ''ہو ہائے، بے بے! اتنی سیانی ہو کے تو یہ بھی نہیں جانتی؟'' اور بولی ـــــ ''شادی!'' اور پھر وہ لوٹ کر یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

کوٹلے سے دُور، ویشنو دیوی کے پہاڑ کا خاکہ اب بھی دھندلا سا نظر آ رہا تھا ـــــ اس وقت ضرور وہاں بے شمار جاتری پہاڑ کی پرکرما کرتے ہوئے جا رہے ہوں گے۔ کیوں کہ اسی پورنیما کو ویشنو دیوی میں جاتریوں کا اکٹھ تھا وہ ضرور ڈھولکیاں، چھینے بجاتے ہوئے گا رہے ہوں گے ـــ بچانا ہے تو بچا لو، اما جی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے............ گاتے بجاتے ہوئے انھوں نے ضرور دکھن کی طرف دیکھا ہوگا اور ضرور ـــــ ان کی نظریں کوٹلہ گانو کے دھندلکے، اندھیارے سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں گی............

گانو کے باہر یہی ایک نشیب تھا جو سرپنچ گیان چند اور اس کے مزدوروں سے پٹنا رہ گیا تھا، جس میں منگل ـــــ مار کھاتا ہوا منگل، بے سُدھ ہو کر گر گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑی بڑی کسیّوں اور کدالوں سے کھدائی کر کے جوہڑ کے پانی کو اندر لایا جاتا تھا اور پھر مٹّی کی گول گول ٹنڈوں کی مدد سے اوپر جہلم ارائین کی کیاریوں کی آبیاری کی جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی کھیتیاں سدا بہار رہتی تھیں۔ پھر ان پر پھروانہہ کی سنسناتی ہوئی چھانو جس میں بے شمار مسافر ستا

---

[1] دوشیزہ

چکے تھے..........اس وقت کچھ دنوں کے لیے بند باندھ کر پانی کو روک دیا گیا تھا لیکن منگل کے چاروں شانے چت اس میں گرنے سے بند ٹوٹ گیا اور جوہڑ کے پانی کے لیے راستہ بن گیا اور پانی تیزی کے ساتھ اندر آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ لوگ منگل کو اٹھاتے اس کے کپڑے پانی سے گیلے اور منہ کیچ میں لت پت ہو چکا تھا۔ منگل نے کئی بار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن آٹھ دس مضبوط بازوؤں کی جوڑیاں اپنے گرد پا کر وہ شرابی کی طرح بنکارتا ہوا راستے پر ہولیا۔

عجیب سا دولھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور سر پر سے پگڑی ندارد..........ہاتھ میں کُند سی کرپان، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے، کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے لودے، آنکھوں میں محبت کے نشے کی بجائے نفرت، ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلا پن..........اور عجیب سی برات، جیسے شیو جی پاروتی کو لینے آئے ہوں..........گلے میں رود راکش کی مالائیں، اور سانپ، منہ میں دھتورہ اور بھانگ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ چھالا اور ہاتھوں میں ترشول..........براتی بندر اور لنگور، شیر اور چیتے اور ہاتھی..........اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کُتا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی گُو..........گُو..........گُو..........گُو!

جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہولہان تھا اور رانو مکمل طور پر بے ہوش لیکن سب عورتوں کو یقین تھا، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا..........اگرچہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا لیکن یہاں چنوں اور پورن دئی اور وڈیا اور ککی اور چنڈی نے مل کر ایک پوری شادی کا سامان کر دیا تھا——ورنہ وہ سب ضائع ہو جاتا..........لڑکا عام طور پر لڑکی کے یہاں جا کر اسے بیاہ کر لاتا ہے لیکن اس وقت لڑکی کا مائیکہ بھی یہیں تھا اور سُسرال بھی یہیں..........آگا بھی یہیں پیچھا بھی یہیں..........پورن دئی باہمنی، وڈیا اور کچھ دوسری عورتیں لڑکی کے ماں باپ——مائیکے کی طرف سے ہو گئیں۔ جنداں، چنوں، سروپو، چنڈی اور سُرما سُسرال کی طرف سے۔ سب ایک دوسرے کی سمدھنیں بنیں، آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں جیسے کوئی لڑائی لڑنے جا رہی ہوں۔ ماں کی حیثیت سے جنداں نے اپنے تقریباً پوپلے سے منہ کو جنبش دی اور ''گھوڑی'' گانا شروع کی——

ارے بنّے!

چھوٹی چھوٹی بوندنیاں مینہ برس رہا ہے

سہاگن ماں تیرے شگن منا رہی ہے!

اور پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے چنوں، سردیو اور سُمر ماو غیرہ کی طرف اشارہ کیا، جو ایک ہی ساتھ شروع ہو گئیں ——

بہن سہاگن تیری گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے ہے، بنّے!............

بھابی سہاگن سُرما ڈال رہی ہے

اور باپ تیرا، زر کی تھیلی کا منھ کھولے کھڑا ہے!

اسی وقت بڑی، بھائیوں کی قطار لیے چھت پہ چلی آئی۔ چھوٹا چموں پیچھے آنے اور باجا سننے پر مچل رہا تھا۔ بڑی اسے منع کرتی، مارتی رہی، لیکن اس کا اپنا جی وہ سب کچھ دیکھنے سننے کو چاہ رہا تھا۔ چنوں موسی کے ہاں سے نکلنے، کوٹھے پر آنے کی دیر تھی کہ سب ہی پیچھے آ گئے اور منڈیر پر کھڑے ہو کر اپنی ماں کی شادی دیکھنے لگے۔ بڑی پہلے آٹھ آٹھ آنسو روئی اور پھر وہاں کا رنگ دیکھ کر ایک بچّی کی طرح سب کچھ بھول کر، نیچے کی طرف سرکنے لگی۔ ودّیا نے چلّا کر کہا۔ ''اینو!—— گاتی کیوں نہیں ہو؟'' اس پہ سب نے اپنی اپنی آواز بلند کر دی۔ تارا سنگھ، گیان چند، دیوانا، کیسر سنگھ، جگو، رُلدو، دُلّا، جمالا اور گانو کے مصلّی جو کچھ دور کھڑے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ایک دم بول اٹھے —— ''گاؤ!—— گاؤنا'' .... اتنے میں رانو کو ہوش آ گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا مرد اور کیا عورت، سب کو دیکھنے لگی، جیسا کہ دلہن کبھی نہیں کرتی۔ ودّیا نے گیت اٹھایا اور پھر باقی بھی سب کی سب شامل ہو گئیں۔

پیلی پیلی وال تیری گھوڑی چرے

اور میرا بنّا—— لپک کر گھوڑی پر سوار ہو

اور چھوٹی سی بنوں کو لے کے محلوں میں آئے

اور پھر منظر لڑکی والوں کے ہاں پہنچ گیا۔ پورن سئی نے سہاگ شروع کیے —— رانی کے باپ کو خطاب کرتے ہوئے ——

بابل! تجھے نیند پیاری ہے؟

ارے! گھر میں کنّیا کنواری ہے!

سندر بیٹی تیری بَر مانگتی ہے، وَر مانگتی ہے، اچھا سا گھر مانگتی ہے!

اوپر کسی نے منہ پر مُٹھی گول کرکے باجے کی آواز نکال دی۔ بس پھر کیا تھا۔ سب سمجھ گئے بارات آگئی۔ خوب ہی دھما چوکڑی مچی۔ گانو کے سب بوڑھے بچے، مرد عورتیں سامنے کے کھلے میدان میں، کنویں کے مَن پر، کوٹھوں کی چھت پر، درختوں کے اوپر، یہاں وہاں سب جگہ پہنچ کر بیٹھ گئے۔ پورن دئی اور اس کی طرح ارساتھن وِدّیا نے برات کی طرف اشارہ کرکے آئے ہوئے مہمانوں کو بندر، سؤر، بھڑوے اور جانے کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اٹھا دیے جس پر خوب ہی کھلی پڑی.......... سمدھنیاں ناچیں، ڈومنیاں تھرکیں........ جب ہی پورن دئی نے اپنی بانہہ اُلاری وہ نظارہ گانو کے لوگ آج تک نہیں بھولے، کیوں کہ چولی کے نیچے سے پورو کی ولایتی انگیا نے آنکھیں ماری تھیں، پھر اس نے وِدّیا کے ساتھ مل کر کئی نمکین اور مرچیلی سٹھنیاں دی تھیں ——

پودینے کی کرو کڑاہی رے

منگل کی ماں، رنڈی کی بیٹی آئی رے

ہمارا اچھا کرارا پودینہ!

اس پر نواب کی بیوی عائشہ، جہلم ارائین اور اس کی تینوں بیٹیاں، عائشہ عنایتی اور سلامتی بھی شامل ہوگئیں، جیسے پودینہ صرف انھی کی مِلک تھی.......... اور سب ناچ ناچ اٹھیں ——

ہمارا اچھا کرارا پودینہ!

مصالحوں والا پودینہ!

منگل کی بہن تھانے داروں سے چھڑائی رے

پودینے کی کرو کڑاہی رے..........

پھر ہنسی، کھیل، کلکاریاں، جن میں مرد بھی شامل ہوگئے .... بچے بھی اور بوڑھے بھی..........کون کس کی چوٹی کھینچ رہا تھا اور کون کس کو کلاوے میں لے رہا تھا، یہ کسی کو پتا نہ چلا۔

پورن دئی جمالے کی بانہوں میں پڑی تھی اور وہیں مچل مچل گئی ۔ وڈیا سروپو کو لپٹ لپٹ رہی تھی............ بڑی نیچے آکر جو کھڑی ہوئی تو اسے کسی طرف سے دھکا پڑا اور آنکھ گیان چند کی جانگھوں میں جا کھلی، جو اسے بڑے پیار، بڑی ہی شفقت سے بھینچ رہا تھا۔

جب ہی چادر کھنچی اور شادی ہو گئی............ ایکا ایکی سب خاموش کھڑے ہو گئے، کیوں کہ ڈولی رخصت ہونے کا سمے آ گیا تھا۔ مائیکے والیوں نے گانا شروع کر دیا——

بائبل! اب تیرا کیا دعویٰ ہے؟

دولھا کا باپ ڈولی کی متیاں پکڑے کھڑا ہے، اب دعویٰ اس کا!

بھیّا! تیرا اب کیا دعویٰ ہے:

دولھا کا بھائی ڈولی کے بازو تھامے کھڑا ہے، اب دعویٰ اس کا!

اور پھر ایک—— واحد بَین لڑکی کا——

بابل!............ طاقچوں میں میری گڑیاں بکھری ہیں لیکن مجھے کھیلنے کا چاؤ نہیں۔

بابل! انگ سہیلیاں یہاں وہاں سے مجھے ملنے آئی ہیں لیکن مجھے ان سے بھی ملنے کا چاؤ نہیں!

.... ہائے روتی ماں انگیا بج گئی اور باپ تو دریا رو رہا ہے——

پھر منھ دکھائی اور جگ ہنسائی............ آخر سر جوڑی!

پہلے رانو کو اور پھر منگل کو پکڑ کر کوٹھری میں ڈھکیلتے ہوئے باہر سے تالا لگا دیا گیا جسے چنوں، دونوں جڑواں بھائی اور بڑی دیکھ رہے تھے اور اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے............

7

اس رات رانو ایک بہن، بیوی اور ماں کی طرح منگل کے زخموں پر سینک کرتی رہی۔ باہر تو جا، نہ سکتی تھی، اس لیے وہیں دوپٹے کو منھ میں ٹھونس کر وہ اس میں اپنے گرم گرم سانس کی دھونکنی چلاتی اور منگل کی سوجن پہ رکھ دیتی۔ اسے آرام بھی آ رہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ کراہ بھی رہا تھا۔ کبھی کبھی درد بغیر بتا دیے، بنا خبردار کیے شعور کی تہوں میں کہیں گم ہو جاتا تو منگل کو رانو کے ہاتھ عجیب سے لگنے لگتے۔ شاید ان ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی کا رنگ اس اندھیرے سے بھی تیکھا تھا اور بُو اس کھٹے سے بھی تیز جو سردی اور گرمی کے ملاپ میں ایک دم مہک اٹھتا ہے اور پھر دل میں ایک عجیب طرح کی اَن کہی، آنکھ میں عجیب طرح کے اَن بہے چھوڑ کر، چند ہی دنوں میں پت جھڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

رانو یکسر بھول چکی تھی، اس کے بچے کہاں ہیں؟ کیسے سوئے ہیں؟ ان میں سے کسی نے کچھ پیٹ میں ڈالا بھی ہے یا نہیں؟ ایک بار چنوں کی شبیہہ لپک کر اس کی سوچ میں آئی اور پھر ویسے ہی، اپنے آپ چلی گئی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ چنوں سے کہیں بالا تھا۔ چنوں اور اس کے ساتھ کے لاکھوں کروڑوں بالک اس کا ایک حصہ تھے، اور بس۔ کبھی بیچ میں منگل بدک کر پہلو موڑ لیتا تھا۔ پھر رانو ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی اور دبی دبی سسکیاں لینے لگتی جو تخلیق سے پہلے ہر عورت کا مقدر رہوتی ہیں۔ ایکا ایکی اسے پیاس لگی۔ لیکن کھڑکی کھول کر کسی کو پانی کے لیے کہنے کی ہمت نہ ہوئی............ پھر منگل بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایکا ایکی اس پر کوئی پاگل پن کا چکّر آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا رہا سہا کُرتا بھی پھاڑ ڈالا............ ”میں

مر گئی۔'' رانو چلائی اور اس کے پاس چلی آئی ——

''پرے ہٹ جا۔'' منگل نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

.........پچھلی رات رانو نے منگل کے پانو پکڑ لیے اور ان پر سر رکھتی، روتی ہوئی بولی۔

''تُو تو جانتا ہے منگلا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔''

منگل جو اَب تک مضمحل ہو چکا تھا بولا —— ''جانتا ہوں۔'' اور پھر نہ جانے کس جذبے سے اس نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھتے رہنے سے اسے پتا پتا، سوئی سوئی دکھائی دینے لگی تھی.........

رانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے، دیکھنے لگی، اس کی تقدیر کا ساتھی، اگلے لمحے، اس مہندی رچے ہاتھ کو اپنے کرخت چھانٹے والے ہاتھوں میں رہنے دیتا ہے، یا جھٹک دیتا ہے؟ لیکن، ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ منگل کا ہاتھ جیسے اپنے آپ نیچے گر گیا اور ساتھ رانو کا بھی......... باہر لوگ ہمیشہ کی طرح یہی سمجھتے رہے —— شادی ایک مسلسل شبِ زفاف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ لوگ تو سرے ہی سے نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے، اُن لمحوں کو بھول چکے تھے جو اُن پر بھی آئے تھے۔ جو تپیدگی اور ہیجان اور اہتزاز دو دلوں کے بیچ پیدا ہوا تھا —— شبِ زفاف کی لذّت اس کے مقابلے پہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مفروضہ حاتم سے مہریں مانگنے جائے، اپنے ساتھ پوری انسانیت اور اس کے وقار کو اس کے قدموں پہ جا گرائے اور اس کے عوض میں ایک دمڑی پائے......... اس پر بھی دُعائیں دیتا ہوا گھر چلا آئے.........

صبح جب رانو اور منگل جاگے تو کسی نے تالا کھول دیا تھا۔ منگل اُٹھا۔ اس نے چلنے کی کوشش کی لیکن دو ہی قدم کے بعد کراہتا ہوا لوٹ آیا اور روتے ہوئے اپنے عروسی بستر پہ گر گیا۔ رانو بھاگ کر باہر پہنچی اور جا کر ماں جنداں کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہے بہو؟'' جنداں بولی۔

اس پر رانو نے کہا۔ ''بھنڈارے کی چابی دو ماں۔''

''وہ کس لیے؟''

''ہلدی نکالنا ہے، اسے بہت مار لگی ہے۔''

جنداں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے چابیاں کھول کر رانو کو دے دیں۔ بھنڈارے کی طرف جانے کی بجائے رانو برآمدے کی طرف لپکی، جہاں بچے آدھے ننگے، آدھے ڈھکے ہوئے سو رہے تھے۔ رانی نے باری باری سب کا منھ چوما اور اُن کے بازوؤں، ٹانگوں میں اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر ان کے جسموں کو ڈھانپا۔ گلابی سی سردی میں ہاتھ، رانوں میں دیے، سُکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونا شروع ہوئے۔ لیکن جب رانی بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ رانو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی، بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منھ نوچ لیا اور بولی — ''جا تُو — اسی سے منھ کالا کروا — ''

رانو پر پہلے کیا کم گزری تھی کہ اس پر بیٹی نے بھی منھ نوچ لیا! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی — بیٹی! تیرے ہی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔ اور تو اور، تُو بھی؟ لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی — اس کی بیٹی، اس کی اپنی، جسے اس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا، ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جانکاہی کے عالم میں اس دنیا میں لائی، بے بسی اور میلے سے دھوتی روتی ہوئی پالا، بڑا کیا اور اب بڑی ہو کر اس نے منھ نہیں نوچا — پھول برسائے ہیں! رانی ایک گُند اور خالی ذہن کے ساتھ اندر ہلدی لینے کے لیے چلی گئی، جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر، توے پہ پکایا اور پھر، منگل کی چوٹوں پر باندھنے کے لیے لے چلی ....

اندر پہنچی تو منگل وہاں نہ تھا۔ شاید، جب رانی اپنی ساس کے پاس تھی، وہ کہیں نکل گیا تھا۔ رانو دوڑ کر باہر دروازے تک گئی — منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا۔ البتہ ڈبّو پاس آ کر دُم ہلانے، چوں چوں کرنے لگا اور اگلے پنجے اٹھا اٹھا کر رانو پہ رکھنے، جیسے کہہ رہا ہو — میں جانتا ہوں رانی! تیرے ساتھ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا، آخر سب ٹھیک ہو جائے گا ....

چنوں روز سویرے مندر جایا کرتی تھی اور صبح کی دودھیا خنکی پہ اس کی آواز پیرتی ہوئی آیا کرتی — ''مناں تیں رام نہ جانیا رے!'' .... لیکن آج مندر جانے کی بجائے وہ سیدھی رانو کے ہاں چلی آئی۔ رانی بھی اسے دروازے میں کھڑی مل گئی، چھٹتے ہی چنوں نے پوچھا —

''کیوں رانی سب سکھ ہے نا؟''

رانی چپ رہی۔

''بول نا۔'' چنوں پوچھنے لگی ۔اس پر بھی جب رانی کچھ نہ بولی تو چنوں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بول ،رات کچھ ہوا؟.......... ہائے کیسی گھنگھنیاں منہ میں ڈالی ہیں؟''———

جو گھنگھنیاں رانو نے منہ میں ڈالی تھیں،اس کے بارے میں کیسے بتاتی ؟اس کھولتے پانی کی تپش اور جلن، جن میں اُس کے جذبات، ان کی کاشت اور حاصل برداشت کا دانہ دانہ تک اُبل گیا تھا، جل گیا تھا، چنوں کو کن الفاظ میں بیان کرتی ؟ نیچے دیکھتی پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رانی بولی——— ''رات کچھ نہیں ہوا۔''

چنوں نے غور سے رانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی ——— ''جھوٹ بکتی ہے؟.......... بھلا، (اچھا)، تیرے منہ پر یہ ناخنوں کے نشان کیسے ہیں؟''

ٹھنڈے پسینے کے قطرے رانو کے چہرے پہ چلے آئے اور وہ کچھ نہ بولی۔ کچھ دیر یوں ہی بیکار، شرمسار سی کھڑی رہنے کے بعد جیسے وہ ایکا ایکی اُبل پڑی۔ ''تو جو کہتی ہے، چنوں! مجھے اس کی ضرورت نہیں——— میں تو تن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے مانگتی تھی، بھیناں!.......... پیٹ میں ڈالنے کے لیے دو روٹیاں.......... پتا نہیں واہگورو پر ماتما کو کیا منظور ہے؟ دیوی ماں کیا چاہتی ہے؟——— وہ اب پھر چلا گیا ہے کہیں..........''

''ہائے رام! چنوں نے پیچھے گلی کے اندھیرے کو صاف ہوتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی۔ ''کدھر گیا مُوا، تت پلتا؟'' اور پھر ایک دم کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بولی۔ ''میں منہ جلی.......... تیرے سامنے تو اب مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے———''

رانو مسکرا دی——— جیسے رو رہی تھی یا رو دی، جیسے مسکرا رہی تھی۔

چنوں، رانو کو دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اس کی تُو فکر نہ کر، رانی! جیسے وہ گیا ہے، بی با! ویسے ہی آ بھی جائے گا۔''

———اور دوپہر کے قریب منگل سچ مُچ ہی چلا آیا۔ اس نے نواب کا کُرتا پہنا ہوا تھا۔ اسماعیل کا صافہ اور گوردواس کا گامے شاہی جوتا۔ بدن پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کا خیال تھا گھر

کی ہلدی ولدی سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں، اس لیے وہ صبح کے پہلے ہی پھیرے میں اسماعیل کے ساتھ اس کے اِکّے پر نکل گیا تھا۔ اور ڈسکے کے بڑے اسپتال میں جا کر پٹّی کروا آیا تھا .... صبح سے کچھ پیٹ میں ڈالا تھا یا نہیں، خدا جانے .... کل سے تو صرف مار کھائی تھی اور یا پھر .... شادی کی تھی!

دن بھر منگل کھاٹ پر بیٹھا زمین کے تنکے گنتا رہا۔ کبھی وزن میں اپنا آپا اسے ایک تنکے سے بھی ہلکا معلوم ہونے لگتا اور کبھی پوری زمین سے بھاری۔ پھر کبھی بیچ میں جھک کر، انگلی سے وہ کچی زمین پہ ''اونسیاں'' ـــــ قسمت کی لکیریں کھینچنے لگتا، لیکن جب انھیں گنتا تو وہ جفت ہی آتیں، کوئی طاق نہ بچتی۔ قسمت کہیں راستہ نہ دیتی۔ جھلاّ کر، ہاتھ چھلاتے ہوئے اس نے اپنے بھاگوں کے سب لیکھ مٹا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اضطراری کیفیت سے چہرہ صاف کیا تو دھول منھ پر چلی آئی۔ اپنی چرف سے صفائی کے عمل میں وہ اور بھی گندا، تقدیر آلود نظر آنے لگا۔

جب ہی ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ بکائن پر کر بیٹھنے والے، کرخت آواز میں کائیں کرنے والے ڈھوڈروں ـــــ پہاڑی کوؤں کو اڑانے، گانو کے گولی جوگے آوارہ کتوں کو ایک نیم جان خارش زدہ کتے پر جھپٹنے سے روکنے لگا... پھر ایک طرف سے کہیں آدھی درجن کے قریب کُتّے، ایک دوسرے پر جھپٹتے، غرّاتے ہوئے چلے آئے، جنھیں بھگاتے ہوئے منگل بول اٹھا ـــــ

''میں حیران ہوں یار!...... کوٹلے میں جو بھی مرتا ہے شاید کُتّا ہی بن جاتا ہے......''

کچی دیوار پرے دور دھولا دہار اور ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ کہیں ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے اور ان کے بیچ کہیں کہیں برف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ان پہاڑوں سے ادھر دکھن کا وہ علاقہ تھا جس کی ٹیکریوں پہ پہاڑی کے سوز نے جنم لیا تھا کیوں کہ یہاں کے عاشق اور معشوق کبھی آپس میں نہ مل سکے تھے۔ ایک اس ٹیکری پہ ہوتا تو دوسرا اس پر، اور بیچ میں دریا ـــــ

پاپی لوگ پہاڑ دے، پتھر جن کے چت
انگ ملاوا کبھی کبھی، نین ملاوا نت

اور ان کی جدائیوں کا درد، راوی، چناب، جہلم کے کنارے کنارے ہوتا ہوا وارث شاہ اور قادریا کے صَوت میں ساندل اور گنجی بار کے دل تک پہنچ گیا تھا .... ایک ایک کر کے

گزرے ہوئے واقعات منگل کے دماغ میں آنے لگے۔اس نے ایک سرد آہ بھری اور مرزے کی آواز میں گنگنانے لگا۔''تُو نے بُرا کیا، صاحباں! ـــــ جو میری تکّی کی اگاڑی باندھ دی۔میرے تیر و ترکش ٹانگ دیے، ورنہ ایک تیر سے تیرے بھائیوں کو کھیت کر دیتا اور دوسرے سے اسے جس کی تُو منگیتر تھی ـــــ''

لیکن، شاید، منگل کے فگار دل کے لیے 'مرزا صاحبان' کا وہ حصّہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر، دوسری بانہہ الارتے ہوئے وہ گانے لگا ـــــ ''چھٹن شاہ فقیر سے ایک جاٹنی عرض کرتی ہے ـــــ میں سالم بکرا تیری نیاز گزاروں، اگر میرے سر کا سائیں مر جائے۔ پانچ سات پڑوسنیں ہلاک ہو جائیں اور جو رہتی ہیں، انھیں تپ آلے۔ گانو کے نمبردار کو پھکی پڑے، جو تھانے میں رپٹ کرتا ہے۔ کراڑ ـــــ بنیے کی ہاٹ جل جائے جہاں ہمیشہ دیا جلتا ہے۔ فقیر کی کتیا مر جائے جو دن رات چُوں چُوں کرتی رہتی ہے ـــــ گلیاں سونی ہو جائیں .... اور میرا محبوب بنا روک ٹوک کے آسکے..........''

یوں جی کو آسودہ کر کے، منگل، اندر جا کر لیٹ گیا۔ جب تک فضا میں سے کُشت و خون نکل گیا تھا۔ صبحیں، دو پہریں اور شامیں ڈھلنے لگیں، جیسے وہ کوئی میلی دیواریں تھیں اور کوئی آسمان کے دریائے درد سے مٹکوں پانی لے کر، کرنوں کی جھاڑو سے انھیں دھوئے گال رہا تھا.......... رانو نے کھانا پکایا۔ پھر بھاگ کر چنوں کے ہاں سے تھوڑا سا گھی لے آئی اور ایک بیوی کی طرح اس کی بڑی سی مقدار روٹی پر رکھ دی۔ وہ روٹی پہ ''چونگھا'' نکالنے ہی والی تھی کہ کسی خیال کے آنے سے رُک گئی، شرما گئی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

کچھ دیر میں، کھانا ڈالنے کے بعد اس نے بڑی سے کہا۔''جا اسے دے آ۔''

بڑی نے نتھنے پھلا کر شانے جھٹک دیے اور بولی ـــــ ''میری جاتی ہے جُوتی۔''

رانو خجل ہو کر خود ہی اُٹھنے والی تھی کہ پاس بیٹھا ہوا چنوں بول اٹھا ـــــ ''لا ماں، میں دے آتا ہوں۔''

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا.......... جیسے یہ اس کا بچپن تھا، اُس کی معصومیت ہی تھی جو رانو کے دُکھ کو سمجھ سکتی تھی۔ یہ بچپن اور معصومیت جو کردہ اور ناکردہ گناہوں سے کہیں اوپر تھے۔

رانو کا جی چاہا، اسے چھاتی سے لگا لے، بھینچ لے، یوں بھینچ لے کہ وہ پھر سے اس کے بدن میں تحلیل ہو جائے اور اس دنیا میں نہ آئے، جہاں.......... جب ہی اس نے تھالی چنوں کے آگے سرکا دی اور خود دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے بیٹھ گئی..........

یوں دن بیت گئے۔ مہینے بیت گئے۔ منگل کے دل میں آہستہ آہستہ ایک ذمّے داری کا احساس جیسے اپنے آپ پیدا ہونے لگا اور وہ چار چار پانچ پانچ روپئے کما کر گھر لانے لگا۔ اگر چہ رانو کے ساتھ اس کا میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ روپے لا کر ماں کے ہاتھ میں دینے کی بجائے رانو ہی کے ہاتھ میں دیتا اور رانو خوش ہو اٹھتی اور اداس بھی۔ ڈر سے ملا جلا ایک استحکام کا جذبہ اس کے دل میں جگہ پانے لگا۔ گانو بھر کی عورتیں، کیا چنوں اور کیا پورن دئی، کیا وِدیا اور کیا سرو پو سب نے ''کچھ ہوا نی ـــــ نی کچھ ہوا؟'' پوچھ پوچھ کے غریب رانو کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ رانو جواب میں صرف اتنا ہی کہتی ـــــ ''رنڈیو! شکر نہیں کرتیں میرا گھر بس گیا ہے، روٹی کپڑا ملنے لگا ہے مجھے؟.......... اب مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکالے گا۔ کوئی میری بیٹی کو نہیں بیچے گا..........''

لیکن ـــــ وہ سب شہد کی مکھیاں یوں ہی چھوڑنے والی تھوڑے تھیں؟ دیر تک وہ رانو کے ارد گرد بھنبھناتی رہتیں اور اس کے کولھوں میں چتّے دے دے کر پوچھتیں ـــــ

''کیا مطلب؟.......... ساری رات وہ ایسے ہی پڑا رہتا ہے؟''

''ہاں۔''

''تو اِدھر اور وہ اُدھر؟''

''ہاں۔''

''تو بھی اُسے بُلانے کی کوشش نہیں کرتی؟''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں ـــــ ناس پٹیے؟.......... وہ تیرا وہ ہے، شادی کی ہے تیرے ساتھ.......... چادر ڈالی ہے تجھ پر؟''

رانو رُونکھی ہو اٹھتی اور بول اٹھتی۔ ''چادر ڈالی ہے تو کیا ہوا؟.......... مجھے اب بھی وہ

ویسے ہی لگتا ہے، جیسے پہلے لگتا تھا——"

اس پر سب ہنکار اٹھتیں ——"ہو ہائے!" "پھٹے منہ" "دُر لعنت" اور پھر وہی——
"تمھیں نیند کیسے آتی ہے؟"

"جیسے پہلے آتی تھی۔"

"وہ بھی سو جاتا ہے بس—— ایسے ہی؟"

"ہاں۔"

"رات کو اٹھتا، اکڑتا—— جما ہی بھی نہیں لیتا؟"

اس پر سب ہنس پڑتیں اور ایک دوسرے کو "جھپیاں" دینے لگتیں اور آخر سمجھاتیں—— "تُو کچھ کر، گشتی جمانے کی، نہیں تو ہاتھ سے جاتا رہے گا۔"

پورو بیچ میں بول اٹھتی—— "کہو تو تجھے ایک ٹونا لا دوں؟"

"ہاں نی" وڈیا حامی بھرتی۔

"نہیں نہیں" رانو کہتی—— "میں کوئی ٹونا ونا نہ کروں گی۔"

"تو پھر بیٹھ کے روئے گی" پورو تنبیہا کہتی۔

وڈیا معنی خیز انداز میں پورو کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھتی۔ تُو تو نہیں روتی نا؟"

پورو ایک دم اپنی شرم اور لاج کو ایک طرف رکھتی، اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی۔ "میری روتی ہے یہ............ میں ٹونکا نہ لاتی، میرا شمبھو پیدا نہ ہوتا تو یہی چاچا تمھارا مجھے گھر سے نکال دیتا............" اس پر پر سب کھلی کپاس کی طرح ہنس ہنس پڑتیں اور پورن دئی ایک بڑی سی آنکھ پھیلا کر، سب کو چاروں طرف دکھا کر مارتی۔ تس پہ چنوں پوچھ لیتی—— "باوا ہری داس کے کے دِن رہ گئے؟"

جب ہی پورن دئی چنوں کی چوٹی یوں کھینچتی کہ سب—— "میں مر گئی، ہائے میں مر گئی............" کے ہلڑ میں ختم ہو جاتا——

اُدھر نصیبوں والے اڈّے پر گورداس، نواب اور اسماعیل منگل کی جان نہ چھوڑتے، اکثر

پوچھتے رہتے ــــــ ''کیوں پھر کیسی لگی؟'' اور منگل کا چہرہ ایک دم لال ہو اٹھتا۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے اس کی ماں، بہن کے بارے میں کوئی بات بے احتیاطی سے کہہ دی ہو۔ وہ چپ رہتا اور بیکار ریلی کے ساز میں بکلس کسنے، یا گھوڑی کو تھپکنے لگتا۔ گورداس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ اُٹھتا ــــــ ''سچ پوچھو تو دوہاجن[1] کی بڑی موج ہوتی ہے؟''

''وہ پہلے ہی رسی بسی ہوتی ہے نا؟............سب جانتی ہے۔''

اس پر سب مل کر ہاہا، ہوہو کرنے لگتے جس کے بیچ میں منگل کی پاٹ دار آواز آتی ....''ٹھہرو تمھاری ماں کا............!'' اور سب ایکا ایکی چپ ہو کر منگل کی طرف دیکھنے لگتے۔ صرف گورداس ہمت کرتا، کیوں کہ وہ تن و توش کے اعتبار سے مضبوط تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر کسی کو سوچنا پڑتا تھا۔ وہ کہتا ــــــ

''اسے ماں بنانے کے لیے بیاہ کیا ہے، اوئے؟ چادر ڈالی ہے............؟''

منگل ایک کڑی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا، لیکن مصلحت کو بہادری سمجھ کر چپ رہتا۔ تھوڑی دیر میں گدلائی ہوئی فضا صاف ہوتی اور اسماعیل کوئی لطیفہ شروع کر دیتا ــــــ یا کثیفہ ــــــ ''ایک سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی؟''

''پھر ــــــ پھر کیا ہوا؟'' نواب، منگل کی طرف دیکھتے، مزا لیتے ہوئے پوچھتا۔ جب ہی بیچ میں کوئی سواری چلی آتی اور نواب اس سے مخاطب ہو جاتا ــــــ ''کوٹلے چلے گی، مائی؟''

''نہیں وِیرا'' مائی کہتی اور چلی جاتی ....نواب پھر اسماعیل کو پکڑتا ــــــ ''ہاں تو ــــــ سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی ــــــ؟''

''ہاں۔'' وہ بیان جاری رکھتا۔'' اور وہ کچھا پہنے ہوئے کیچ میں کود پڑے اور لگے اکنی ڈھونڈنے ــــــ اور اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے ــــــ اللہ مل جائے! یا اللہ مل جائے ــــــ ایک مسلمین پاس سے گزرا۔ اللہ کا نام سن کر ٹھہر گیا اور بولا ــــــ ''اوئے سردار! تُو ہمارے اللہ سے کیوں کہتا ہے؟ اپنے واہگورو سے کیوں نہیں؟............سردار جی نے اوپر دیکھا اور بولے ــــــ اونہہ! اکنی کے لیے واہگورو کو کیچڑ میں ڈالوں؟''

---

[1] وہ عورت جس کی دوسری شادی ہو

اس پر سب کھلی مار کے ہنس دیتے۔ منگل بھی مسکرا اٹھتا اور اسماعیل اسے اجازت نامہ سمجھ کر اس کے پاس پہنچا اور کہتا ——— "منگلا! یہ ٹھیک ہے، سرداروں کے بارہ بجتے ہیں؟"

"ہاں، بجتے ہیں۔" منگل اقرار کرتا۔

"تیرے بھی بجتے ہیں۔"

"ہاں میرے بھی بجتے ہیں۔"

"پھر منگل کے "جونڈے" پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسماعیل پوچھتا" یہاں کچھ ہوتا ہے؟"

"ہاں ہوتا ہے۔" منگل پیچھا چھڑانے کے لیے مان لیتا۔ لیکن اسماعیل اسی پر بس نہ کرتا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا۔" سن.......... یہ تمھیں دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے یا رات کے بارہ بجے بھی؟"

"دن کے.......... جو اصلی سکھ ہے، اسے تو دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے.......... اتنے بال اور گرمی کتنی پڑتی ہے۔"

"تو پھر ——— ؟" اسماعیل کہتا۔" وہ اپنے گانو کا وسا کھا سنگھ ہے نا ——— ترکھان...... وہ تو رات کے بارہ بجے بہت "کھرود" کرتا ——— شور مچاتا ہے۔"

منگل جواب دیتا ——— "وہ حرام جادہ ——— جُرور مُسلمان سے سکھ ہوا ہوگا!"

اور سب مل کر ہنسنے لگتے۔ منگل کی آواز سب سے بلند ہوتی۔ پھر بیچ میں کوئی جاترن چلی آتی اور سب مل کر اسے لپک لیتے۔ اس کی گٹھری نواب کے اِکّے میں ہوتی، جوتے منگل کے اِکّے میں اور وہ خود، گورداس کی بانہوں میں۔ اکثر ایسا ہوتا، میاں ایک اِکّے میں ہوتا اور بیوی دوسرے میں اور بچّہ تیسرے میں۔ پھر بہت ہی گالی گلوج کے بعد سب مل کر کسی ایک کا اِکّا بھر کر روانہ کر دیتے اور خود دوسری سواریوں کے پیچھے بھاگنے لگتے۔ منگل کو اب عورتوں میں صرف سواری کی حد تک دلچسپی تھی۔ وہ کبھی کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا بھی، تو ایک سرسری نظر سے ——— جیسے کہہ رہا ہو، ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں.......... سلامتے میں اسے اب بھی اسے دلچسپی تھی۔ اس لڑکی کو عورتوں کی ڈاک سے پتا چل گیا تھا کہ منگل اور اس کی بیوی میں ابھی تک کچھ وہ نہیں ہوا.......... وہ اور بن سنور کر اس کے سامنے آتی اور سیروں کے اشارے کرتی۔ لیکن اندر سے وہ جلی بیٹھی تھی۔ اس نے

فیصلہ کر رکھا تھا، ایک دن منگل کو اپنے چنگل میں پھنساؤں گی —— ڈھارے کے پیچھے کپڑے اتر واؤں گی۔ اور جب وہ ہاتھ بڑھائے گا تو شور مچادوں گی اور اس کی وہ بے عزّتی کراؤں گی کہ یاد ہی کرے .... اب جب کہ وہ بیوی والا ہو چکا ہے، اس کا منھ ہمیشہ کے لیے کالا ہو جائے گا.........

اُس دن نصیبوں والے اڈّے پہ منگل نے نواب کے ساتھ پی لی .... لیکن ڈرتے ڈرتے۔ اپنے بھائی کے زمانے میں تو وہ بوتلیں لنڈھایا کرتا تھا لیکن اب وہ ڈرتا تھا۔ اسے پینے کی خواہش تھی لیکن یوں بے تکے پن سے نہیں۔

رانو بھی عام عورتوں کی طرح تھی جو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنے شوہروں کے چہرے دیکھنا سیکھ جاتی ہیں۔ اس پر آنے والے ایک ایک شکن کو جاننے پہچاننے لگتی ہیں۔ جب ان کا مرد کوئی گناہ کر کے آتا ہے تو انھیں لامحالہ پتا چل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتیں۔ باتیں کرنے میں وہ ان کی زیر زبر دیکھ لیتی ہیں، بلکہ چوکھٹ کے اندر پہلا ہی قدم ان کی پوری جاتک، پوری الف لیلیٰ ان کے سامنے دہرا دیتا ہے...... اس سے پہلے بھی منگل نے دو چار بار پی لی تھی اور وہ جان گئی تھی .... منگل کو بھی معلوم تھا کہ وہ جان گئی ہے...... لیکن، اس پر بھی خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور ایسے ہی نبھتی رہی.........

جوں جوں دن بیتنے لگے، گانو کی عورتیں، رانو کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں۔ اور وہ سوچنے لگی —— شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں .... وہ ڈرنے لگی، اپنے مستقبل سے، اپنے بچّوں کے مستقبل سے کیوں کہ بیچ بیچ میں منگل الف ہو اٹھتا تھا —— ''ہٹاؤ یہ سب کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔''

اور رانو کانپ جاتی۔ وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی۔ اُس پر اُس کا حق ہی کیا تھا؟ —— نہیں نہیں، حق تو تھا —— پنچایت کی موجودگی میں، گانو کے سب مرد عورتوں کی گواہی میں، اس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی .... سوچیں تو حق ہے بھی اور نہیں بھی۔ چادر کا کیا ہے؟ —— اڑھائی تین گز کا کپڑا .... ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں؟ یہ سب ٹھیک ہے۔ نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں .... تلوکا بھی تو تھا، اس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی۔ جو منھ میں آتا، دھڑ سے کہہ ڈالتی۔ چاہے بعد میں مار ہی کھاتی۔ میں اسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی؟......... منگل، رانو

پر انگلی بھی نہ اٹھاتا تھا، سوائے رات کے، اس جگہ پر کھڑا بھی نہ ہوتا جہاں رانو کی پرچھائیں پڑتیں۔ پھر بھی؟..........اس کا کیا مطلب؟ــــــ چلو اچھا ہی ہے، مار تو نہیں پڑتی۔ ہڈیوں کو سینک تو نہیں کرنا پڑتا، لیکن..........بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد رانو سمجھ گئی وہ منگل کو کیوں نہیں کچھ کہہ سکتی؟ دوسری عورتیں جو اناپ شناپ منہ میں آئے، بک دیتی ہیں۔ دن چھلاّ، رات زیور کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں اور اُسے، لا کے دینا پڑتا ہے..........

آج دن کچھ اندر باہر تھا جب منگل قصبے سے لوٹا۔ سورج کی روشنی ابھی آسمان پر ہونے سے اشٹم کا بے نور چاند سفید سی پتنگ کی طرح ایک کیکر میں الجھا ہوا تھا۔ اور اب اکّے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا ساہنسیوں کی ٹھٹی کے اوپر، آسمان کے کھلے میدان میں جا کر ساکت ہو گیا۔ جہاں منگل اپنا اکّا رکھ دیا کرتا تھا اور ٹکی کو تھوڑا چارہ وارہ ڈال کر گھر چلا آتا ــــــ پھر لوٹ آنے، اسے کھریرا کرنے اور دانہ ڈالنے کے لیے..........باقی کا کام اگلی سویر پر ملتوی..........

اکّا اور ٹکی کا بندوبست کرنے کے بعد منگل لوٹا۔ جہاں وہ اِکّا کھڑا کرتا تھا، وہاں سے دائیں طرف فارم کی پندرہ پندرہ فٹ اونچی اکھ کھڑی تھی، جس کے بیچ میں سے چیونٹی بھی نہ گزر سکتی تھی۔ البتہ جھینگر، دن بھر، اپنی ہی دُم میں سے لیس نکال کر تار سا بناتے اور جھولتے جھلاتے، ایک سے دوسرے گنّے تک پہنچ جاتے اور پھر اس کے رس میں ڈوب کر اگلے گنّے کے پاس......

بائیں طرف مکان شروع ہوتے تھے، جن میں سب سے ادھر مدرسہ تھا اور اس کے ساتھ والا مکان جہلم اراعین کا جس کے اُدھر جا کر اب چاند تھم گیا تھاــــــ

فضا میں سے ایک قسم کی خوشبو آرہی تھی۔ منگل جانتا تھا وہ خوشبو کیسی ہے؟......بات یہ تھی گاؤں کے کسان ہر سال اسی مہینے رس نکالتے، گُڑ بناتے اور اکھ کے بیچ میں تھوڑی سی جگہ خالی کر کے، زمین کھود کے، گُڑ سے بھرا ہوا مٹکا اس میں رکھ دیتے اور کیکر کی چھال اس میں ڈال کر اوپر گوبر اور گھوڑے کی لید ڈال دیتے۔ ....کچھ دن میں مٹکا چلنے "بولنے" لگتا اور بُو بُو کرتی ہوئی شراب مٹکوں سے باہر چلی آتی، ہوا میں بس جاتی..........فضا مکدّر ہو اٹھتی اور معطر بھی..........

اب بھادوں اسوج میں ڈھل رہا تھا جب کہ گرم ہوا اور لُو کے عادی جسم سرد ہوا کا ایک بھی جھونکا برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک عجیب طرح کی اُلجھن اور کاہش انسان کے دل کے اندر پیدا

ہونے لگتی ہے، نہ آدمی چادر اوڑھ سکتا ہے، نہ چھوڑ سکتا ہے ....عورتیں کسی خیالی کپکپی سے اثر پذیر ہو کر سب گودڑ اور روئی اندر سے نکال لاتی ہیں اور پھر دھنیے کو بُلوا اُس سے دھنوا، نئے لحافوں میں بھرتی، اُن پہ کالے سوت کے ''نگندے'' ڈالتی، لمبی تان کے سو جاتی ہیں ——— سردیوں کے لیے تیار۔ اب ان کے لیے چاہے کُہر پڑے یا برف۔ لیکن مردوں کو ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایک اذیت ہوتی ہے۔ اُن کے جسم ایک دم سیاہ اور سُرخ ہو اُٹھتے ہیں اور مسام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر مقابل کے مساموں سے انگنت بار جفت ہونے کے لیے چل نکلتے ہیں.........مرد کا پورا جسم ایک پھنیئر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا ہے..........

منگل گھر کی طرف قدم اُٹھانے ہی والا تھا کہ بائیں طرف چھت پر سے آواز آئی——''منگلا وے۔''

منگل نے اوپر دیکھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اشٹم کا چاند آ کر اتر گیا تھا..........سلامتے کھڑی تھی اور اس کے دھندلے سے نقش دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے نقش جو اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پورے نظر نہیں آتے۔ سلامتے نے کہا—— ''ٹھہر وے، مجھے تجھ سے کام ہے''

منگل—— جامد و ساکت رہ گیا۔ اس کے بدن میں اس وقت ایک ہی چیز حرکت کر رہی تھی—— اس کا دل، جس نے تمام تر سکوت کی کسر نکال دی..............سلامتی ادھر سے آ رہی تھی جس طرف لکڑی کی سیڑھی جہلم کے گھر میں اترنے کی بجائے، باہر اترتی تھی۔ جس پر آزادانہ اتر چڑھ کر عنایتی اور سلامتی اور جہلم لال لال مرچیں سوکھنے کے لیے ڈالا کرتیں..........جتنا آدمی پوری زندگی میں کرتا ہے، اتنا منگل نے سلامتی کے کوٹھے پر سے اپنے آپ تک پہنچنے میں سوچ ڈالا۔ سلامتی آ کر منگل سے کچھ دور پر کھڑی ہو گئی—— چپ چاپ!

منگل نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، سلامتیے۔''

''کچھ نہیں'' سلامتی بولی..........اس کی آواز میں شکایتیں تھیں، حکایتیں تھیں اور آنسو تھے۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ ''تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی لیکن دکھ تجھے نہیں بتاؤں گی——''

''بتا نا'' منگل نے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سلامتی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے وہ ڈر گئی تھی............

''پرے پرے''——سلامتی بولی۔

——ایک خوشبو اُڑ کر سلامتی کی طرف سے آئی۔ یہ خوشبو گاؤں کی خوشبوؤں میں سے نہ تھی۔ کیوں کہ ان خوشبوؤں سے منگل کے مشام پوری طرح سے واقف تھے۔ یہ شہر کی خوشبوؤں میں سے تھی جو محبت کو ایک قسم کی گوارا سی عفونت دے دیتی ہیں، بخلاف اس پسینے اور غلاظت کی بدبُو کے جو تندرست بدنوں کی ناتمام محبت اور اس کی تب و تاب میں صندل ہو جاتی ہے............منگل کے دل میں اواخر بھادوں کی ہواؤں سے جو شعلہ ایکا ایکی بھڑک اٹھا تھا، اس ''پرے پرے'' سے اور بھی لپک اٹھا۔ سلامتی کے رکھ رکھاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بولا۔

''تُو مجھ سے ڈرتی ہے؟''

''ہاں۔'' سلامتی بولی۔ ''یاد نہیں اُس دِن——؟............''

''یاد ہے'' منگل بولا۔ ''پر سب دن ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ سلامتیے؟''

اور وہ آگے بڑھ گیا۔ سلامتی پیچھے ہٹتی، ''نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔'' کہتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ اس نے سوچ رکھا تھا۔ منگل کے ہاتھ پکڑتے ہی شور مچا دے گی اور اسے پکڑوا کر اپنی بے عزّتی کا بدلا لے گی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا——اگر یہ ریچھ کا بچہ، اس ایک جست کے فاصلے کو، جو اس کے اور منگل کے بیچ رہ گیا تھا، پار کر کے اسے پکڑ لے اور اس کا منہ بند کر لے یا منہ کو بالوں سے بھرپور چھاتی میں بھینچ لے تو وہ کیا کرے گی؟ اس کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جائے گی............اور وہ ریچھ، آہستہ مگر یقیناً اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سلامتی کی آواز گلے میں اٹک گئی............وہ کانپ رہی تھی اور نہ جانتی تھی منگل پر بھی کوئی لرزہ چھا رہا ہے............صرف ایک قدم............اور سلامتی کے لیے اب سب کچھ ناممکن العمل ہو گیا تھا، دونوں برابر، آمنے سامنے ایک دوسرے کی آنکھوں کو تلاش کر رہے تھے، دو بلّوں کی طرح اندھیرے میں گھور رہے تھے............ایسے میں صرف عورت کا دماغ کام کرتا ہے، مرد کا نہیں۔ جیسے پھر مرد کا کرتا ہے، عورت کا نہیں۔ اس ایک قدم کے فاصلے کو منگل کی بجائے سلامتی نے پاٹ لیا——اور اُچک کر منگل سے چمٹ گئی۔ اس نے من جانے ئےانداز سے منگل کے

بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا جارحانہ عمل روک لیا۔اور منگل ایک بیٹھی سی آواز میں بولا ۔''بولو کیا کام تھا؟''

''کچھ نہیں۔'' سلامتی بولی۔''سوچا تھا ملے گا تو تجھ سے کہوں گی —— ''اڑیا[1] جتھے تیرے ہل وگدے،اوتھے لے چل چرکھا میرا۔'' اور پھر وہ ہنس دی۔

منگل نے پھر ہاتھ آگے بڑھائے ۔سلامتی بولی ۔''پاگل ہو گیا ہے............یہ بھی کوئی وقت ہے،جگہ ہے؟''

''نہیں،نہیں۔''

''نہیں۔''

''تو پھر —— کب؟..........کہاں..........؟''

سلامتی نے اکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہاں..........جب ادھر مندر میں گھنٹیاں بجیں اور مسجد میں ملّا اذان دے..........''

منگل نے پہلے اکھ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف، جہاں اتر پچھم میں کچھ پھوئیں پھوئیں سے بادل جمع تھے ۔پھر سلامتی کی طرف وہ دیکھتے ہوئے بولا۔''ہاں، ٹھیک ہے..........کل ہزاری نے وہاں سے شراب کا مٹکا نکالا تھا۔'' اور اس نے اکھ کی طرف اشارہ کیا—— ''بس مٹکے دو مٹکے جتنی ہی جگہ ہے'' اور پھر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا مگر اس کے پھڑکتے ہوئے ہاتھوں کو یقین نہ آ رہا تھا،ان کے قابو میں کیا چیز آئی اور کیا نکل گئی ۔اس نے اپنے آپ میں ہمت کی بھی کمی پائی اور سوچا—— آج دو گھونٹ شراب تیزاب کے اندر ہوتے تو مزہ آ جاتا اور پھر،دن بھر اِٹے اور ڈھول کے بعد اُسے اپنا آپ کچھ گندہ بھی لگ رہا تھا۔ منہ سے ماں بہن کی گالیوں کی بُو آ رہی تھی ۔پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا ۔''اچھا سلامتیے ، بھولنا نہیں..........''

''میں نہیں،تو ہی بھول جائے گا ۔'' سلامتی منگل کی نگاہوں کا شک دُور کرتے ہوئے بولی۔

---

1 جہاں تیرے ہل چلتے ہیں، وہاں میرا بھی چرخا لے چل

''نہیں'' منگل نے کہا۔

ـــــ اور آدھے چاند کی رات میں منگل سلامتی کی نظروں کو دَلتا ہوا چلا گیا۔ بدن میں ایکا ایکی ایک تناؤ سا پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی چال ہی بدل گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سانپ لہرانا بند ہو گیا تھا اور پیچھے سے دیکھنے پہ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں، کوئی لٹھ جا رہا ہے۔

سلامتی وہیں کھڑی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اسے بھی بھادوں کے جھونکے لگے تھے اور اُس کا بدن ہوا میں پڑے سُلگتے ہوئے کوئلے کی طرح کبھی بھڑک اٹھتا اور کبھی بُجھ جاتا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے آدھی رات کے وقت جب منگل آئے گا تو سلامتی شور مچانے، اسے پکڑوانے، پٹوا دینے کے منصوبے کو عمل میں نہیں لائے گی .... گھر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا تہ بند کسا کہ سامنے سے عنایتی، سلامتے کی بڑی بہن آ گئی۔

''تو کہاں سے ـــــ آپاں؟'' سلامتی بولی؟

''خسر مادائی کے ہاں سے .... جوشاندہ لے کر آئی ہوں۔''

''جوشاندہ؟'' ـــــ وی کس لیے؟''

''مرنے کے لیے۔'' عنایتی نے بیزاری سے کہا۔

سلامتی کچھ نہ سمجھی۔ عنایتی نے کچھ شرماتے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ ''عورت ہونا بھی ایک ہی لعنت ہے.........''

''ہو ہائے!'' سلامتی نے کچھ بتا پاتے ہوئے کہا۔ ''روڑا پٹکی پڑا تو ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا ـــــ؟''

''اسی لیے تو ـــــ یہ مر رہی ہوں'' عنایتی نے کاڑھے کی بڑی سی پُڑیا کو ماتھے کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں مل کر گھر کی طرف چل دیں۔ سلامتی بولی۔ ''یہ سب کرنے سے پہلے تم نے مراد سے پوچھ لیا؟''

ـــــ مراد عنایتی کے میاں کا نام تھا۔

''آنہہ!'' عنایتی نے اپنی بانہہ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اس نامراد سے پوچھنے بیٹھتی تو ابھی

تک گیارہ ہوتے..........میرا پیٹ ہے کہ ملوک سنگھ کا آٹھواں..........؟"

سلامتی کو جھرجھری سی آئی ۔ وہ الھڑ کچھ نہ جانتی تھی لیکن کائنات میں ـــــ مادہ تھی جس کے رحم ہوتا ہے ـــــ وضع حمل اور تولید کے نام ہی سے جس کے اندر ایک نامحسوس سی کسمساہٹ دوڑ جاتی ہے ۔سلامتی نے کہیں دور کی بات سوچی ۔آخر یہ ہوتا ہے؟..........یہی ہوتا ہے تو پھر؟......جب تک عنایتی دروازے کے اندر پیر رکھنے جا رہی تھی، سامنے اُس نے مُراد، اپنے میاں کو اپنی سالی عائشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا اور الٹے پانو باہر آکر سلامتی سے بولی۔

"ایے! پھر ملا تجھے وہ بھاٹیہ لڑکا؟"

"کون؟" سلامتی نے کہا ـــــ حالاں کہ جانتی تھی عنایتی کہاں مار کر رہی ہے۔

"ارے وہی، اکّے والا..........منگلو؟"

سلامتی نے جب تک سوچ لیا ـــــ "نہیں" وہ بولی..........

اس کے بعد عنایتی اندر جا کر عنایتی عائشہ، روڑے، مراد وغیرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جہلم پھر ترکاری کے بدلے، صبح گوشت میں ڈالنے کے لیے چنے کی دال لینے گئی تھی۔ ...ابّے کا ہمیشہ کی طرح کچھ پتا نہ تھا۔ سلامتی ایک کھاٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس دن کا دہاڑنے والا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ شرم اور خجالت سے لال ہو اٹھی ـــ نہ جانے کیا ہوگا مجھے! ایسے بھی کوئی مانتا چلا جاتا ہے کسی کی بات؟ وہ کہتا ـــ اتار دے اور بھی کچھ، تو میں وہ بھی اتار دیتی......
پاگل! کیسے پھر گلی میں آکر کُرتا پہنا اور اپنے یہ دوزخی چھپائے......اللہ! کوئی دیکھ لیتا تو؟......

کچھ ہی دیر میں سلامتی، اُبلنے، کھولنے لگی ....بولا ـــــ ہو گئی سیر، چلی جا اب......اور مجھے جانا پڑا۔ اتنی بے عزّتی نہ ہوئی ہوگی کسی ماں کی بیٹی کی ۔ پر، جس چیز کو آپاں بے عزّتی کہتی ہیں، میں اسے بے عزّتی نہیں کہتی ....پھر وہ اٹھی اور ہانڈی لے کر سب کو کھلانے پلانے کے بہانے عنایتی کے پاس چلی گئی اور جب سب جنے تھوڑے اِدھر اُدھر ہوئے تو اس نے عنایتی کو منگل سے اپنی ملاقات کا واقعہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ملنے آئے گا ـــــ مدرسے کے باہر، اکیلے میں..........

تھوڑی ہی دیر بعد مراد، گانو کے دو چار بدمعاشوں کو لے آیا، اپنی غریبی، اپنے افلاس کے

باوجود وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ایک کافر کسی مسلمان لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے......سب
نے مل کر جلدی جلدی لاٹھیاں، چھویاں اور گنڈاسے جمع کر لیے......اور پھر بیٹھ کر، برسوں پہلے کے
جاترن اور تلوکے کے قتل کی باتیں کرنے لگے......

8

منگل نہا دھو چکا تھا اور اب اپنی داڑھی کو کچی گھانی کا تیل لگا رہا تھا۔ صبح جب خیرے نے کُپڑے میں سرسوں ڈالی تو پہلی چند بوندیں بوتل میں منگل نے لے لی تھیں............ نصیبوں والے اڈّے سے لوٹ کر، سلامتی سے ملنے کے بعد، منگل چموں سے کھیلا بھی، بڑی کی چوٹی بھی کھینچی اور ماں جنداں سے بڑی کے لیے ''بابو'' دیکھنے کی باتیں بھی کیں ـــــ اور پھر گھر چہک اٹھا............

آج رانو اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی شادی کو ابھی دو چار سال ہی ہوئے ہیں اور وہ بچے اس کی بڑی سوت کے ہیں۔ یا وہ بڑا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کے قتل ہو جانے پر، اس نے اس کی بیوی پر چادر ڈال لی ہے ـــــ نہیں نہیں، یہ تو نہیں ہوتا۔ چادر چھوٹا بھائی ہی ڈالتا ہے۔ بڑے بھائی کے لیے تو چھوٹے کی بیوی بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے ـــــ

چوں کہ منگل خود، معمول کے خلاف، آج شام کو نہا دھو کر صاف ستھرا ہوا تھا اس لیے رانو اُسے غلط سمجھ گئی تھی............ وہ سمجھی یہ سب میرے لیے ہے، آج کا دن میرا تھا، رات بھی میری ہے............ رانو کو دیکھ کر منگل سمجھا، یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے۔ لیکن نہیں............ آج رانو اپنی ہی آنکھوں، اپنے ہی دل، اپنے ہی گالوں ـــــ ہونٹوں، کولھوں، رانوں کا قصور تھی۔ آج صبح جب وہ ''نہا کر جوہڑ میں سے نکلی تو سُلفے کی لاٹ معلوم ہو رہی تھی؛'' پھر اس نے گھر پہنچ کر دن میں کئی بار ابٹنا مل کر جلد کو اتنی نرم اور چکنا بنا لیا تھا کہ اس پر سے نگاہیں اور جذبے پھسل پھسل جاتے تھے اور پھر وہیں پڑے مچل مچل جاتے اور اس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر نہ اٹھائے............ پھر اس نے بندی لگا رکھی تھی۔ کوئی غور سے دیکھتا تو پتا چلتا، آج وہ صرف

بندی نہ تھی ـــــــ وہ صبح کا سورج تھی جو گہرائیں رخ ہوتا ہے اور تیز تیز اپنے محور کے گرد گھومتا جاتا ہے، پھر ایکا ایکی جیسے کرنوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر کسی نے چھپلا دیا.......... اخروٹ کی چھال کا رنگ ہونٹوں پر چلا آیا اور اب تک کے سوکھے ہوئے چھوہاروں کی بجائے وہ رس بھریوں کے ڈھیر معلوم ہونے لگے..... منگل نے ایک بار پھر ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ـــــــ

''تُو آج باجار گئی تھی؟''

رانو نے ایک اچٹتی ہوئی نظر منگل پہ ڈالی اور پھر اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر نگاہیں چُرا لیں اور دلہنوں کی سی دھیمی آواز میں بولی ـــــــ ''ہاں'' اور پھر کام کاج کے بہانے، اپنا آپ اِدھر اُدھر چھپانے، وقت بتانے لگی ـــــــ

رانو کیا چھپا رہی تھی؟ یہ بات نہیں کہ وہ گھڑ سیانیوں کی طرح اپنا سارا کچھ ایک ہی دم نہ دے دینا چاہتی تھی بلکہ کوئی بات تھی جو اپنے، بندی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریوں سے اوپر ہوتی ہے، جس کا تعلق عورت کی شکل وصورت سے نہیں ہوتا، نہ اس کی نسائیت اور اس کی انتہا سے ـــــــ جسے وہ دھیرے دھیرے سامنے لاتی ہے اور جب لاتی ہے، تب پتا چلتا ہے ـــــــ یہ بات تھی! جیسے اشٹم کا چاند اپنا آدھا چھپائے رہتا ہے اور آہستہ آہستہ، روز بروز، ایک ایک پردے ـــــــ دوپٹے، چولی، انگیا، سب کو الگ ڈالتا جاتا ہے اور آخر ایک دن، ایک رات، پورنیما کے روپ میں آ کر کیسی بے خودی و مجبوری، کیسی ناداری اور لاچاری کے ساتھ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے.......... کیا علم النساء، علم النجوم سے دور کی بات ہے؟ کوئی بھی علم دوسرے علم سے فاصلہ رکھتا ہے؟.......... جن لوگوں نے برسوں اور عادتاً آسمانوں پہ جھانکا، ستاروں کو دیکھا ہو، ان کی جھِل مِل کے ساتھ مرے، ہل ہل کے ساتھ جیے ہوں، اماوس کے ساتھ مرجھائے، پونم کے ساتھ کھلے ہوں، وہی رجنی کی آنکھوں میں، پلکوں کے نیچے، زمینوں سے بڑی، آسمانوں سے بڑی، برق ومقناطیس کی وسعتوں میں جو راس رچائی جاتی ہے، جو بھنگڑے اور جھمّر اور لڈّی ناچے جاتے ہیں، ان کے راز سمجھتے ہیں ـــــــ وہی اشٹم کے چاند کا بھید بھی جانتے ہیں..........

منگل، اِتنے والا، پھر سلامت میں بے سلامت ہو کر اس گھر کی اشٹم کا بھید کیسے سمجھتا؟ اس نے کبھی آسمانوں پہ جھانکا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا، وہ خود ایک ستارہ ہے ـــــــ

سورج، جو کبھی کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جو دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا ہے اس کے طلوع و غروب، اس کے توازن و اعتدال شب و روز آپس میں سر ٹکراتے، مر جاتے، سلف کا حصّہ ہو جاتے ہیں .... بنات النعش اس کی طرف دیکھتی ہوئی معدوم، چاند ـــــ بے نور، کاغذی ہو کر گھٹتا گھٹتا گھٹ جاتا ہے اور آخر عدم کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور وہ ـــــ سورج ـــــ بے خبر... ....

لیکن آج ـــــ اس بے خبرے منگل کو رانو کچھ خبریں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس گھونگھٹ کو اٹھا دینا چاہتی تھی جو منگل اور اس کے بیچ حائل ہو رہا تھا۔

گھنڈا نھیاں کرے سوجا کھیاں نُوں گھنڈ لاہ مُنھ اُتوں لاڑیے نی
وارث شاہ نہ دبیّے مرتیاں نُوں پھُل اگ دے وچ نہ ساڑیے نی

ـــــ گھونگھٹ دیکھنے والوں کو اندھا کر دیتا ہے۔ اے دلہن! اسے مکھڑے پر سے ہٹا دے۔ وارث شاہ! موتیوں کو دفنا کر نہیں رکھتے، نہ پھولوں کو آگ میں جلاتے ہیں.......... اور آج رانو نے اس پردے اور حجاب کو دور کر دینے کی ٹھان رکھی تھی، جسے بیچ سے ہٹائے بغیر خدا بھی نہیں ملتا۔

اُدھر منگل آج جیسے کوئی رشوت دینا چاہتا تھا۔ اس نے کُرتے کی جیب سے رانو کے لیے بالوں کی کچھ سوئیاں نکالیں۔ لوٹتے ہوئے جنھیں وہ قصبے سے لے آیا تھا۔ انھیں ہاتھ میں لیتے ہی رانی چونک اُٹھی۔ اس کے منھ سے ایک بے خودی کے عالم میں ہانکلی ـــــ عورت میں لذت کی انتہا، لیکن منگل کہیں دور دیکھ رہا تھا.......... پھر لوٹ کر اس نے پیسے نکالے اور رانو کے ہاتھ میں تھما دیے.......... رانو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، لیکن اُس نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا ـــــ

"یہ آٹھ روپے ـــــ کہاں سے آ گئے؟"

"آج پسرور کی سواری لگی تھی۔"

"تو ـــــ؟"

"تو کیا؟......... کھاؤ، خرچو۔" اور پھر پہلی بار، اپنی بیاہتا زندگی میں پہلی بار، اس نے معنی خیز نگاہوں سے رانو کے سنگھار کی طرف دیکھا اور بولا۔ "خرچ بھی تو بڑھ گیا ہے!"

اور رانی پہلی بار، اپنی نئی بیاہتا زندگی میں پہلی بار ایک بیوی کی طرح شرمائی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا اُبٹنا، اس کی مہندی، آخروٹ کی چھال، اور رس بھریاں ننگی ہو گئیں۔ اس نے سمٹنے کے پردے سے اپنا سب کچھ ایک بار ڈھک لیا۔ وہ منگل کے قریب ہونے میں کتنی دور اور دور ہونے میں کتنی قریب ہو جاتی تھی۔ پھر اس نے بھی سوچا—— ابھی نہیں۔ ابھی تو مندر میں گھنٹیاں بھی نہیں بجیں، مسجد میں مُلّا نے اذان نہیں دی............

منگل نے کہا—— ''کھانا نکال دے جھٹ سے۔''

''ابھی نہیں۔''

''کیوں؟—— ابھی کیا ہے؟''

رانو کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ لیکن منگل نے خود ہی ایک انجانے پن میں اسے اُس دُبدا سے نکال لیا—— ''کیا کوئی بہت اچھی چیز پکی ہے؟''

''ہاں'' رانو نے کہا۔ اور پھر کھٹے سے اس کے دوپٹے میں کوئی توتا بولنے لگا۔ ''چنے کی دال پکائی ہے۔ ساتھ پودینے کی چٹنی۔ کراری، مسالوں والی——''

کتنی بھول ہوئی! منگل کو وہ سب یاد آ گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے، اور بال جیسے اپنے آپ پگڑی سے باہر آ گئے۔ اگر بالوں میں نہیں تو خیالوں میں ضرور اس دن والی من چھٹیاں۔ آک کی بڈھی مائیاں اڑی ہوئی تھیں، وہ ایک دم خفا ہو کر بولا۔ ''دو، جو بھی پکا ہے نہیں میں جاتا ہوں، ضروری کام ہے۔''

رانو سنبھلتے سنبھلتے پھر گر سی گئی۔ اس نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ اور ہی پکایا تھا............ شاید کوئی ایسی ویسی بات نہ بھی ہو............ اچھا ہی ہے، جب لوٹے گا بچے سو چکے ہوں گے۔ سُسر کی کھوں کھوں، کھانہہ کھانہہ، ساس کے شروع رات خراٹے بند ہو چکے ہوں گے۔ ایسی خاموشی ہو گی کہ سانس بھی روکنے پڑیں گے، ایکا ایکی منگل نے کہا۔

''میری وہ کُرتی کہاں ہے؟''

رانو سمجھ گئی............ سنسنا گئی۔

''کہاں جا رہا ہے؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا۔ ''دیکھتے نہیں، بادل

گھرے ہیں ــــــ؟''

''ہوں گے۔'' منگل نے کہا۔ ''تو کون ہے روکنے والی؟''

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی۔ بولی۔ ''نہیں، میں تو کوئی نہیں.......... ایسے ہی پوچھا تھا ـــــ''

اگر رانی اُڑ جاتی.......... جیسے تلوکے کے ساتھ اُڑ جاتی تھی اور کہتی ــــــ ''میں نہ روکوں گی تو اور کون روکے گا؟'' تو منگل الف ہو جاتا۔ لیکن وہ اپنی، پھٹی ہوئی، میلی، بوسیدہ سی چادر کے رشتے کو سمجھتی تھی۔ منگل رانی کے اس مریل سے جواب سے کچھ ڈھیلا ہو گیا اور بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا۔ ''جا رہا ہوں رنڈی کے ہاں ــــــ''

یہ فقرہ شوہر عموماً اس وقت کہتے ہیں جب وہ واقعی رنڈی کے ہاں جا رہے ہوں اور بیویاں سمجھتی ہیں ان کا میاں کسی غلط جگہ پر نہیں جا رہا۔ ورنہ وہ ایسے کہتا؟ لیکن رانو کو حالات میں ہر لحظہ پیدا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دے دی تھی جو اس کی دوسری بہنوں کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ایکا ایکی وہ دیوی سے ایک عام، گوشت پوست کی عورت بن گئی۔ ایک دم چالاک اور عیار.......... حرافہ! ــــــ کیا کرتی؟ ــــــ وہ مجبور تھی اور بےبس۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، ان کے ساتھ بدلتا ہے، ورنہ پرماتما نے اسے اتنا بڑا انسوں کا جال نہ دیا ہوتا ــــــ

کُرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بھی نتھنے پھولنے لگے جو منگل کو رانی کے دُوپٹے میں دکھائی نہ دیے۔ ایک بیوی مقابلے کے لیے، اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے، ایک بیسوا کی سطح پر اُتر آئی تھی۔ اپنی نگاہوں کے افق پہ اُسے سلامتی کا بدن لہراتا ہوا نظر آیا، جس کے بدن کے کسے کسائے اور متناسب اعضاء میں متقابل کے لیے قدرتی جگہیں بنی تھیں۔ جس کے جسم کی تازگی اور شادابی کو اُبٹنے اور بندی اور اخروٹ کی ضرورت نہ تھی.......... جو سب چیزیں منگل سے استھول، پتھر آدمی کے لیے بےکار تھیں۔ جو خود چٹان تھا، چٹانوں سے بھڑنا چاہتا تھا، خود لوہا تھا، لوہے سے ٹکرانا چاہتا تھا.......... اور رانو جانتی تھی اور اس کے لیے تیار تھی .... اس نے ایک آڑی نظر سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا

اور بولی——

''وہاں پڑی ہے تیری کُرتی۔''

جب ہی باہر سے وڈّیا کی آواز آئی——''رانو''

رانو ایک دم باہر لپکی اور اس سے پہلے کہ وڈّیا کچھ کہتی——رانو نے اُسے باہر ڈھکیلتے ہوئے کہا——''چلی جا——وڈِو.........اس وقت چلی جا۔''

وڈّیا نے بے کار سی ضد کرتے ہوئے کہا——''کیوں نی——؟''

رانو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔''پرماتما کے لیے...... بڑے بڑوتوں کے لیے......''

اور روڈّیا حیرانی سے پیچھے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

رانو اندر آئی تو منگل ٹرنک کھول چکا تھا۔اس نے کچھ کپڑے اِدھر اُدھر بکھیر رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں مٹھے مالٹے کی بوتل تھی اور آنکھوں میں چمک——

''یہ کہاں سے آئی؟''اس نے رانو سے پوچھا۔

''یہ کیا؟''

یہ''——''منگل نے بوتل کو ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا۔''مجھے کیا معلوم؟''اور اسے بہت کچھ اپنا آپ چھپانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ڈبّو رونے لگا تھا،.........رانو نے آدھی اندر آدھی باہر جا کر بانہہ الارنی شروع کردی تھی——''ہات،ہات موئے!.........یہاں کیا دھرا ہے،تیرے رونے کو.........؟روان کے ہاں جا کر،جن کے ہاں ترکاری ملتی ہے،گوس ملتا ہے.........''اور پھر مُڑ کر بولی''تیرا بھائی پیا کرتا تھا نا——''

''ہاں مگر''منگل نے حیرانی سے کہا۔''اتنے برسوں سے.........؟''

''پڑی رہی ہوگی——میں نے تو جب سے اس ٹرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

منگل بوتل گھما گھما کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آرہا ہو——بالکل وہی شراب تیزاب جس کی اس شام اسے طلب تھی۔جس سے اس نے چاہا تھا کہ اس کی ہمّت بڑھے،چیتے کی سی لپک آجائے،دس گھوڑوں کی سی طاقت.........اسے بھی اپنے ذہنی افق پر ایک تروتازہ،تندرست اور توانا لڑکی دکھائی دی،اس نے تھوڑا اندر باہر ہو کر اوپر،آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب بادل گھر

آئے تھے اور چاند کو اپنے لحاف و توشک میں چھپا لیا تھا............

ضرور کہیں گرمی پڑی ہوگی، بخارات اٹھے ہوں گے جو اس مہینے، بھادوں کے آخر میں کوٹلے کے اوپر چھا گئے ــــ شاید کہیں رات اور دن برابر ہونے والے تھے .... بادلوں کے بیچ میں سے اپنا گریبان پھاڑ کر دیکھتے ہوئے ستاروں سے اس بات کی تسلی کر کے کہ ابھی پہلا ہی پہر شروع ہے، منگل لوٹ آیا۔ لیکن لوٹنے کے بعد وہ پہلا سا منگل نہ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی کرختگی اس کی نگاہوں میں چلی آئی تھی۔

''میں کبھی کبھی ــــ وہاں نصیبوں والے اڈّے پر لگا لیتا ہوں۔'' وہ انگوٹھا اور مٹھی منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

''میں جانتی ہوں۔'' رانو نے کہا۔

منگل نے پروانہ کی، نہ کسی استعجاب کا مظاہرہ............ پھر اس نے بوتل کی طرف دیکھا۔ حرص و آز نے بہت کچھ اسے دیکھنے نہ دیا۔ مثلاً رانو کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والا سیل، ساتھ ہی اس کا تیز ہوتا ہوا تنفس۔

''تیرے سامنے تو نہ پیوں گا'' وہ اپنی ہی رٹ لگاتے ہوئے بولا۔

رانو چونکی ہوگی ــــ ''کیوں؟''

''تو بُرا مانتی ہے نا؟''

رانو کہنے جا رہی تھی ــــ نہیں، میں کیوں بُرا مانوں گی؟ میرا حق ہی کیا ہے؟ لیکن اندر سے کسی آواز نے اسے روک دیا۔ اس کی نگاہیں پھر ایک حرافہ کی نگاہیں ہو گئیں اور وہ بولی۔

''ہاں، تو جانتا ہی ہے، مجھے زہر لگتی ہے۔''

پھر، جیسا کہ رانو کا اندازہ تھا، جیسا کہ وہ منگل کو جانتی تھی، جیسا کہ وہ چاہتی تھی ــــ منگل ایک دم بھنّا اُٹھا۔ ایک دم بوتل کے گلے میں مٹھی گھماتے ہوئے اس نے کاگ کو ڈھیلا کر دیا پہلے چوروں پھر ڈاکوؤں کے انداز میں بولا۔ ''یہی ہے نا تم عورتوں کی بات .... کھانے پینے سے بھی روکتی ہو اپنے مردوں کو۔'' اور جھینپ گیا۔

رانو خوش ہوئی۔ زبانی ہی سہی مگر ''عورت'' اور ''مرد'' کا رشتہ تو قائم ہوا۔ اوپر سے خفگی کا

اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''خبردار! میں نہ پینے دوں گی۔''

بالکل جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے کاگ نکال کر باہر پھینک دیا۔ بُو سی نکلی اور سارے کمرے میں پھیل گئی۔ رانو نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ ناک کے سامنے کرلیا اور دوسرا ہاتھ منگل کے ہاتھ اور بوتل کے منہ پر رکھ دیا۔ منگل نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا— ''میں پیوؤں گا— ضرور پیوؤں گا۔''

''تو نے تو اپنے بھائی کو ہٹکایا تھا——بوتل توڑی تھی، مجھے چھڑایا تھا۔''

''وہ ——وہ تو تجھ پر ترس کھایا تھا۔''

پھر——جیسا کہ رانو نے سوچا تھا، منگل نے اس کے ہاتھ جھٹکنے شروع کر دیے۔ بیچ میں بڑی آ گئی۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب پا کر ٹھٹھک گئی.......... جب ہی باہر سے بادل کی گرج سنائی دی۔ ''جا ٹو'' رانو اسے دیکھ کر بولی۔ ''کھانا کھلا دے، سلا دے سب کو —اندر، پانی پڑنے والا ہے۔'' بڑی نے باہر جاتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ آج وہ صبح ہی سے ماں کے تیور دیکھ رہی تھی اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی۔

رانو پھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اسے ڈھکیلنے لگا۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ، رانو کے بدن کے ہر حصے کو لگ رہے تھے۔ بیچ میں اس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی، لیکن چادر کا بیع نامہ تھا جو رانو کا بدن توڑ رہا تھا، مروڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک دم بوتل سے منہ لگا کر پیتے ہوئے، ہانپتے کانپتے کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں جو ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔''

منگل نے اس چھینا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی۔ رانی کچھ اور لپکی۔ منگل نے اب کے اسے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اسے زدوکوب کرنے لگا——بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا..........وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور منگل اسے نیچے دبانے کی۔ بیچ میں ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کر وہ پھر پی گیا.......... ہولے، ہولے اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔ خون کانوں اور سر کی طرف آنے لگا۔ رانو کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے اعضاء میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہو گئی جسے زیر کرنا مشکل ہو گیا——ناممکن..........اب کے جو رانی اٹھی تو

منگل نے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا............

خون کا ایک فوارہ رانو کے سر سے چھوٹا اور اس کی ٹانگیں اسے سنبھالنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ زمین پر پڑی تھی ــــ آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا............رانو کی خاموش بغاوت کے باوجود آواز اندر جنداں تک پہنچ گئی اور وہ بولی۔

"کیا ہے، بہو؟"

ایک عجیب قسم کی لذّت سے بے ہوش ہوتے ہوئے رانو نے جواب دیا۔" کچھ نہیں، تائی، بلّی ہے!............اور پھر اس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی۔ بدن کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے ۔ جہاں ہاتھ پڑا تھا ہاتھ، ٹانگ پڑی تھی ٹانگ اور جہاں کپڑا پڑا تھا، کپڑا ــــ نیچے شراب گری تھی یا پانی ــــ رانی کی شلوار تر بتر ہو رہی تھی۔ اب تک جو کچھ ہوا اس سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ دونوں میں سے کس نے پی ہے؟ نشہ کسے آیا ہے؟............کس کا اترا ہے؟............

منگل رانو کے پاس حیران کھڑا تھا ــ عجیب عورت ہے! اتنی مار پڑی اس پر بھی کہہ دیا ــ بلّی ہے!............وہ شرمسار تھا اور شکر گزار بھی۔

پگڑی پھاڑ کر اس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دیے اور پھر کپڑے کو مٹھی میں رکھ کر اس پو سانس کی دھونکنی چلانے لگا۔ رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی، لگانے لگا۔ ویسے ہی، جیسے اس رات رانی نے کیا تھا............رانی کو آرام آ رہا تھا۔ حظ آ رہا تھا اور منگل کو رونا، اور اس رونے میں کفارے کی تسکین، روتے روتے اس نے رانی کے پانو پکڑ لیے۔ اب وہ اسے اوپر کھینچ رہی تھی، اس کا بدن سہلا رہی تھی ــــ جیسے مار اسے نہیں، منگل کو پڑی ہے ــــ

"معاف کر دے، مجھے معاف کر دے۔" منگل رٹ لگائے جا رہا تھا۔

"وعدہ کر، پھر نہ پیے گا۔" رانو نے اس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم کسی خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے، پیش قدمی کرتے ہوئے بولی۔ "وعدہ کرے گا تو میں ــ میں آج تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" منگل نے کہا اور پھر سوچنے لگا، اس نے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟ ــــ! رانو آہستہ سے اٹھی اور باہر چلی گئی۔ منگل باہر بیٹھا برتنوں پر بارش کی جلترنگ سُن رہا

تھا۔ بڑی نے سب کو کھلا پلا دیا تھا اور کہیں دور، اندر سُلا دیا تھا——جیسے، ہمیشہ کے لیے............
جیسے انسان اور قدرت کے درمیان اس عظیم سازش میں وہ بھی شریک ہوگئی تھی——رانو نے تنور کو
برسات سے بچانے کے لیے اس پر ایک بڑا ساداہبڑا رکھ دیا اور پھر کھانا لے کر اندر چل دی۔
رانو لوٹی۔تھالی میں ایک طرف روٹی پڑی تھی اور دوسری طرف کچھ پیاز اور——
چانپیں! منگل نے حیران ہوکر چانپوں کی طرف دیکھا اور پھر رانی کی طرف اور اس کے منہ میں
پانی آنے لگا۔رانو نے گلاس میں ایک دم بہت سی شراب اُنڈیل دی اور منگل کے ہاتھوں میں
تھما دی۔منگل کو جیسے یقین نہ آرہا تھا۔کھانے سے نظریں ہٹا کر اس نے رانی کی طرف دیکھا جس
کی نگاہیں پیالے بنی ہوئی تھیں۔پھر وہ انکار نہ کرسکا۔گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔
''آج کے بعد پیوں تو سمجھو—— گائے کھاؤں۔''
اس نے گلاس منہ کی طرف اٹھایا تو رانو نے روک دیا۔''ٹھہرو............جیسے اسے کوئی
بات یاد آگئی۔وہ باہر گئی اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چینی کی رکابی تھی۔اور
اس میں دل کی شکل کا ایک ٹماٹر............جو آٹھ حصّوں میں کٹا پڑا تھا!
منگل پینے اور کھانے لگا۔رانو رو رہی تھی............ایسا مزہ منگل کو نصیبوں والے اڈّے پہ
کہاں آیا تھا؟ روتے کانپتے ہوئے رانو نے اور انڈیلی——اور............اور............اور شراب
رانی کو چڑھ گئی——رانی کو! چھپنے کے بجائے وہ کھلنے لگی۔پہلے جالی کا دوپٹہ جیسے اتفاق سے گر
گیا۔ پھر کرتے کے تکمے کھل گئے۔جب ہی مندر کے گھنٹے سنائی دیے، پھر مسجد سے اذان——
''ہات!''منگل نے گھنٹے اور اذان سنتے ہوئے کہا............
''ہات کیا؟''رانو پوچھنے لگی۔
''یہ۔''منگل نے اپنا غیر یقینی ہاتھ جہلم ارائین کے گھر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔''یہ
مُلّا اور پنڈت——''
اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی، دروازے تک گیا لیکن باہر گھپ اندھیرا دیکھ کر، لڑکھڑاتا
ہوا اپنی جگہ پہ آرہا۔پھر ایکا ایکی اپنی آنکھوں پہ پورا زور ڈالتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا——
رانی کھڑی تھی۔پونم کا چاند!............جو بے صبر ہوکر آدھے سے پورا ہوگیا تھا، اور بادلوں کے

لحاف وتوشک کو چیرتے ، پھاڑتے ہوئے ، نیچے زمین پر اتر آیا تھا۔

منگل اُٹھ کھڑا ہوا اور سانس روک کر نیچے دیکھنے لگا۔ بہ مشکل تمام بولا۔

''تم............تم نے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟''

رانو نے اپنا پھٹا پرانا جالی کا دوپٹہ اٹھایا اور اسے اپنے اور منگل کے بیچ تانتے ہوئے بولی۔ ''لو ، اتار دیے۔'' اور دوپٹے کو دو اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھامے ، رانو پہلو کی طرف مُڑی............عورت کا حُسن ثلاثہ منگل کے سامنے تھا، جس سے گیہوں کی روٹی کھانے والا کوئی بھی مرد انکار نہیں کر سکا ....اور بیچ میں لطیف سا پردہ ....پھر، اس حُسن پر ایک انگڑائی ، ٹوٹی............سال کے دن ہفتے ، ہفتے کے سات دن ، دن کے آٹھ پہروں ، گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پانو تک گہنا دیتا ہے۔

منگل کے چہرے پر سُرخیاں اور سیاہیاں دوڑ گئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کے مسام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں چل دیے............کبھی بارش کے ڈر سے چھپتے ، کبھی اس کے لیے باہر آتے۔ ساون اور بھادوں میں تو بارش ہمیشہ ہوتی ہے۔ جہاں تہاں بھی ہوتی ہے لیکن بڑوں کا کہنا ہے کہ جب بھادوں اور سوج کے بیچ دن اور رات ملتے ہیں ، برابر ہوتے ہیں تو دیوی کے کوٹلے پر ضرور چھینٹے پڑتے ہیں............منگل نے ایک اندھے کی طرح لپک کر ، اندازے ہی سے رانو کو کلاوے میں لے لیا۔ پھر ایک ہی لمحے میں وہ جسم کے تپتے ہوئے زعفران زاروں پہ تھے............اس سے پہلے کہ ان کے سانس تیز ہوتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ، جہاں سے وہ پھر لوٹ کر واپس نہیں آتے ، منگل رانو سے کہہ رہا تھا۔

''آج تم............کتنی کھوب شورت لگ رہی ہو——بھابی!''

9

گھر کے دروازے میں کھڑی، آسمان سے مسلسل بارش پڑتے دیکھ کر سلامتی جھلا رہی تھی۔ اپنے ناکوں پہ ہلکے ہلکے تھپیڑے لگا رہی تھی۔ پھر وہی ہاتھ اس نے کولھوں سے نیچے تھپکنے شروع کر دیے اور سی سی کرنے لگی، جیسے، غلطی سے اُس نے ایک ساتھ بہت سی مرچیں کھا لی ہوں............ گھنٹے اور اذان کی آخری گونج اس کے کانوں سے معدوم ہو رہی تھی اور وہ ملاؤں اور پنڈتوں کو کوسنے دے رہی تھی، جنھوں نے انسانی جسم بنایا تو نہ تھا، البتہ اس سے انکار، اسے گالی دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے............

رات کے دوسرے پہر کا آخر تھا اور بارش تھی کہ ہٹ ہٹ کے پڑ رہی تھی۔ مدرسے کے برآمدے میں، ایکھ کے برابر کھڑے مراد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بکواس ہے یار، یہ عورت بھی۔"

خلیفے نے اتفاق کیا اور اللہ داد اور حکومت نے بھی۔ اور سب اپنے اپنے لٹھ اور ٹوکے اور چھویاں اور گنڈاسے لے کر، بارش میں بدن کی چربی تک بھیگتے ہوئے، اپنے اپنے گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دیے۔ "بچ گیا سکھروا۔"

مراد کو نامراد لوٹتے دیکھ کر دُور، اندر، چارپائی پہ پڑی ہوئی سلامتی نے ہاتھ مار کر دیے کو بجھا دیا۔ پھر اپنے بدن پر اس دن کی آخری انگڑائی توڑی اور بولی۔

"شکر ہے اللہ............"

10

آج سورج نے، چھدرے چھدرے بادلوں کے پیچھے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔آج آسمان کے کوٹلے پر کوئی نادار، اپنی محنت سے شرمسار، روتا، کڑھتا ہوا اپنی پھٹی پرانی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا——

ہوائیں چلنے لگی تھیں جن کے دوش پہ لہراتے ہوئے کہیں لوب نار، کوک نار، اور پامیر اور سلیمان کی طرف سے چھوٹے چھوٹے سفید پرندے آنے شروع ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا دور، ہزاروں فرسنگ دور، کہیں کھیلنے والے بچّوں نے کاغذ کی کشتیاں، وقت کے دھارے پہ چھوڑ دی ہیں یا ویشنو دیوی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں وہ سب نذرانے لوٹا رہی ہے جو صدیوں میں ، جاتریوں نے ڈھولکیاں اور چھینے بجا بجا کر، امبا دیوی کی استتی گا گا کر اس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔

شب و روز بے اعتدال ہو رہے تھے۔ راتیں، دن پہ بھاری ہونے لگیں۔ شکست خوردہ سورج شب کے سامنے شرمایا اور بادل کے پردے سے منہ نکال کر اپنی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ بس اس کے مسکرانے کی دیر تھی کہ تیتر کے پروں پہ رنگ بکھر گیا۔ دُرّاج وسار کی چال میں نئے انداز چلے آئے اور نیم کی نازک سی ڈالی پہ جھولتی، وزن درست کرتی ہوئی جھانپل کے گلے میں سے ایک مترنم اور مطیّب بے اختیاری پھوٹ نکلی ....سورج نے نہ صرف جامن اور بکائن اور لنڈے پیپل کے پتّوں سے صلح کی بلکہ ببول اور کنوار گندل کے بدن پہ اُگے ہوئے کانٹوں کو بھی اپنا کہا——اور زمین کے آنسو چوم چوم لیے............

کسانوں نے کہیں آنسوؤں کے بیچ، زمین کو زیرِ لب، دبی دبی ہنسی ہنستے دیکھ لیا اور وارفتہ ہو کر اپنے اپنے ہل نکال لیے اور اس مست الست کاشت کو خریف کا نام دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک شہتوت کی کچی کنواری ڈالیاں توڑ لائے اور ان کی کمانیں بنا، ان پہ چلّے چڑھا، اِدھر اُدھر، بے ربط سے تیر پھینکنے لگے۔ مسجد میں مُلّاؤں اور مندر میں پنڈتوں نے تمناؤں کی شومیدھ کے گھوڑے چھوڑ دیے اور پوری کائنات ایک مسلسل، نہ ختم ہونے والی جندہ بازی میں لگ گئی............

منگل نے اپنا ساز نکالا اور اس پر کلغی سجائی۔ رانی نے تنور پر سے دابڑہ اٹھایا اور اس کے کچھ گیلے ہونے کی وجہ سے اس میں ڈھیر سی چیلیاں اور مُن چھٹی ڈال دی۔ رات کی آمدنی سے ایک روپیہ نکال کر بڑی کو دیا تا کہ جاٹوں کے ہاں جا کر خالص گھی تلوا کر لیتی آئے۔ مدرسے میں بڑے بچوں کے ششماہی امتحان ہو رہے تھے، اس لیے چھوٹا چمّوں جہلم اراعین کے ہاں مولیاں اور آلو لینے کے لیے پہنچا تو سلامتی سر کے گرد جالی کا دوپٹہ باندھے بیٹھی تھی——اور کنپٹیوں پہ آٹے کی چڑیاں لگائے——

چمّوں کو مولیاں اور آلو خریدتے دیکھ کر سلامتی بول اٹھی —— کیا بات ہے، چُمیا؟...........آج تمھارے آلو اور مولی کی روٹیاں پک رہی ہیں——؟''

''روٹیاں نہیں، پراٹھے۔'' چمّوں نے اتراتے ہوئے کہا——''ماں نے تنور تپایا ہے نا......''

''ہائے ہائے وے۔'' جہلم کہنے لگی——''تیری ماں نے تنور تپایا ہے؟''

''ہاں!'' چمّوں نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔''تمھیں پراٹھے لگوانے ہوں تو آجاؤ یا سلامتی کو بھیج دو۔''

پھر وہ سبزی لے کر چلا گیا اور پیچھے جہلم، عنایتی اور عائشہ ہنستی رہیں۔ سلامتی طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ سے جلی بھُنی سُنتی رہی——

پکتے ہوئے پراٹھوں میں سے خوشبو آ رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے حضور سنگھ اور جنداں کو للچا رہی تھی۔ حضور سنگھ سے نہ رہا گیا...........''ذرا نرم لگانا بیٹی!'' اس نے کہا۔''میرے دانت کام نہیں کرتے۔'' اور جنداں بھی نہ رہ سکی۔ بولی۔''دیکھ تو...... ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے......''

رانو نے گٹھی میں بسے پراٹھے، نئے، صاف ستھرے جھاڑن میں باندھ کر منگل کی طرف بڑھا دیے۔ منگل نے مخموری نگاہوں کے ساتھ رانو کی طرف دیکھا اور پھر ——— اس کے کیچڑ سے پٹے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہت صفائی کرنی پڑے گی؟ ——— !''

رانو نے دیکھتے ہوئے کہا ——— ''ہاں!'' اور پھر ایک عجوب سی نگاہ منگل پر ڈالتے ہوئے بولی ——— ''ہم عورتیں اور بنی کس لیے ہیں؟''

منگل نصیبوں والے اڈّے کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ رانو کو کوئی بات یاد آ گئی اور وہ فوراً بول اُٹھی۔ ''ٹھہرو!''

منگل وہیں رُک گیا۔ کچھ دیر میں رانی دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی ''مجھے دو شلواروں کا کپڑا لا دو............ تیوہار آ رہے ہیں............''

منگل نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو اپنے بدن پہ، سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی۔ ''سب کے پاس یہ ہے میرے پاس ہی نہیں۔'' ——— اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرائی نہیں، کِھل کِھل کر کے ہنس اُٹھی۔

منگل نے تھوڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا ——— ''اچھا، دیکھو!''

''دیکھو دیکھو کچھ نہیں۔'' رانو نے بے جھجک کہہ دیا۔ ''میں کیا سب کے سامنے بنا شلوار کے پھروں گی۔'' اور پھر بولی۔ ''میرا تو کچھ نہیں جاتا............''

منگل نے ایک دم اپنا سر ہلایا، جیسے اپنے حق کو کسی دوسرے سے خلط نہ کرنا چاہتا ہو...... رانو پھر کہنے لگی ——— چنوں کو اُس کے گھر والوں نے صُوف کا سوٹ سلوا دیا ہے...... کیسا اچھا لگتا ہے، اس کے گورے گورے پنڈے پر کالا کالا، نرم نرم صُوف ———''

منگل سوچنے لگا۔

رانو نے اور آگے بڑھ کر منگل کے اُریب پُرتے کا دامن تھام لیا اور بولی............ ''تم آج پھر پسرور نہیں تو گوجرانوالے نہیں سیالکوٹ سمبڑیال کی سواریاں ڈھونڈھ لینا ——— بچے بھی قیمیں مانگتے ہیں............''

منگل جیسے ایک دم فرمائشوں کے شیریں وترش انبار کے نیچے دب گیا۔ ساز میں سے کلغی نیچے گر گئی جسے اٹھاتے پھر سے ساز میں ٹکاتے ہوئے اس نے رانی کی طرف دیکھا، جو ابھی تک اس کا کُرتا تھامے ہوئے تھی، جیسے منگل اس کا چور تھا، جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا۔

''اچھا بابا، اچھا''........... منگل نے اپنا کُرتا چھڑایا اور چل دیا۔ رانی السائی سی کھڑی، چوکھٹ میں جڑی، ہمیشہ کی طرح اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا مرد ـــــ تکمیل اور تعمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کر دیا تھا! پھر رانی اُسے دیکھ کر ایکا ایکی ٹھٹک گئی ـــــ تلوکا!........... نہیں، منگل ـــــ منگل!........... لیکن، یہ وہ جنگل تو نہ تھا جسے ایک دن رانو نے دیکھا تھا، جس دن چنّوں نے اس پہ چادر ڈالنے کی بات کی تھی اور ایک البیلے پن میں وارث گاتے ہوئے جسے گلی کے نکّو نے لپک لیا تھا........... آج وہ چپ تھا اور اس کے چوڑے چکلے کاندھے محبت کے بوجھ سے دب گئے تھے، جس کے کارن وہ آپ ہی اپنا بڑا بھائی معلوم ہونے لگا تھا...........

وہ جا رہا تھا اور گلی کے نکّو جیسے پرے ہو گئے تھے۔ گاؤں سے باہر کے کالے کوس ایک دوسرے میں اُلجھ گئے تھے۔ اُلجھتے سلجھتے راستے کہیں بھی جاتے تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ ان پہ اُڑتی ہوئی دھول اور گرد، کیچڑ اور غلاظت میں ہر منگل کا خون اور پسینہ رچا ہوا تھا۔ پھر، راستوں کے اس گورکھ دھندے میں ایک راستہ ضرور ایسا تھا جو ہر جانور، ہر انسان کو سرِ شام ''گھر'' لے آتا تھا۔

اپنی نگاہوں کے دھندلکے میں منگل کے حل ہوتے ہی رانی اندر لوٹ گئی۔ آج اس کے پاؤں یقین سے زمین پہ پڑ رہے تھے۔ آج ہر چیز کتنی آسان، کتنی سبک ہو گئی تھی جس کے مقابلے پہ اپنے کیچڑ سے پٹے آنگن کو صاف اور ستھرا اور پھر سے مہماں نواز بنانا کوئی محنت کی بات ہی نہ تھی۔

11

کسی کو اندازہ نہ تھا اب کے کوٹلے پہ اتنا جاتری پڑے گا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا اب کے سامنے پہاڑوں پہ وقت سے پہلے برف پڑ جائے گی اور امبا دیوی سب بھگتوں کو کوٹلے کی طرف بھیج دے گی۔ اور پسرور، گوجرانوالہ، سمبڑیال، سیالکوٹ، ستراہ اور ستو کی سے سواریاں آئیں گی لاریوں اور بسوں پر، تانگوں اور اِکّوں پر، بیل گاڑیوں اور چھتناریوں پر............

کسی کو معلوم نہ تھا کوٹلہ گانو کے لوگوں کے گھر دولت سے بھر جائیں گے اور اُن پر دھن برسنے لگے گا۔ دیوانے شاہ کا سودا بک جائے گا اور جاٹ کا گھی، خیرے کا تیل اور جہلم کی سبزی............ کبوتر مندر کے کلس سے گانو کی گلیوں میں اتر آئیں گے اور دانہ کھائیں گے اور ان کے پیار کی گھوں گھوں، چوبیس گھنٹے چلنے والی آٹے کی مشین کی ٹوٹو میں گم ہو جائے گی............ اور برات گھر، دھرم شالہ اور ذیلداروں کی حویلی میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہوگی اور لوگ دس دس، بیس بیس روپے ایک ایک کوٹھری کے دیں گے............ سنار کی بالیاں، ٹھٹھیار کی تھالیاں، چراغ کے پھوزے، کمہار کے کوزے، سب بک جائیں گے اور اوربڑ پہ پتہ رہے گا نہ محراب پر شہد کا چھتہ...... اور ابھی لوگ آ رہے تھے — ناچتے اور گاتے، دف کوٹتے، نفیری بجاتے —

''بچانا ہے تو بچالو، امبا جی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے............''

کوئی نہ جانتا تھا سال کے اس حصّے میں کوٹلے کی عورتیں کیوں اوپر سے سوکھشم اور نیچے سے استھول ہو جاتی ہیں؟ کوئی کہتا اس کی وجہ پچھلی گرمی ہے، کوئی آنے والی سردی...... اور پھر وہ ہنسنے لگتے۔ گانو کی کنج گامنیاں ہاتھوں میں تھالی، تھالی میں صد برگ، صد برگ میں سیندور لیے مندر

کی طرف چل نکلتیں اور اپنی ہی چال میں مست کہیں ایک کولھے پر تھم جاتیں تو گیان چند اور کیسر سنگھ، رلدو اور دیوانے کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ان کے جاتے ہی وہ ہوش میں آجاتے اور یک زبان ہو کر چلّا اٹھتے —— "ہوئے ہوئے!"..........

آج ہی بڑی پرکرما کا دن تھا۔ حضور سنگھ اور جنداں تک باہر گئے تھے، لیکن رانو گھر ہی میں بیٹھی تھی۔ اس کے کارن بڑی بھی نہ گئی تھی —— جوان جہان لڑکی اور اس پہ پرکرما کے لیے آئے ہوئے ہزاروں البیلے، اس کی ایک انگلی بھی کسی کے حصے میں نہ آتی ...... شلا پہ کوئی لال لال چیز پیس کر رانو اسے انگلی سے سمیٹتی ہوئی ایک کٹوری میں رکھ رہی تھی۔ گھلے ہوئے بیسن میں ہری مرچ کی دم نظر آتی تھی اور آلو کے قتلے اور چولھے پہ کڑاہی چڑھی تھی جس میں سرسوں کا تیل اُبل رہا تھا......

جب ہی چنوں کالے صُوف کا سوٹ پہنے، گلے میں دوپٹہ اڑاتی ہوئی اندر آئی —— کالی قمیص میں سے اس کا گورا گورا سینہ، محبت اور کینہ لیے زندگی کا سیاہ وسفید سمجھا رہا تھا۔ رانو کو چوکے اور صحن میں یوں تھم گڑی دیکھ کر چنوں بولی۔

"ہائے ہائے نی خصم کھانیے —— آج کے دن تو گھر مری ہے؟"

رانی نے یونہی سا سر ہلا دیا۔

چنوں اور پاس آتے ہوئے بولی۔ "باہر سب جھٹڑیں[1] کھڑی تیری جان کو رو رہی ہیں اور تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

اور چنوں کی نظر رانو کی گلبرے کی شلوار پر جا پڑی۔ "یہ بات!" چنوں نے اسے چھوتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ رانو نے چنوں سے جان چھڑانے کے لیے کڑاہی میں پونی ڈال دی۔ ہاتھ اوپر اُٹھے تو چنوں کو رانو کے کُرتے کے اندر کچھ اور ہی گول سڈول، کچھ مخروطی سا نظر آیا۔ اس نے بڑھ کر اوپر ہی سے کُرتے میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر فوراً ہی باہر نکال کر جھٹکنے لگی —— "ہائے میں مرگئی!" وہ بولی، جیسے جلتے ہوئے کوئلے چھو لیے ہوں —— "مالم ہوتا ہے منگل تیرے ساتھ سیدھا ہو گیا!"

رانو کچھ نہ بولی۔ دوسرے ہاتھ سے شلا پہ پسی ہوئی لال ہری چیز کے چٹخارے لینے لگی۔

1۔ زنانِ مطلقہ

''یہ کیا؟'' چنوں نے پوچھا۔

اور پھر اس نے غور سے دیکھا۔ کھٹ مٹھی چٹنی تھی۔ چنوں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ ایک انگلی سے اس نے بھی چٹنی کو منہ میں ڈال لیا اور سی سی کرتی، آگے بڑھتی رانو کو شانوں سے جھنجھوڑتی ہوئی بولی—— ''ہائے ہائے نی۔ رنڈیے—— ؟—— !——''

رانو، اونہوں، آنہاں کرتی ہوئی پیچھا چھڑانے لگی۔

''سچ بتا۔'' چنوں بولی۔ ''نہیں تو میرا مری کا منہ دیکھے .... بتا، تجھے میری سوگند..........''

رانو نے کچھ گھور گھار کے بڑی کی طرف اشارہ کیا جو پکی نشانی تھی۔ پھر چنوں کے کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاہو!''[1]

چنوں ایک دم تھرک اُٹھی۔ ایک ہاتھ کولھے پر، دوسرا سر پر رکھے، وہ اپنے محور کے گرد گھوم گئی اور پھر ایکا ایکی باہر کی طرف لپکی—— چلاتی، پکارتی ہوئی—— ''نی سرو پو! .... نی چاچی پارو! وڈونی—— اڑیے کہاں مر گئیں ساری کی ساری..........؟''

جتنی تیزی سے چنوں باہر نکلی، اتنی ہی تیزی سے منگل اندر آیا۔ دروازے میں دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ چنوں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ منگل کی پگڑی پرے جا گری اور جوڑا کھل گیا۔ اسے یوں دیکھ کر چنوں کچھ ہنستے، کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی——

''اندھا! .... دکھائی نہیں دیتا۔ پورا کوڑ[2] ماہی دھرت[3] راشٹوں کا ہے——''

''پر چنوں!'' منگل نے پگڑی اٹھا کر بات شروع ہی کی تھی کہ چنوں بھاگ گئی، منگل نے جوڑا لپیٹتے، پگڑی پر سے گرد جھاڑتے ہوئے آواز دی—— ''رانو!''

رانو سامنے ہی بیٹھی تھی، لیکن چونک پڑی۔ آج منگل نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ وہ رانی بھی کہہ سکتا تھا لیکن، ''رانو!''—— ضرور کوئی بات تھی۔ .... رانو نے منگل کی طرف دیکھا جو اس کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا، جیسے کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتا ہو۔

''سن رانو، کمال ہو گیا—— حد ہو گئی..........''

---

1. ہاں 2. خاندان 3. دھرت راشٹر، کوروؤں اور پانڈوؤں کا جدّ امجد، جو اندھا تھا۔

رانی اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی، بولی۔ ''پہلے تم کہہ لو، پھر مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''کیا کہنا ہے؟''

''پہلے تم کہہ لو۔''

منگل کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نگاہ بڑی پر جا پڑی جو دیوار کے پاس کھڑی تھی اور جس کی نگاہ باہر کی طرف تھی اور کان ماں باپ کی طرف۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے منگل بڑے پیار سے بولا—— ''بیٹا! تو اندر جا۔''

بڑی، چھوٹی سی ہو کر اندر چلی گئی۔ منگل بولا—— ''جاتریوں میں ایک لڑکا آیا ہے، پچیس چھبیس برس کا..........گبھرو، جوان——ڈسکے کے متصدّی کا بیٹا..........زمینیں، مکان، دکانیں، جائداد..........''

رانی کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ کہہ اُٹھی۔ ''تب تو وہ——''

''ارے تُو سن تو۔'' منگل بولا—— ''وہ کہتا ہے میں شادی کروں گا تو بڑی سے، دنیا کی اور کسی لڑکی سے نہیں۔''

''نہیں۔'' رانو نے ایک دم سب کام چھوڑ دیا..........اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''تیری قسم۔'' منگل نے کہا——اور اس نے آج پہلی بار رانو کی قسم کھائی تھی۔ رانی کی سانس تیز ہونے لگی۔ گلبرے میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی——

''اس نے بڑی کو دیکھا ہے؟''

''ضرور دیکھا ہوگا..........شاید نہ بھی دیکھا ہو۔''

''نہ دیکھا——نہ ملا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا معلوم؟'' منگل بولا۔ ''گانو کے پنچ بھی یہی چاہتے ہیں..........اور تُو تو جانتی ہے، پنچوں میں پرمیشر ہوتا ہے۔''

''ہاں۔'' رانی مان گئی۔ ''پنچوں میں پرمیشر نہ ہوتا تو میں آج کہاں ہوتی؟''

کچھ شہ پاتے ہوئے منگل جاری ہوا—— ''وہ سب کہتے ہیں، تیری بیٹی راج کرے

گی، رانی بنے گی ـــــ مطلب، تم ایسی رانی نہیں، وہ............وہ جو اصلی ہوتی ہے..........."

یہ سب کچھ رانی کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ لیکن منگل کہے جا رہا تھا۔ "وہ کچھ لینے دینے میں بھی نہیں۔ اُلٹا سختی سے انکار کرتا ہے۔" اور پھر ایکا ایکی کسی خیال کے آنے سے وہ کہہ اُٹھا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں، میں کچھ دوں گا نہیں۔ مجھ سے جو ہوگا، دوں گا اپنی بیٹی کو ـــ پیچھے تھوڑی رکھ لوں گا۔"

"اپنی بیٹی!" رانو کے کانوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔

"میں تو اس کے لیے بک جاؤں گا، رانو۔" منگل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چاہے اس کے لیے مجھے اِکا اور ٹکی کیوں نہ بیچنے پڑیں.........."

جب ہی منگل کو کچھ یاد آیا ـــــ "تم بھی تو کچھ کہہ رہی تھیں ـــــ ؟..........."

"کچھ نہیں۔" رانو بولی۔ "صرف مادائی کو بلوا دو............مجھے ابھی سے اس کے ساتھ بات پکی کرنی ہے۔"

"سرمادائی؟" منگل نے دہرایا اور پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے رانی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔ "سچ؟"

رانی نے خفیف سا سر ہلایا اور مسکراتے، شرماتے ہوئے پرے دیکھنے لگی۔

اسی دم چنوں، چاچی، پورو، بھابی وِدیا، جانکی، سروپو، چھوٹی رانی چنڈی ـــــ عورتوں کا ایک غول کا غول اندر چلا آیا۔ تالیاں بجاتا، شور مچاتا، ناچتا گاتا ہوا ـــــ

چُوڑے والی بانہہ کڈھ کے

مُنڈا موہ لیا تویتاں والا

ـــــ چُوڑے والی بانہہ دکھا کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا ـــــ !

دمڑی دا سک مل کے

منڈا موہ لیا تویتاں والا

ـــــ دمڑی کی چھال ہونٹوں پہ مل کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا ـــــ ! ـــــ !!

منگل نے انھیں چپ کرانے کے لیے ہاتھ اوپر کیا۔ "چنوں ـــــ چاچی!"

پورن دئی نے آگے بڑھ کر زور سے منگل کو دھکا دیا اور بولی ——— "جا دے جا، بڑا آیا ہے۔"

"نینگر پڑا[1]۔" چنوں نے بھی دھکا دیا۔

"دفان ہو جا۔" وِدّیا بولی۔ "تیرا یہاں عورتوں میں کیا کام؟"

"بے حیا" پورو بولی ——— "تیرا جو کام تھا تو نے کر دیا............اب جا اِکا چلا!" اور پھر رانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "لڑکا پیدا کرناری ——— ایک اور مصیبت نہ کھڑی کر لینا۔"

اور بھی عورتیں اندر آنے اور منگل کو دھکے دے دے کر باہر نکالنے لگیں۔ رانو منگل کو بچاتے ہوئے رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی ——— "ہائے ہائے رنڈیو!............ہائے نی میرا مرد............نی بس کرو، ہائے ——— مار ہی ڈالو گی؟"............اور منگل سر کو بازوؤں میں دے کر اپنی عزّت بچاتا ہوا، لحہ بہ لحہ دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا اور چلّا رہا تھا ——— "چاچی ——— چنوں! جاتا ہوں، میں جاتا ہوں ——— میری توبہ، میرے باپ کی توبہ"............اور وہ گرتا پڑتا، پگڑی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب میدان عورتوں کے ہاتھ تھا۔ وہ رانی کی طرف بانہیں اُلار اُلار کے گا رہی تھیں ——— ناچ رہی تھیں۔

پودینے کی کرد کڑاہی رے
ہمارا اچھا کرارا پودینہ............ہو!
مسالوں والا پودینہ ....ہو!

اور وہ پاگل ہو رہی تھیں۔ ان کے گانے اور ناچ کی رفتار تھی کہ کم ہونے کی بجائے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے شور میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اس پر بھی رانو نے پورو کو پرے لے جا کر کہہ ہی دیا۔

"بدھائی ہو چاچی۔"

"بدھائی کس بات کی؟" پورن دئی نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی دھوتی کو کستے ہوئے کہا۔

1۔ دولھا

"بڑی کے لیے بر مل گیا!"

بڑی، جو دروازے میں کھڑی تھی، مرچ کی طرح لال ہو کر اندر سٹک گئی اور عورتیں، جن کی نظروں کے افق پر ہمیشہ دو لھے رہتے ہیں اور نیچے دُلہنیں۔ جن کے کان شہنائی کی آواز سننے کے لیے شہوانی، آنکھیں براتیں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں، ایک دم بے خود اور پاگل ہو اُٹھیں۔ ابھی سے انھیں بڑی کی برات دکھائی دینے لگی، باجے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ انھوں تو یہ بھی نہ پوچھا —— لڑکا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ انھیں تو زرتار سہرے لگائے، سر پر کلغی سجائے، ہاتھ میں تلوار لیے، گھوڑی پر چڑھا ہوا دولھا نظر آرہا تھا اور ساتھ جانوروں، بندروں اور سوروں کی برات، جو پھٹے پُرانوں میں سے ان کا جوبن لوٹے جارہی تھی اور اب وہ گا رہی تھیں ——

واڑ تھلّے دو نمبو پکّے

جیٹھ منگے اُدھارے

—— باڑ کے نیچے دو نیبو پکے ہیں۔ جیٹھ اُدھار مانگ رہا ہے!

نہ میں جیٹھا مُلّے دیندی

نہ دیندی رکھوارے

ڈنڈیاں نوں دل پہ گیا —— جھمکے لین ہُلارے

—— اے جیٹھ! نہ میں مول دیتی ہوں، نہ رکھنے کے لیے .... نازک ڈالیوں کو بل پڑ گیا ہے اور جھمکے جھولنے لگے ہیں۔

ایک اور نے شروع کیا ——

سوہریا بدام رنگیا!

نوُنہاں گوریاں، پُتر تیرے کالے ——

—— اے بادام کے رنگ والے سُسر! بہوئیں گوری ہیں (لیکن) بیٹے کالے...... وہ اپنے تصور میں دنیا بھر کی دلہنوں کو اُن کے سُسرال پہنچا چکی تھیں۔

اس شور کی وجہ سے، دیوی ماں کے درشنوں کے لیے ئی ہوئی پوری پرکرما، منگل کے گھر

کی طرف پلٹ پڑی۔ جیسے دیوی ماں مندر میں نہیں ، وہاں ہے۔ یا جیسے مندر وہاں چلا آیا ہے جہاں خلقت ہے۔ گیان چند سرپنچ ، تارا سنگھ نمبردار، جگو، رلدو، دیوانا، کرمو، ڈلا، جمالا سب آ کر کھڑے ہو گئے.........کوٹھے پر عورتوں کے ٹھٹ نظر آنے لگے، نیچے مردوں کے.........اڑوس پڑوس اور باہر گاؤں کے لوگوں کے علاوہ سُر مادائی بھی آئی تھی جو ساری دنیا کو دنیا میں لائی تھی اور اب اوروں کو بھی لانا چاہتی تھی ——

جہلم کی تینوں بیٹیاں —— عنایتی، عائشہ اور سلامتی بھی چلی آئیں۔ ساتھ جہلم کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تھا —— مولو! جس کے بے خود، بے بس اشاروں کی طرف دیکھ کر سلامتی شرما رہی تھی، بر ما رہی تھی۔ پھر نواب کی بیوی —— عائشہ گورداس کی گُن وتی.........سب اگلی پچھلی کدورتیں بھول کر اس لمحے میں کھو کھو گئیں.........

پورو اور وِدیا نے رانی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا.........ان سب کے درمیان ڈبو پاگل ہوا گھوم رہا تھا۔ اِسے اُسے سب کو سونگھ رہا تھا، بے تحاشا دم ہلا رہا تھا.........رانو کچھ احتیاط، کچھ بے احتیاطی سے ناچ رہی تھی۔ اس کے گلبرے کی شلوار —— معلوم ہوتا تھا کوڑیالے رنگ کا کوئی سانپ ہے جو لپٹا، بل کھاتا ہوا اوپر ہی اوپر جا رہا ہے.........رانو، جس کا مصیبت میں دبا ہوا حسن آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا، پھانٹوں والے کُرتے کے بیچ سے آنکھیں مارنے، چندھیانے، خیرہ کرنے لگا، جیسے کوئی شیطان بچہ ہاتھ میں آئینہ لیے آتے جاتوں پر سورج کی روشنی کا عکس لپکائے، ان کی آنکھیں چندھیائے، بار بار اندھا کیے جائے.........

ناچتی ہوئی عورتوں کی نگاہوں میں دنیا ایک وسیع و عریض دائرہ بن گئی، جس کے بیچ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے صرف خاکے تھے۔ پھر وہ بھی رنگ کے بڑے بڑے چھینٹوں اور دھبّوں میں بدل گئے.........اور آخر، ایک ہی رنگ رہ گیا —— سورج کی کرنوں کا رنگ، جس میں سب ہی رنگ چھپے رہتے ہیں اور الگ الگ پہچانے جانے کے لیے انسان کے دماغی منشور کے محتاج و منتظر ——

باہر کچھ اور ہی شور مچا اور یہ غول کا غول، جھرمٹ کا جھرمٹ کئی نئے رنگ پیدا کرتا، ایک دوسرے پر گرتا پڑتا، دروازے پر، کوٹھوں کی منڈیروں پر، کنوئیں کے من پر پہنچ گیا.........

——یہ جاتری لوگ تھے جو سر جھکائے دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے آرہے تھے۔ ڈھولک پیٹتے، چھینے بجاتے ہوئے دیوی ماں کی استتی گارہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے چلے آئے تھے —— گناہ، جو ہو چکے تھے .... گناہ، جو ہو رہے ہیں .... گناہ، جو ہونے والے ہیں ....

وہ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔

ماتا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں
میّا رانی .. ..
ہے میّا! تُسیں سّتے بھیناں گوریاں
سر لال پھلاں دیاں جوڑیاں
ماتا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں

——پھر منظر کھلا اور سب نے دیکھا چودھری مہربان داس اور اس کا بھائی گھنشام، سات سال کی قید کاٹ کر آرہے تھے۔ جاتریوں کے شور اور غوغے ان کو پڑتے ہوئے حال کے پس منظر میں ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی .... کمریں سجدوں سے دوہری اور کان توبہ اور شرم سے لال .... صدیوں کے خشوع وخضوع کے بعد اب اُن کے ہونٹوں پر چُپ چلی آئی تھی اور اُن کی یہ چُپ داستانیں کہہ رہی تھی ....

اور ان سب کے بیچ ایک لڑکا تھا —— پچیس چھبیس برس کا —— گبھرو —— جوان —— خوب صورت —— جو اس وقت بڑے آرام، بڑے پیار، بڑی ہی محبت اور عقیدت سے دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا .... اسے دیکھ دیکھ کر لوگ حیران ہو رہے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا، نگاہوں میں ایک ہی تجسس —— اتنی چھوٹی عمر میں، اس لڑکے نے کون سا گناہ کیا تھا؟ .... شاید .... اس نے گناہ نہیں، گناہ نے اِسے کیا تھا ....

جب ہی بھیڑ کو چیرتا، دھکّے دیتا، دھکّے کھاتا ہوا منگل، رانی کے پاس چلا آیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر، جھنجھوڑتا ہوا بولا —— ''رانو! وہ ہے .... وہ ہے لڑکا۔'' اور اس نے بھینٹیں گاتے ہوئے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی۔

رانو نے دور سے اس خوب صورت لڑکے کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں میں سوئمبر رچ گیے۔ من ہی من میں اس نے بڑی کی بانہوں کے ہار اس کے گلے میں پہنا دیے اور خود امر بیل بنی اس سے لپٹ لپٹ گئی ـــــ اتنا جوان، اتنا سجیلا، گبھرو نہ ملا ہوگا کسی ماں کی بیٹی کو۔ محبت کے جوش میں دیوانی ہوتی ہوئی رانی نے پاس کھڑی چنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے اسے بھینچے، اس کی چیں بلاتے ہوئے بولی ـــــ

''ہائے نی چنوں ـــــ میں تو پار ہوگئی............''

بڑی بھی عورتوں کے جھرمٹ میں سے سر نکال نکال کر لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ آپا دھاپی کی اس بھیڑ نے اس کی سب شرموں کو چھپا لیا تھا، لہو پورے بدن سے کھنچ کر اس کے منہ کو آنے لگا تھا، وہی لہو سلامتی کے چہرے سے غائب ہوگیا اور وہ اپنی بڑی بہن سے کہنے لگی............ ''آپاں، گھر چل ـــــ میں تو تھک گئی ـــــ''

اور رانی بچّوں کی طرح اِسے اُسے سب کو اپنا کھلونا دکھا رہی تھی ـــــ ''دیکھا چاچی؟ وِدّو تو بھی دیکھ............ دیکھ چنڈیے، رنڈیے............ لاجو............''

پورو چاچی نے دیکھا، وِدّیا نے جانچا، چنڈی نے تولا۔ لاجو، جانکی، ٹکی............ اور رانی سب کی طرف دیکھتی، سر جھٹکتی ہوئی بولی ـــــ ''ہے نا؟''

جب ہی رانی نظروں کی کڑی ٹوٹ گئی۔ اس نے دیکھا کہ چنوں کے چہرے کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اسی بے بہارے، توریے کے پھول کی طرح............ رانی نے ایک تیز سی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے کہا ـــــ ''ہائے نی؟'' اور پھر اسی نظر سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی جو اب تک قریب آ چکا تھا اور نظروں کی جھولیاں پھیلائے، ہاتھ جوڑے رانی سے کوئی بھیک مانگ رہا تھا۔ رانی نے ایک دم سانس اوپر کھینچی ـــــ ''میں مرگئی!۔''

سانس باہر آنے سے پہلے، رانی کے چہرے کی سُرخی صاف اور سامنے پر لگا کر اڑتی ہوئی نظر آئی اور وہ روئی کی طرح سفید ہوگئی، پہلے ہاتھ کانپے پھر پورا کا پورا بدن تشنجی ہوگیا اور وہ لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــــ ''وہی ـــــ یہ تو وہی ہے، جس نے میرے............''

رانی اس ناگہانی صدمے سے بے ہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ صدیوں کے سُرگ

سے سفید اور سرافگند، حضور سنگھ کہیں سے گرتا پڑتا چلا آیا اور قریب کھڑی جنداں بوڑی سے بے پروا ہو کر اس نے رانی کو گرنے سے تھام لیا۔ آج اس کی آنکھیں جو ہڑ پہ نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑانے کی بجائے، پورے پر تول رہی تھیں۔ شاہین صفت، بلند آشیانوں کی طرف اُڑ رہی تھیں......

''بہو۔'' اس نے لرزتے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے کہا۔ ''تو کیسے روتی ہے؟...... میری طرف دیکھ، جس نے بیٹا دیا ہے، ہمیشہ بیٹا دیا ہے، جب کہیں جا کے ایک بیٹا پایا ہے۔''

اور پھر، بہو رانی کی روح کو پالینے کے جتن میں بڈھا حضور سنگھ خود کہیں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں کی گنگا جمنا، اس کی داڑھی کے جنگل بیلوں میں گم ہو رہی تھیں۔ تلوکے کی موت کے بعد آج تک اس کے ہاتھ، کسی نہ ہاتھ آنے والی چیز کی تلاش میں کھپ گئے تھے —— آواز گلے میں کانپتی رہ گئی تھی...........

نہیوں لبھنے لال گواچے
مٹی نہ پھرول جوگیا ......

—— جوگی! بے کار کی خاک مت چھان۔ لال جو ایک بار کھو گئے سو کھو گئے۔ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے، ہاں، لال کے بدلے تجھے لال مل جائیں گے، ہیرے مل جائیں گے........... موتی........... پنے........... پر وہ لال نہیں...........

جب ہی تو........... حضور سنگھ آنکھیں اس دنیا کے رشتوں اور بندھنوں میں کہیں رُل گئی تھیں اور نظارے اس کی بے بسی پر رو رہے تھے۔ اب وہ خود نظارہ تھا اور خود ہی ناظر، آپ تماشا اور آپ ہی تماشائی........... اس کے سر پہ گیروے رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے پیچ کھل کھل جاتے تھے۔ اس وقت پلو سے وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اور ریک سی ناک پونچھتا ہوا کوئی جوگی، کوئی رمتا رام معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کو چھوڑ رہا تھا، پر دنیا اسے نہیں چھوڑ رہی تھی........... آج موت کے دروازے پہ کھڑے اُسے کوئی دِبھ درشٹی مل گئی تھی اور وہ دیکھنے لگا تھا—— جنم...... مرن........... اور بیچ میں ایک رانی بہو،........... جو شادی کے روز، ایکا ایکی کہیں کتم عدم سے معرضِ وجود میں چلی آتی ہے اور پھلکاری کے پیچھے سے اپنی کلیسروں سے آئی، لال لال چوڑیوں

سے پٹی، گوری گوری بانہیں نکالتی، چھنکاتی ہے .... مہندی کی خوشبو سے بوجھل ہاتھ جوڑتی، گھونگھٹ کی اوٹ سے، نیم نگاہی کی زبان میں منتیں کرتی اپنے سُسر سے کہتی ہے ـــــ پتا مہ! تو اپنا ایک یہ بیٹا دے دے مجھے۔ میں اس کے بدلے تجھے دس دوں گی۔ اسی کی شکل میں .... اسی کی عقل میں .... اور پتامہ کہتا ہے ـــــ ہاں ہاں بیٹی! پر یہ بیٹا میرا ـــــ؟ اور پھر وہ آنسو پونچھتا ہوا منہ پھیر لیتا ہے ....

رانی کے لانبے لانبے کیش، حضور سنگھ کی انگلیوں سے اٹدنے والی شفقت کے سیل میں نہار ہے تھے، چھینٹے اڑا رہے تھے۔ آج اُسے اپنے کھوئے ہوئے باپ کی جگہ کوئی، آسمانی باپ مل گیا تھا۔ اسی لیے ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز، وہ بار بار اپنا سر اس کی چھاتی پہ پٹخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی ـــــ ''نہیں .... نہیں باپو، یہ نہ ہوگا .... ہائے! میری بیٹی! ـــــ میں مر جاؤں گی، باپو ....''

اس وقت پرکرما کے لیے آئی ہوئی ساری خلقت تھم چکی تھی اور رُکے ہوئے سانسوں سے ایک عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، رانی ہاں کہے گی تو دنیائیں بس جائیں گی اور نہ کہے گی تو پرلے آجائے گی۔ مہاپرلے، کیا انسان اور کیا حیوان، کیا پشو اور کیا پنچھی، کیا دھرتی اور کیا آکاش، سب ناش ہو جائیں گے۔ سب کے پاس کوئی نوح نہ رہے گا اور خدا کے پاس کوئی روح .... شبد میں جھنکار نہ رہے گی، جیوتی میں پرکاش نہ رہے گا .... اور بیچ پرمیشور سامنے کھڑے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوئی دُعائیں مانگ رہے تھے اور ان کی دُعاؤں میں یہ سیدھا سادا، معصوم منگل بھی شامل ہو گیا تھا ....

جب ہی رانی کو دلاسا دیتے ہوئے حضور سنگھ بولا ـــــ ''بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ...... کیوں ہو رہا ہے؟ ـــــ اسے تو نہیں جانتی، نہ میں جانتا ہوں، نہ یہ لوگ جانتے ہیں ..... تُو اسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر ..... ایک چُپ، یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں .....''

رانی نے مُڑ کر دیکھا۔ بڑی کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی ـــــ ماں! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو نہ بولی تو میں بن بیاہی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی ..... رانی نے سُسر کے کاندھے پر سے سر اُٹھایا اور بولی۔ ''اچھا باپو، اچھا۔''

ایک دم بھینٹیں شروع ہو گئیں ۔لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ گانے، بجانے، شور مچانے لگے، جن کے بیچ رانی نے اوپر، مندر کی طرف دیکھا۔سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسّم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اُسے منوّر کر رہا تھا............تھوڑی ہی دیر میں رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔اس پہ بھی ایک تیز، چکا چوند کر دینے والی روشنی تھی جو جھپک جھپک کر، لپک لپک کر رانی کی طرف آ رہی تھی اور جس نے پوری طرح سے اس کے بدن کا احاطہ کر لیا تھا............اسی دم مندر میں گھنٹیوں کا غوغا مچا، مسجد سے اذان بلند ہوئی اور جہاں کلس تھے، وہاں اندھیرے میں کسی کے ہاتھ پھیلے اور گردن لٹکتی ہوئی نظر آئی۔

ایک ڈر تھا............اور ایک حظ بھی، جن میں سنسناتی ہوئی رانو نے اپنے دونوں ہاتھ کلسوں کی طرف اُٹھا دیے اور روتی دھوتی، لرزتی کانپتی ہوئی بولی——

''لا،!............ہے دیوی ماں——!!''

ڈرامے

بیدی کے ڈرامے

تعارف

بیدی کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ''بے جان چیزیں'' (1943) اور ''سات کھیل'' (1946)۔ دونوں مجموعوں میں خواجہ سرا کی تکرار ہے اور ''بے جان چیزیں'' میں جو ڈراما ''ایک عورت کی نہ'' کے عنوان سے شامل ہے، وہ سات کھیل میں ''پانو کی موچ'' کے نئے نام سے دُہرایا گیا ہے۔ ڈرامے کے موضوع کو دیکھتے ہوئے پانو کی موچ بہتر عنوان ہے۔ اس طرح بیدی کے یہاں کل گیارہ ڈرامے ملتے ہیں۔ ان گیارہ ڈراموں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنی دلچسپی کھو بیٹھے ہیں، کیونکہ تفریحی یا طربیہ ڈراموں کی ایک مصیبت یہ ہے کہ سماجی حالات کے بدلنے کے ساتھ ہی ظرافت کے ان سرچشموں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو اپنے زمانہ میں ان ڈراموں کو زعفران زار بناتے تھے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ خود ڈراما نگار نے جن وسائل کا استعمال کیا ہے، مثلاً طنز یا مزاح، تو اس میں اتنی فنکارانہ گہرائی یا شدت پیدا نہیں کر پایا کہ طنز کاٹ دار بنتا اور مزاح قہقہہ زار۔ مثلاً ''کار کی شادی'' میں طنز کا وار گہرا نہیں پڑتا۔ مکالموں میں بھی ظرافت کا وہ عنصر پیدا نہیں ہوتا جو ایک اچھے طنزیہ ڈرامے کو پُر لطف بناتا ہے۔ کار کی شادی ایک ایسے نوجوان کا ڈراما ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کی منگیتر اور اس کے ماں باپ لڑکے کو اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں، جب کہ اس کے دوست کا کہنا ہے کہ ان کی دلچسپی اس کی

دولت اور کار نہیں ہے۔ چنانچہ لڑکا سچائی کی پرکھ کے لیے ایک روز بغیر کار کے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے باپ کا کاروبار ٹھپ ہوگیا ہے اور کار بھی بک گئی ہے۔ یہ سنتے ہی لڑکی اور اس کے گھر والوں کے حوصلے بیٹھ جاتے ہیں اور ڈراما بھی ٹھپ ہوکر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل سیدھی لکیر کا ڈراما ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی اور تحیر کا عنصر نہیں ہے۔

اس نوع کے ڈراموں میں سب سے اچھا ڈراما ''ایک عورت کی نہ'' یا ''پانو کی موچ'' ہے۔ ڈرامے کا سب سے جاندار کردار ہردئے ناتھ ترپاٹھی کی بیوی بسنتی کا ہے، جسے ڈرامے کے اخیر میں گھبراہٹ کے عالم میں دوڑ بھاگ کرنے کی وجہ سے پانو میں موچ آجاتی ہے۔ ڈرامے کے مکالمات میں برجستگی اور تھوڑے بہت تکلفانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ بین السطور طنزیہ اشاروں اور کنایوں نے مزاح میں سوفسطائیت کا عنصر پیدا کردیا ہے۔ مزاح کا یہ رنگ کرداروں کے نفسیاتی اور جنسی دوغلے پن کو سہارنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ بسنتی اشاروں کنایوں کو نہ سمجھنے کا ڈھونگ بھی کرتی ہے لیکن شوہر کے کنایوں کا مطلب پالیتی ہے، جو وہی ہے جو وہ چاہتی ہے لیکن دکھاوا مطلب نہ سمجھنے کا کرتی ہے۔ یہ فنکارانہ بازی گری اس جنسی کھیل کے لیے ہے جو کرداروں کے جنسی فلرٹیشن کی حدود میں رہ کر بھی کافی بلند بانگ ہے۔ ڈراما خوش طبعی سے لکھا گیا ہے، اسی لیے کامیڈی کی حدود میں رہتا ہے اور اخلاقی مسائل پیدا نہیں کرتا۔

''تلچھٹ'' کے متعلق مظفر علی سیّد کا خیال ہے کہ یہ ڈراما ایک روسی کہانی پر مبنی ہے۔ مظفر علی سیّد کا یہ خیال بھی درست ہے کہ موضوع کو دیسی بنانے کی شدید کوشش کے باوجود، ڈراما بدیسی ہی رہتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بیدی جب ماں اور بیٹے کے رشتہ پر لکھتے ہیں تو ان کا موضوع اپنی زمین کی مٹی سے کیسے شاداب بنتا ہے۔ اسی ارضی آب و رنگ کی شدید کمی اس ڈرامے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ڈرامے میں سادگی اور مکالموں میں روانی ہے۔ اس ڈرامے کو آسانی سے اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔

''بے جان چیزیں'' کافی بے جان ڈراما ہے۔ ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ ڈاکٹر قدوائی اور ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، شادی کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑتے ہیں، الگ ہوجاتے ہیں اور پھر مل جاتے ہیں۔ ان کے اِن جذباتی رویوں کی

نمایندگی بے جان چیزیں بھی کرتی ہیں یعنی کلینک کے سائن بورڈ، چائے کی پیالی، جوتوں کے تسمے، فوٹو فریم اور جھاڑن وغیرہ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ بیڈ روم فارس میں چیزوں کی اُتھل پتھل سے بڑا مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ بیدی سیدھی سادی کہانی پر شاہکار افسانے لکھتے ہیں لیکن سیدھے سادے پلاٹ کو پُر تجسس اور پُر لطف ڈرامے میں نہیں بدل سکتے۔

''رخشندہ'' بیدی کا دلچسپ علامتی ڈراما ہے۔ مقام پرانی وضع کے ٹھاٹھ دار مکان کا بیرونی حصّہ ہے۔ ایک گیلری سی اس مکان کے اردگرد دوڑ گئی ہے جس کا ایک حصہ سامنے نظر آ رہا ہے۔ اس گیلری پر ٹین کی ایک چھت ہے۔ وقت رات کا ہے۔ زوروں کی بارش ہو رہی ہے اور بجلی کڑک رہی ہے۔ پردہ اُٹھنے پر رخشندہ دیوار سے لگی چلتی ہوئی سامنے نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ ساٹن کی شلوار اور آرگنڈی کی قمیص اس کے دُبلے پتلے اور روح ایسے لطیف جسم کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو اس کے سفید چہرے پر سر کے بھورے بال یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے دِیے کی لو سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں، وہ رخشندہ ہے۔

اِس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بیدی رخشندہ کو ایک روح کی مانند پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی اعصاب زدہ لڑکی ہے۔ وہ بارش میں بھیگتی ہوئی اپنی بہن کے کمرے کے دروازے پر جاتی ہے۔ وہ پریشان ہے کیونکہ اس کا شوہر ابھی تک باہر سے نہیں آیا۔ بہن اسے سمجھاتی ہے، ڈانٹتی بھی ہے کہ آ جائے گا، اس میں اتنے گھبرانے اور بدحال ہونے کی کیا بات ہے۔ بیدی ڈرامے میں آہستہ آہستہ شوہر کے انتظار کی کہانی کو حسنِ ازل سے روح کی جدائی کی کہانی میں بدل دیتے ہیں۔ جدائی کی اس کہانی میں بیدی نے روح کے اضطراب کو رخشندہ کی اعصاب زدگی اور بے قراری کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جدائی کی اس کرب ناک حالت میں روح حقیقت مطلق کی تلاش و تعاقب اور انتظار و وصال کی کرب ناک گھڑیوں سے گذرتی ہے۔ جس طرح ازل سے چاند، سورج کا تعاقب کر رہا ہے، لیکن ہمیشہ سے برابر کا فاصلہ قائم ہے، اسی طرح روح ازل سے اپنے محبوب کو پکڑنے کے لیے عالمِ ہستی میں سرگرداں ہے لیکن اسے پکڑ نہیں پاتی۔ ایک اور جگہ رخشندہ کہتی ہے ''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں میں ہی ایک عورت ہوں جس کا خاوند ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں ہی ایک روحِ سرگرداں ہوں جو صدیوں سے سائے ایسے سبک

اور تیز گام قدموں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہی ہے، جو اپنے گوہرِ مقصود کی تلاش میں ازل سے آوارہ ہے— میں نے کتنی صحرا نوردی کی ہے، کتنے کوہ و دشت ناپے ہیں۔ چٹانوں اور کانٹوں کی نوکوں کے جلتے ہوئے بوسے میرے قدموں پر حاوی ہو گئے ہیں"۔

بیدی رخشندہ کی پریشانی کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا مکالموں کے ذریعہ اس میں ماورائیت اور غنائیت کا عنصر بھی پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ڈرامے کو محض حقیقت پسندانہ سطح پر پڑھنا ممکن نہیں رہتا۔ حقیقت پسندی کی دیوار میں بہت سے ایسے روشن دان کھل جاتے ہیں جہاں سے پُراسرار روحانی احساس کی روشنی ڈرامے کو ایک دوسرا ہی ڈائمنشن عطا کرتی ہے، رخشندہ کی اعصاب زدگی جنون میں اور جنون کشف کے مقام میں داخل ہو جاتا ہے، بھابھی رخشندہ کے کشف کو پہچان لیتی ہے۔" آپا مجھے بخش دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تو مجسم روح ہے۔"

ماورائیت کے اس ڈائمنشن کو شوہر کی آمد اور زیادہ طاقتور بناتی ہے، رخشندہ پھوٹ پڑتی ہے۔" کہاں تھے آپ؟"

"میں یہیں تھا، کیوں کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ تم سب لوگ پریشان کیوں نظر آتے ہو؟"

رخشندہ کہتی ہے" آپ یہاں نہیں تھے، یہاں نہیں تھے۔"

"میں تم سے ایک ہاتھ کی دوری پر تھا۔ اے مضطرب روح۔ میں ہمیشہ ایک ہاتھ کی دوری پر رہتا ہوں۔ لیکن تم مجھے پانے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتیں۔"

ڈرامے کا حسن اس کی غنائیت میں ہے جو ماورائیت کی عطا کردہ ہے، لیکن حقیقت پسندانہ سطح پر ایک اعصاب زدہ لڑکی کی بیقراری اپنا حق منواتی ہے۔

"آج" بھی ایک ایسا ڈراما ہے جو اسٹیج پر آسانی سے کھیلا جا سکتا ہے۔ جائے وقوع ایک بڑا ریستوراں ہے اور وقت 1944 کی ایک رات ہے۔ یہ گویا دوسری جنگِ عظیم اور ہندستان کی تحریک آزادی کا زمانہ ہے۔ جنگ کی وجہ سے گہری افسردگی اور جنگِ آزادی کی وجہ سے جوش و خروش نے ڈرامے کے نوجوان اور بوڑھے کرداروں میں، جن میں کچھ آرٹسٹ ہیں، کچھ بے عمل کمیونسٹ اور کچھ ڈرائنگ روم دانشور، ایک ایسی ثنویت اور بگاڑ پیدا کر دیا ہے کہ نہ تو وہ عملی

طور پر کچھ کر سکتے ہیں نہ ذہنی طور پر۔ برقی قمقموں سے جگمگاتے ریستوران میں دو کھرے ڈانسر ہیں، ایک امریکی اور ایک انگریز، جو زندگی اور موت کا کھرے ناچ پیش کرتی ہیں، زندگی ایک جگر مگر کرتے لباس میں، اور موت سیاہ فرغل میں۔ ریستوراں میں دوسرے تماشائیوں کے علاوہ ایک پروفیسر ٹھاکر ہیں جو اپنے آپ کو گاندھی سے کچھ کم نہیں سمجھتے۔ دو بلانوش ہندستانی طالب علم ہیں۔ شنکر کیمونسٹ ہے اور صفدر آرٹسٹ، جو گراموفون کمپنی میں ملازم ہے۔ سب لوگ کھرے دیکھتے ہیں جس میں موت بڑے حسین اور فنکارانہ طور پر زندگی کو اپنے سیاہ فرغل میں دبوچ لیتی ہے۔ ڈرامے کے کردار طویل مکالمے بولتے ہیں جن میں ان کی زندگی کی ناکامی اور محرومی کا جذباتی بیان ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس وقت کے ہندستانی نوجوان کا عام موڈ تھا۔ خاندانی اور پیشہ ورانہ مجبوریوں کے تحت وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کر لیتے ہیں اور اس طرح نوجوانی کے اونچے آدرش خاک میں مل جاتے ہیں۔ اب یہ لوگ بے عملی کے شکار ہیں، ان کے کوئی قومی آدرش اور وطنی نصب العین نہیں رہے۔ یہ خزاں زدہ پتوں کی مانند ہوا کے جھونکوں پر اُڑتے ہیں۔ کوئی ذوقِ عمل نہیں، کوئی سرفروشی کی تمنا نہیں۔ ریستوراں میں بیٹھ، شراب میں دُھت ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی زندگی کو اپنے پاس بلاتا ہے، کوئی موت کو جو کھرے ڈانسر کی صورت میں اُن کے پاس آتی ہیں اور ان نوجوانوں کے متعلق فیصلہ کرتی ہیں کہ انھیں کون سی چیز کی ضرورت ہے۔ زندگی کی یا موت کی۔ یہ ڈرامے کے نازک مقامات ہیں اور انھیں سنبھالنے کے لیے ڈرامائی مکالمات کو جذباتیت اور خطابت کی پُل صراط پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ مایوسی کی تاریک فضا میں پروفیسر ٹھاکر کے ذریعہ ہندستان کی روح، اس کے ماضی، اس کے کلچر اور اس کی عوامی روایات سے وابستگی پیدا کرنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ جس زمانہ کا یہ ڈراما ہے، وہ ہندستانی نوجوان کے لیے رومانی کرب اور ذہنی انتشار کا زمانہ تھا۔ ایک طرف جنگ عظیم، فاشزم، کمیونزم اور جمہوریت کے مابین تصادم، فاشزم کے خلاف کمر بستہ وہ سامراجی طاقتیں، جن کا ہندستان غلام تھا۔ بین الاقوامی سطح پر کمیونزم کو فاشزم کا خوف، لہٰذا ملکی سطح پر کمیونسٹوں کا جنگِ آزادی میں شریک نہ ہونا کہ انگریز فاشزم کے خلاف لڑ رہے تھے۔ جنگِ آزادی میں تقسیم ملک کا جھگڑا، فرقہ وارانہ فسادات۔ گویا ایک انتشار کا عالم، بیدی وقت کے اس بحران اور نراج کو ڈرامے میں قید کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

''روحِ انسانی'' بھی ''آج'' ہی کی مانند سیاسی نوعیت کا ڈراما ہے جو جرمن ڈراما نگار ارنسٹ ٹالر میں بیدی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ارنسٹ ٹالر بیدی کو ایک ایسا ڈراما نگار نظر آیا جو انسان دوست، حریت پسند اور انقلابی تھا اور جو جرمن فاشزم کی تاریک سازشوں کا شکار ہوا۔ جنگ کے زمانہ میں ایک جرمن تمثیل نگار پر ریڈیو ڈراما کیسے براڈ کاسٹ کرتا، شاید اسی دشواری کے پیشِ نظر بیدی نے ارنسٹ ٹالر کا نام نکال کر روحِ انسانی کر دیا۔ اس کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ ڈراما سوانحی ڈرامے کی ٹھوس سطح اور گوشت پوست کے ایک زندہ کردار کو چھوڑ کر ''روح انسانی'' کی تجریدیت اور عمومیت میں تحلیل ہو گیا۔ اب جیل کا عملہ اور قیدی ہیں اور وہ اذیت ایک ڈراما نگار، ایک بھرے پرے انسان کو دے رہے ہیں لیکن اذیت روحِ انسانیت جھیل رہی ہے۔ چونکہ روحِ انسانیت ایک تجریدی تصور ہے، اذیت جھیلنے کی اس کی طاقت ایک عام فرد سے زیادہ ہے۔ اسی لیے ڈرامے میں اذیت اپنی اہمیت کھو دیتی ہے، حالانکہ بیدی نے ڈرامے میں اذیت پر اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے۔ اس کے باوصف ڈراما ایک جابرانہ نظام اور آزادیِ فکر کے بیچ ٹکراؤ کو اثر انداز طریقہ پر پیش نہیں کر سکا۔

''چانکیہ'' اور ''خواجہ سرا'' دونوں تاریخی پسِ منظر میں لکھے گئے ڈرامے ہیں۔ ''چانکیہ'' میں بیدی کی ہندی شیلی اپنے شباب پر ہے اور ''خواجہ سرا'' میں مفرس اردو کی اپنی رنگینی اور شیرینی ہے۔ ''چانکیہ'' چندر گپت کے دربار کا ٹھاٹھ باٹ ہے تو ''خواجہ سرا'' میں مغلیہ تہذیب کی اپنی چمک دمک ہے۔

چانکیہ چندر گپت کا مہامنتری ہے، اپنی حکمتِ عملی، موقع شناسی اور ساز باز کرنے والی اپنی مخصوص چانکیہ بدھی سے اس نے چندر گپت کو ایک وشال راجیہ کا حکمراں بنایا ہے۔ چانکیہ اپنے مقاصد کے حصول میں ہر ناجائز طریقہ کا استعمال روا رکھتا ہے۔ اس کی سازشوں اور چالوں سے چندر گپت کی رانی دُردھرا اچھی طرح واقف ہے اور اس سے سخت نفرت کرتی ہے۔ چندر گپت بھی اس کی چالوں کو سمجھتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ دراصل سیاست اور طاقت کی دنیا ہی ایسی ہے، کہ کمزور اور طاقتور بھی چانکیہ نیتی کے سحر میں گرفتار ہوتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو وہ چاہتا ہے۔ بیدی کا یہ ڈراما فنکاری کا اچھا نمونہ ہے اور اس کے ہندی مکالمات میں بیدی نے جو رنگ و آہنگ

پیدا کیا ہے وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

چانکیہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ پورے ڈرامے میں نیتی شاستر اور سیاسی حکمتِ عملی کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص اس جال کا صیدِ زبوں ہے۔ کوئی ہیرو اور جاں باز نہیں۔ اس لیے چانکیہ وِلن یا کھل نایک بھی نہیں۔ سب سیاسی شطرنج کے مہرے ہیں اور چانکیہ چالاک شطرنج کا کھلاڑی۔ راجہ پروتک اور انورادھا، جسے چانکیہ نے وِش کنیا کے طور پر پالا ہے، ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں۔ وہ لگن منڈپ میں آگ کے قریب ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور زہر دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ چانکیہ کی سازش یہ ہے کہ پروتک کی تکمیلِ آرزو ہی میں اس کی زندگی کا خاتمہ بھی ہوگا۔ پروتک بھلے اسے محبت کی جیت سمجھے لیکن چانکیہ نیتی میں یہ اس کی ہار اور چانکیہ کی جیت ہے۔ پورے ڈرامے کی بساط ایسے ہی اخلاقی تضادات سے بُنی گئی ہے جو ڈرامائی عمل کو ہمارے لیے اتنا پُر تجسس اور پُر فشار بناتے ہیں۔

''خواجہ سرا'' بڑی فنکارانہ سلیقہ مندی سے لکھا گیا ڈراما ہے۔ چانکیہ اگر سنسکرت آمیز ہندی میں ہے تو ''خواجہ سرا'' دودھ میں ڈھلی ہوئی مُفرّس اردو میں ہے۔ مغلیہ تہذیب کی جزئیات اور شاہی گھرانے کے آداب و اطوار کا بیدی کا علم حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ فارسی اشعار اور تراکیب کا بھی ڈرامے میں خوب استعمال کیا گیا ہے۔ اگر یہ ڈراما لوگوں کے ذہن میں تازہ ہوتا تو لوگوں کو تعجب نہ ہوتا کہ ایک پنجابی سکھ نے مرزا غالب کی فلم کے اتنے خوبصورت مکالمے لکھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بیدی جو بھی اسلوب اختیار کرتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

خواجہ سرا عشق کا ڈراما ہے۔ ایک ایسا عشق جو شبنم بھی ہے اور طوفان بھی۔ کاشفہ شاہی دربار کی ایک کنیز ہے جس سے سلطنت کا ولی عہد مرزا کوچک عشق کے جذبۂ بے اختیار میں سراپا شعلہ بنا ہوا ہے، لیکن کاشفہ کو گہری محبت ہے قباد سے اور قباد کاشفہ کا عاشقِ زار ہے اور دونوں کی یہ محبت بچپن سے پروان چڑھ رہی ہے، جب کہ وہ ازبک محلّہ میں غریب ماں باپ کے گھروں میں ہمسایوں کے طور پر رہتے تھے۔ قباد خوبصورت اور تنومند ہے اور طاقت کے کھیلوں میں مرزا کوچک ہمیشہ اس سے ہارتا ہے۔ اس کا بدلہ لینے اور خود کی اور کاشفہ کی راہ سے قباد کے کانٹے کو نکال پھینکنے کے لیے مرزا کوچک ایک چال چلتا ہے جس کا قباد آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اسے خواجہ سرا

بننے پر رضامند کر لیتا ہے تا کہ شاہی حرم میں وہ اپنی محبوبہ کاشفہ کے ساتھ زندگی بھر کا قرب حاصل کر لے۔ قباد خواجہ سرا بننے کے بعد کاشفہ سے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرتا ہے۔ کاشفہ کو اس کی یہ بے لوث قربانی پسند نہیں آتی کیونکہ اب وہ اس کا مرد عاشق تو رہا نہیں۔ اب وہ اس سے محبت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی۔ مرزا کوچک سے وہ سخت نفرت کرتی ہے کہ اس نے قباد کے ساتھ بڑا غیر انسانی سلوک کیا۔ کاشفہ بڑی جاندار اور جرأت مند لڑکی ہے اور جب مرزا کوچک، قباد خواجہ سرا کو مارنے دوڑتا ہے تو وہ اس کا بچاؤ کرتی ہے۔ اس موقع پر محبت کی یہ تثلیث ڈرامے کو زبردست کشاکش اور کشمکش سے بھر دیتی ہے، پھر ایک کنیز کے ساتھ مرزا کوچک کا عشق ان خواتین کو پسند بھی نہیں آتا جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہے۔ ان کی روک اور سرزنش مرزا کوچک میں شعلۂ عشق کو اور بھڑکاتی ہے۔ اس درمیان کاشفہ محل سے نکل کر ایک فوجی افسر قویش کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کی پناہ میں چلی جاتی ہے، مرزا کوچک عشق میں پاگل ننگی تلوار لیے قویش کی طرف جاتا ہے اور سب لوگ فکرمند ہیں کہ پتہ نہیں اس لڑائی کا انجام کیا ہو کہ قویش بہت طاقتور ہے۔ جب اس بحران اور تگ و دو کے درمیان محل کی بیگمات خواجہ سرا قباد سے کہتی ہیں کہ وہ محل کے اندر ہی ہے اور جیسے اسے کسی چیز کا پتہ ہے نہ اِن باتوں کی فکر۔

''نقلِ مکانی'' بیدی کا بہترین ڈراما ہے جو پہلے ریڈیو کے لیے لکھا گیا، لیکن اب مطبوعہ صورت میں اسٹیج ڈائرکشن اسٹیج ڈرامے کے طور پر دیے گئے ہیں۔ بیدی کی فلم ''دستک'' جو بہت سراہی گئی اور جسے بہت سے انعامات بھی ملے، اسی ڈرامے پر مبنی ہے۔ اس فلم کی اسکرپٹ کو شمس الحق عثمانی حاصل کرنے اور ہندی سے اردو میں منتقل کر کے اپنی کتاب ''بیدی نامہ'' میں شائع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ اسکرپٹ پڑھنے میں بھی بہت دلچسپ ہے، کاش بیدی کی فلموں کی دوسری اسکرپٹ بھی اسی طرح شائع ہو جائیں۔ مثلاً مرزا غالب، مدھومتی، ستیہ کام وغیرہ۔ کہنے کا مطلب یہ کہ بیدی نے جو کچھ بھی تخلیقی کام کیا، اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ چاہے وہ افسانہ ہو، ڈراما یا فلم اسکرپٹ۔

''نقلِ مکانی'' ایک ایسے بیاہتا جوڑے کی کہانی ہے جو بمبئی میں ایک ایسے مکان میں رہنے پر مجبور ہے جس میں پہلے ایک گانے بجانے والی طوائف شمشاد رہتی تھی۔ عذرا قبول صورت

بھی ہے اور گانے بجانے کی شوقین بھی، جس سے چاروں طرف بدگمانیاں پھیلتی ہیں کہ یہاں پر کوئی طوائف رہنے آئی ہے۔ قسم قسم کے لوگ دستک دیتے ہیں اور آتے ہیں اور نفیس کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا ہے۔ لٹھیت اور غنڈے بھی آتے ہیں، پولس انسپکٹر اور کانسٹبل بھی آتا ہے۔ محلّہ کے لوگ جلسہ بھی کرتے ہیں کہ یہ گندگی یہاں سے دور کی جائے۔ عذرا کی جان ضیق میں ہے۔ سب کچھ اسی کو جھیلنا پڑتا ہے کیونکہ نفیس تو دفتر میں ہوتا ہے۔ دوسری جگہ تلاش کرنے پر مکان ملتے ہیں لیکن اس کے لیے پگڑی کی تگڑی رقم چاہیے اور نفیس شریف اور ایمان دار آدمی ہے۔ عذرا اس سے کہتی ہے کہ دفتر کے دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی بالائی رقم کیوں نہیں لیتے۔ یہ گویا ایک معصوم عورت میں شر کا پہلا نفوذ ہے جو دولت کی مایا نگری بمبئی کا عطیہ ہے۔ اسی درمیان ایک عیاش رئیس شیو برت جو شمشاد کا گانا سننے آیا کرتا تھا، دروازے پر دستک دیتا ہے۔ نفیس عذرا سے کہتا ہے، ''اِدھر لے آؤں؟ سیٹھ ہے کوئی چور تو نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں ایک گانا سنا دو، سیٹھ صرف گانا سننے کا شوقین ہے۔ سو ایک روپیہ ہو جائے گا۔ گانا سنانے میں کیا حرج ہے۔''

اس طرح نفیس کے اندر بھی اس کی اخلاقی مزاحمت کی عمارت ڈھے جاتی ہے۔ سیٹھ آکر بیٹھتا ہے۔ عذرا بڑی کوشش سے طنبورا چھیڑتی ہے۔ دروازے پر پنواڑی نمودار ہوتا ہے جو ڈراے کا ابلیسی کردار ہے۔ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا ہے،

''کتنے پان درکار ہوں گے سرکار کو''؟

اس طرح ڈراما شر کی ظفر مندی، معصومیت کی موت اور شیطان کی آمد پر ختم ہوتا ہے۔ انجام دل کو دہلا دینے والا ہے، جسے خود بیدی کو اپنی فلم اسکرپٹ 'دستک' میں بدلنا پڑا۔

وارث علوی

کار کی شادی

(ایک طنز)

افراد:

شفیق، محمود

بتول، فرحت، زینت..... حمید اور اکرم

ابا جان، امّاں جان

کریمن

منظرِ اوّل

کسی شہر کی ایک غیر آباد سڑک۔ ایک طرف کریم نگر کی کار کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا نمبر 355 جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آرہا ہے۔ کار کے پیچھے ایک ڈائریکشن پوسٹ ہے جس پر ایک ہاتھ بنا ہوا اسٹیج کے ایک وِنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے — امان اللہ پارک کو۔

شفیق، ایک نوجوان لڑکا، کار کے سہارے کھڑا ہوا، سگریٹ کا دُھواں اڑ رہا ہے۔ قریب شفیق کا ہم عمر دوست محمود، ہاتھ بغلوں میں دیے، شفیق کو طویل سیر کے لیے اُکسا رہا ہے۔ شفیق اور محمود کا معاشرتی امتیاز ان کے چہروں اور ان کے کپڑوں

سے واضح ہے۔ شفیق کا کلین شیو چہرہ، گیبرڈین کا ایک عمدہ سُوٹ اور سُرخ ٹائی اس کی امارت کا پتہ دیتی ہے۔ محمود کی ڈاڑھی کے سیاہ خط صاف نظر آ رہے ہیں۔ بلکہ اس کا غرارہ تک گھر کا دُھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے کوٹ کے کالر یوں اُٹھے ہوئے ہیں، جیسے وہ اپنے آپ کو سردی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا ہو۔

شفیق ایک لاپروا، معصوم اور کھلنڈرا سا چھوکرا ہے۔ بخلاف اس کے محمود ایک سنجیدہ، رُوکھا اور ٹھیٹ ہندی میں کنیا راسی لڑکا ہے۔ اس کی ہر بات میں تیکھی طنز موجود ہے اور اپنے چہرے کی لکیروں سے وہ آزمودہ کار شخص دکھائی دیتا ہے۔

شفیق: لو! اب آدھ گیلن کے قریب اور پٹرول پھونک دیا۔ ارے بھائی پٹرول راشن ہو چکا ہے (جیب سے کارڈ برآمد کرتے ہوئے) کارڈ کے مطابق سارے مہینے کے لیے صرف ایک گیلن باقی رہ گیا ہے اور تمھاری طویل سیر ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔

محمود: چلو ہٹو آئے کہیں کے — ابھی سلمیٰ یا بتول کو لفٹ دینا ہو تو باقی کا گیلن بھی پھونک دو...... مجھے بس پارک تک چھوڑ آؤ، پھر جہاں جی چاہے دفان ہو جانا۔

شفیق: بڑا احمق ہے تُو — وہاں بھلا پارک میں کیا رکھا ہے؟

محمود: جو بتول کے یہاں دلشاد کوٹھی میں رکھا ہے۔ تمھارا راستہ بھی تو ادھر ہی ہے۔

شفیق: گویا بتول کے یہاں میں ہر روز جاتا ہوں۔ مجھے وہاں گئے دو ہفتے کے قریب ہوئے ہیں۔ بتول کے ماں باپ مجھ سے خفا ہو رہے ہوں گے۔ تم نہیں جانتے محمود، وہ کتنے اچھے لوگ ہیں۔ اماں جان تو مجھے اپنے حمید اور اکرم سے سوا چاہتی ہیں، اور بتول — اب اس کے متعلق کیا کہوں — بس مٹی جاتی ہے۔ اور زینت — اور فرحت اور — نہ جانے اُن کے گھر میں کون کون ہے۔ میرے جانے سے وہاں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ پہلے پہل بتول اتنی کُھل کر بات نہیں کرتی تھی اور اب تو وہ بالکل میرے قریب آ بیٹھتی ہے...... (چمک کر) وہ سب نئی روشنی کے آدمی ہیں۔ بس ایک مہینے تک نکاح ہو جائے گا اور پھر......

محمود: بیاہ ہو جائے گا (طنز آمیز ہنسی ہنستے ہوئے) — اور یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تمھارے

والد اگر ہردوئی کے جج ہونے کی بجائے میرے والد کی طرح محض ایک کلرک ہوتے تو تم بھی میری طرح پارکوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے شفیق ——— حتیٰ کہ تم اپنی زندگی کے پٹرول یعنی خون کو راشن کارڈ کے آخری قطرے تک پھونک ڈالتے۔

شفیق: (تمسخر سے) یہی تو مصیبت ہے کہ خون ابھی راشن نہیں ہوا اور پٹرول راشن ہو چکا ہے ——— تم غلط کہتے ہو محمود۔ مجھ میں بہت سی ذاتی خوبیاں بھی تو ہیں۔

محمود: مثلاً؟

شفیق: مثلاً میں صحت مند ہوں۔ خوبصورت ہوں اور تمھاری طرح باشا نہیں بنا رہتا۔

محمود: اونہہ! خوبصورتی ——— یہ بھی ایک اضافی بات ہے۔ میں اپنا کلیجہ جلاتا ہوں اور تمھیں چائے کے ساتھ مکھن ملتا ہے۔ اس کے باوجود تم میں مجھ سے کیا زیادہ ہے۔ سوائے اس بات کے کہ تم نے گیبرڈین کا ایک نہایت عمدہ سُوٹ پہنا ہوا ہے اور میرا ——— میرا کوٹ کثرتِ استعمال سے بوریا ہو رہا ہے ——— جلدی میں میں اپنے غرارے تک کو لوہا نہیں کر سکا۔

شفیق: میں گاتا اچھا ہوں۔

محمود: میں لکھتا اچھا ہوں۔

شفیق: اور مجھے کلر ملا ہے۔ اُس دن ٹیسٹ باؤلنگ میں بتول بھی آئی تھی محمود، اور میں بڑی فارم میں تھا ——— بتول نے مجھے بتایا کہ ہر چوٹ پر اس کا دل اُچھلتا تھا ——— (محمود کو جھنجوڑ کر) ارے سُن رہے ہو؟ ——— اس کا دل اُچھلتا تھا...... تم نہیں جانتے محمود وہ سب لوگ مجھے کتنا چاہتے ہیں اور میں کتنا بے اعتنا ہو رہا ہوں۔ اب دیکھو، پورے دو ہفتے کے بعد جا رہا ہوں۔ اُن کے یہاں ———

محمود: ارے احمق! تمھارے کلر اور تمھاری باؤلنگ کو کون پوچھتا ہے اور بے اعتنائی یہی ہے نا کہ بتول سُرخ ٹائی پسند کرتی ہے اور تم ہمیشہ سُرخ پہنتے ہو۔ وہ ہمیشہ گہرے رنگ کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور تم ہمیشہ گرے سُوٹ سلواتے ہو۔ اچھا خاصا بندر بنا رکھا ہے، بتول نے تمھیں (ڈرامائی انداز سے ہنستا ہے)۔ اس کے ہاتھ میں جوڈ گڈگی

ہے وہ تمھیں دکھائی نہیں دیتی۔ اور ذات ذات لیے پھرتے ہو، حالانکہ تم نے اپنی ذات اپنی شخصیت کو مکمل طور پر بتول میں کھو دیا ہے — ہاہاہا —

شفیق: (اونچی آواز میں) محمود! باز نہیں آتے تم؟

محمود: (اس سے بھی اُونچی آواز میں) خدا نہ کرے تمھاری شادی ہو بھی جائے تو میں تمھیں مسٹر شفیق احمد کہنا چھوڑ دوں گا۔ میں تمھیں مسز شفیق احمد کا خاوند کہوں گا — مسز شفیق احمد کا خاوند!...... جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہے؟ — اس کا مطلب یہ ہے کہ شفیق احمد بذاتِ خود کچھ بھی نہیں۔ لوگ اُسے محض اس لیے جانتے ہیں کہ وہ بتول کا خاوند ہے — (ہنستا ہے)

شفیق: باز آجاؤ محمود — کار میں بھی اسی طرح باتیں کر رہے تھے تم۔ اگر کوئی حادثہ ہو جاتا تو ہم دونو —

محمود: میں چاہتا ہوں آج تمھارے سارے طلسم توڑ ڈالوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں بُت شکن ہوں اور تمھارے بُت خانے کے تمام ہیکل توڑ کر وحدہٗ لاشریک کا راستہ دکھانے کا کام مجھے ودیعت کیا گیا ہے...... (سخت نفرت سے) چھ مہینے سے عشق و محبت کی بے معنی داستانیں سُنتے سُنتے کان پک چکے ہیں (چڑا کر) بتول یہ کہتی ہے، بتول وہ کہتی ہے (کانوں تک ہاتھ لے جا کر) اس نے میرے لیے فلاں آویزے پہنے (سمٹ کر) وہ مجھے دیکھ کر یوں سمٹی، یوں ہوئی — ارے میاں! تمھارے ہردوئی میں تین سہ منزلہ مکان ہیں نا؟ یہ ان مکانوں کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ شفیق کی نہیں بلکہ میاں احسان الحق سب جج ہردوئی کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ بھی میں رعایتاً کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اگر میں کہوں میاں احسان الحق سب جج کا بیاہ رچایا جا رہا ہے تو تم میرے منھ پر تھپڑ مار دو گے — تمھارے ہاتھ سے کار کا وھیل چھوٹ جائے گا اور پھر حادثہ ہو جائے گا — حادثہ! اور میں مرنا نہیں چاہتا، اگرچہ میری ساری زندگی پارک میں جُوتیاں چٹخاتے گزری ہے۔

شفیق: ارے بکواس بند کرو۔

محمود: تم ایک احمقوں کی جنّت میں بستے ہو۔ یہ تمھاری تین سوچپن ہے نا — یہ کریم رنگ کی کار جو ابھی فراٹے بھرتی ہوئی پارک اور دلشاد کی طرف جائے گی، یہ اس کی شادی ہو رہی ہے — تم جنّت الحمقا میں بستے ہو شفیق —

شفیق: دیکھو محمود! میں عقلمندوں کے جہنم کا قائل نہیں۔ تم نے ہمیشہ احمقوں کی جنّت پر غور کیا ہے۔ عقلمندوں کے جہنم کو کبھی تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھا...... اس وقت کوئی بھی دعویٰ سراسر بے معنی ہوگا۔ لیکن میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ شفیق احمد ہوگا کہ بتول سے شادی کرے گا — میاں احسان الحق سب جج ہر دوئی نہیں۔ یہ شفیق احمد ہوگا جو دلشاد کوٹھی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگا۔ اس کریم رنگ کی تین سوچپن کا بیاہ نہیں رچایا جائے گا۔ بلکہ اس شخص کا جس کی جیب میں تین سوچپن کا لائسنس پڑا ہے۔ شادی کے بعد ایک شاندار ولیمہ اور پھر دعوتیں۔ ایک بڑی دعوت میں سب اپنا اپنا تعارف کرائیں گے۔ تمھیں خاص طور پر مدعو کیا جائے گا اور تمھارے یہ خرگوش سے کان، بتول کو اپنے آپ کو فخر سے مسز شفیق احمد کہتے ہوئے سُنیں گے۔ خر کی بجائے خرگوش اس لیے کہتا ہوں کہ تم میرے منھ پر ایک تھپڑ دو گے اور پھر — حادثہ! — اور کون خبیث ہے جو مرنا چاہتا ہے۔

(دونوں مل کر ہنستے ہیں)

محمود: چلو پھر، مجھے پارک تک چھوڑ آؤ۔

شفیق: میرا تم کو برادرانہ مشورہ ہے — اب خرید لو نئے جُوتے۔ یہ تو گھِس کر ختم ہو چکے۔

محمود: دفان ہو جاؤ — جُوتوں کی بجائے میں کار کے لیے سہرے خریدوں گا۔

شفیق: حسد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے تمھاری باتوں میں۔ میں آج کار کو بورڈ اسکول کے میدان ہی میں کھڑا کر جاؤں گا تا کہ میں شفیق اور فقط شفیق احمد بن کر ہی بتول کے ہاں جا سکوں — تین سوچپن کا مالک بن کر نہیں۔

(جاتے ہیں)

منظر دوم

دلشاد کوٹھی کا ایک کمرہ، جو کہ تصویروں وغیرہ سے آراستہ پیراستہ ہے۔ کمرے کے ایک طرف کلاک لٹک رہا ہے جو کہ اس وقت پانچ بج کر چالیس منٹ کا وقت بتا رہا ہے۔ دائیں کونے میں ایک بڑی سی ہارمونیم کی پیٹی پڑی ہے۔ چاندنی کو لپیٹ کر ایک طرف رکھا ہوا ہے، حمید ایک نو سالہ چھوکرا کرسی پر چڑھ کر بجلی کا بلب اُتارنے کی کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کریمن ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی قینچی ہاتھ میں لیے کسی کپڑے کی کتر بیونت میں مشغول ہے —

اسٹیج کے عین سامنے ایک صوفہ پڑا ہے جس میں نفیس تکیہ اور سرہانے دلشاد والوں کی نفاست کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک کرسی ہارمونیم کی پیٹی کے پاس پڑی ہے۔ دو تین کُرسیاں اس انداز سے دھری ہیں کہ وہ بُری نہیں معلوم ہوتیں۔ جوں جوں کردار کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں، حسبِ مرتبہ بیٹھتے جاتے ہیں۔

اواخر تمثیل میں ٹوسٹ سے پہلے دلشاد میں خوب ہماہمی اور شور پیدا کیا جائے تاکہ بعد کی خاموشی اس شور کے پسِ منظر، زیادہ خاموش اور افسردہ دکھائی دے۔

(بائیں طرف سے شفیق کی آواز آتی ہے)

شفیق: حمید! — حمید بھائی — اکرم!

(حمید کُرسی پر سے اُتر کر ناچنے اور تالیاں پیٹنے لگتا ہے)

حمید: (دائیں طرف آواز دے کر) اماں جان! شفیق بھائی جان آ گئے...... فرحت، زینت! شفیق بھائی جان آ گئے — آپا —

اماں جان: (گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوتی ہیں) کریمن! اری کریمن! — صبح سے پیٹ رہی ہوں چاندنی بچھا دے پھر سے —

کریمن: کیسے بچھا دیتی میں بی بی جی — حمید پھر چڑھ آئے گا ننگے پانو چاندنی پر۔

اماں جان: (دانت پیستے ہوئے) اری اُس ناشدنی کو تو میں نے دیر سے منع کر دیا ہے۔

کریمن: اور یہ کپڑے کی بیونت —

اماں جان: جائے چولھے میں کپڑے کی بیونت ۔ جانے چاندنی بچھانے میں برس لگتے ہیں۔ تیرے بدن میں تو جیسے کیڑے پڑ گئے ہیں (بائیں طرف آواز دے کر) آؤ شفیق بیٹا، آؤ شفیق بیٹا—

شفیق: (اندر آتے ہوئے) سلام عرض کرتا ہوں، اماں جان!

اماں جان: جیتے رہو بیٹا! اللہ عمر دراز کرے (کریمن کی طرف منہ کر کے) دم نکل جائے کھڑے کھڑے تیرا...... کریمن بندی ......تُو تو کوئی کام بھی نا کرتی ۔ (دائیں طرف سے فرحت اور زینت بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہیں ۔ اُن کی عمر بالترتیب گیارہ اور تیرہ سال ہے۔ جہاں اماں جان کے چہرے اور اُن کی باتوں سے بناوٹ اور لگاوٹ ٹپکتی ہے۔ یہ لڑکیاں قدرے گستاخ اور معصوم دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں نے قریب قریب ایک ہی طرح سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ صرف فرق ہے تو یہی ہے کہ فرحت ننگے سر چلی آئی ہے اور زینت کے گلے میں چُندری پڑی ہے)

فرحت: شفیق بھائی جان!

زینت: شفیق بھائی جان!

شفیق: ہلو، ہلو—— کیا کر رہی ہو تم؟

اماں جان: ٹھہر جاؤ بیٹا! ابھی چاندنی بچھواتی ہوں۔ (کریمن کے ساتھ مل کر چاندنی بچھانے لگتی ہیں۔ شفیق بھی اُن کی مدد کرتا ہے) حمید صبح سے کیچڑ میں پانولت پت لیے پھرتا ہے (قہر آلود نگاہوں سے حمید کی طرف دیکھتی ہے) اسی لیے چاندنی اُٹھوا دی تھی (یک لخت غصہ میں آ کر) اور صبح سے کہہ رہی ہوں اس کریمن بندی کو— بچھا دے، بچھا دے— لیکن جانے کر کیا رہی ہے۔ (آنا فاناً چہرے میں چمک، اور لہجے میں شکایت پیدا کرتے ہوئے) اور تم تو بس عید کا چاند ہو گئے، رُوٹھ گئے ہم سے کیا؟

شفیق: استغفر اللہ!— اماں جان! میں اور آپ سے ناراض ہو جاؤں۔

اماں جان: لے دے کر میں نے تمھیں ایک بیٹا بنایا تھا (آواز میں رقت پیدا کر لیتی ہیں) حمید اور اکرم کی نالائقیوں پر تو مجھے رونا آتا ہے۔

شفیق: (مجرمانہ انداز میں) میں خود محسوس کر رہا تھا، اماں جان! لیکن ان دِنوں بہت مشغول ہوں۔ آخری سال ہے کالج میں —— لیکن ہیں! آپ کی تو آنکھوں میں پانی اُمڈ آیا۔ میں اِن جذبات کے لیے آپ کا کتنا احسان مند ہوں، اماں جان! آپ مجھے میری ماں سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں اور جو عورت اپنی ماں سے بھی زیادہ پیار کرنے لگے......

اماں جان: (بھرائی ہوئی آواز میں) تو وہ کٹنی ہے، یہی کہنے لگے تھے نا تم؟

شفیق: نہیں نہیں اماں جان —— میں کہنے لگا تھا ——

اماں جان: بدل گئے نا۔ اب میں تمھیں اپنا سینہ چیر کر کیسے دکھاؤں؟ —— سچ ہے، پرائے بھی کبھی اپنے ہوئے ہیں ——

شفیق: دیکھیے اب آپ نے اتنی جلدی پرایا بھی بنا دیا، اماں جان! مجھ سے قصور ہوا۔ خطادار ہوں۔ دراصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ حقیقی ماں بھی ہر ایک بیٹے سے یکساں محبت نہیں کرتی۔ مثلاً میری اماں جان چھوٹے امجد کو ہی چاہتی ہیں اور میں تو ان کی نگاہوں میں جچتا ہی نہیں۔

(سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں)

اماں جان: ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن میں اس کے اُلٹ ہوں۔ مثلاً میں بتول کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتی ہوں۔ حالانکہ وہ تمھاری طرح گھر میں سب بچوں سے بڑی ہے۔

زینت: (شکایت کے لہجے میں) اماں جان بہت طرفداری کرتی ہیں آپا کی۔

فرحت: سر چڑھا لیا ہے آپا کو۔

اماں جان: اب لو! یہ مجھ پر جانبداری کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن بتول مجھے پسند ہی آ گئی نا۔ اب میں کیا کروں۔ یہ کوئی میرے بس کی تھوڑے ہی ہے۔ کیا ٹھہری ہوئی لڑکی ہے۔ کیسا ہاتھی دانت کا بنا ہوا چہرہ ہے —— مجھے تو بس گُڑیا سی دکھائی دیتی ہے، زینی کہاں ہے وہ؟

زینت: کون کہاں ہے —— آپا جان ——؟

فرحت: آپا اِدھر نہیں آئیں گی۔ وہ آپ سے رُوٹھ گئی ہیں، شفیق بھائی جان!

شفیق: میں نے تو رُوٹھنے والی کوئی بات نہیں کی۔

فرحت: آپ آئے کیوں نہیں اتنے روز سے۔ رُوٹھی ہوئی تو میں بھی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آپ ہی آپ اِدھر چلی آئی۔ جب یہاں آ پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ میں تو رُوٹھ گئی تھی——

(سب ہنستے ہیں)

شفیق: شاید وہ بھی تمھاری طرح بھول کر چلی آئیں۔

زینت: اُوں! منھ دھو رکھیے۔

اماں جان: اری کریمن! بتول کہاں ہے؟

کریمن: (دائیں طرف جھانکتے ہوئے) منھ دھونے گئی ہیں بی بی جی——!

شفیق: (ہنستے ہوئے) بہت اچھا کریمن——

کریمن: ذرا چاندنی کے شکن نکالنے دیجیے نا۔

حمید: بھائی جان یاد ہے آپ نے مجھے غلیل سکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد آپ ایسے غائب ہوئے جیسے—— جیسے گدھے کے سر سے سینگ——

اماں جان: (حمید کو چپت دکھاتے ہوئے) ارے چُپ رہو بدتمیز! تمھیں بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔

حمید: یہ سلیقے ولیقے تم عورتوں کو ہی مبارک ہوں، اماں جان! میں جھوٹ تھوڑے ہی کہتا ہوں۔

زینت: ارے بکو مت۔

حمید: تم مت بکو۔

زینت: ہات چھوڑ بیٹھوں گی بس۔

اماں جان: ہاں ہاں لگا دے۔ دیکھتی کیا ہے مُردار—— ناک میں دم کر رکھا ہے اِس ناشدنی نے۔

حمید: اچھا یوں سہی۔ اس کے بعد آپ ایسے رفو چکر ہوئے کہ کوئی پتہ وتہ ہی نہیں اور نشانے نشانے میں مَیں نے دھوبی کے بیٹے چندوا کی آنکھ پھوڑ ڈالی اور دھوبی نے مجھے بہت

مارا بھائی جان! (رونے لگتا ہے) آپ ہوتے تو مجھے چھڑا دیتے۔ یہ بُزدل اکرم تو پاس کھڑا تماشا ہی دیکھتا رہا۔ بلکہ کہنے لگا—اور مارو اِس ہاتھ چھوڑ کو—اب آپ اکرم سے بدلہ لیں تو میرے بھائی جان—ورگرنہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ آپا بتول چھوڑ خواہ آپ کی شادی کریمن سے—(سب ہنستے ہیں۔ زینت شرما کر چُندری سے منہ ڈھانپ لیتی ہے)

کریمن: (شرماتے ہوئے) ارے چل ہٹ! بے شرم کہیں کا۔ بی بی جی......

اماں جان: تجھے وہ پیٹوں گی حمید کہ یاد رکھے گا عمر بھر......

کریمن: یہ چھوکرا بڑا جبان دراج ہو گوا بابو جی۔ اب یہ قبر ماں سادی رچائے میری۔

حمید: ناحق ناراض ہو گئیں بی کریمن! میں نے یہ سچے دل سے کہا تھا۔ اس لیے کہ میں تمھیں آپا سے زیادہ پسند کرتا ہوں— آپا بتول کو تو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔

اماں جان: (اُونچی آواز میں) ارے بے حیا، خاموش ہو گا یا نہیں؟

شفیق: نہیں نہیں اماں جان۔ اسے کچھ نہ کہیے۔ معصوم بچہ ہے ابھی تو۔

اماں جان: جی ہاں، معصوم ہی تو ہے۔

حمید: اور جو بیاہ شادی بُری ہی بات ہوتی ہے تو آپا کو کیوں اسی کنوئیں میں دھکیلنے لگے ہیں آپ لوگ؟

کریمن: ارے چھوٹے میاں ٹخنے جتنے اونچے ہو اور باتیں کیا بناتے ہو۔

زینت: یہ حمید تو فتنہ ہے فتنہ۔

حمید: یہ زینت تو بس پارہ ہے پارہ۔

اماں جان: (حمید کے گالوں پر چپت جماتے ہوئے) اب یہ ٹھیک ہو گا کمبخت۔

(حمید روتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے)

کریمن: (ڈر کر) بی بی جی، میں چلتی ہوں— بہت کام ہے باورچی خانے میں (جاتی ہے)

زینت: اماں جان! آپ نے ناحق اسے مارا۔

اماں جان: اری چل ہٹ کُٹنی! آپ ہی سرہو رہی تھی اور اب آپ ہی—

فرحت: مارنے کوتھوڑے ہی کہا تھا۔

(زینت منھ بسورنے لگتی ہے)

اماں جان: اری اِدھر آ، منھ بسورنے لگی—— دیوانی!

(زینت کو بغل میں لے لیتی ہے)

چُپ کر، شفیق بھائی کے سامنے روتی ہوئی اچھی لگتی ہے تو؟

شفیق: اماں جان! آپ نے زیادتی کی—— اور پھر کریمن کے سامنے آپ کو اسے نہیں مارنا چاہیے تھا۔

اماں جان: دیکھتے نہیں تھے کیا کہہ رہا تھا۔ (بات کا رُخ پلٹتے ہوئے) اور——ہاں، ان کے ابا جان تمھیں بہت دنوں سے یاد کر رہے ہیں۔ تسبیح پھیرتے ہیں وہ تو تمھارے نام کی، تمھیں دیکھ کر ٹھنڈ پڑ جاتی ہے ان کے کلیجے میں۔ کہتے ہیں: اللہ کسی کو بیٹا دے تو شفیق جیسا، نا کہ اکرم اور......

شفیق: ابا جان کی بندہ نوازی ہے۔ وگرنہ میں تو،......

(اکرم، عمر پندرہ سال، زینت اور فرحت سے بڑا، بتول سے چھوٹا داخل ہوتا ہے اور شفیق کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

اماں جان: کون ہے——؟ اکرم؟

اکرم: آداب عرض، بھائی جان——امی! اُس دن بہت سیر کروائی تھی کار پر بھائی جان نے۔

زینت: آج ہماری باری ہے گھومنے کی۔

اکرم: لیکن بڑی مدت بعد آپ کا آنا ہوا۔ اُس دن کے بعد راہ دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں ہی پک گئیں۔

فرحت: اور اُس دن آپ مجھے پیچھے ہی چھوڑ گئے۔ میرا بھی کار کی سیر کو بہت جی چاہتا تھا۔

اماں جان: شفیق بیٹا! ایک بات تو پوچھی ہی نہیں۔ کہو اماں جان تو راضی ہیں نا؟ اور ابا جان اور تمھاری آپا امتل اور ننھے میاں اور کون کون ہے وہاں——؟

شفیق: اور؟......اور امجد اور رفیق اور خالدہ اور...... مجھے خود بھی کچھا تنا یاد نہیں۔ یہ جانتا ہوں

کہ وہ سب راضی خوشی ہیں۔ امجد مینڈک کی طرح ٹرّاتا ہے اور خالدہ ایک پُر شکم بھینس کی طرح پھنکارے مارتی ہے۔

(دائیں طرف سے ایک بزرگانہ آواز آتی ہے۔ اے کِدھر گئیں تم؟)

اماں جان: جی آئی۔ ابھی آتی ہوں۔ بیٹا! حمید کے ابا جان بُلا رہے ہیں۔

(جاتی ہیں)

فرحت: اب پھر کب سیر کروائیں گے؟

زینت: اس دفعہ بڑی دُور کی سیر ہوگی۔

اکرم: کیا دلّی تک کی؟ (دائیں طرف دیکھتے ہوئے) لو آپا بتول آگئیں۔ میں چلتا ہوں۔ یہ ہر بات پہ مجھے ضرور کاٹیں گی۔ جو کہوں اس کے خلاف ــــــ

(بتول بڑی طمانیت کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ سترہ سال کی عمر ہے، شباب کا عالم ہے۔ چمکیلے سیاہ بال عمداً بکھیر رکھے ہیں اور دوپٹا ایک لااُبالیانہ انداز سے شانوں پر ڈال رکھا ہے)

شفیق: ارے مت جاؤ تم۔

اکرم: نہیں بھائی جان۔ آپ جانتے نہیں۔ ہم دونوں ایک پل بھر بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

(بھاگ جاتا ہے)

فرحت اور زینت: شفیق بھائی جان آئے ہیں آپا۔
شفیق بھائی جان آئے ہیں آپا۔

بتول، شفیق: (ایک ساتھ) السلام علیکم۔

بتول، شفیق: (ایک ساتھ) وعلیکم السلام۔

شفیق، بتول: (اکٹھے) مزاج اچھے ہیں...... جی ہاں۔

(سب ہنس دیتے ہیں)

شفیق: بہت دنوں سے میں نے آپ کو کالج جاتے نہیں دیکھا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟

بتول: جی نہیں۔ تین دن سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کل کچھ افاقہ تھا۔ لیکن ہفتے کے روز وہاں

گروپ میٹنگ کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ میرے نام انھوں نے ایک مضمون مڑھ دیا تھا۔ شادی کے جواز — اور مضمون تیار نہیں تھا۔

شفیق: بڑا مشکل مضمون ہے۔ میں اور آپ مل کر دو برس لکھتے رہیں تو مشکل سے ختم ہو۔

زینت: ایک مضمون کے لیے دو سال!

فرحت: دو سال؟

بتول: (ہنستے ہوئے) ...... اور پھر اتوار کو پردہ کلب میں جانا تھا۔ آپ نے تو اپنی امی جان سے سُن ہی لیا ہوگا۔ وہاں عورتوں نے سنگتروں اور کیلوں کے چھلکے ایک دوسری پر بے تحاشا پھینکے۔ یہ پردہ دار عورتیں بغیر پردے کی عورتوں سے زیادہ چھلکے پھینکتی ہیں۔

شفیق: زینت بہن! اس وقت کیا بجا ہوگا۔ میری گھڑی ٹھیک کام نہیں کرتی۔

بتول: وہ دیکھیے سامنے۔ اس وقت چھ بجنے میں دس منٹ ہیں۔ کیوں، وقت کو کیا کہنا ہے؟

زینت: ہاں وقت کو کیا کہنا ہے؟

فرحت: وقت کو......

بتول: ابھی آئے اور ابھی وقت بھی پوچھنے لگے۔ اگر چہ میں خود بھی یہاں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہوں۔ اگر کہیں سیر کا ارادہ ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔

زینت: میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔

فرحت: آپا! میں بھی پیچھے نہیں رہوں گی۔

شفیق: میرا ارادہ پکچر دیکھنے کا ہے۔ شہر میں ایک بہت اچھی پکچر آئی ہے بتول — ''تمھارا گھر'' نام — یہ دلشاد کو بھی نہیں۔ خدا جانے کیا بلا ہے —!

بتول: کچھ بلا کیوں ہوگی، شفیق وَلا ہوگا۔

(ہنستے ہوئے)

زینت: (لاڈ سے) پکچر میں بھی جاؤں گی، آپا!

فرحت: میں بھی جاؤں گی، شفیق بھائی جان! وگرنہ —

بتول: خاموش! تم سب کی سب تیار ہو جاتی ہو۔ کیا یہ شریف زادیوں کا وطیرہ ہے؟

زینت: اور آپ ——

بتول: خاموش! (شفیق سے) میں ''تمھارا گھر'' دیکھنا چاہتی ہوں۔ بڑا مزہ رہے گا۔

شفیق: (ہنستے ہوئے) میرا گھر دیکھو گی تو بہت مزا رہے گا۔

بتول: چلو ہٹو۔

شفیق: اب بنتی کیوں ہو۔ دیکھو گی تم ضرور۔

زینت: (پُرشکوک انداز سے) تمھارا مطلب پکچر سے ہے نا؟

بتول: تو اور کیا؟

شفیق: تم کیا سمجھنے لگیں؟

فرحت: (مبہم سی خوشی کے ساتھ) جب شفیق بھائی آتے ہیں تو ہمارے ہاں خُوب رونق ہو جاتی ہے۔ پروگرام مرتب ہونے لگتے ہیں۔

بتول: یہ تم نے بہت گاؤدی بات کی ہے۔ آخر یہ تو سبھی جانتے ہیں۔

فرحت: آپا تمھیں میری کوئی حرکت پسند بھی آتی ہے؟ میں نہیں بیٹھتی تمھارے پاس۔ جب کوئی کسی کو بُرا لگنے لگے تو وہ (گھبرا کر) بہت بُرا لگنے لگتا ہے۔

(سب ہنس دیتے ہیں)

شفیق: بتول! بھئی میں آج تم سے وہ گانا سنوں گا — پیا ہنس بنو اور چُگ جاؤ...... وہ جو تم نے وِملا سے سیکھا ہے۔

بتول: آپ کا مطلب ہے کہ میں نے کیوں ابھی تک آپ سے گانے کی فرمائش نہیں کی۔

شفیق: مجھے گانا آتا ہی کب ہے — میں تو صرف غسل خانے کا گویا ہوں۔

بتول: جی آں! اور وہ —— کوئی میرے دل سے پوچھے......؟

(محبت اور تحسین کی نگاہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

شفیق: چھوڑو! تمھاری سُریلی آواز کے سامنے ——

بتول: جی ہاں۔ بڑے بڑے پہلوان دم نہیں مارتے!

زینت: ٹھیریے میں ابھی آئی (دائیں طرف چلی جاتی ہے)

بتول: آپ گائیے۔

شفیق: جی نہیں۔یہ گانے کی فضا نہیں ہے۔

(زینت ایک ٹب لیے ہوئے داخل ہوتی ہے)

بتول: لیجیے زینت غسل خانے کا ٹب لے آئی ہے۔اب تو فضا موافق ہے نا؟

(ہنستے ہیں)

شفیق: اچھا لو۔ (اٹھ کر پٹی پر آبیٹھتا ہے)

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو

یہ خلش ——

(گلے کو ملتے ہوئے) اُوہوں......اُوہوں۔آج میرے گلے میں خلش ہے۔

بتول: قاعدے کی رُو سے تو جگر میں ہونی چاہیے۔

فرحت: اجی سنائیے بھی۔

زینت: ٹب میں پانی ڈال دوں؟

شفیق: —— کوئی میرے دل سے پُوچھے، تیرے تیر نیم کش کو

یہ خلش ——

(دھپ سے اپنے دونوں ہاتھ سروں پر رکھ لیتا ہے اور بے ہنگم آوازیں پیدا ہوتی ہیں)

(بقیہ نثر میں)

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔آج میں نہیں گا سکتا،تم ہی سناؤ کچھ۔

بتول: لیجیے۔لیجیے۔

(اُٹھ کر پٹی پر بیٹھ جاتی ہے اور شفیق کا پسندیدہ گیت گاتی ہے شفیق قریب کھڑا انہماک سے سُنتا ہے)

پیا ہنس بنو اور چگ جاؤ بکھرے ہوئے موتی جوبن کے

جی یہ جوانی آئی ہے

ہونٹوں پہ کہانی آئی ہے
یوں دِن بھی تو ہیں ساون کے

پیا ہنس بنو اور مجگ جاؤ ——————

شفیق: مارولس! تم اپنی فارم میں ہو بتول۔

بتول: جیسے آپ کرکٹ کے روز تھے۔

فرحت: آج آپا نے بہت اچھا گایا۔

بتول: اب تو سیر کی مستحق ہوں اور پکچر کی (پلٹ کر) آپ کا یہ سُوٹ خُوب ہے، کٹ کتنی اچھی ہے۔

فرحت: اور سُرخ ٹائی بھی خوب ہے۔

شفیق: جی ہاں، اچھا خاصا بندر بنا رکھا ہے تم لوگوں نے مجھے۔

بتول: یہ بندر کب سے گیبرڈین کے سُوٹ پہننے لگے؟

شفیق: شاید تم نے بندر کبھی نہیں دیکھا۔ بندر تو ازل سے گیبرڈین کا سوٹ پہن رہے ہیں۔

بتول: اور بندر سُرخ ٹائی بھی پہننے لگے ہیں!

شفیق: نہیں نہیں میرا مطلب ہے...... یہ ابّا جان کی آواز آ رہی ہے؟ ابّا جان کو بھی سینما لے جائیں گے۔

بتول: ابّا جان نہیں جانے کے۔

شفیق: اصرار سے مان جائیں گے۔

فرحت: بھائی جان کے کہے شاید چلے جائیں۔

زینت: ابّا جان کسی کو سینما جانے سے منع نہیں کرتے۔ وہ اسے پسند کرتے ہیں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکیں تو ...... لو! ابّا جان، اماں جان اور اکرم آ رہے ہیں۔

(ابّا جان، ایک بزرگ اور برگزیدہ انسان بڑے پُر وقار انداز سے داخل ہوتے ہیں اور شفیق کے پاس صوفے میں دھنس جاتے ہیں۔ ان کے

ساتھ اماں جان اور اکرم بھی ہیں۔ اماں جان کے ہاتھوں میں ایک نفیس پاندان تھما ہے)

شفیق: (اُٹھ کر) آداب عرض کرتا ہوں، ابا جان!

ابا جان: اللہ عمر دراز کرے بیٹے! کیا بات تھی آتے نہیں تھے تم۔ گھومتے گھامتے کبھی اِدھر بھی شکل دکھا گئے۔ حمیدؔ کی اماں جان کی طرف مخاطب ہو کر کوئی چائے وائے بھی پلائی ہے تُم نے؟

شفیق: یہاں کوئی تکلف تھوڑے ہی ہے۔ ابا جان! میں خود مانگ کر پی لیتا چائے!

اماں جان: (گھبرا کر) شفیق آتا ہے تو میں کھوسی جاتی ہوں۔ کریمن! اری او کریمن۔

کریمن: (دور سے) کیا حکم ہے بی بی جی؟

اماں جان: اری چاء بنادو جلدی سے۔

کریمن: (دور سے) میں نے پہلے ہی کیتلی رکھ دی ہے چُولھے پہ۔

اماں جان: بڑی ہوشیار عورت ہے۔

زینت: بڑی سیانی ہے۔

فرحت: بڑی موقع شناس ہے۔

بتول: میں تو اس کی قائل ہوں۔

ابا جان: بڑی اچھی ہے۔

کریمن: (دور سے) بی بی جی۔ بسکٹ ایک ہفتے سے ختم ہو رہے ہیں۔

بتول: یہ لیجیے۔

اماں جان: بس اس میں نقص ہے تو یہی ـــــ شفیق تو ٹھہرا بھلا اپنا۔ نہیں تو......

بتول: کیا یہ بات بُلا کر نہیں کہی جا سکتی تھی؟

فرحت: ہاں۔ موقع محل بھی نہیں دیکھتی۔

زینت: کتنی بے وقوف عورت ہے۔

ابا جان: آخر جاہل ہے۔

شفیق: بسکٹوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔اماں جاں؟ —— ہاں اگر ابّا جان چاہیں تو منگوا لیجیے۔

ابّا جان: نہیں نہیں بیٹا، میں تو بسکٹ نہیں کھتا۔ مجھے ڈاکٹروں نے میٹھا اور اسٹارچ کھانے سے منع کیا ہے۔

اماں جان: تو نہ سہی بسکٹ۔آج شفیق بیٹا کھانا یہیں کھائیں گے۔

ابّا جان: تو کیا پکایا ہے، آج شفیق بیٹا کے لیے؟

اماں جان: کیا پکایا ہے؟ پلاؤ۔آلوؤں والا پلاؤ اور فرنی اور......

ابّا جان: (وقار کھوکر) بہت خوب! مجھے آلوؤں والا پلاؤ بہت مرغوب ہے اور فرنی......

شفیق: لیکن ڈاکٹروں نے تو آپ کو اسٹارچ کھانے سے منع کیا ہے۔

ابّا جان: ارے بیٹا۔اتنا پرہیز بھی کیا ہے ساری زندگی پرہیز میں ہی گزر گئی اور اب میرا جی چاہتا ہے کہ ہر بات میں بد پرہیزی کروں۔ڈاکٹر جائیں جہنم میں۔

شفیق: لیکن صحت کا تو خیال رکھنا ہی چاہیے۔

ابّا جان: صحت جائے جہنم میں۔

زینت: (آہستہ سے شفیق کے کان میں) ابّا جان کے دماغ میں ہر وقت جہنم ہی رہتا ہے۔آخر یہ جہنم ہے کتنا بڑا؟

شفیق: (زینت کے کان میں) یہ دلشاد کے احاطے سے کیا بڑا ہوگا۔(دونوں ہنستے ہیں)

ابّا جان: بعض وقت تو جی چاہتا ہے کہ تمام وہ کام کیے جائیں جو ڈاکٹروں نے منع کیے ہیں۔ انسان کچھ اپنی موت سے محبت کرنے لگتا ہے۔

اماں جان: دیکھیے۔آپ بہت بڑھ رہے ہیں۔

شفیق: ابّا جان ! آپ اور اماں جان آج میرے ساتھ پکچر دیکھنے چلیں۔ دیکھیے میری درخواست کو ردّ نہ کیجیے گا۔

ابّا جان: اب کہاں کھیل تماشے کے ہیں ہمارے دن؟......لیکن چلا جائے۔ کیوں کیا خیال ہے، تمھارا حمید کی اماں؟

اماں جان: جیسے آپ کہیں، اور پھر شفیق نے کب کب کہنا ہے۔

شفیق: سب جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔

ابّا جان: دفتر سے کچھ کاغذات لایا ہوں۔ ذرا انھیں سنبھال کر رکھ لوں۔ اور پھر ایک چٹھی لکھ لوں۔

اماں جان: (خوش ہوکر) بہت مدت کے بعد جاؤں گی آج بائیسکوپ دیکھنے۔

بتول: پکچر اچھی ہے۔ اماں جان —— "تمھارا گھر"

شفیق: تعریف تو بہت سُنی ہے۔ سُکھ من کام کرتی ہے اور اُس کے مقابل شریف حسین وغیرہ......

ابّا جان: اے ذرا پاندان ادھر بھی —— پان کھاؤ گے شفیق بیٹا؟

شفیق: میرے گلے میں خلش ہے ابّا جان۔

ابّا جان: اسی لیے تو کہتا ہوں۔

(اماں جان ایک گلوری شفیق کو پیش کرتی ہیں)

زینت: اس میں ملیٹھی ڈال دیجیے اماں جان۔

(ملیٹھی ڈال کر ایک گلوری شفیق کو اور ایک ابّا جان کو پیش کرتی ہیں)

شفیق: بتول، زینت، فرحت اور ہاں اکرم، بھئی تم سب دیر لگا رہے ہو۔ اب تو چھ ہو گئے۔ اگر اس رفتار سے سب تیار ہونے لگے تو سینما پہنچ لیے۔

بتول: اُس دن تو ایک منٹ میں پہنچ گئے تھے۔

شفیق: دو میل ہے یہاں سے، ایک منٹ میں کیسے؟

بتول: کار کے آگے بھلا یہ راستہ کیا ہے؟

اماں جان: ہاں۔ کار کے آگے بھلا کیا ہیں دو میل؟

زینت: بڑی تیز جاتی ہے۔

اکرم: اُڑتی ہے۔

ابّا جان: یوں دکھائی دیتا ہے، جیسے کار میں بیٹھے سب آدمیوں کو پر لگ گئے ہیں۔

(سب کے چہرے چمک رہے ہیں)

شفیق: (بے کیفی سے) اجی کار کہاں؟ میں تو پیدل ہی آرہا ہوں اب۔

(سب کے چہروں پر سیاہی سی چھا جاتی ہے)

بتول: کیا خراب ہو گئی کار؟

ابا جان: پھر وہی پُرزہ بگڑ گیا۔

اماں جان: پھر دہلی جانا پڑے گا کیا؟

شفیق: نہیں اماں جان۔ بِک گئی۔

ابا جان: کیا کوئی نئی خریدنے کا ارادہ ہے؟

اماں جان: اے ہے۔ کوئی اتنی پُرانی بھی تو نہ تھی۔

بتول: نیو ماڈل خرید رہے ہیں۔

ابا جان: ہاں! کوئی نیو ماڈل خرید رہے ہوں گے میاں احسان الحق — اب ہردوئی کے سب جج کی شان کے شایاں نہیں وہ کار۔

شفیق: اجی کہاں، کار سے بمشکل قرضہ چکایا گیا ہے۔

اماں جان: قرضہ؟

ابا جان: قرضہ؟

زینت: قرضہ؟

بتول: کیسا قرضہ؟

اماں جان: سچ کہتے ہو......؟

(سب کے چہروں پر مُردنی سی چھا جاتی ہے)

شفیق: اب آپ تو اتنے قریب ہیں۔ بھلا آپ سے کیا چھپاؤں۔ ابا جان کو جُوئے کی بہت بُری عادت ہے۔

ابا جان: کیسا کہا؟ جُوئے کی عادت ہے میاں احسان الحق سب جج ہردوئی کو — یعنی جُوئے کی عادت ہے؟ —!

شفیق: جی ہاں! اگرچہ وہ بہت مہذب ہوا ہے۔ برج، پریل، پتنگ۔ سب بڑی بڑی جگہوں میں جا کر وہاں سینکڑوں کے نہیں، ہزاروں کے داؤ لگاتے ہیں۔
——اب دیکھیے، مجھ میں ایک بھی ایسی عادت نہیں۔

ابّا جان: زیادہ مقروض آدمی تو سرکاری ملازمت میں رہ ہی نہیں سکتا۔

شفیق: ابھی سرکاری حلقوں تک کچھ بھی نہیں پہنچا اور پھر دُور تک رسائی ہے اُن کی۔ لیکن میں نے پیچھے پڑ کر اپنے آپ کو عاق کروالیا ہے، تاکہ ان کا کوئی قرضہ مجھے اپنی زندگی میں ادا نہ کرنا پڑے۔

اماں جان: کار بھی بِک چکی ہے اور تم نے اپنے آپ کو عاق کروالیا ہے— تم نے بچپنا کیا ہے شفیق! میاں صاحب کے تین چار مکان جو ہیں اور پھر تمھارے نام پر ایک کوٹھی بھی ہے۔

بتول: شفیق وِلا—

ابّا جان: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور پھر اس شہر میں ہم سے سب کچھ چھپا رہے۔

شفیق: اب آپ کیا پُوچھتے ہیں ابّا جان! گھروں کے بس پردے ہی ہوتے ہیں۔
——شفیق وِلا بھی رہن رکھا ہوا ہے اور مکانوں کا بھی جھگڑا ہے۔

ابّا جان: شفیق وِلا بھی رہن ہے—— لیکن تمھارے مکان تو جدی ہیں۔

شفیق: جی ہاں صرف ایک ہے۔ اور وہ بھی بہت خستہ حالت میں۔ اگر آپ اُسے بچا ہوا کہہ سکتے ہیں تو کہہ لیں۔

اماں جان: تو کچھ بھی نہ ہوا۔

شفیق: قرضہ کافی ہے۔ لیکن یہ چیز مجھ پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتی۔ میری صحت اچھی ہے۔ تعلیم ہے۔ آخری سال پاس کر کے کالج میں لیکچرر نہیں تو ڈیمانسٹریٹر تو ضرور ہو جاؤں گا۔ ڈیڑھ سو کے قریب تنخواہ پاؤں گا۔ بڑے عیش کی زندگی رہے گی۔

ابّا جان: واقعی تم نے بچپنا کیا۔

اماں جان: آخر تم بھی میرے حمید اور اکرم کی طرح ہی نکلے نا۔

شفیق: میں تو کہتا ہوں کہ ان حالات میں میں نے بہت عقلمندی کی، وگرنہ ساری عمر ان کا قرضہ ادا کرتا رہتا۔

اماں جان: اچھی! عقلمندی ——— اور سو ڈیڑھ سو میں آجکل بنتا کیا ہے۔ کیا ڈیڑھ سو میں تم کار رکھ لو گے؟

ابا جان: ہاں۔ کار تھوڑے رکھی جاتی ہے۔

زینت: ہونہہ، کار!

فرحت: ہونہہ، کار!

اکرم: میں کہتا ہوں۔ آپ بائیسکل بھی نہیں رکھ سکتے۔

شفیق: ساری عمر آدمی ڈیڑھ سو پر تھوڑے ہی رہتا ہے۔ میرے والد صاحب جب نوکر ہوئے تو ان کی تنخواہ بہت ہی قلیل تھی۔

ابا جان: لیکن وہ ڈیڑھ سو بھی غیر یقینی ہے۔

شفیق: یقینی! ــــ پرنسپل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے ——— اور اس کے علاوہ میں کبھی کبھی ریڈیو پر گا بھی آتا ہوں۔ اُس کے بھی پیسے ہو سکتے ہیں۔

ابا جان: اجی رہنے دیجیے۔ اُن چھٹکل پیسوں سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھو میری اڑھائی پونے تین سو تنخواہ ہے۔ کوٹھی ہے۔ ایک آدھ مکان ہے، جس کا کرایہ وصول کرتا ہوں۔ لیکن بایں ہمہ میں کار نہیں رکھ سکتا۔ کار کا خرچ معمولی تو ہوتا نہیں ہے۔

شفیق: ابا جان! آپ غور فرمائیں۔ ایک اچھی زندگی کے لیے کار کیا ضروری ہے؟

ابا جان: یہ میں نہیں کہتا، لیکن......لیکن......

اماں جان: آخر ہوتا ہی ہے نا شفیق......

ابا جان: پہلے تو تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔

شفیق: اب جو کر دیا ابا جان۔ ایک ہی بات تو ہے۔ پیشتر اس کے کہ بہت دیر ہو جائے، میں نے آپ سے معاملہ وضاحت سے عرض کر دیا۔ لیکن آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں صحت مند ہوں۔ میرے پاس ہُنر ہے۔ میرے پاس تعلیم ہے۔ میں فوراً کسی کالج میں

لگ جاؤں گا اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ والد صاحب نے مجھے ہر قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا ہے۔ یوں وہ آدمی بہت سمجھدار ہیں۔ مجھے قرضے ورضے کی لعنت سے بچانے کے لیے انھوں نے خود ہی یہ راستہ تجویز کیا تھا۔ قانون کی زد سے بچانے کے لیے اُن سے زیادہ واقف کار کون ہوگا؟ ......اچھا، میں آج اماں جان کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ آپ اُن سے کسی تاریخ کے لیے اصرار کر رہی تھیں ——— لیکن انھیں بہت مصروفیت تھی۔ اس لیے آپ کی بات کو توجہ سے نہ سُن سکیں۔ آج آپ تاریخ بتا دیں۔

اماں جان: یہی شادی کی تاریخ نا۔

شفیق: اوہو! مجھے علم نہیں تھا کہ تاریخ شادی کے سلسلے میں پوچھی تھی۔

اماں جان: لیکن اتنی بھی جلدی کیا ہے شفیق؟

ابّا جان: میں نے اپنے والد سے بھی مشورہ کرنا ہے نا۔ آخر وہ بزرگ آدمی ہیں۔ کہیں گے میری رائے ہی نہیں لی گئی۔ انھیں تبرکاً پوچھ لیا جائے گا۔ اور پھر ——— نکاح کی تاریخ......

شفیق: بالکل، ابا جان، بالکل ——— مجھے معلوم نہ تھا۔

بتول: پھر میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اماں جان!

اماں جان: تو تم جا کر گرم گرم چاء پی کر لیٹ جاؤ۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

شفیق: اور پکچر؟ ——— خیر، اگر طبیعت درست نہیں تو نہ سہی۔

ابّا جان: ٹھہرو بتول بیٹا، میں بھی چلتا ہوں۔

شفیق: آپ بھی نہیں جائیں گے، ابا جان؟ ابھی ابھی آپ جانے کے لیے تیار تھے۔

ابّا جان: نہیں شفیق میاں! گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہو تو خاک لُطف آئے گا پکچر کا۔ اور یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ میں آج دفتر کا بہت سا کام گھر لے آیا ہوں۔ تم یقیناً مجھے معاف کر دو گے شفیق بیٹا.....کبھی کبھی آیا کرو۔ اس اگلے مہینے تو ہم سب گانو جا رہے ہیں.....کہیں مئی جون میں آئیں گے۔ پھر تم آیا کرنا۔

شفیق: (سرد آہ بھرتے ہوئے) اچھا ابّا جان! سلام عرض کرتا ہوں۔

لبّا جان: جیتے رہو۔

بتول: آپ مجھے معاف کریں گے۔ مجھے سر درد بہت زیادہ ہو رہا ہے۔

شفیق: نہیں نہیں۔ آپ شوق سے جائیں۔

(لبّا جان اور بتول دائیں طرف چلے جاتے ہیں۔ کریمن چاء رکھ کر غائب ہو جاتی ہے)

اکرم: زینت! میرا کنکوا کہاں رکھا ہے؟

زینت: یہ کنکووں کا وقت ہے نا۔

اکرم: ابھی تو بہت دن ہے۔

زینت: فرحت آپا —— مجھے سوال سمجھاؤ ——

فرحت: چلو۔

(زینت، فرحت اور اکرم بائیں طرف چلے جاتے ہیں۔ صرف اماں جان اور شفیق رہ جاتے ہیں)

اماں جاں: کریمن چاء رکھ گئی ہے۔ چاء کی پیالی پی لو۔ کھانا ذرا دیر سے بنے گا۔

شفیق: نہیں نہیں۔ اماں جان! —— آپ تو مجھے میری ماں سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ اتنی محبت کے بعد کیا کھانا باقی رہ جاتا ہے؟ آج میری طبیعت بہت ہی مسرور ہے اماں جاں!

اماں جان: تمھارا اپنا گھر ہے بیٹا! لیکن —— ٹھہرو، میں آتی ہوں کریمن کہیں فرنی میں گھٹے نہ ڈال دے۔

(دائیں طرف چلی جاتی ہے)

شفیق: (سرد آہ بھر کر) بس سب چلے گئے اور میں تنہا —— اب کوئی بے کار، یہاں آئے گا؟

(شفیق لڑکھڑاتا ہوا بائیں طرف نکل جاتا ہے)

(پردہ)

ایک عورت کی نہ

(مزاحیہ)

افراد:

ہردے ناتھ تیواڑی.........مصنف

ونتی...............ہردے ناتھ کی بیوی

پروفیسر مسز گپتا..........مقامی گرلز کالج کی پروفیسر اور تیواڑی کی مدّاح

مدن....................ہردے ناتھ کا دوست

منظر

ہردے ناتھ تیواڑی کا رہائشی کمرہ جس کا ایک دروازہ مطالعہ، اور دوسرا رسوئی میں کھلتا ہے۔ رہائشی کمرے میں ایک بڑا سا کوچ پڑا ہے جس کے دائیں یا بائیں طرف ایک نفیس شنگار میز رکھا ہے۔ شنگار میز پر شیشے کے قریب کریم، ایشز آف روز زہیر کریم کی نیلی شیشی، کیوٹکس نیل پالش، اور دوسرا آرائش کا سامان پڑا ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ سینٹ، پاؤڈر اور کنگھی آرائشی سامان میں نہ رکھی جائے بلکہ ان میں سے ایک چیز ضرورت کے مطابق میز کی دراز میں سے نکالی

جائے.....قریب ہی ایک کھونٹی پر دو میلی سی دھوتیاں اور ایک نئی نفیس ساڑی ٹنگی ہوئی ہے۔

صوفے کے قریب، ایک ہشت پہلو میز پر چند کتابیں عمداً بے ترتیبی سے بکھیر رکھی ہیں— مصنف مطالعے کا ماحول پیدا کرتے ہوئے پڑھتا ہے۔ پردہ اُٹھنے پر مدن ایک کتاب لیے کوچ میں دھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے قریب ہی تیواڑی صاحب ایک گیت گنگنار ہے ہیں، آج انھوں نے ایک قابلِ تحسین ناٹک لکھا ہے جس کا گانا (گانا کوئی ہو جائے لیکن ذرا مزاحیہ از قسم— 'ہم تو ڈرتے ہیں کپڑے بدلتے ہوئے'۔ ہو جائے تو بہتر ہے) آہستہ آہستہ مدھم ہوتا ہوا سیٹیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر مدن اور تیواڑی کے پانو کی تھاپ گانے کی سُر تال پر اترتی ہوئی یک لخت سم پر آجاتی ہے۔

تیواڑی: آج سچ مچ زندگی کتنی دلچسپ معلوم ہوتی ہے!

مدن: ایک کامیاب ناٹک لکھ لینے کے بعد؟ ہاں، زندگی میٹھی کیوں نہ معلوم ہو بھائی۔

تیواڑی: سچی بات ہے مدن مجھے اپنے ہاں ننھے بھاشی کے پیدا ہونے پر اتنی خوشی نہ ہوئی، جتنی آج ہو رہی ہے۔

مدن: (تیواڑی کے قریب جا کر) بتاؤ تو بھلا کیا لکھا ہے؟

تیواڑی: نام بہت سندر ہے ناٹک کا——ایک عورت کی نہ!

مدن: ایک عورت کی نہ؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟——ویسے نام تو بہت اچھا ہے!

تیواڑی: مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی نہ—ہاں کے برابر ہوتی ہے۔

مدن: (ہنستا ہے) لیکن ہمیشہ ایسے نہیں ہوتا——

تیواڑی: عام طور پر ہوتا ہے۔ تمھیں بائرن کا وہ مصرعہ یاد ہے؟—

And Whispring-"I Shall never consent" consented

کہتی تھی نہ مانوں گی، مگر مان گئی——ناٹک میں دایہ کا کردار بہت اچھا رہا ہے۔ دراصل میں اپنی تحریر میں بہت گہری طنز لانی چاہتا ہوں (خطیبانہ انداز میں) میں

انسان کو دیوتا کی صورت میں نہیں دیکھتا۔ اس کی سرشت میں بسی ہوئی بربریت اور وحشی پن کو دیکھتا ہوں۔ اور عورت سر سے پانو تک ایک فریب کار ہستی ــــ ایک الوژن ــــ مایا ــــ بس مایا ــــ!

(رازدارانہ لہجے میں) اور ایک بات کہوں تم سے۔ ''ایک عورت کی نہ'' میں نے مسز گپتا سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

مدن: (منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے اور آنکھیں پھیل جاتی ہیں) مسز گپتا؟ مسز گپتا پہ؟ وہ تو بڑی مداح ہے تمھاری۔ اس بے چاری کو خواہ مخواہ کیوں اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہو؟...... اور اگر اسے پتہ چل گیا تو تمھارے خلاف ہو جائے گی اور پھر تمھارے ڈرامے اور تمھاری کہانیاں بھی رتن اور پربھاکر کے امتحانوں میں شامل ہونے سے رہیں۔ جانتے ہو کتنا مالی نقصان ہوگا تمھارا؟

تیواڑی: بلا سے۔ پہلے ہی کون سے اسکائی اسکریپر بنا لیے ہیں جو ڈھے جائیں گے۔ بیسویں صدی کی ہر تعلیم یافتہ عورت کی طرح مسز گپتا بھی تو بچوں کے نام سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں آخر اس دنیا کا ہوگا کیا؟

(رسوئی میں ونتی ایک طرف سے دوسری طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اُس نے ایک نفیس ساڑی پہن رکھی ہے)

مدن: (آہستہ سے) کون ہے؟

تیواڑی: نہ جانے کون؟ کوئی دوسری مرتبہ ادھر سے اُدھر گزرا ہے۔ میرے خیال میں تو ونتی ہے۔ نہیں تو دایا ہوگی۔

مدن: ہاں ہاں، یہ شاید بھابی ہی ہیں۔ بڑی مشغول دکھائی دیتی ہیں آج۔

تیواڑی: اوہ اب میں سمجھا۔ وہ اندر آنا چاہتی ہے۔ اس کمرے میں...... اکیلے بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہوگی بے چاری! سچ پوچھو تو وہ تمھارے لطیفے بہت پسند کرتی ہے مدن۔ تمھارے چلے جانے کے بعد تمھاری گپوں اور تمھارے فقروں کو بڑے چٹخارے لے کے دُہرایا کرتی ہے۔ تمھاری تعریف کے پُل باندھا کرتی ہے۔ کہتی ہے جو عورت اس آدمی سے

وابستہ ہوگی وہ بہت سُکھی رہے گی اور یہ وسنتی پر ہی موقوف نہیں ، ہر ایک عورت دوسرے مرد کی باتوں کو پسند کرتی ہے۔

مدن: (قہقہہ لگاتے ہوئے) تعجب ہے تیواڑی، تم بھابی کے متعلق بھی ایسا کہنے سے نہیں چُوکتے۔ بہت بڑ گئے تم اور کتنے ظالم ہو۔ابھی ابھی تم نے خود ہی کہا تھا کہ انسان میں بربریت اور وحشی پن بہت ہوتا ہے۔سوٹھیک کہا تھا تم نے۔

تیواڑی: (بدستور سنجیدہ آواز میں) لیکن عورت کو بھی تو فریب کار کہا تھا۔

مدن: (ہنستے ہوئے) وہ بھی بہت حد تک درست ہوگا۔لیکن مرد کے لیے بھی تو دوسری عورت کی آواز نغمہ سے کم نہیں ہوتی۔

تیواڑی: اسی لیے تو کہتا ہوں۔ وسنتی بھی عام انسان کی کمزوریوں سے مستثنٰی نہیں، گو میں اس بات کا اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ اکثر عورتوں کو اپنی نئی ساڑی دکھانے، نئی سینڈل کی نمائش کرنے اور چند تحسین کی نگاہیں حاصل کرنے کے سوا اور کچھ مطلب نہیں ہوتا——

(وسنتی پھر دروازے کے قریب آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے)

لو اب وہ آیا ہی چاہتی ہے۔وہ تمھارے قریب آبیٹھے گی۔تم خواہ کسی ڈھب کی باتیں کرو۔وہ دلچسپی ظاہر کرے گی۔تم خواہ کسی زبان میں گفتگو کرو، وہ ایسا ظاہر کرے گی گویا سب کچھ سمجھ رہی ہے اور وقتاً فوقتاً ایک آدھ قہقہہ بھی لگائے گی۔(وسنتی بالآخر چلی ہی آتی ہے اور اندر آتے ہوئے نہایت شیریں لہجہ میں تیواڑی سے خطاب کرتی ہے)

وسنتی: دیکھیے نا، آپ کا بٹوا چارپائی کے نیچے گر پڑا تھا، لیجیے سنبھالیے۔پھر خواہ مخواہ ہندستانی بیویوں کو کوستے پھریں گے کہ وہ ہمیشہ خاوندوں کی جیبوں کی تلاشی لیتی ہیں اور انھیں شوہر کی ایمانداری سے دی ہوئی رقم پر قناعت نہیں ہے۔(کچھ دیر بعد——یوں ظاہر کرتے ہوئے جیسے انھوں نے سچ مچ مدن کو ابھی دیکھا ہے)

او! آپ ہیں مدن جی؟ نمستے! چھما کیجیے گا۔ میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔کب سے آئے ہیں آپ؟

مدن: نمستے بھابی۔ابھی آرہا ہوں میں تو—— کہیے کیا حال ہے ننھے بھاشی کا؟ اور آپ کی

چھوٹی بہن کا؟ بیمار تھیں نا اس دن جب ہم سب اُن کے ہاں مزاج پُرسی کے لیے
گئے تھے۔

وسنتی: جی، اب تو اچھی ہے، آپ کی بہت مہربانی......

تیواڑی: وسنتی! آگے آجاؤ نا، بیٹھو، لو کُرسی......مدن جی سے کاہے کی شرم۔ اپنے ہی بھائی تو ہیں
(کُرسی بڑھاتے ہوئے) لو بیٹھو......بیٹھو۔

مدن: جی ہاں بیٹھیے۔ بیٹھیے نا......

وسنتی: (معذرت چاہتی ہوئی) نہیں چلتی ہوں—بہت سے کام کرنے ہیں۔ دھوبی آنے
والا ہے کپڑوں کے لیے، پانی اُبل رہا ہے۔ آپ ایک آدھ پیالی چائے کی تو ضرور—

مدن: جی نہیں۔ جی نہیں......

وسنتی: اور ننھا گلی میں کھیل رہا ہے۔ ڈرتی ہوں کسی گندے حوض میں نہ گر جائے، ہمارے
پڑوسیوں نے گندے حوض کے لیے ڈھکنا بھی تو نہیں بنوا رکھا اور گھر کے سامنے کیچڑ
ہی کیچڑ پڑی رہتی ہے۔
(پھر) لیکن خیر، بیٹھ جاتی ہوں کچھ دیر کے لیے—(کُرسی سرکا کر بیٹھ جاتی ہے)

مدن: (جوش سے) تیواڑی جی، آپ اپنے پڑوسیوں کو نوٹس کیوں نہیں دیتے بھلا؟ خدا نہ
کرے اگر بھاشی کھیلتا کھیلتا حوض میں گر جائے تو؟

وسنتی: یہ بھلا گھر کے کام کاج کیوں کرنے لگے۔ ہر کوئی آپ ایسا تھوڑے ہی ہے۔ ان کی بلا
سے کوئی حوض میں گر کر مر جائے یا آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔ کچھ دنوں سے دایا
کو بخار آرہا ہے۔ میں کتنے ہی دنوں سے چلّا رہی ہوں۔ کوئی نوکر لاؤ، کوئی نوکر لاؤ،
لیکن آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

تیواڑی: اوہو، وسنتی——تمھارے گلے تو اب حد سے گزر گئے۔ اب تو کچھ کیے بنا چارہ نہیں
ہوگا۔ اچھا شریمتی جی آپ مجھے صرف آج کی مہلت دے دیں—ہاں مدن، اب کوئی
لطیفہ ہو جائے۔ مزیدار۔

مدن: انگریزی کے لطیفے یاد ہیں مجھے تو، ان سے بھلا وسنتی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

تیواڑی: پھر وہی بات، سمجھتے نہیں ہو۔ میں کہتا ہوں خواہ تم انگریزی میں سناؤ خواہ فرانسیسی میں ــــــ

وشنی: جی ہاں، مدن جی آپ کچھ سنائیں۔ میرے سامنے جب بھی کوئی بدیشی بھاشا بولتا ہے تو مجھے بہت ہی لطف آتا ہے (مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے) عجیب عجیب شکلیں بنتی ہیں اور انھیں دیکھ دیکھ کر مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے بھائی......

تیواڑی: دیکھو وشنی، مدن کی باتیں سُن لو۔ بہت دلچسپ ہوتی ہیں ان کی باتیں۔ (تینوں مل کر ہنستے ہیں) بات پیچھے ہو رہی ہے اور تمھارے میکے والے پہلے آدھمکے۔ یہ تم عورتوں کی بہت بُری عادت ہے ــــــ

وشنی: (خفا ہو کر) میری باتیں تو آپ کو اچھی نہیں لگتیں ــــــ یہاں مسز گپتا ہو ــــ تو......

تیواڑی: مسز گپتا معقول عورت ہے۔ وہ ہر موضوع پر آسانی سے بات چیت کر سکتی ہے۔ عام اُجڈ عورتوں کی طرح ہر وقت میکہ ــــــ میکہ......

مدن: ارے بھائی جانے بھی دو ــــــ تیواڑی ــــــ

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: کون ہے؟ ٹھہرو میں جاتا ہوں دیکھنے کے لیے۔

(بائیں طرف جاتا ہے)

آواز: مدن جی یہیں ہیں کیا؟

تیواڑی کی آواز: یہیں ہیں بھائی ــــــ کوئی ضروری کام ہے کیا؟

آواز: جی ہاں، بہت ضروری کام ہے گھر پہ، مجھے ماتا جی نے بھیجا ہے۔

(واپس آتا ہے۔ مدن واپس جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

وشنی: ایسا بھی کیا ضروری کام ہے مدن جی؟

مدن: نہیں بھائی، بس میں چلتا ہوں۔ ماتا جی کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ میں انھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔

ونتی: کیوں نہیں بسا لیتے اپنا گھر۔ دروازہ کھلا رہے گا اور ماتا جی کی خبرگیری بھی ہو جائے گی——

مدن: (ایک سرد آہ بھر کر) اب بسانا ہی پڑے گا اپنا گھر!

تیواڑی: (آتے ہوئے) بس پھر چلے تم مدن؟

مدن: جی ہاں، بھابی معاف کیجیے گا۔ میں آپ کو لطیفے پھر کبھی سنا دوں گا۔

ونتی: کوئی بات نہیں۔ میں خود چلتی ہوں۔ بھاشی کہیں حوض میں نہ گر جائے۔ چاول چولھے پر رکھے ہیں، کہیں گل نہ جائیں۔

مدن: (جاتے ہوئے) یہ آپ کی ساڑی تو بہت نفیس ہے۔ اس رنگ پر سنہرا باڈر بہت اچھا دکھائی دیتا ہے۔ علی بھائی سے خریدی ہوگی۔ ہے نا؟ میں بھی اپنی بیوی کو خرید دوں گا۔ ایسی ہی ساڑی۔

ونتی: دام بھی تو بہت نفیس ہیں۔ اسّی روپے۔ محلّے کی ہر عورت نے پسند کی ہے۔

تیواڑی: اور محلے کے مردوں نے بھی پسند کی ہے۔

(سب ہنستے ہیں——مدن چلا جاتا ہے)

ونتی: میں وہ گھر کے کام کاج والی دھوتی پہن لوں۔

(اندر جا کر میلی کچیلی دھوتی باندھ لیتی ہے۔ اس اثنا میں تیواڑی گنگناتا اور کتابوں کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ میلی دھوتی پہن کر ونتی پھر اُسی کمرے میں آجاتی ہے)

تیواڑی: تم نے ساڑی تو خوب پہنی۔

ونتی: شکر ہے ایشور کا...... آپ کو بھی کچھ پسند آیا——

تیواڑی: گویا میری ہی پسند کا تو خیال رہتا ہے تمھیں ہمیشہ۔ میرے لیے ہی پہنی تھی تم نے ساڑی۔ تبھی تو مدن کے جانے کے بعد فوراً اُتار کر بھی پھینک دی اور باندھ لی یہ میلی کچیلی دھوتی—— جسے تیلن بھی نہ باندھے کوئی——

ونتی: اور کیا کرتی——؟ کام کاج میں بھی ساڑی ہی پہنے رہتی—— نوکر لا دیجیے تو میں

اب بھی پہن لیتی ہوں وہی ساڑی۔

تیواڑی: اور تم نے بہانہ بھی تو خوب بنایا ——

وسنتی: بہانہ کس بات کا؟

تیواڑی: اندر آنے کا بٹوے کا بہانہ......

وسنتی: میں یہاں آنا ہی کب چاہتی تھی؟

تیواڑی: اور آ بھی گئیں!

وسنتی: میں یہاں بیٹھنا کب چاہتی تھی؟

تیواڑی: اور بیٹھ بھی گئیں ——!

وسنتی: میں کہتی ہوں آپ بڑے خراب آدمی ہیں۔

تیواڑی: جی ہاں۔ ہوں تو خراب ہی!

وسنتی: (بگڑ کر) اچھا یوں ہی سہی۔ مان لیجیے میں خود آنا چاہتی تھی۔

تیواڑی: تو بٹوے وٹوے کا بہانہ تراشے بغیر بھی تو آسکتی تھیں۔ صاف طور پر کہہ دیتیں۔ بھئی مجھے تمھاری باتوں سے بہت ہی دلچسپی ہے۔

وسنتی: کس کی باتوں سے دلچسپی ہے مجھے؟

تیواڑی: مدن کی باتوں سے اور کس کی باتوں سے؟

وسنتی: چھی! آگ لگاؤ اس کی باتوں کو...... میں تو آپ کے کہنے سے بیٹھ گئی تھی۔ میں نہ کہتی تھی کہ بھاشی حوض میں گر جائے گا اور چاول گل جائیں گے، ورنہ میں تو...........

تیواڑی: ہاں کونہ کے پردے میں لپیٹنا تو تمھاری فطرت ہے۔ آپ ہی آپ بیٹھ جاتیں تو تم شاید اپنے آپ کو بے وقعت سمجھتیں۔ تم عورتوں کو موڑ توڑ کر باتیں کرنے، اُلجھے اُلجھے فقرے کہنے میں بہت لطف آتا ہے نا...... عورتیں فطرتاً سانٹھ گانٹھ پسند کرتی ہیں ——

وسنتی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

تیواڑی: جی آں —— کیا کہہ رہا ہوں میں؟ اب یہ باتیں کیا سمجھو گی تم۔ اُس وقت یوں ہنس رہی تھیں جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہو —— اُس وقت تو فرانسیسی اطالوی تک سمجھنے

گئی تھیں۔

ونتی: (کانوں کو ہاتھ لگا کر) میرے ایشور! بڑے وہمی ہیں آپ تو!

تیواڑی: جانتا تھا، کہنے پر یہی الزام لگاؤ گی۔ بلکہ ابھی تک تم نے مجھے حاسد نہیں کہا۔

ونتی: (جھلا کر) میں جاتی ہوں۔ میرے چاول——

تیواڑی: ہاں ہاں! گل گئے ہوں گے تمھارے چاول!

ونتی: ننھا بھاشی——

تیواڑی: ہاں ہاں! حوض میں گر پڑا ہوگا ننھا بھاشی......

ونتی: میں کہتی ہوں۔ آپ بات بھی کرنے دیں گے مجھے؟

تیواڑی: بھاگ تو تم رہی ہو—اب کا ہے کو بیٹھو گی میرے پاس۔ دراصل اب یہاں ہے ہی کون؟ مدن تو......

ونتی: (سٹپٹا کر بیٹھ جاتی ہے) لو بیٹھ جاتی ہوں بابا—— میرا کیا ہے۔ چاول گل جاتے ہیں تو گل جائیں۔ پھر کہنا، یہ کیسے چاول ہیں، گوبر سے......اور پھر ہر وقت کے طعنے کہ تمھیں کھانے پکانے کا ذرا بھی سلیقہ نہیں اور بھاشی؟—— ہاں، بھاشی حوض میں ڈوبتا ہے تو ڈوب جائے۔ وہ میرا بھی اتنا ہی بیٹا ہے جتنا آپ کا۔

(آواز بھرّا جاتی ہے پھر ونتی دھوتی کے پلّے سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے)

تیواڑی: دیکھو ونتی! او چھے وار مت کرو مجھ پہ اور...... میں روز روز نہیں منانے کا تمھیں۔

ونتی: (رونی آواز میں) کہتا کون ہے آپ کو؟

تیواڑی: (کچھ دیر بعد) سچ مچ ناراض ہو گئیں۔

ونتی: (اسی طرح) آپ باتیں جو ایسی کرتے ہیں، دل جلا دینے والی۔

تیواڑی: (کمرے میں ٹہلتا ہوا گنگناتا ہے) رُوٹھا ہوا ہے کوئی، کوئی منا رہا ہے۔

(کچھ دیر بعد)

آؤ صلح کر لیں ونتی، وہ تو سب کچھ مذاق میں تھا ونتی— جانے بھی دو ونتی......

ونتی: اب کون منت کرتا ہے آپ کی، جایئے، کیجیے اپنا کام۔

تیواڑی: اِدھر دیکھو ونتی! یہ چھوٹی چھوٹی جھپٹ محبت میں اضافہ کرتی ہے —— اور پھر —— گد گدا کے بھی ہنساتے ہیں، ہنسانے والے ——

(تیواڑی گد گدانے کے لیے بڑھتا ہے۔ ونتی اُچھل کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

تیواڑی: (کچھ دیر بعد) دیکھو آج وہ تمھارے ڈاکٹر لانبے آرہے ہیں (تمھارے پر زور دیتا ہے)

ونتی: تمھارے کا کیا مطلب؟

تیواڑی: اوہ تمھارے...... ہیں تو وہ دوست میرے ہی۔ لیکن تمھیں ان کی باتیں بہت پسند آتی ہیں نا۔ جب انھوں نے اپنے کالج کے دنوں کا ایک رومان سنایا تھا، تو کتنی خوش ہوئی تھیں تم۔ اور تم نے آپ ہی اعتراف کیا تھا کہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ جو عورت شادی کرے گی، وہ گویا سورگ میں رہے گی۔

ونتی: (بگڑ کر) تو کیا جھوٹ کہا تھا میں نے؟

تیواڑی: اجی جھوٹ وُوٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہر دوسرے مرد کی عورت سورگ میں رہتی ہے ——

ونتی: (جل کر) سورگ کو سدھار جاتی ہے۔

تیواڑی: جی آں! یہ تو اب کہہ رہی ہو نا۔

ونتی: ہاں ——

تیواڑی: اچھا! تو یوں ہی سہی —— آج وہ میرے ڈاکٹر لانبے آرہے ہیں۔ (میرے پر زور دیتا ہے)

ونتی: تو میں کیا کروں، مجھے کیا غرض؟ میں نے کون سے تھال پروس رکھے ہیں اُس کے لیے ——

تیواڑی: پھر وہی بات خواہ مخواہ جھگڑے کی —— اجی شریمتی جی، میں کہتا ہوں، تمھیں سیر کروا لائیں گے۔ ذرا ان کے ساتھ ہوا خوری کے لیے چلی جانا۔ آخر اس میں حرج ہی کیا

ہے۔تمھاری طبیعت جو ہر وقت میری وجہ سے مضمحل رہتی ہے، اچھی اچھی باتیں سننے سے بہل جائے گی۔اور پھر تم اچھی سے اچھی ساڑی پہنو گی۔کہو، تمھیں مدن سے سینما کا پاس منگوا دوں؟

وسنتی: (غصّے سے) میں نہیں جاؤں گی—— میں کبھی کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔اب نہ کسی کی موجودگی میں آ کر بیٹھوں گی۔نہ کسی کی بات پر ہنسوں گی، نہ کسی کے دُکھ پر روؤں گی۔میں نہیں جانتی تھی آپ کا دل اتنا چھوٹا ہے۔

(آواز پھر بھرّا جاتی ہے)

...... اپنی باری یاد نہیں ہے۔مسز گپتا کے ساتھ کس طرح گھل مل کر باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ آتی ہے، تو میری رُوح جل اُٹھتی ہے۔اُس کا ہار پسند کیا تو مجھے بھی ایک لا دیا—پہلے ہی سے لا دیتے تب میں جانتی۔

(گلا بھر جاتا ہے)

اُس دن اکیلے ہی سینما چلے گئے۔واپس آئے تو کہنے لگے آج تم مجھے بالکل فلاں ایکٹرس دکھائی دیتی ہو اور پھر لگے مجھ سے گھل مل کر باتیں کرنے۔سامنے وسنتی اور دماغ میں مس فلاں——اسے تمھاری ویاکرن میں پریم کہتے ہیں۔اب میں خوب سمجھتی ہوں تمھاری ان باتوں کو——

تیواڑی: دیکھو وسنتی—— خواہ مخواہ الزام لگا رہی ہو——

وسنتی: (رُندھے ہوئے گلے سے) اور آپ تو میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کر رہے ہیں نا؟

تیواڑی: میرا کام ہر ایک کی فطرت کو دیکھنا ہے۔میں تمھیں دیکھتا ہوں۔مسز گپتا کو دیکھتا ہوں۔ اگر تمھیں پتہ ہو کہ میں نے اپنے نئے ناٹک میں مسز گپتا کی سی تعلیم یافتہ مگر بچوں کے نام سے کوسوں دُور بھاگنے والی بیسویں صدی کی عورت کی کتنی گت بنائی ہے تو تم حیران رہ جاؤ——

وسنتی: جی آں—— جانتی ہوں، وہ تو صرف لکھنے میں ہے نا۔

تیواڑی: اُوں اُوں۔

وسنتی: ہُوں! جانتی ہوں ——— یُوں تو اس پہ جان دیتے ہیں، اُسے دل سے چاہتے ہیں۔

تیواڑی: اتنا ہی جتنا تم ڈاکٹر لانبے کو چاہتی ہو۔

وسنتی: (زور سے) خاموش! ایسی باتیں مجھے بالکل نہیں بھاتیں..... سمجھے آپ؟..... مجھے اس موئے..... نگوڑے کی شکل تک سے نفرت ہے! سخت نفرت!!!

تیواڑی: مجھے بھی مسز گپتا ایک آنکھ نہیں بھاتی، ایک آنکھ!

(دونوں ہنس دیتے ہیں)

وسنتی: باتیں ہیں ———

تیواڑی: ہاں باتیں..... (کچھ سوچتے ہوئے) آ..... آ..... میں کہہ رہا تھا؟

وسنتی: میں کیا جانوں، کیا کہہ رہے تھے ———

تیواڑی: ہاں میں تم ہی سے کچھ کہنے والا تھا، بھول گیا ——— اوہو! کمبخت یاد ہی نہیں آتا ———

(کچھ دیر بعد)

میری یاد دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

وسنتی: وہی نگوڑے ڈاکٹر لانبے کا ذکر کر رہے تھے۔ کِدھر کے کِدھر بہک گئے۔

تیواڑی: (تالی بجاتے ہوئے) او ہاں، بہت اچھی ہے یاد تمھاری ——— خاص طور پر جب کہ ——— ہاں، آج شام کو وہ یہاں آئیں گے۔ دیکھو ایک بات کہے دیتا ہوں وسنتی..... میں نے ایک اور بھی نیا ناٹک شروع کیا ہے "تانک جھانک" اس کا نام ہے۔ میں چاہتا ہوں کل تک اسے ختم کر ڈالوں۔ دو سین تو میں نے لکھ بھی لیے ہیں ——— وہ آئیں گے تو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں، بولو، کیا کہو گی۔

وسنتی: یہی کہوں گی، اپنے کمرے میں بیٹھے تانک جھانک......

تیواڑی: شُش..... بہت بُری ہو تم۔

وسنتی: جی ہاں ہوں تو بُری ہی ———

تیواڑی: دیکھو منت سے کہتا ہوں۔ اُن سے کہہ دینا کہ میں آج گھر پہ نہیں ہوں۔ تم جانتی ہو

میرے سر میں صبح سے تھوڑا تھوڑا درد ہو رہا ہے۔ ناٹک لکھتا رہا ہوں صبح سے......
جاؤ ذرا چمنی پیس پر سے اسپرین کی ٹکیا تو لا دو۔

ونتی: میں کہتی ہوں زیادہ اسپرین نہیں کھانی چاہیے۔

تیواڑی: میں تو جیسے ہر روز ایک شیشی اسپرین کی کھاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ کوئی حرج نہیں۔
میرا کہا یاد رکھوگی نا؟ اور دیکھو دایا کو بھیج کر مدن جی سے دو پاس منگوا لینا اور ڈاکٹر
صاحب کے ساتھ سینما چلی جانا۔ شام اچھی گزر جائے گی۔ ہمارے مقدر میں تو رونا
پیٹنا لکھا ہے۔ تمھیں بھی اپنے ساتھ کیوں رُلاؤں؟ بھاشی کو دایا کے حوالے کر دینا۔
سمجھیں۔ ذرا باغ میں گھما لائے گا۔ آئے گا تو دودھ میں پلا دوں گا۔ شیشی کہاں
رکھی ہے ـــــ فیڈر ـــــ اور نپل کہاں ہے۔ مجھے بتاتی جانا۔

ونتی: میں نے جانے کی رضامندی کب ظاہر کی ہے؟

تیواڑی: دیکھو، مانا بھی کرتے ہیں۔ یوں تنگ نہیں کیا کرتے ـــــ میں کہتا ہوں آخر اس میں
حرج ہی کیا ہے ـــ؟

ونتی: اُوں ہُوں، میں تو کبھی نہیں جانے کی ـــــ مدن سے باتیں کرنے میں کیا حرج تھا؟

تیواڑی: اُف ایشور! وہ تو سب کچھ مذاق میں تھا ـــــ دیکھو، ذرا ساڑی اچھی پہننا۔ بانکی ٹکو۔
وہی۔ وہی جس میں ساڑھے تین انچ چوڑا بارڈر لگا ہے۔ علی بھائی کے یہاں سے
لائے تھے ـــــ ہاں ہاں وہی ـــــ مُسکرا رہی ہونا۔ بڑی اُستاد ہو۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

ونتی: دیکھیے کوئی آیا ہے۔

تیواڑی: ڈاکٹر لانبے کے سوا اور کون ہوگا؟

ونتی: اُف میں تو میلی سی دھوتی باندھے بیٹھی ہوں۔

(گھبرا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے)

ونتی: (دُور سے) نئی دھوتی ہی کوئی نہیں۔ اور یہ دونوں میلی ہو چکی ہیں، بہت میلی۔ شلوار،
ساڑی ہی باندھ لیتی ہوں۔ وہی جو آپ کو پسند ہے۔

تیواڑی: ہاں ہاں وہی باندھنا۔ جس میں ساڑھے تین انچ چوڑا بارڈر لگا ہے۔ علی بھائی کے یہاں سے لائے تھے ــــــ وہی۔

ونتی: مسکرا رہے ہونا ــــــ بڑے استاد ہو۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: دایا سے کہو وہی آواز دے دے۔ ایک شریف آدمی نیچے کھڑا ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

(ونتی ایک طرف جاتی ہے۔ اُس کے کپڑوں کے لپیٹ میں آکر ایک کرسی گر جاتی ہے جس سے اُس کے حواس باختہ ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے)

ونتی: (دبی آواز میں) رامی ــــــ اری رامی ــــــ مردار۔ دو بجے سے سو رہی ہے تو ــــــ اُٹھ ــــــ دیکھ باہر ڈاکٹر لانے آئے ہیں۔ ان سے کہہ دے بابو جی گھر پہ نہیں ہیں۔ باہر گئے ہیں۔ اُٹھ جلدی سے۔ اری اُٹھی بھی (نسبتاً آہستہ آواز میں) دراصل آج بابو جی کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہ جانا نہیں چاہتے۔ سارا دن بیچارے کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔

تیواڑی: رہنے دو اب۔ میں تمھاری ہمدردی نہیں چاہتا۔ رامی! کہہ دو گھر پہ نہیں ہیں۔

ونتی: کہہ دو بابو جی گھر پہ نہیں ہیں..... لیکن بی بی جی ہیں۔

تیواڑی: اوہ میں بھول گیا۔

ونتی: مسکرا رہے ہونا۔ بڑے اُستاد ہو تم۔ میں نے تو کہا تھا۔ سینما......

تیواڑی: رامی! کہو آپ آجائیں۔ بی بی جی کو آپ کے ساتھ باہر جانا ہے۔ سینما۔ پاس ہیں۔ دیکھو ٹھیک اسی طرح کہنا ذرا دو منٹ لگا کر دروازہ کھولنا۔ آواز دے دو پہلے ــــــ

ونتی: میں نے کہا جی۔ کنگھی کہاں ہے۔ میرے بال بھی بکھر رہے ہیں۔

(ونتی کی گھبراہٹ کا اندازہ میز کے ساتھ ٹھوکر لگنے سے ہوتا ہے۔ وہ اُوئی کہہ کر لنگڑاتی ہوئی چلنے لگتی ہے اور تیواڑی اس کے پاؤں کو دبانے لگتا ہے)

تیواڑی: کہیں بہت تو نہیں لگی، ونتی!

(ونتی اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میز کے دروازوں کو بار بار کھولتی اور بند کرتی ہے)

ونتی: نہ جانے کنگھی کہاں رکھی ہے کمبخت۔ یہ موئے بھاشی نے کہیں پھینک دی ہوگی۔ ناک میں دم کر دیا ہے اس نے تو میرا۔ رو چکی اس کی جان کو میں تو ——

تیواڑی: خفا کیوں ہوتی ہو؟ کنگھی میرے پاس ہے ۔ لو …… یہ لو۔ اور دیکھو اچھی طرح بنانا بال۔

ونتی: مسکرا رہے ہو؟ بھلا بال بنانے میں کیا عیب ہے۔ آپ ہی کو کوئی کہے گا تو اتنے بڑے لیکھک کی بیوی کتنی اُجڈ ہے۔ خانہ بدوش عورتوں کی طرح بال بھی سیدھے نہیں کرتی۔

(ایک لمحہ بعد)

بال بناؤں گی اور دائیں طرف مانگ نکالوں گی۔ بالکل مسز گپتا کی طرح۔

تیواڑی: مسز گپتا کا اس سے کیا تعلق ہے۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔

ونتی: (نخرے سے) اوہو۔ اُس کا نام لینا بھی گناہ ہو گیا اب۔

(زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: رامی سے کہو، اب تو دروازہ کھول دے۔ ورنہ وہ بے چارا مایوس ہو کر چلا جائے گا۔

ونتی: ٹھہرو مجھے بال ٹھیک کر لینے دو۔ میرا…… میرا…… پاؤڈر بھی تو یہاں نہیں ہے۔

(میز کے دراز کو کئی مرتبہ کھولتی اور بند کرتی ہے)

تیواڑی: وہ سامنے تو پڑا ہے، ناحق گھبرائے جاتی ہو۔

ونتی: (واپس آتے ہوئے) اوہ، میں تو سچ مچ ہی گھبرا گئی تھی۔ یہ ساڑی اچھی لگتی ہے نا۔ مجھے آپ کی عزت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ دیکھیے، بیوی شوہر کی عزت ہوتی ہے۔

تیواڑی: ہوں۔ میں کب انکار کرتا ہوں؟

ونتی: تو اقرار کب کرتے ہیں؟ وہ میری سینٹ کی شیشی کہاں گئی (گھبرا کر) جلدی بتائیے۔ اِدھر دیکھیے۔ اُدھر۔ بھاشی —— موا بھاشی ——

(سیڑھیوں پر قدموں کی آواز)

تیواڑی: (دبی آواز میں) لو وہ آ گئے سیڑھیوں میں۔ سنگاردان میں پڑی ہوگی تمھاری سینٹ۔

ونتی: میں کہتی ہوں آپ اُس کے نام سے چڑتے کیوں ہیں؟ اُس کے سامنے بس پگھلے جاتے ہیں۔

(اندرونی دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: لو وہ آ ہی گئے۔ میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔

(تیواڑی اپنے مطالعے کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا ہے)

ونتی: (دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے) آ جائیے...... آیئے، آیئے۔

(ڈاکٹر لانبے کی بجائے مسز گپتا نمودار ہوتی ہیں۔ ونتی کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے اور کریم کی شیشی ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے)

ونتی: اوہ مسز گپتا! آپ۔ آیئے — آ...... آ...... یئے ——

مسز گپتا: ونتی جی۔ اوہ شیشی ٹوٹ گئی کریم کی۔ بے حد افسوس ہوا مجھے!

ونتی: (رکھائی سے) اوہ۔ کوئی بات نہیں بہن! ایک شیشی؟ یہاں تو بہت کچھ ٹوٹتا رہتا ہے اور کسی دن ——

مسز گپتا: کہیں جا رہی تھیں آپ؟

ونتی: (سوچتے ہوئے) نہیں یونہی۔ صبح سے طبیعت کچھ پریشان تھی۔ میں نے کہا ذرا ٹائلیٹ کر لوں۔

مسز گپتا: ہاں بہن۔ ٹائلیٹ کرنے سے انسان — تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ بدن میں جان آ جاتی ہے۔ لیکن اتنا اہتمام۔ کریم۔ سینٹ —— اور پھر کہیں جا بھی نہیں رہیں آپ — تیواڑی جی تو گھر پہ نہیں ہیں۔

ونتی: (گھبرا کر) وہ تاک جھانک —— ابھی ہی باہر گئے ہیں۔

مسز گپتا: تاک جھانک، کیا کہنے لگی تھیں آپ۔

ونتی: یہ ان کے نئے ناٹک کا نام ہے —— تاک جھانک، مکمل کرنے کے بعد گھر سے

نکلے ہیں۔ ناٹک کا نام تو اچھا ہے کہتے ہیں، بیسویں صدی کی ایک بچوں سے ڈرنے والی عورت......

مسز گپتا: (سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اور فتح مندی کے احساس سے) بہن تعجب ہے۔ آج تم نے میری طرح کیوں دائیں مانگ نکالی ہے۔

ونتی: ہاں، وہ ایسی ہی مانگ پسند کرتے ہیں۔

مسز گپتا: سچ؟

ونتی: ہاں سچ!

مسز گپتا: میرا تو ارادہ تھا کہیں باہر چلیں۔

ونتی: مگر وہ گھر پہ نہیں ہیں۔

مسز گپتا: ہاں جانتی ہوں۔ رامی نے بتادیا تھا...... ذرا وہ ہوتے —— تم ہوتیں تو رونق ہو جاتی۔

ونتی: گھر سے نکلنا تو گرہستن کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت مشکل۔ نہ جانے عورتیں کیسے بچوں کو نوکروں کے حوالے کر کے تین تین چار چار گھنٹے باہر گھوم آتی ہیں۔ عورت کو تو اپنے گھر اور بچوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میں تمھارے ساتھ چلی ہی جاتی لیکن میرے پاؤں میں کچھ موچ آ گئی ہے اور پھر چولھے پر کچھ چاول رکھے ہوں۔

(کمرے کے اندر سے آواز آتی ہے)

تیواڑی: ڈر ہے کہیں گل نہ جائیں چاول۔

ونتی: (گھبرا کر) ننھا بھاشی گلی میں کھیل رہا ہے۔

تیواڑی: ڈر ہے کہیں حوض میں نہ گر پڑے۔

مسز گپتا: (خوش ہو کر) تیواڑی جی کی آواز!

(دروازہ کھلتا ہے۔ تیواڑی باہر آتے ہیں)

تیواڑی: گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں مسز گپتا۔ معاف کیجیے گا، میں گھر پر نہیں۔ یعنی ان سے میں نے ہی کہا تھا کہ کہہ دینا، میں باہر چلا گیا ہوں۔ بات یوں ہے کہ ایک ناٹک

شروع کیا تھا۔ دیکھیے نا، لوگ آتے ہیں میرا وقت ضائع کر کے چلے جاتے ہیں۔ پوچھو بھئی کیا کام ہے، تو بس یہی صاحب آپ کے درشن کرنے ہیں۔ خیر آپ کی تو علاحدہ بات ہے۔ بالکل علاحدہ۔ میری ٹوپی کہاں ہے ونتی؟

ونتی: باہر جا رہے ہیں آپ۔ میں آپ کو ہرگز ہرگز باہر نہ جانے دوں گی۔ دیکھو بہن، آج ان کی طبیعت خراب ہے۔ صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی اسپرین کھائی ہے اور اب باہر بھی جانے لگے۔

تیواڑی: جانے دو —— ایک گھنٹہ ہوا اسپرین کھائے اور ——

ونتی: میں کہتی ہوں ہوا لگ جائے گی اور زیادہ بیمار ہو جائیں گے آپ۔

تیواڑی: چھوڑو اس بات کو۔ بتاؤ میری ٹوپی کہاں ہے۔ ٹھنڈی ہوا میں گھومنے سے درد کافور ہو جائے گا۔ وہ علی بھائی والی ساڑی تم نے پہنی ہی ہوئی ہے۔ بھاشی کو کھلانے کے لیے رامی لے ہی گئی ہے۔ دو تین گھنٹے سے پہلے کیا آئے گی۔ وہ جانتی ہے نا کہ اس سے پہلے بی بی سینما سے نہیں لوٹنے کی۔ بس اب چلو۔ مسز گپتا بھی چلیں اچھا رنگ رہے گا۔

(ونتی کراہتی ہے)

ونتی: مشکل ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ جائیں۔

مسز گپتا: آپ بھی چلیں بہن۔ کپڑے تو آپ نے پہنے ہی ہوئے ہیں، لیکن بابا۔ میں مجبور نہیں کرتی۔ اگر طبیعت چاہے تو شوق سے چلیں۔ صحت بھی دیکھنی لازمی ہے۔

ونتی: اچھا تم جو اصرار کرتے ہو تو چلی ہی جاتی ہوں۔ لیکن اوہ —— اُف ہائے!! میرے پانو کی موچ کا کیا ہوگا۔ میرے پانو...... کی...... موچ...... کا...... کیا...... ہوگا......

تیواڑی: ہُوں۔ کیا ہوگا۔ ارے اُٹھو چلو۔ راستے میں سے ڈاکٹر لانے کو ساتھ لے لیں گے۔

(پردہ)

رُوحِ اِنسانی

(ایک المیہ)

افراد:

روحِ انسانی، ایک حسّاس مصنّف کے جسم میں، جواپنی آزادروی کی پاداش میں زندانی قرار دیا جاتا ہے۔

قیدی نمبر 1

قیدی نمبر 2

قیدی نمبر 3

داروغہ جیل، کانسٹیبل، چپراسی، ناظمِ اعلیٰ، جج، کچھ اور لوگ جن میں جیل کے چھوٹے ملازمین مثلاً بہشتی، خاکروب وغیرہ بھی شامل ہیں۔

وقت: موجودہ جنگِ عظیم سے ایک سال پہلے۔

منظر

جیل کا ایک کمرہ، رُوحِ انسانی ایک دیوار کے سہارے جھکی ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے سلاخیں تھامے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ سر کے بالوں کے دو گچھے سر جھکے

ہونے کے باعث آنکھوں کو ڈھانپ رہے ہیں۔ کبھی کبھی جب روحِ انسانی سر کو جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے ہٹاتی ہے تو اس کی آنکھوں کی بجائے صرف دو تاریک سے گڑھے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاڑھی کے بڑھے ہونے نے چہرے کی یاسیت میں اضافہ کر دیا۔

زنداں کے دوسرے کونے میں تینوں قیدی تاش کھیلنے میں معروف ہیں۔ ایک قیدی اپنے پھٹے ہوئے لبادے میں ہاتھ ڈال کر جوئیں نکالتا ہے اور انھیں ناخنوں پر رکھ کر مارتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا قیدی اپنے مُنھ سے موٹر کا ہارن بجاتا اور گالیاں دیتا ہے اور تیسرا، ایک مجنونانہ انداز میں کھیلتے ہوئے مار دو، مار دو پکار اُٹھتا ہے۔

زنداں کے سامنے دفتر میں عام فرنیچر کے علاوہ، کلاک اور کیلنڈر لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بجلی کا ہنڈہ بھی روشن نظر آتا ہے۔ کلاک ٹیلیفون کا موتف (Matif) ہے، اس لیے اس کی آواز روحِ انسانی کے ذہنی کیفیات کے مطابق بلند یا مدھم کی جائے۔

روحِ انسانی: (سر اُٹھا کر) داروغہ ——— داروغہ جیل ———! آج پورا ایک ماہ ہو چکا ہے اور میں زنداں کے اسی حصے میں پڑی سڑ رہی ہوں۔

داروغہ جیل: مجھے ناظمِ اعلیٰ کی طرف سے آپ کو اسی جگہ رکھے جانے کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ لہٰذا افسوس ہے میں آپ کو اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں دے سکتا۔

روحِ انسانی: لیکن داروغہ صاحب! کم از کم مجھے میرے ہم جنسوں میں تو رکھا جاتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں، میں اس قیدی کی ساتھی ہو سکتی ہوں جو زندگی بھر ایک ذلیل سی ٹیکسی چلاتا رہا ہے اور جسے عورتوں کے اغوا اور فحاشی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں آتی؟ کیا میں دوسرے قیدی کے ساتھ رکھے جانے کے قابل ہوں، جسے ڈاکے اور رہزنی کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں سوجھتا؟ کیا میں اس تیسرے قیدی کی رفیق ہو سکتی ہوں جو کبھی نہاتا ہی نہیں، جس کی بغلیں ہر وقت باس مارتی رہتی ہیں؟

داروغہ جیل: آپ ناحق ناراض ہو رہی ہیں۔ آپ کے مطالبات پر پہلے ہی غور کیا جا چکا ہے، اور ناظمِ اعلیٰ فی الحال آپ کو یہاں سے تبدیل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

روحِ انسانی: کیا ناظمِ اعلیٰ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ کسی آدمی کی سیاسی سرگرمیوں کو روک دینے کے لیے صرف قید ہی کافی ہے؟ کسی کے ہاتھ پانو باندھ دینا اور پھر ہر ممکن طریقے سے اُسے اذیتیں دے کر ایک شیطانی خوشی محسوس کرنا، تم ایسے مہذب لوگوں کا ہی شیوہ ہے۔۔۔۔۔ مجھے میرے خیالات ستاتے ہیں، وہ کاغذ پر آنے کے لیے تڑپتے ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے قلم دوات مہیا نہیں کی گئی۔ شاید اسی لیے کاغذ مجھ تک نہیں پہنچائے گئے۔

داروغہ جیل: ہم نے آپ کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے سامان مہیا کیا۔۔۔ مثلاً۔۔۔ مثلاً وہ آپ کے کمرے میں تاش کے پتّے پڑے ہیں۔

روحِ انسانی: (تڑپ کر) پتے؟ تاش کے پتے؟۔۔۔ لیجیے میں آپ کو یہ پتے دِکھاتی ہوں۔ وہ تینوں قیدی اسی تاش کے ساتھ کھیل رہے ہیں (جاتی ہے اور پتے چھین لاتی ہے۔ کونے سے آوازے بلند ہوتے ہیں)

قیدی نمبر 1: محترم خاتون!۔۔۔ بازی میرے ہاتھ تھی۔

قیدی نمبر 2: تاش واپس دے دیجیے گا۔

قیدی نمبر 3: اُف! سارا مزا کرکرا کر دیا۔

روحِ انسانی: (سلاخوں تک پہنچتے ہوئے) یہ ہیں تاش کے پتے؟ گھِسی ہوئی تاش کے میلے کچیلے پتے؟ وہ کون سی تاش ہے جس کے صرف سینتالیس پتے ہوں۔ ان میں پان کی بیگم کہاں ہے؟ پان کا نہلا کدھر غائب ہے؟ حکم کا یکہ کہاں ہے۔۔۔ اس سے پہلے یہی تاش بغل کے کمرے میں بسنے والے بدنصیب قیدی کی دلچسپی کا سامان تھا۔۔۔ اس قیدی کی دلچسپی کا سامان جس کے پھیپھڑوں سے خون کے پرنالے بہا کرتے تھے اور جن کی موت زنداں کے اسی حصے میں واقع ہوئی۔ آپ خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ وہ پتے چھانٹتے ہوئے تاش کو لب لگایا کرتا تھا۔ کیا

یہی حفظانِ صحت کے قوانین آپ یہاں برتتے ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ زنداں کے اس حصے میں بسنے والے چاروں بدبختوں کو وہی سل کی بیماری لاحق ہو جائے؟

داروغہ جیل: (غصّے میں) آپ کو صحت کا اتنا خیال ہے تو آپ نے ایسا کام نہ کیا ہوتا، جس سے آپ کو یہاں آنا پڑا۔ اپنے قلم کو زیادہ تے کرنے سے روک دیا ہوتا (نفرت سے) آپ کی خواہش ہے کہ آپ کو یہاں گھر کا سارا آرام میسّر آئے۔ آپ کی سی بدلگام خاتون کو یہاں رکھ کر حکامِ اعلیٰ نے آپ سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ قید اور آزادی کا جو اصلی فرق ہے۔ وہ آپ نے ابھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔

روحِ انسانی: شاید آپ کا اشارہ قید بامشقت کی طرف ہے۔

داروغہ جیل: بالکل،

روحِ انسانی: لیکن آپ نہیں جانتے کہ میں قید بامشقت کو قیدِ محض پر کتنی ترجیح دیتی ہوں۔ یہاں مجھے میرے خیالات ستاتے ہیں اور میرا دماغ پھٹا پڑتا ہے۔ قیدِ محض میں کسی شخص کے نہ ہونے سے جو ذہنی کوفت ہوتی ہے وہ کسی جسمانی تکلیف سے زیادہ ہے۔ میرے لیے کوئی چیز جسمانی طور پر اتنی ایذا رساں نہیں۔ مجھے میرا ذہن ستاتا ہے۔ لوگ بید زنی کو وحشی سزاؤں میں شمار کرتے ہیں۔ کاش حاکمِ اعلیٰ نے میرے تئیں بید لگانے کا حکم صادر کیا ہوتا۔

داروغہ جیل: ہاہاہا— آپ کی حالت بالکل ایک بیمار کی سی ہے۔ بیمار ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ اُسے وہ خاص بیماری، جس میں وہ اب مبتلا ہے، نہ ہوتی۔ اس کی بجائے کوئی اور ہو جاتی تو اسے مطلق پروانہ تھی...... ہاہاہا...... مثلاً کل ہی ایک قیدی کے دانتوں میں درد ہو رہا تھا۔ اس کے مسوڑھے پھول گئے تھے اور وہ بار بار کہتا تھا۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ مجھے ایک سو پانچ بخار ہو جائے— اب اے روحِ انسانی! آپ ہی فیصلہ کر سکتی ہیں کہ ایک سو پانچ بخار اچھا ہے یا دانتوں کا شدید درد۔

(ہنستا ہے)

روحِ انسانی: آہ! تم اپنی وحشیانہ ہنسی سے مجھے کتنی اذیت دے رہے ہو — کیا میں نے بید زنی ہوتے نہیں دیکھی؟ کیا میں نے کسی کو مہذب درندوں کی سنگینوں کا شکار ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہی قیدیوں میں سے ایک کے گوشت کی دھجیاں اُڑتے دیکھی ہیں۔ ٹکٹکی کے کلمبوں اور سامنے دیوار پر ابھی تک سیاہ خون کے چھینٹے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے زخموں کو میں نے سفید، زرد، سرخ اور پھر جامن ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان آنکھوں نے اس کے شدت درد سے بیہوش ہوجانے کا مشاہدہ کیا ہے، میں اچھی طرح سے جانتی ہوں تمھاری قید بامشقت کیا ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ مجھے دفتر کا کام دیتے ہیں۔ کولھو چلواتے، سن بٹواتے، دریاں بنواتے اور کیا کرتے؟ لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ قیدِ محض سے باقی سب سزائیں اچھی ہیں، خاص طور پر اس انسان کے لیے جو ذہنی طور پر بیدار ہو اور جسے پڑھنے کے لیے کتابیں اور لکھنے کے لیے کاغذ قلم دوات مہیا نہ کی جائے۔

داروغہ جیل: آپ نے بید لگتے صرف دیکھے ہیں۔ (دیکھے، پر زور دیتا ہے) — آپ نے کسی کو سنگینوں کا شکار ہوتے ہوئے صرف ملاحظہ فرمایا ہے (ملاحظہ پر زور دیتا ہے)۔

روحِ انسانی: داروغہ جیل! — تین برس ہوئے مجھے سازش کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ چار پائیوں کے نیچے میرے ہاتھ دیے گئے تھے۔ سخت سردی میں مجھے برف پر لٹایا گیا تھا۔ میرے ناخنوں میں سوئیاں چبھوئی گئی تھیں۔ مجھے بالوں سے پکڑ کر شاہراہوں پر گھسیٹا گیا تھا، لیکن میں ایک طرح سے خوش تھی۔ وہ اذیتیں رونے، ہاؤ ہو بپا کرنے کا سامان تو تھیں اور اس شور و غوغا میں میرے دن گزر رہے تھے۔ یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو مجھے رونے میں ہی مشغول رکھے۔ البتہ کچھ وقت اپنے کمبل کے پتو مارنے میں گزر جاتے ہے۔ لیکن باقی سارا دن ایک تباہ کن بیماری کے عالم میں گزرتا ہے اور میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ میری باقی سزا قید بامشقت میں بدل دی جائے۔

داروغہ جیل: آپ کی سی باتونی عورت کے ساتھ مغز کھپائی کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پیچھے ہٹ جائیے—

روحِ انسانی: داروغہ—— داروغہ صاحب——

داروغہ جیل: (بلند آواز سے) کیا شور مچا رکھا ہے؟

روحِ انسانی: (دیوانہ وار—— سلاخوں سے بازو باہر نکالتے ہوئے) میری صرف ایک ہی خواہش ہے داروغہ صاحب— میں تاش نہیں چاہتی۔ مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں، مجھے قلم اور دوات نہیں چاہیے—— داروغہ! مجھے قیدِ محض کی بھی اتنی پروا نہیں۔ میری صرف ایک ہی خواہش ہے، صرف ایک ہی خواہش ....آہ! کوئی توجہ نہیں دیتا.....آہ!......

(قیدی نمبر 1 پیچھے سے آکر، روحِ انسانی کے کندھوں کو چھو دیتا ہے)

قیدی نمبر 1: اے ذی عزت روح!—— میں اگرچہ ساری عمر ایک ذلیل سی ٹیکسی چلاتا رہا ہوں۔ آپ کی نظروں میں بہت گرا ہوا ہوں، لیکن............

روحِ انسانی: (نفرت سے) پرے ہٹ جاؤ، زندانی، زندانی——!

قیدی نمبر 1: لیکن—— خاتون! ہمارے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ لکھنے والے کی روح ہیں اور لکھنے والے خدا کے پیامبر ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے ساتھیوں میں سے ایک ڈاکو ہے اور دوسرا ایک غلیظ و کریہہ انسان—— لیکن ہم سب آپ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ فقط آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟

(قیدی نمبر 2,3 قریب آجاتے ہیں)

قیدی نمبر 2: اے ذی اقتدار رُوح! آپ کی یہ حالت ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر حصے میں تجھے ستایا گیا لیکن انسانی دل ابھی اتنا پتھر نہیں ہوا کہ اپنے ہی دل اور دماغ کو کچل ڈالے۔

قیدی نمبر 3: آخر آپ یہ تو بتا سکتی ہیں کہ آپ کی خواہش کیا ہے؟ آپ نے روٹی کے متعلق کبھی

شکایت نہیں کی، حالانکہ اس میں نصف سے زیادہ ریت ہوتی ہے۔ آپ نے کھٹملوں کا کبھی ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ ہم پر راتوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔

روحِ انسانی: قیدی! میرا مطالبہ بظاہر ایک معمولی سا مطالبہ ہے۔ یہ میرا ایک راز تھا، جس کا اخفا میں مصلحت سمجھتی تھی۔ جانتی تھی، جن مراعات سے میرے ذہن کو تسکین پہنچے گی وہ مجھے نہیں دی جائیں گی۔ میں نے اس مطالبہ کو ناظمِ اعلیٰ کے سوا اور کسی کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ داروغہ کو بھی اس کا پتہ چل چکا ہے اور چونکہ میں نے درخواست داروغہ کے توسط سے نہیں دی اس لیے وہ کچھ چڑ سا گیا ہے۔ وہ میری ایک معمولی سی عرضداشت کو نہ مان کر ایک شیطانی خوشی محسوس کرتا ہے۔ میں نے اپنے مطالبے کو صیغہ راز میں اس لیے بھی رکھا کہ آپ لوگ اس مطالبے کی نوعیت پر ہنس دیں گے اور کہیں گے، روحِ انسانی نے مانگا بھی تو کیا مانگا ——— لیکن میری اس ذہنی تکلیف نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے ——— آہ!

قیدی نمبر 1: یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں۔

قیدی نمبر 2: (بیک زبان) یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں، روحِ انسانی!

قیدی نمبر 3: ہم ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد کریں گے۔

روحِ انسانی: وہ سامنے دفتر میں تم لوگ کیا دیکھ رہے ہو ———
آہ! میری سب سے بڑی مصیبت یہی ہے!

قیدی نمبر 1: وہ تو بم اور ٹینک بنانے والے کارخانوں کا ایک نقشہ ہے۔

قیدی نمبر 2: یا بس ایک گھڑی ——

قیدی نمبر 3: صرف ایک گھڑی ——

قیدی نمبر 1: یا ایک کیلنڈر ہے لٹکا ہوا ——

قیدی نمبر 2: جس پر ایک بھریاں عورت کی تصویر ہے ——

روحِ انسانی: ہاں ——— وہ گھڑی اور کیلنڈر! ——— میں جنوری کی چودہ تاریخ کو یہاں آئی تھی۔ مجھے وہ تاریخ ایسے یاد ہے جیسے وہ میری لوحِ یادداشت پر کسی تیز اور نوکدار

چاقو سے کندہ کردی گئی ہو —— آہ! میری یاد سے وہ تاریخ محض اس لیے محو نہیں ہوتی کہ میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں ——!

قیدی نمبر 2: لیکن اس سے کیا ہوتا ہے اے ذی احترام روح! —— مثلاً میں یہاں نومبر کی اکیس کو لایا گیا تھا۔

روحِ انسانی: میری بات سنو بھائی! آج مارچ کی تین تاریخ ہے۔ مجھے یہاں آئے ایک ماہ اور سترہ دن ہو چکے ہیں اور ابھی نہ جانے کتنا عرصہ باقی ہے۔ اگر وہ کیلنڈر وہاں آویزاں نہ ہوتا تو مجھے ہرگز اتنی ذہنی کوفت نہ ہوتی۔ اس بیکاری کے عالم میں میں دن کی گھڑیاں گنتی ہوں اور کیلنڈر دیکھ کر ہر روز حساب کرتی ہوں — آج اتنے دن گزر گئے اور آج اتنے...... اور کلاک کی ٹِک ٹِک جو بظاہر معمولی ہے، میرے دماغ پر ایک وزنی ہتھوڑے کی طرح پڑتی ہے ——

(کلاک کی آواز اتنی اُونچی ہو جاتی ہے کہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا)

—— آہ! —— آہ بھائی! تم میری مصیبت نہیں جانتے۔ میں نے ناظم کے نام بھی ایک عرضداشت لکھ بھیجی تھی کہ میرے سامنے سے کیلنڈر اور گھڑی اُٹھا لیے جاویں —— اور یہی میری سب سے بڑی خواہش تھی۔

قیدی نمبر 2: لیکن اس بات کے ماننے میں ناظم اعلیٰ کو کیا عذر ہو سکتا ہے؟

روحِ انسانی: موجودہ ناظم فسق و بربریت کا عہد لانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ یہ بنی نوع انسان کی روح کو اذیت دینے میں ایک شیطانی خوشی محسوس کرتے ہیں — وہ داروغہ جا رہا ہے — (دیوانہ وار چلاتے ہوئے) — داروغہ — داروغہ — (پھر گھڑی کی ٹِک ٹِک وزنی ہتھوڑے کی طرح پڑتی سنائی دیتی ہے) — آہ داروغہ —— خدارا۔ وہ کیلنڈر — وہ کلاک!! —— اور کچھ نہیں چاہیے، اور کچھ نہیں چاہیے۔

(وقفہ)

(آہستہ آواز میں) جب سے ان لوگوں کو میری ذہنی کوفت کا علم ہوا

ہے، تب سے میرے سامنے کمرے کی بتی چلتی رہتی ہے، تا کہ وہ
کلاک اور کیلنڈر مجھے دکھائی دیتے رہیں۔ اس سے پہلے کم از کم رات
تو پتوؤں کے باوجود اچھی کٹ جاتی تھی، لیکن اب میں تین چار
راتوں سے سو بھی نہیں سکی —— ساتھی! وہ سامنے لٹکتے ہوئے گھڑی
اور کیلنڈر میری جان لے کر رہیں گے۔

(آواز بھرّا جاتی ہے)

اور بُری طرح جان لیں گے۔ اس سے بہتر ہوتا کہ مجھے گولیوں کی باڑھ مار دی
ہوتی یا سنگینوں سے چھلنی کر دیا ہوتا۔ جو سزا دماغ کو دی جاتی ہے، وہ کبھی جسم کو نہیں
دی جاتی ——

قیدی نمبر 3: انسانی روح! مجھے ایک بات سوجھ گئی۔ کم سے کم، آپ رات کو آرام کر سکتی ہیں۔

قیدی نمبر 1: کیا بات سوجھ گئی تمھیں؟

قیدی نمبر 2: ہمیں بھی بتاؤ، بھائی!

روحِ انسانی: مجھے کسی طرح اس گھڑی اور کیلنڈر سے نجات دلاؤ ساتھی! میں منت سے کہتی
ہوں۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔ بظاہر یہ بات کتنی معمولی ہے لیکن میرے لیے دنیا
کی سنگین ترین سزا ہے۔ تمھیں کیا ترکیب سُوجھ گئی؟

قیدی نمبر 3: کیا آپ نے وہ اینٹ دیکھی ہے؟

روحِ انسانی: ہاں تو —— وہ کونے میں پڑی ہے۔

قیدی نمبر 3: بس اسی کے چھوٹے چھوٹے پتھر بنا کر ہم بتی کا نشانہ بنالیں گے۔ بتی کے ٹوٹنے پر
چاروں طرف اندھیرا ہو جائے گا اور پھر آپ اطمینان سے سو سکیں گی۔

روحِ انسانی: یہی کیا کم غنیمت ہے —— میں بیان نہیں کر سکتی کہ میں تم لوگوں کی کتنی ممنون
ہوں —— اگرچہ یہ صرف ایک رات کے لیے ممکن ہے...... صبح کو پھر وہاں بتی
لگا دیں گے —— لیکن ایک رات ہی سہی...... صرف ایک رات......

قیدی نمبر 3: آپ دیکھیں تو سہی —— (قیدی نمبر 2 سے) دیکھو تو وہ کون آتا ہے —— ارے

بُلاؤ چپراسی کو۔

قیدی نمبر2: چپراسی — میاں چپراسی —

چپراسی: (ایک طرف سے ٹہلتا ہوا داخل ہوتا ہے) کیا بات ہے زندانیو — آج میرے پاس تمباکو ختم ہے۔ میں تمھیں کوئی سگریٹ نہیں دے سکتا۔

قیدی نمبر1: ارے سنو بھائی! ہم تم سے سگریٹ نہیں مانگتے — ہمیں سامنے میدان سے وہ پچیس تیس پتھر اُٹھا دو۔

چپراسی: کیا کرو گے تم ان پتھروں کو؟

قیدی نمبر3: ہوں! کیا کریں گے ان پتھروں کو — ارے اپنا سر تو نہیں پھوڑنا ہے، سردیوں کی لمبی راتیں بڑی مشکل سے کٹتی ہیں۔ یہاں رات روشنی تو ہوتی ہی ہے، ہم کوئی دل بہلانے کے لیے کھیل کھیلیں گے۔

(قیدی چند پتھر اُٹھا کر قیدیوں کے حوالے کرتا ہے)

چپراسی: لو یہ پتھر — (پردے کے پیچھے سے داروغہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔
— ''چپراسی!''

آواز: (مکرر) چپراسی۔

چپراسی: جی آیا داروغہ صاحب۔

(چلا جاتا ہے)

روحِ انسانی: بس ابھی سے بتی کا نشانہ شروع کر دو گے کیا؟ اور دوسرے قیدی — اور وارڈر —

قیدی نمبر1: زنداں کے اِس حصے میں ان دنوں کوئی نہیں ہے۔

قیدی نمبر2: وارڈر نو بجے آتا ہے۔

قیدی نمبر3: موقع اچھا ہے۔

قیدی نمبر1: (پتھر مارتے ہوئے) وہ! — بس ذرا سا چوک گیا۔

قیدی نمبر2: ایک...... دو...... تین...... (پتھر کے گرنے کی آواز) وہ مارا — بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے — ایں...... وہ کون ہے؟...... وارڈر؟ — نہیں، چلا گیا۔

(کنکر پھینکتے ہوئے)

قیدی نمبر 1: چُوک گیا۔

قیدی نمبر 3: نہیں لگا — اوہ!

قیدی نمبر 2: (پتھر مارتے ہوئے) ایں! ایک بال بھر بھی اِدھر ہو جاتا تو......

قیدی نمبر 1: وہ لیا، بچ گیا۔

قیدی نمبر 3: (پتھر مارتا ہے — چھن سی آواز سے کلاک کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے اور لنگر دھم سے زمین پر آرہتا ہے) — وہ مارا۔

سب مل کر: وہ لیا خدا کی قسم —

روحِ انسانی: (احساسِ تسکین سے) بند ہو گئی — گھڑی کی ٹِک ٹِک بند ہو گئی۔

قیدی نمبر 3: شیشہ ٹوٹ چکا ہے۔

قیدی نمبر 1: ہندسے بھی پھٹ گئے ہیں — اور اسپرنگ اُچھل کر باہر گر چکا ہے۔

قیدی نمبر 3: لنگر زمین پر پڑا ہے۔

قیدی نمبر 2: خوب کیا، خوب کیا۔

قیدی نمبر 3: اب بتی کو لو — (پتھر پھینکتے ہوئے) خالی۔

قیدی نمبر 1: (پتھر شیڈ کو لگتا ہے اور چھن کی سی آواز پیدا ہوتی ہے) — وہ مارا، لیکن یہ کمبخت شیڈ کو ہی لگا ہے۔ ناظم کی بیوی کبھی کبھی اپنے بچے کو چھرّے والی بندوق دے دیتی ہے تاکہ وہ فاختہ کا نشانہ بنائے۔ اگر اس کی بندوق ہمیں مل جائے تو پل بھر میں بتی کا صفایا کیا جا سکتا ہے۔

قیدی نمبر 3: ٹھہرو بھائی! مجھے داؤ لگانے دو...... دیکھو کوئی دیکھ تو نہیں رہا...... بتی کو کھڑا ہو لینے دو۔

قیدی نمبر 1: (باہر جھانک کر) کوئی دیکھتا نہیں — تمھاری قسم وارڈر باہر ہے۔ ابھی تک۔

قیدی نمبر 3: (بلب کے زور سے گرنے کی آواز آتی ہے اور اندھیرا چاروں طرف پھیل جاتا ہے) — وہ لیا۔

آوازیں: شاباش، شاباش —— تم بہت اچھے نشانچی ہو — کیلنڈر کو بھی پھاڑا جا سکتا ہے، لیکن اب تو اندھیرا ہو چکا ہے۔

روحِ انسانی: تم سب پتھر پھینک دو — کیلنڈر کا کام بھی ہو جائے گا۔ اس وقت ہمیں خاموشی سے سو جانا چاہیے۔ اگر میں آج رات سو سکی تو غمِ فردا کے لیے اچھی ہو جاؤں گی۔ مجھے فکر تو ہے محض اس بات کی، کل تفتیش ہو گی اور آپ کو میری وجہ سے ناحق تنگ کیا جائے گا۔

ایک آواز: اس بات کے لیے میں ذمہ دار ہوں۔

دوسری آواز: ہم کہہ دیں گے کہ ناظم کی بیگم صاحبہ نے نشانہ بازی کی مشق کے لیے اپنے چھوکرے کو بھیجا تھا۔

روحِ انسانی: لیکن چپراسی سب کچھ جانتا ہے۔

ایک آواز: او —— وہ —— جانتا ہے۔ اس جرم میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا ہمارا۔ سب سے پہلے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ تم نے پتھر دیے کیوں؟ وہ اپنے آپ کو پھنسا دیکھ کر یقیناً کہہ دے گا کہ پتھر میں نے نہیں دیے۔

روحِ انسانی: اور داروغہ؟

دوسری آواز: داروغہ کا باپ بھی نہیں بولنے کا —— یہ سب کچھ اس کے بیٹے نے کیا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

تیسری آواز: اب سو جاؤ —— جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

دوسرا منظر

وہی جو منظرِ اوّل میں ہے۔ سورج کی پہلی کرنیں زنداں میں سوئے ہوئے قیدیوں پر پڑ رہی ہیں۔ روحِ انسانی سلاخوں کے قریب بیہوشی کے عالم میں پڑی ہے۔ اُس کے منہ پر ہلدی سی بکھر رہی ہے اور نقاہت کے شدید آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر روحِ انسانی پہلو بدل کر اُٹھتی ہے —— پسِ پردہ کسی

گرجے میں ویگنز کی Symplany سُنائی دیتی ہے۔ پھر دُور سے بندوقوں کی باڑھ کی آواز آتی ہے، جسے سُن کر باقی قیدی بھی جاگ پڑتے ہیں اور اپنے کان ایک عورت کی صدائے گریہ پر لگا دیتے ہیں۔

روحِ انسانی: یہ کون عورت رو رہی ہے؟

قیدی نمبر 3: یہ بالکل میری ماں کی آواز ہے — !

قیدی نمبر 1: نہیں! یہ بالکل میری ماں کی آواز ہے۔ لیکن..... میری ماں تو فوت ہو چکی ہے!

روحِ انسانی: آہ! یہ نہ اس کی ماں کی آواز ہے نہ تمھاری —— یہ مادرِ دہر ہے جو درد کرب کے ایک شدید احساس سے کراہ رہی ہے اور اپنے بیٹوں کی موت پر گریہ وزاری کرتی ہے —— بیٹے! جنھیں اپنے ہی بھائیوں کو مارنے کے لیے اسلحہ بنانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے اور جب وہ انکار کرتے ہیں تو گولی کا نشانہ بنتے ہیں (افق کی طرف دیکھ کر) —— ٹھہرو زندانی —— مجھے افق پر مسیح کی روح جلوہ گر ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یسوع —— عزیز بیٹوں کی موت پر آنسو بہانے کے لیے خود آسمان کی بادشاہت چھوڑ آیا ہے۔

قیدی نمبر 3: روحِ انسانی! تم کیا باتیں کر رہی ہو؟

قیدی نمبر 1: کیا تمھیں سچ مچ عیسیٰ مسیح دکھائی دیتے ہیں، روحِ انسانی؟

روحِ انسانی: تم اسے میری پریشان دماغی ہی تصور نہ کرو زندانی —— ! —— مسیح کہہ رہا ہے۔ میں نے چند شیطان صفت انسانوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنی معصوم بھیڑوں کا تمام عذاب اپنے ذمے لیا۔ اور ٹھیرو — زندانی! —— مجھ پر ایک عظیم الشان حقیقت کا کشف ہو رہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ کون کہتا ہے اُسے کسی نے سُولی دی۔ اپنی معصوم بھیڑوں اور ان پر کیے گئے ظلم کی خدا کا بیٹا تاب نہ لا سکا اور اس نے صلیب پر لٹک کر خودکشی کر لی — میں سمجھتی ہوں —— خودکشی ہی نجات کا ایک مسیحی طریقہ[1] ہے۔

1۔ یہ ارنسٹ مالر کے الفاظ ہیں

قیدی نمبر 3: روحِ انسانی، روحِ انسانی! آپ کا چہرہ ایک بہت ہی مہیب صورت اختیار کر رہا ہے۔

قیدی نمبر 1: روحِ انسانی! ——— خدارا آسمان کی طرف مت دیکھو۔

روحِ انسانی: وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں نے خودکشی کی۔ خودکشی ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ میں اپنی تحریر میں اس انوکھے طریقۂ نجات کی تلقین کیا کروں گی ——— اے انسانی استبداد۔ رحم! رحم!!

(کانپتی آواز میں)

نطشے اپنی ساری زندگی رحم کو ایک سفلی اور نسوانی جذبہ قرار دیتا رہا، سپر مین بننے کی کوشش میں اپنے اساسی جذبات کو دباتا رہا۔ لیکن جب ان قدرتی احساسات کو دبانے کی وجہ سے پاگل ہوا اور عالم دیوانگی میں اس نے ایک زخمی گھوڑے کو دیکھا تو اس کے تمام دبے ہوئے جذبات اُبل پڑے اور وہ اس قدر رویا، اس قدر رویا کہ آنسوؤں کے دریا بہا دیئے ——— آج انسان اپنے اس جذبہ رحم کو دبانے میں مکمل طور پر کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن وہ دن دُور نہیں جب کہ اُس کی غیر فطرتی حرکتیں اسے پاگل کر دیں اور پھر وہ اپنی روح کو پالے ———

قیدی نمبر 3: تم ٹھیک کہتی ہو، روحِ انسانی!

قیدی نمبر 2: ہمیں انسان کی نیکی میں یقین ہے روحِ انسانی ——— یہ گمراہ انسان پھر راہِ راست پر آئے گا۔

روحِ انسانی: آج مارچ کی چار ہے ——— اور شام کو ایک ماہ اور اٹھارہ دن بیت جائیں گے۔

قیدی نمبر 3: اب دیکھیے آپ نے اپنے دماغ کو ہی کیلنڈر بنا لیا ہے۔

روحِ انسانی: میں رات کو بھی پوری نیند نہیں سو سکی۔ سونے سے پہلے اندھیرے کی وجہ سے میرے سامنے گھر والوں کی افلاس زدہ شکلیں پیدا ہونے لگیں۔ پہلے میرے اور ان محسرت و افلاس کے مارے ہوؤں کے درمیان بجلی کا قمقمہ حائل ہو جاتا تھا لیکن اب ——— آہ!......

قیدی نمبر 3: آپ ایسے خیالوں کو دماغ میں لایا ہی نہ کریں۔ رُوحِ انسانی! وہ تو...... (گھوم کر) روحِ انسانی! بہت سے آدمی آ رہے ہیں۔ ذرا تیار ہو جیے۔

(داروغہ اور کنسٹیبل داخل ہوتے ہیں)

داروغہ: اوہو! کنسٹیبل ــــ یہاں تو بہت سے پتھر پڑے ہوئے ہیں ــــ اوہ! بلب بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کیا بدتمیزی ہے؟

کنسٹیبل: جی ہاں، داروغہ صاحب ــــ یہ کنکر دفتر کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ اور میز پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

داروغہ: اور وہ میز کے قریب کوئی پیتل کی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کنسٹیبل: اوہ! یہ تو گھڑی کا لنگر ہے۔

داروغہ: اوہ کلاک ــــ! اس کا شیشہ اور لنگر سب کچھ ٹوٹا ہوا ہے۔ کس کی شرارت ہے یہ! (اِدھر اُدھر دیکھ کر) اور ہاں کنسٹیبل!

کنسٹیبل: جناب!

داروغہ: سامنے کمرے کے قیدی کیا کر رہے ہیں۔

کنسٹیبل: (زنداں کی طرف جھانکتے ہوئے) اُوں! روحِ انسانی لوہے کی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی ہے۔ جیسے انھیں توڑ ہی ڈالے گی۔ اِس کے بال بے طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ لب سُوکھے ہوئے ہیں اور آنکھیں گڑھے سی دکھائی دیتی ہیں ــــ اور دوسرے زندانی تاش کے پتے چھانٹ رہے ہیں۔

داروغہ: ہوں ــــ میں سمجھا ــــ ذرا ان سے پوچھا جائے۔

(زنداں کی طرف بڑھتے ہوئے)

داروغہ: کیوں جناب! یہ کلاک اور بلب کس نے توڑے ہیں؟

قیدی نمبر 3: جی ہاں داروغہ صاحب ــــ آپ کے چھوٹے بیٹے اور اس کے ساتھیوں نے توڑے ہیں......

قیدی نمبر 1: یہ سب چھوکرے بندوق اور پتھروں سے نشانہ بازی کی مشق کرتے رہے ہیں۔

قیدی نمبر 2: داروغہ صاحب! بھلا آپ سوچیں تو ——— ہمارے پاس پتھر آ کیسے سکتے ہیں؟

کنسٹیبل: میرا بھی یہی خیال ہے داروغہ صاحب کہ یہ کام چھوکروں نے ہی کیا ہوگا۔ میں نے کئی ناقابلِ سراغ کیس تفتیش کیے ہیں اور مجرم کی شکل دیکھ کر ہی بہت سی باتیں جان لیتا ہوں۔ اپنے تجربے کی بنا پر ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔

داروغہ: تم نہیں جانتے کنسٹیبل ——— مجھے پتہ ہے کہ بلب توڑے جانے کا کیا مقصد ہے؟ اگر تمھارے تجربے کے پیشِ نظر یہ بات مان بھی لی جائے تو بھی اس بات میں شک نہیں کہ اس شرارت کے محرک یہی لوگ ہیں۔

کنسٹیبل: لیکن انھیں بلب توڑ دینے سے کیا حاصل تھا؟

داروغہ: تم نہیں جانتے کنسٹیبل۔

کنسٹیبل: اگر اس معاملہ کی رپورٹ بھی ہوتی تو معاً یہ سوال اُٹھے گا کہ رات کو دفتر میں بلب جلانے کی ضرورت کیا تھی۔ وہاں کون سا خزانہ دھرا تھا اور اُلٹا الزام ہم پر عائد ہوگا۔ خاص طور پر جب کہ اس بات میں چھوٹے صاحبزادے ———

داروغہ: تم بلب کے ٹوٹنے کی ماہیت سے واقف نہیں اور رات کی بتی صرف میرے ہی ایما پر روشن نہیں ہوتی۔ البتہ مجھے ڈر ہے تو محض اس بات کا کہ کل رات کو میں نے کسی کو ڈیوٹی پر تعینات نہیں کیا، وگرنہ یہ حادثہ کیسے وقوع پذیر ہوتا ——— اور تم جانتے ہو۔ ناظمِ اعلیٰ کتنا جابر آدمی ہے۔

کنسٹیبل: جی ہاں ——— ہم کاہے کو بلب ٹوٹنے کی ماہیت سے واقف ہوں گے۔ ہم تو گویا بھاڑ جھونکتے ہیں یہاں ——— گویا احمق ہیں۔

داروغہ: تم خواہ مخواہ ناراض ہونے لگے۔ بھلا میں تمھیں کیوں احمق سمجھنے لگا۔

کنسٹیبل: اور بات کیا ہے کیونکہ اس میں چھوٹے صاحبزادے بھی شامل ہیں۔ آپ کو یہ بات بڑھانی نہیں چاہیے۔ میں نے خود بھی چھوٹے صاحبزادے کو شام کے وقت یہاں منڈلاتے دیکھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی بندوق تھی ——— اُسی نے یہ

شرارت کی ہوگی، ورنہ اِن لوگوں کے پاس کنکر کیسے آسکتے ہیں۔

داروغہ: مجھے تعجب ہے! لیکن آج شام کو ڈیوٹی پر کون تھا؟

کنسٹبل: غالباً وہی چپراسی ــــ جو بارک میں مشقت لے رہا ہے۔ اُسے آواز دیجیے۔

داروغہ: (ایک طرف منہ کرتے ہوئے) چپراسی، اے چپراسی ــــ

چپراسی: جی آیا............

(داخل ہوتا ہے)

داروغہ: کل شام تمھاری نوکری تھی؟

چپراسی: جی ہاں۔

داروغہ: آج یہاں ایک واقعہ ہوگیا ہے۔ دفتر کا کلاک اور بلب بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ تم بتا سکتے ہو کل شام کو یہاں کون کون آیا؟

چپراسی: (حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے) کلاک اور بلب! ــ کیسے ٹوٹ گئے۔ داروغہ صاحب! میں نہ کہا کرتا تھا کہ ناظم صاحب کے حکم کے مطابق دروازہ بند رکھا جائے ــــ (پتھر دیکھتے ہوئے) ــ یہ پتھر ہیں ــ یہ پتھر......تو کل ...... م......م......

کنسٹبل: چھوڑیے داروغہ صاحب ــــ میں نے جو کہہ دیا کہ یہ بچوں کی شرارت ہے۔

چپراسی: جی جی ــ جی۔ یہ بچوں کی شرارت ہے ــــ م......م نے خود دیکھا ہے......جی ہاں کل چھوٹے صاحبزادے اس طرف گھوم رہے تھے۔ بیگم صاحبہ انھیں نشانہ بازی کی مشق کے لیے اِدھر بھیج دیتی ہیں۔

کنسٹبل: بس قصہ پاک ہوا ــــ چھوٹے صاحبزادے......

داروغہ: (غصّے میں) کنسٹبل خاموش رہو ــ تمھیں کیا پڑی ہے جو بار بار چھوٹے میاں کا نام لیتے ہو۔ حالانکہ اسے اِس بات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر جلدی تم نے اپنا رویّہ نہ بدل ڈالا تو مجھے ڈر ہے کہ براہِ راست ناظم سے تمھاری شکایت کرنا پڑے گی۔ سمجھے۔ تم معاملات کی نزاکت سے کبھی واقف نہیں ہوتے، اور ہمیشہ

بڑھ کر باتیں کرتے ہو۔

کسنٹبل: پچھلے ہفتے آپ کا قلمدان کس نے توڑا تھا؟ اور فرمایئے داروغہ صاحب! ٹیلیفون کی ایکسٹنشن کس نے خراب کی تھی۔ میری طرف سے آپ شوق سے ناظم صاحب کے پاس شکایت لے جائیں۔ میں سچائی پر ہوں۔

داروغہ: (ہنستے ہوئے) گویا یہاں سب باتیں سچائی کو مدِ نظر رکھ کر ہوتی ہیں (ایکا ایکی بارُعب لہجہ اختیار کرتے ہوئے) لو اب تیار رہنا ——— میرے کوارٹر میں جاؤ اور بیگم سے کہو کہ جو نیا کلاک میں نے پارسل منگوایا تھا، وہ دفتر کے استعمال کے لیے دے دے اور دیکھو، ایک بجلی کا بلب بھی لیتے آنا۔ میں بیگار کے قریب کھڑا ہوں گا۔

(جاتے ہیں)

قیدی نمبر 3: میرے خیال میں داروغہ ناظمِ اعلیٰ کے پاس جا رہا ہے۔

روحِ انسانی: جانے دو۔ مجھے افسوس ہے کہ بات وہیں کی وہیں رہی۔ داروغہ مجھے آرام و آسائش دینے پر تلا ہوا ہے۔ کیلنڈر وہیں رہے گا اور کلاک کی جگہ نیا کلاک آجائے گا، زندانی! داروغہ نہیں چاہتا کہ میں تھوڑی سی زندگی بھی بغیر ذہنی کوفت کے گزار سکوں۔ وہ دیکھو کیلنڈر کے ہندسے گھورتے ہوئے مجھے اچھی طرح نظر آتے ہیں۔

قیدی نمبر 3: روحِ انسانی! اب آپ اُدھر نہ دیکھیے۔

روحِ انسانی: نئے نظام والوں نے جس طرح نمولر کو مارا وہ میرے ذہن میں اچھی طرح سے محفوظ ہے۔ نمولر کی زبان مجھے ابھی تک لٹکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں شبنم کے قطرے کا سا پاکیزہ آنسو پلکوں کی سُولی پر لٹک رہا ہے۔

قیدی نمبر 1: روحِ انسانی! یہ کتنا خوف ناک منظر ہے۔ خدارا اسے ہمارے سامنے بیان کرنے کی کوشش نہ کرو۔

روحِ انسانی: اگر مجھے زندہ رہنے کی مُہلت ملی، تو میں بدنصیب نمولر کی شہادت پر ایک تمثیل لکھوں

گی۔ اور نئے نظام والوں کے فلسفہ میں جو شیطانی کد ہے، اسے بے نقاب کر دوں گی۔ نمولر کو جسمانی اذیتیں دے کر مار ڈالا گیا۔ اور مجھے ذہنی عذاب سے مارا جا رہا ہے ـــــ زندانی! مجھے امید نہیں کہ میں یہاں دو تین ماہ سے زیادہ کاٹ سکوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ البتہ اس طرح ایک ذہنی سزا پا کر سِسک سِسک کر مرنا نہیں چاہتی۔

قیدی نمبر 3: لیجیے وہ چپراسی پھر کلاک دفتر کی دیوار پر لٹکا رہا ہے۔

(پھر کلاک کی ٹِک ٹِک وزنی ہتھوڑوں کی طرح روحِ انسانی کے ذہن پر پڑتی ہے اور روحِ انسانی کراہنے لگتی ہے)

قیدی نمبر 3: روحِ انسانی! میں خود محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو کسی بھی قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

قیدی نمبر 1: آپ ہماری روحِ رواں ہیں، اور ہم ـــــ

قیدی نمبر 3: ٹھہرو ـــ وہ ناظم آ رہا ہے ـــــ روحِ انسانی! آپ علاحدہ کھڑی دیکھتی رہیے۔ آپ کو قید بامشقت دلا کر ذہنی کوفت سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔

روحِ انسانی: لیکن میں ہرگز ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ تم میری وجہ سے سزا پاؤ۔ للّٰہ کوئی ایسا فعل مت کرنا جس کی ذمہ داری تم پر آئے۔ دیکھو زندانی میں منت سے کہتی ہوں۔

قیدی نمبر 3: روحِ انسانی! آپ کی زندگی ہماری زندگیوں کے مقابلے میں کہیں قیمتی ہے۔ ہماری آنکھیں آپ کے عذاب کو نہیں دیکھ سکتیں۔

(ناظم، داروغہ، چپراسی اور دوسرے لوگ داخل ہوتے ہیں)

ناظم: آپ روحِ انسانی ہیں!

روحِ انسانی: جی مجھے ہی اس نام سے پکارا جاتا ہے۔

ناظم: کلاک اور بلب توڑنے کی آپ ذمے دار ہیں کیا؟

قیدی نمبر 3: میں اس کے متعلق آپ سے ذاتی گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔

داروغہ: ہاں آپ ناظم صاحب سے بات کر لیں۔ چھوٹے صاحبزادے کی شرارت محض

ایک افسانہ ہے۔

ناظم: آپ خاموش رہیں داروغہ صاحب!

(ناظم قیدی نمبر 2 کے قریب جاتا ہے۔ قیدی اُس کا کالر پکڑ کر بے تحاشا مارنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے قیدی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ''میرا کالر چھوڑ دو'' کہنے کے بعد ناظم کراہتا سُنائی دیتا ہے۔ جیل کے تمام ملازمین —— ''دوڑو — دوڑو — ناظم کو مار دیا، دوڑو''۔ ''میری رائفل کہاں ہے'' — ''میرا بیٹن لے لو'' — کا شور مچاتے ہوئے قیدیوں پر پل پڑتے ہیں۔)

قیدی نمبر 3: پرے ہٹ جاؤ، روحِ انسانی!

روحِ انسانی: ہرگز نہیں زندانی! ناظم کو مارنا ہمارا مقصد نہیں۔ اس کے سر پر ایک ہی چوٹ ہمارے لیے کافی ہے —— ہٹ جاؤ۔

(قیدی ناظم کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ کنسٹیبل اور جیل کے دوسرے ملازمین یکے بعد دیگرے تینوں قیدیوں کو مار گراتے ہیں — اس نفسا نفسی میں روحِ انسانی بھی زخمی ہو کر گر جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

ایک فوجی عدالت۔ ناظم ایک بڑی کُرسی پر بیٹھا ہوا صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اس کے میز پر بہت سے کاغذات بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تینوں قیدی اور روحِ انسانی زنجیروں میں جکڑی ہوئی کھڑی ہیں اور دوسری طرف کورٹ مارشل دیکھنے کے لیے آئے ہوئے لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

ایک تماشائی: ناظم نے احکام جاری کردیے ہیں۔

دوسرا: تم نے فیصلہ کا آخری حصہ سُنا؟

تیسرا: ہاں میں نے سُنا ——— ابھی روحِ انسانی کے متعلق کچھ نہیں سُنا۔

چوتھا: آخر اتنی جرأت!

پانچواں: تم معاملے سے اچھی طرح واقف نہیں ——— روحِ انسانی نے زندانیوں کی مدد سے یہ فعل محض اس لیے کیا کہ وہ مرنا چاہتی تھی۔

پہلا: مرنا چاہتی ہے؟

دوسرا: ہاں ہاں ——— مرنا چاہتی ہے۔

تیسرا: اس معمولی واقعہ کی سزا موت نہیں ہوسکتی۔

چوتھا: آپ نہیں جانتے، یہ لوگ نئے نظام کے قیدی ہیں۔

پانچواں: ہمارے ملک میں جب صبح طلوع ہوتی ہے تو سینکڑوں عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں۔

پہلا: بچے یتیم ہوجاتے ہیں۔

دوسرا: چُپ ———!

تیسرا: خاموش ———!

چوتھا: فوجی عدالت ہے۔

پانچواں: پہلے قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرّت سی ناچ رہی ہے۔

پہلا: جو صرف شہیدوں کے حصّے میں آتی ہے۔

دوسرا: مجھے نمولر کی موت یاد ہے۔ مرتے ہوئے اس کے چہرے پر بھی اِسی قسم کی مسکراہٹ تھی۔

تیسرا: نمولر کی ماں ——— بچاری ——— آہ!

ناظم: تیسرے زندانی! تم نے اپنی موت کا فیصلہ سُن لیا؟ اب اسے لے جاؤ اور کیفرِ کردار تک پہنچادو۔

(سپاہی لے جاتے ہیں۔ پردے کے پیچھے سے گولی کی آواز سُنائی دیتی ہے)

پہلا تماشائی: مار دیا گیا۔ ایک لمحہ پہلے وہ زندہ تھا۔

دوسرا: ہاں ہاں۔ ہماری تمھاری طرح ایک زندہ انسان تھا۔

تیسرا: اس کی زبان باہر آ چکی ہوگی — لیکن اس کے جسم کے حصے ابھی تک پھڑ پھڑا رہے ہوں گے۔

چوتھا: خون جم رہا ہوگا۔

روحِ انسانی: (رونی آواز میں) — اے رفیق — تیری موت پر مادرِ دہر، خون کے آنسو بہاتی ہے۔ میں تیرے لیے کتنی قربت محسوس کر رہی ہوں اور چند ہی لمحوں میں تمھاری رفاقت کا حق ادا کروں گی۔

ناظم: دوسرے زندانی تم بھی تیار ہو جاؤ۔

قیدی نمبر 2: ناظم! میں تیار ہوں —

(قیدی نمبر 2 کو لے جاتے ہیں۔ پھر پہلے کی طرح پردے کے پیچھے سے گولی کی آواز آتی ہے)

ناظم: (شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے) نشانہ خوب رہا۔

کنسٹیبل: دل پہ بیٹھا ہے۔

پہلا تماشائی: (پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے) قیدی نے ایک دفعہ گر کر پھر سر اُٹھایا ہے۔

دوسرا: گویا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

تیسرا: لیکن وہ کہہ نہیں سکا۔

چوتھا: کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کی دُھندلی نگاہیں سب کچھ کہہ گئی ہیں۔

ناظم: دوسرے زندانی کا سر لے کر اس کے گاؤں کے باہر لٹکا دو۔

قیدی نمبر 1: میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ناظم: (غصے سے) لے جاؤ — روحِ انسانی تیار ہو۔

(لے جاتے ہیں)

روحِ انسانی: میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔

(پردے کے پیچھے سے کسی عورت کے رونے کی آواز آتی ہے)

پہلا تماشائی: یہ کون عورت رو رہی ہے؟
دوسرا: کوئی بوڑھی عورت ہے۔
روحِ انسانی: یہ مادرِ دہر کی آواز ہے جو اپنے بیٹوں کی موت پر گریہ وزاری کر رہی ہے۔
ناظم: روحِ انسانی کو ایک لامحدود قیدِ محض دی جاتی ہے اور اسے تنہا دفتر کے سامنے کمرے میں جہاں کہ وہ پہلے تھی، رکھا جاتا ہے۔
روحِ انسانی: (چیختے ہوئے) قیدِ محض ——— قیدِ محض ——— قیدِ بامشقت بھی نہیں؟
آوازیں: قیدِ محض؟
پہلا تماشائی: روحِ انسانی اپنے بال نوچ رہی ہے۔
دوسرا: اس کی آنکھیں خوف ناک طور پر پپوٹوں سے باہر اُبھر آئی ہیں۔
تیسرا: اس پر وحشت اور دیوانگی طاری ہے۔
روحِ انسانی: قیدِ محض! ——— ناظم ——— کیلنڈر ——— خدا کے لیے اس کمرے میں سے کیلنڈر اور کلاک اُٹھا لیجیے۔ وگرنہ مجھے میرے ساتھیوں کے پاس پہنچا دیجیے ——— ناظم! میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔
پہلا تماشائی: کیلنڈر؟
دوسرا: کلاک؟
تیسرا: روحِ انسانی کا مطلب کیا ہے آخر؟
روحِ انسانی: کیلنڈر ——— کلاک ——— ناظم! خدا کے لیے ———
ناظم: (نفرت سے) لے جاؤ ———

(روحِ انسانی کو بالوں سے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ چند وحشیانہ قہقہوں کے درمیان کلاک ٹِک ٹِک یوں بلند ہوتی ہے کہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا ———)

(پردہ)

اَب تو گھبرا کے......

(نقل، ایک ایکٹ)

افراد:

خلیل بی کام .... بینک کلرک

جی گڈوانی .... بینک کا سپر وائزر

سردار صاحب، شریمتی جی .... بینک کے گاہک

خالق کائنات کی بھاری اور گرگراتی ہوئی آواز، ریل گاڑی کے پہیّوں کی گڑگڑاہٹ کے مشابہ۔

فرشتۂ موت۔

منظر

بینک کا ایک حصہ، کاؤنٹر پر دو تین کلرک بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے دو الماریاں ہیں، جن میں لیجریں قرینے سے پڑی ہیں۔ الماریوں میں خالی جگہ اس بات کی مظہر ہے کہ کچھ لیجریں حسبِ ضرورت نکالی گئی ہیں، کچھ کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ سُپر وائزر کی میز اور کاؤنٹر پر پڑی ہیں۔ لیجروں کے پیچھے سے سُپر وائزر کا صرف سر ہی دکھائی دیتا ہے۔

سُپروائزر کے پیچھے ایک ڈائس (Dais) سپرنٹنڈنٹ کی میز پر رکھی ہے۔ اُس پر ٹیلیفون پڑا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب غائب ہیں۔

آج کل ششماہی کے دن ہیں، اس لیے سب سودا لگانے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے عجلت کا یہ عالم ہے کہ سُپروائزر صاحب اور ایک دو کاؤنٹر کلرک عصبی طور پر بیمار دکھائی دیتے ہیں۔

خلیل کچھ زیادہ ہی کھویا کھویا نظر آتا ہے۔ خالدہ، اُس کی بیوی گھر میں بیمار پڑی ہے، جس کی تیمارداری کے باعث وہ شب بھر آنکھ نہیں جھپک سکا۔ اس لیے کام کی زیادتی کے باوجود کبھی کبھی ایک آدھ پل کے لیے اُونگھ جاتا ہے۔

وقت اور تاریخ ـــــ جیسا کہ کلاک اور کیلنڈر سے ظاہر ہے، ساڑھے بارہ کے قریب 27 جون 1937۔

ایک کلرک: (خلیل کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) چُھٹی ملی خلیل میاں؟...... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے چُھٹی کے لیے درخواست دی تھی۔

خلیل بی کام: (ایک لیجر کو بند کرتے ہوئے) چھٹی؟ کہاں ملی چھٹی...... عرضی ابھی تک اپنا ڈیموکریٹک سفر طے کر رہی ہے۔ غالبًا وہ سپردائزر کی میز سے آگے نہیں جانے پائی ـــــ سپرنٹنڈنٹ کی میز صبح سے خالی ہے۔

کلرک: بیگم کا مزاج کیسا ہے؟

خلیل: میں کیا جانوں بھائی ـــــ غالبًا جی ہی رہی ہوگی۔ صبح اُسے حرارت زیادہ تھی۔ بچے نے ابھی تک ماں کا دودھ نہیں پیا۔ ماما، دودھ میں روئی بھگو کر اُس کے حلق میں ٹپکا رہی ہے۔ حالات تشویشناک ہیں (لیجروں کی طرف دیکھ کر)
اُف اتنی لیجریں جمع ہوگئی ہیں۔ ابھی حسابدار آئیں گے اور پاس بُکوں کا تقاضا کریں گے۔ مسٹر گڈوانی بہت آہستہ کام کرتے ہیں۔ مکمل ڈیموقراطی ہیں۔ گڈوانی صاحب، اب کیا کیا جائے؟

(چپراسی کو بُلاتا ہے)

سوبھی ! او سوبھی .... گڈوانی صاحب، سوبھی برابر نصف گھنٹہ سے غائب ہے۔

(کام میں مشغول ہوجاتا ہے)

(پھر)

آج کیا تاریخ ہے؟

(کوئی جواب نہیں دیتا)

کلرک: دراصل کام ہے ہی بہت۔ کاؤنٹر کی بک بک جھک جھک کے علاوہ سینکڑوں کتابوں کو سود لگا ڈالا ہے۔ صبح آٹھ بجے آیا تھا۔ تمھاری قسم ......اور ابھی تک قلم نہیں رکھا اور یہ دیکھو خلیل میاں، دینو دودھ رکھ گیا ہے۔ پڑا پڑا ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ اب تو پینے کو جی نہیں چاہتا تمھاری قسم!......

سُپر وائزر گڈوانی: تیس جون، کوئی چھٹی نہیں۔

خلیل: (چونک کر) کیا کہا جناب! بینک ہالی ڈے نہیں؟

گڈوانی: نصف اسٹاف کو آنا پڑے گا، جس میں خلیل میاں، مہتا اور ہانڈہ تینوں شامل ہیں۔ منیجر صاحب مٹھائی یا الاؤنس کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ سب کی رائے لی جائے گی۔ ووٹوں کی بنا پر فیصلہ ہوگا۔ یہ انڈسٹریل بینک ہے، کوئی مداری کا کھیل نہیں ہے......

خلیل: یہ ایک دیموقراطی انسٹی ٹیوشن ہے کوئی ڈکٹیٹر کا......

گڈوانی: دیکھو نا، اب کیا کیا جائے۔ ششماہی کے دن ہیں۔ لو مسٹر خلیل، نوٹ کر لیجیے گا منیجر صاحب کے آرڈر۔

(خلیل بڑھتی ہوئی کتاب پر بادلِ ناخواستہ دستخط کرتا ہے)

خلیل: مرے کو مارے ———

کلرک: (ہاتھ پھیلا کر) شاہ مدار۔

گڈوانی: خلیل میاں، آپ کے ایریز پڑ رہے ہیں۔

خلیل: اجی جناب، گڑھے کیوں نہ پڑیں آخر—— آنکھیں ہی تو ہیں، بارہ بارہ گھنٹہ کی مار کھاتی ہیں یہ آنکھیں!

گڈوانی: چ چ، اوہو! گڑھے نہیں! اریرز۔ اگر ہم یکم جولائی سے پہلے پہلے اپنے حصے کا سود ختم نہ کر سکے تو اچھا نہ ہوگا۔ تمھارے متعلق منیجر صاحب کا خیال اچھا ہے۔ آخر بی کام ہو۔

خلیل: ایک دن میں سود کے ایک سو چوراسی اندراج کرنے کے بعد بھی اگر آپ مجھے بے کام کہیں تو پھر—— اچھا! آپ کا مطلب بی کام ہوں میں، گویا منیجر صاحب خوش ہو کر مجھے اسسٹنٹ منیجر ہی تو لگا دیں گے۔

(گھبرا کر)

یکم جولائی سے پہلے پہلے؟ ... لاحول ولاقوۃ......م......م...... میری بیوی بیمار ہے۔ مسٹر گڈوانی! تعجب ہے یہاں کسی کو ذرا بھی ہمدردی نہیں۔ بارہ گھنٹے کی حاضری۔ بینک ہالی ڈے بھی نہیں۔ کاش منیجر صاحب کا خیال میرے متعلق اچھا نہ ہو......اور ہاں، گڈوانی صاحب! آپ نے میری درخواست کا کیا کیا؟ میں سچ کہتا ہوں مجھے آپ کے ڈیموقراطی طریقے سخت......

گڈوانی: (پدرانہ شفقت سے) اوہ! مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے۔ جب مسز گڈوانی کی موت ہوئی تھی تو بہت لوگ ہمدردی کے لیے آئے تھے۔ لیکن...... لیکن میں کیا کہہ رہا ہوں۔ دیکھو نا، اب یہ سب کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے ہے یعنی...... یعنی ششماہی کی وجہ سے، وگرنہ میں ضرور انسانوں کی طرح یا کم سے کم آپ کی طرح تو باتیں کرتا...... میرا...... میرا مطلب ہے تمھیں ڈیموقراطی طریقے سے کیوں نفرت ہے؟ ایک ڈیموقراطی ملک میں ہی بینک اس قدر آرام سے چل سکتے ہیں۔ تمھیں اگر بارہ گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے تو علاحدہ بات ہے اور پھر تمھاری چھٹی کے معاملے میں تو میں ہٹلر سے بھی بڑا ڈکٹیٹر بننے کو تیار ہوں۔ فقط میرے بس کی بات ہو (جوش میں) میرے بس کی بات ہو تو تمھیں ایک دن کی چھٹی کیا ہمیشہ

کی چھٹی......

(کاؤنٹر کی طرف دیکھ کر) سردار صاحب کھڑے ہیں۔ان کا کام پہلے کردو۔

(سردار صاحب سے)

ہلو، سردار صاحب، ست سری اکال، کہیے مزاج اچھے ہیں؟

(سردار صاحب جواب نہیں دیتے)

خلیل: (چیک ہاتھ میں لے کر معائنہ کرتا ہے — پھر آہستہ سے) بیرر چیک ہے مسٹر گڈ وانی، حسابدار کے دستخط نہیں ملتے۔

سردار صاحب: (چیخ کر) میں بیٹ کرتا ہوں۔ دستخط بالکل ملتے ہیں۔ اب میں تصدیق کس کی کراؤں؟ جسے بینک جانتا ہو اُس کی؟ آپ لوگ پبلک کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ بینک میں میرا کوئی واقف نہیں اور پیسوں کی مجھے سخت ضرورت ہے، دو بجے سے پہلے پہلے...... سمجھے آپ؟ ناممکن ہے۔ آپ مجھے پیسے نہ دیں۔ ایک دفعہ آپ نے مجھے پہلے بھی تنگ کیا تھا؟ میں شکایت کروں گا۔ اخبار میں آرٹیکل لکھوں گا، بینک کو بدنام کروں گا۔ منیجر صاحب کہاں ہیں؟ (سردار صاحب داڑھی میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ دُور منیجر صاحب کے کمرے کی طرف جا کر لوٹ آتے ہیں) لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں منیجر کے پاس جاؤں۔ میں شور مچاؤں گا۔ منیجر خود بخود یہاں بھاگا آئے گا۔

(باآواز بلند)

اگر آپ لوگوں نے مجھے......

خلیل: (گھبرا کر...... منت سے) سردار صاحب......

کلرک: (منت سے) جناب سر...... د...... ا...... ر صاحب......

گڈوانی: (منت سے) سردار بہادر......

سردار صاحب: (داڑھی کو چباتے ہوئے) سردار صاحب، سردار بہادر...... پھر اس سے اوپر نائٹ ہُڈ ہوتی ہے۔ لیکن جناب مجھے خطابات نہیں چاہئیں۔ مجھے پیسے درکار ہیں۔ دستخط

بالکل ملتے ہیں۔ میں اِن سے کامیاب طور پر جعلسازی کرسکتا ہوں ......ار......
میرا مطلب ہے اتنے درست ہیں کہ جعلسازی بھی روا ہے۔یعنی...... میں اپنے
آپ کو اچھی طرح بیان نہیں کرسکا۔میرے......

خلیل: (گھبرا کر) لیکن یہ تو آپ کے دستخط ہیں۔

سردار صاحب: اور آپ کو میرے باپ کے چاہئیں؟......آپ کس کے دستخط چاہتے ہیں؟

خلیل: سردار امر سنگھ ولد سردار شیر سنگھ کے......

سردار صاحب: تو میں ابھی تک امر سنگھ ہوں، شیر سنگھ نہیں ہوں۔

گڈوانی: سردار صاحب، کلرک کا مطلب ہے کہ کیا اس چیک کا جو بیئرر ہے، وہ حسابدار
خود ہے؟

(دستخطوں کا غور سے مطالعہ کرتے ہوئے)

دیکھیے، شریمان جی۔آپ نے اصلی دستخطوں کی بجائے اے۔ایس آہلووالیہ لکھا
ہے۔آپ سیدھا امر سنگھ لکھیں۔غالباً آپ شاعر ہیں، آہلووالیہ تخلص کرتے ہیں۔
لیکن کون سے بحر میں آپ اسے آسانی سے استعمال کرسکتے ہیں— آہلووالیہ—
ہزج مثمن سالم...... مجھے بھی نوجوانی میں شاعری کا سودا رہا ہے۔میرا مطلب ہے
یہ لیجیے ٹوکن 161 بی......

سردار صاحب: (ٹوکن لیتے ہوئے) آپ کیا کہہ رہے ہیں......آہلووالیہ میری ذات ہے۔

گڈوانی: اوہ! ذات ہے۔پھر تو وزن اور بے وزن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔(کچھ دیر
بعد) بات یوں ہے کہ آپ بہت دنوں کے بعد تشریف لائے ہیں، تشریف
رکھیے۔میز پر اخبار پڑا ہے۔دیکھیے۔

(سردار صاحب ملتفت نہیں ہوتے)

(سردار صاحب کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے)

''آپ کہاں کام کرتے ہیں؟''

(سردار صاحب جواب نہیں دیتے)

''آپ کا دولت خانہ؟''

(سردار صاحب خاموش رہتے ہیں)

گڈوانی: (خفیف ہوکر) خلیل میاں، آپ اُونگھ رہے ہیں۔

ملیل: (چونک کر) آج کیا تاریخ ہے؟ (کوئی جواب نہیں دیتا)

یک کلرک: (نصف درجن کے قریب چھینکیں لگاتے ہوئے).......ا.......و.......ف...... یہ نزلہ، اور بینک ہالی ڈے کو بھی آنا پڑے گا۔ دماغ پانی ہوکر بہ چکا ہے۔ جسم ٹوٹ رہا ہے۔ جس پر خدا کا قہر نازل ہو وہ اس جگہ نوکر ہو جاتا ہے۔ اس سے تو مرجانا اچھا ہے تمھاری قسم!

وسرا کلرک: (میز پر سر رکھ کر گاتا ہے)

اب گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہلا کلرک: (خلیل کے پاس پہنچ کر) خلیل میاں، اس حساب میں تم نے کلوزنگ بیلنس غلط لکھا ہے۔ سُود بھی غلط جمع کیا ہے۔ اگر یونہی آڈٹ میں چلا جاتا تو تمھیں خواہ مخواہ بیان دینے پڑتے ــــ ذرا خیال رکھا کرو۔ آج منیجر صاحب ذرا دُرشت ہو رہے ہیں۔

گڈوانی: (اپنے میز پر سے) مسٹر خلیل ــــــ جرنل میں آپ نے غلط اندراج کیا ہے (غور سے دیکھتے ہوئے) نہیں نہیں غلط نہیں...... بہت ہی مدھم لکھا ہے۔ ذرا پنسل کو دبا کر لکھا کرو۔ آڈٹ والوں کو تکلیف ہوگی۔ دیکھو بھائی، تم گریجویٹ ہو، ہمیں تم سے زیادہ توقع ہے۔

ملیل: جی آں، یہ تعلیم کا پاس ہی تو ہے جو مجھے گدھے کی طرح لاد دیا جاتا ہے۔ ہفتہ میں پچاسی پچاسی گھنٹہ کام...... استغفر اللہ۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ بینک کلرکوں اور دُکان کے ملازموں سے ہفتہ میں چوّن گھنٹے کام لینے کے متعلق تحریک شروع ہے۔ جب تک نوے گھنٹہ کام لیا جائے گا غلطیاں ہوں گی۔ جب تک ایک سو پانچ درجہ بخار یا شدت کے زکام میں ہندسوں کا کام یعنی میزان لگانی پڑے گی، بیوی

کے بسترِ مرگ پر ہوتے ہوئے دفتر آنا پڑے گا — یہ سب کچھ یونہی ہوگا۔

دوسرا کلرک: خلیل اس دن 27 تھی 24 نہیں، تم نے تاریخ غلط لکھی ہے۔

خلیل: دیکھو! میں منّت سے کہتا ہوں ہانڈہ! آج جو غلطی تمھاری نظر سے گزرے، اُسے سُرخ سیاہی سے ٹھیک کر دینا۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ بقول گڈوانی صاحب میں آج بس گریجویٹ ہوں۔

گڈوانی: لیکن یہ لیجروں میں بہت سے سُرخ اندراج بھی تو درست نہیں۔ تم بارہ گھنٹے کام کرتے ہو تو باقی بھی اتنا ہی کرتے ہیں اور پھر گریجویٹ ہو کر......

خلیل: (اُچھل کر) پھر گریجویٹ...... گریجویٹ...... میں کہتا ہوں گریجوایٹ آدمی ہوتے ہیں اور صرف آدمی۔ لیکن جب اُن کی بیویاں بیمار ہوتی ہیں تو وہ آپ کی طرح ایم۔ ایف (M.F) ہوتے ہیں۔ ایم۔ ایف۔ آپ سمجھے ایم۔ ایف کا کیا مطلب ہے، صاحب — مڈل فیل......

گڈوانی: (بدستور پدرانہ شفقت سے) اوہو! خلیل — کوئی بات نہیں میاں...... بس ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ دفتر میں بھی اور گھر میں بھی...... تمھاری بیوی کو دراصل کیا تکلیف تھی؟...... زچگی؟...... زچگی (آہ بھر کر) ہر مرد کو اس منزل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے ہر بیوی والے مرد کو اپنی بیوی...... ارے! میں آج کیا کہہ رہا ہوں — اپنی بیوی کی زچگی پر اُسے رات بھر جاگنا پڑتا ہے۔ پھر وہ شخص پاگل ہو جاتا ہے۔ دفتر میں کسی ذمہ دار جگہ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا...... بڑا موذی مرض ہے۔ یہ میری بیوی اسی مرض سے پرلوک سدھار گئی تھی۔ ابھی اس کا نواں بچہ ہی تھا اور ہاں بیگم کو سیپٹک سے بچانا۔ اسی مرض سے مسز گڈوانی (کاؤنٹر کی طرف دیکھ کر)...... شریمتی جی کھڑی ہیں۔ پہلے ان کی رقم جمع کر دو۔ سود بھی لگا دینا۔

(سردار صاحب کو پاس بُک دیتے ہوئے)

لیجیے سردار صاحب اپنی پاس بُک۔

(سردار صاحب اپنی پاس بُک لے کر چلے جاتے ہیں)

(شریمتی جی سے)

نمستے جی

(شریمتی جی گڈوانی کی طرف دیکھتیں بھی نہیں)

(خلیل سے— کھسیانہ ہو کر)

زیادہ دیر نہ لگانا خلیل میاں۔ شریمتی جی کھڑی نہ رہیں۔ آپ بینک کی دیرینہ سرپرست ہیں، سمجھے؟ مسز سی ایل نہرو۔ مسٹر نہرو بھی ہمارے مہربان ہیں۔ محکمہ نہر میں ایگزیکٹو انجینئر ہیں۔ شاید آپ جانتے ہوں گے؟ (شریمتی جی سے) مسز نہرو، آپ کی انٹری ایک منٹ میں کردی جائے گی۔ تشریف رکھیں——

(مسز نہرو ملتفت نہیں ہوتیں)

گڈوانی: (خفیف ہو کر) اُونگھ رہے ہو خلیل۔

خلیل: (چونک کر) آج کیا تاریخ ہے؟

(کوئی جواب نہیں دیتا)

(اُونچی آواز سے)

سوبھی! او سوبھی—— مسٹر گڈوانی، سوبھی برابر ایک گھنٹہ سے غائب ہے۔ میز پر لیجریں پڑی ہیں۔ شکایات کے لیے میں ذمے دار نہیں ہوں۔ اور گریجویٹ ہونے کے لیے بھی......

(گڈوانی صاحب خود لیجریں اُٹھاتے ہیں اور دستخط وغیرہ کرتے ہوئے پاس بُک شریمتی جی کو دے دیتے ہیں۔ شریمتی جی پاس بُک لے کر کچھ دُور تک چلی جاتی ہیں۔ لیکن پھر پاس بُک کھول کر بیلنس دیکھتی ہوئی واپس آ جاتی ہیں)

شریمتی جی: مسٹر گڈوانی، دیکھیے، جو پاس بُک آپ نے مجھے دی ہے، یہ میری نہیں ہے۔ یہ کسی آلو والے کی ہے۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ آپ پاس بُکوں کے بارے میں بھی

احتیاط سے کام نہیں لیتے، حالانکہ............

خلیل: آلو والا نہیں محترمہ —— آہلو والیہ!

گڈوانی: ہی ہی تخلّص نہیں —— کمبخت ذات ہے......اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ ......ہی ہی......ہی......میں نے بھی......

شریمتی جی: اوہ، آئی سی......تبھی تو میں حیران ہو رہی تھی کہ آلو والے کے پاس دو اڑھائی ہزار روپیہ کیسے آ سکتا ہے (تیز ہو کر) مجھے کاپی فوراً واپس دے دیں۔ پوری روڈ پر میری کوٹھی بن رہی ہے اور مجھے وہاں فوراً پہنچنا ہے۔ معاف کیجیے۔ بینک کا نظام کچھ اتنا قابلِ تحسین نہیں ہے۔ میرے شوہر ایگز یکٹو انجینئر ہیں اور منیجر کے ذاتی دوست۔ میں شکایت کروں گی۔ Rubbish Bank This!

(سپرنٹنڈنٹ کی میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ گڈوانی پہنچ کر رسیور اُٹھاتا ہے)

گڈوانی: منیجر صاحب ہیں؟ — کل کی؟ — وؤچر پر دستخط نہیں ہوئے؟ مجھے افسوس ہے ......تعجب ہے......میں ابھی حاضر ہوا......آئندہ نہیں ہوگا جی......کاؤنٹر پر ایک شریمتی جی کھڑی ہیں، ذرا......

(ٹیلیفون رکھتا ہے۔ دو قدم کاؤنٹر کی طرف جاتا ہے۔ پھر گھنٹی بجتی ہے اور گڈوانی واپس آ کر ٹیلیفون اُٹھاتا ہے)

ہلو......سردار سنگھ جی آہلو والیہ......جی ہاں......جی ہاں ہاں......ہاں جی جی...... ایڈیٹ؟ (Ididt)......کیا مطلب ہے آپ کا؟.... آپ اپنی کاپی لے جائیں اور مسز نہرو کی واپس کر دیں......ای بلاک؟......ایڈیٹ؟

شریمتی جی: نان سنس! ربش بینک دِس!

گڈوانی: (ٹیلیفون رکھ کر) منیجر صاحب بھی بُلا رہے ہیں۔ شریمتی جی! میں ابھی چلا...... میں ابھی آیا......میرا مطلب ہے منیجر صاحب کی طرف چلا اور آپ کی طرف آیا......(کبھی جاتا ہے اور کبھی آتا ہے اور اپنی سراسیمگی میں نہایت مضحکہ خیز دکھائی دیتا ہے) (شریمتی جی کچھ دُور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ خلیل اپنا سر بوجھل

محسوس کرتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیتا ہے اور اُونگھ جاتا ہے...... گویا وہ مر چکا ہے...... خالقِ کائنات اور فرشتۂ موت نمودار ہوتے ہیں۔ خالقِ کائنات کو پسِ پردہ ایک تحکمانہ اور بھاری آواز سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ فرشتۂ موت ایک سفید ریش، پُر جلال ہستی ہے۔

منظر وہی ہے۔ لیجریں اُسی طرح پڑی ہیں۔ صرف دو تین کلرک سُپر وائزر اور شریمتی جی وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ روشنی بہت مدھم کر دی جاتی ہے)

خالقِ کائنات: (پسِ پردہ آواز —— گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے مشابہ) فرشتۂ موت!

فرشتہ: خالقِ کائنات!

خالق: نیا منشی کیسا ہے؟

فرشتہ: مالکِ دو عالم! آپ کے ڈبُّو سے بھی زیادہ دُم ہلاتا ہے اور کان پھٹکتا ہے۔ گریجویٹ ہے۔ بی کام۔ گوشۂ اقتصادیات میں مفید و معاون ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے بینک میں اس کی بہت ضرورت ہے۔

خالق: تو وہاں اُسے اسسٹنٹ منیجر بنا دیا جائے — کیا خیال ہے تمھارا؟

فرشتہ: خداوندا! یہ شخص زندگی بھر کاؤنٹر کلرک رہا ہے۔ اسے اس جگہ کا بہت تجربہ ہے۔

خالق: کام تو بہت اچھا کرتا ہوگا—— گریجویٹ ہے۔

فرشتہ: خط نہایت عمدہ ہے۔ عالی جاہ ایک بات کہوں۔

خالق: کہو۔

فرشتہ: گھبراتا بہت ہے۔

خالق: (ہنستے ہوئے) یہ اس کی سرشت ہے—— میری کردار نگاری کا ایک نمونہ ہے۔

فرشتہ: صرف گھبراتا ہی نہیں۔

خالق: اور کیا کرتا ہے؟

فرشتہ: کام کرتے کرتے اُونگھ جاتا ہے۔

خالق: دیکھو بھئی، اس کی بیوی بیمار ہے۔ جس کی وجہ سے بچارہ رات بھر سو نہیں سکا۔

فرشتہ: یہ تو دنیوی باتیں ہیں مالکِ کُل ـــــــ یہاں کا کام تو رُکنے سے رہا۔

خالق: اچھا! اس کی یہ عادت مٹانے کے لیے اسے کان سے پکڑ کر جگا دیا کرو۔

(فرشتہ خلیل کا کان مروڑتا ہے۔ خلیل بہت درد محسوس کرتا ہوا اور کراہتا ہوا جاگ پڑتا ہے)

خلیل: (چونک کر) آج کیا تاریخ ہے؟

(کوئی جواب نہیں دیتا)

(اپنے ماحول سے واقف ہو کر)

اوہ! اب میں بینک میں نہیں ہوں۔ اے سفید ریش بزرگ آپ کون ہیں؟ آپ کا پُر جلال چہرہ مجھے بہت پسند ہے۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے بینک سے میری گلوخلاصی کروائی۔ لیکن ایک عرض ہے آپ سے، نورانی چہرے والے بزرگ سے میں کان پکڑ کر جگانے والے سلوک کا ہرگز متوقع نہیں ہوں۔ وہاں تو مسٹر گڈوانی بھی کبھی اتنی جرأت نہ کر سکے اور آپ

فرشتہ: میں فرشتۂ موت ہوں۔

خلیل: لیکن آپ گڈوانی سے بڑھ کر کیا ہوں گے؟

فرشتہ: اچھا تو اب تم کیا چاہتے ہو؟

خلیل: اوّل تو یہ کہ مجھے کان پکڑ کر نہ جگایا جائے اور دوم میری بیوی کو صحت کا جام بخشا جائے۔

فرشتہ: مجھے دنیا کا صرف ایک کام سونپا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اچھا صحت کا جام اور کیا ہوگا کہ میں اُنھیں یہاں لے آؤں۔

خلیل: ٹھہرو، ٹھہرو ـــــــ مجھے آپ کے مخصوص کام کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو میری بیوی کے تین لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ صحت کے جام کا آپ اُلٹا مطلب لیتے ہیں بزرگوارم!

فرشتہ: دنیوی اقدار کے مطابق یہ بُری بات ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کسی کی روح لینا، اُسے دنیا کی تکالیف سے نجات دلانا ہے۔ اس لحاظ سے یہ صحت کا جام نہ ہوا تو وہ کیا ہوا؟ تم نے خود ابھی ابھی بینک سے گلوخلاصی کروانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس صورت میں تو......

(جانے لگتا ہے)

خلیل: لیکن......ٹھہریے......اس کے تین لڑکے اور ایک لڑکی......

فرشتہ: انھیں بھی ساتھ لیتا آؤں؟

خلیل: نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ مجھے دراصل ایک دن کی چُھٹی چاہیے۔

فرشتہ: چھٹی؟ ...... یہاں کبھی چھٹی نہیں ہوتی...... دوسرے لفظوں میں یہاں ہمیشہ چُھٹی ہے۔

خلیل: کوئی بات نہیں، میں ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ دے دوں گا۔

فرشتہ: یہاں کوئی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ منظور نہیں کیا جاتا۔ یہاں کی چھٹیوں کو کوئی Fundamental اور Supplementary رول Apply نہیں کرتے۔ نہ ہی یہاں کوئی سول سروس ریگولیشن ہیں۔ جانتے ہو خدا کے قوانین کی غیر مرئی کتاب اور دنیوی کتابوں میں کیا فرق ہے؟

خلیل: کیا فرق ہے؟

فرشتہ: بس یہی کہ دنیوی کتابیں چھپتی ہیں اور پھر رہتی دنیا تک اس میں تبدیلیاں اور Correction slips لگتی رہتی ہیں۔ لیکن خدا کی غیر مرئی کتاب میں کبھی Correction slip نہیں لگی۔

خلیل: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

فرشتہ: میرا مطلب سیدھا ہے، خدا کا قانون انمٹ ہے۔ ایک دفعہ جو لکھا گیا، ہمیشہ کے لیے لکھا گیا۔ اس میں کسی غلطی یا ترمیم کا امکان نہیں۔

خلیل: تو چُھٹی کا سوال حذف؟

فرشتہ: چھٹی؟...... بینک میں چھٹی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہاں بہت کام ہے۔کل کائنات کا حساب رکھا جاتا ہے۔(لیجروں کی طرف اشارہ کرکے)...... یہ زحل کا، یہ مشتری کا......اور کونے میں یہ چھوٹا سا لیجر زمین کا ہے۔

خلیل: آہ!

(سرد آہ بھر کر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

اُف! اتنی لیجریں جمع ہوگئی ہیں۔ابھی حسابدار آئیں گے اور پاس بُکوں کا تقاضا کریں گے، تعجب ہے اے فرشتۂ موت۔ یہاں بھی کام گھونگے کی رفتار سے ہوتا ہے۔آپ بھی مکمل ڈیموقراطی دکھائی دیتے ہیں ...... مسٹر گڈوانی کی روح آپ میں حلول کر گئی ہے کیا؟

(چپراسی کو بُلاتا ہے)

سوبھی......اوسوبھی...... آقا! سوبھی متواتر دو گھنٹے سے غائب ہے۔یہ کام کیسے چلے گا؟ لیجریں کون اُٹھائے گا؟

فرشتہ: عزیزِ من! ابھی سوبھی کے اکیس سال اور دنیا میں باقی ہیں۔ وہ یہاں کیسے آسکتا ہے؟

خلیل: تعجب ہے بزرگوارم! مگر وہ تو اس دنیا میں بھی موجود نہیں تھا۔

فرشتہ: کیا مطلب؟

خلیل: یہی کہ جب میں اُس دنیا میں تھا تو شاید کسی دوسری دنیا میں اس کے اکیس سال باقی تھے۔

(کچھ دیر بعد ـــــ ایک بھاری لیجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

تو لیجریں کیسے اُٹھیں گی؟

فرشتہ: یہ تمھارا اپنا کام ہے۔

خلیل: واہ فرشتہ صاحب! اچھے رہے۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہونے کا...... آپ ہیں عزرائیل تو میں ہوں خلیل۔

فرشتہ: یہاں کام نہ کرنے والے کو روحانی اذیت دی جاتی ہے۔

خلیل: کیا روحانی اذیت دی جاتی ہے؟ کسی بے وفا حور کے دامِ محبت میں گرفتار کیا جاتا ہے؟

فرشتہ: چ چ چ ——— اِس اُنگلی کے اُٹھنے پر ایک غیر مرئی کوڑا حاضر کی روح کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے۔

(اُنگلی اُٹھاتا ہے...... خلیل ایک آدھ منٹ کے لیے فرش پر اِدھر اُدھر لوٹتا ہے۔ اُٹھنے کے بعد چپکے سے اپنی پیٹھ پر لیجریں لدوا لیتا ہے اور پھر ہانپتا ہوا اپنی جگہ واپس آتا ہے)

فرشتۂ موت: دیکھو خلیل ——— سینکڑوں کتابوں میں سود لگنے والا ہے۔ .....اور دیکھو کلکتہ میں سَن کے ایک کارخانے میں دو مزدور ایک عورت جھاریا نامی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ابھی ان دونوں نے مشین کے پٹوں میں آکر مرنا ہے۔ لیجر 232 میں سب سیکشن کلکتہ نکالو اور ان کے حساب بند کر دو۔

(خلیل کانپ جاتا ہے۔ کسی مشین کے بھاری بھرکم پہیّوں کی آواز آتی ہے۔ پھر دو مختلف ہلکی سی چیخوں کی جو...... جھاریا...... پر ختم ہو جاتی ہیں)

اور میں خود بھی تو یہاں سے نہیں ہلا۔ دودھ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے تمھاری قسم...... اب تو پینے کو جی نہیں چاہتا۔

خلیل: تعجب ہے۔

فرشتہ: تعجب کس بات کا؟

خلیل: یہی کہ آپ بھی دودھ پیتے ہیں۔

فرشتہ: اس کے سوا کوئی جی ہی کیسے سکتا ہے؟

خلیل: کیا یہاں خالص دُودھ مل جاتا ہے۔ آپ کے سامنے بھینس دوہتے ہوں گے۔ تو پھر آپ کے ہاں مسز عزرائیل بھی ہوں گی۔

فرشتہ: ہمارے ہاں تمھارے ایسا دودھ نہیں ہوتا۔ ہمارا دودھ اور دہی غیر مرئی ہوتے

ہیں۔ نہ میٹھے ہوتے ہیں نہ پھیکے۔ وہ ہماری روح کی خوراک ہیں اور ہمیں ابدی زندگی بخشتے ہیں۔ ہماری بیگمیں نوری ہوتی ہیں۔

خلیل: جی سمجھ گیا——سنا ہے کہ خالق برتر کا یومِ ولادت نزدیک ہے۔

فرشتہ: تمھارا مطلب چھٹی سے ہوگا——ارے بابا! کہہ جو دیا یہاں کوئی چھٹی نہیں۔ تمھیں کام کرنا پڑے گا۔

خلیل: محترمی ! کیا یہاں بھی ہاف ایرلی Half yearly یعنی ششماہی کے دن آتے ہیں۔

فرشتہ: یہاں ڈیلیز (Dailies) ہوتی ہیں، یعنی روزانہ سود اور حساب کتاب ہوتا ہے۔

خلیل: (اُچھل کر) اوہ! پھر تو مرے۔

فرشتہ: تمھیں موت نہیں آسکتی۔ تمھیں ابدی زندگی عطا کی گئی ہے۔

خلیل: ایک ابدی زندگی بلا تعطیل کے۔ کتنی حیرت کی جگہ ہے اور خالقِ برتر کے یومِ ولادت کو بھی کوئی چھٹی نہیں۔

فرشتہ: بات یوں ہے، خدائے برتر کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور (اُوپر دیکھتے ہوئے) ہمیشہ رہے گا۔

(سجدہ کرتا ہے۔ خلیل بھی اُسے دیکھتے ہوئے حیرت سے سر بسجود ہوتا ہے)

خلیل: (اُٹھ کر) اوہ! یہاں دن میں چوبیس گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ خدائے ذوالجلال کے یومِ ولادت کو بھی چھٹی نہیں......ار......پھر بھول گیا۔ خدائے ذوالجلال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ سے ہے (اُوپر دیکھتے ہوئے) اور ہمیشہ رہے گا۔

(پھر سجدہ کرتا ہے اور اُس کے گھٹنے کانپتے اور آپس میں ٹکراتے ہیں۔ عزرائیل بھی اُس کے ساتھ ایک متین سجدہ کرتا ہے)

(ایک طرف)

اے خدا! تجھ سے تیرا خدا سمجھے!

(فرشتے سے)

محترمی! اس کا مطلب ہے کہ ایک ہفتہ میں یہاں ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کا کام ہوا......

......اُف......

فرشتہ: عزیزِ من! ایک سو چوالیس گھنٹوں کا۔

خلیل: وہ کیسے؟

فرشتہ: خدا نے چھ دن دنیا بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔

خلیل: تو ساتویں روز چھٹی ہوگی؟

فرشتہ: لیکن ساتویں روز نصف اسٹاف کو آنا ہی پڑتا ہے۔ اس دفعہ تمھاری باری ہے۔

خلیل: لیکن میری بیوی...... یہاں بیوی کا سوال ہی نہیں۔ ایک سو چوالیس گھنٹہ کیا ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کا کام۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔ مرے کو مارے۔

(غیب سے آواز آتی ہے)

آواز: شاہ مدار۔

خلیل: آپ کا نام عزرائیل نہیں ہونا چاہیے۔

فرشتۂ موت: تو کیا ہونا چاہیے؟

خلیل: شاہ مدار۔

فرشتہ: لیکن اس تبدیلی کی ضرورت کیوں؟

خلیل: آپ مرے ہوئے کو مارتے ہیں۔

فرشتہ: (اُنگلی اُٹھاتا ہے) بس۔

(خلیل صاحب پھر فرش پر لوٹتے ہیں اور اُٹھنے پر یوں محسوس کرتے ہیں، جیسے اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہو)

خلیل: (کچھ ہوش میں آکر) میری بیوی بیمار ہے...... قبلہ شاہ مدار —— عزرائیل......

خداوندا...... تعجب ہے......

یہاں بھی کوئی فریاد رسی نہیں۔ یہاں بھی ہمدردی نہیں۔ دن میں چوبیس گھنٹے کی حاضری......

فرشتہ: خداوندا! ــــ نووارد منشی نے ایک اُوور ڈرافٹ (Over Draft) دے دیا ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق ایک روسی بنام خروشوف کو روسی پرج (Purge) کا شکار ہو جانا چاہیے تھا۔ خروشوف ایک زبردست ٹرانسکین ہے۔ آج لینن گراڈ کی قتل گاہ میں......

خلیل: (کانپتے ہوئے) اُوور ڈرافٹ؟ ــــ لایئے میں سُرخ سیاہی سے ٹھیک کردوں۔ قبلہ عزرائیل آپ تو بزرگ ہستی ہیں۔ لیکن مکتب کے بچوں کی طرح شکایتیں کرتے ہیں۔ ماسٹر جی! لیٹین میری دوات میں سے ڈُبکی لے گیا۔ ماسٹر جی! مجھے نندلال چڑاتا ہے اور میری ماں کو بلّی کہتا ہے...

اس میں بھلا بات ہی کیا ہے۔ لایئے میں سُرخ سیاہی سے ٹھیک کردوں۔

خالقِ کائنات: یہاں ایک دفعہ جو لکھا گیا، اسے کوئی سُرخ سیاہی درست نہیں کرسکتی۔

فرشتہ: خالق! ــــ آپ کا عتاب اس گستاخ پر نازل ہونا چاہیے۔ یہ مجھے مکتب کا بچہ کہتا ہے۔

خالق: کتنا اُوور ڈرافٹ دیا گیا؟

فرشتہ: حضورِ دو عالم! دو ماہ کا۔

خالق: خلیل کی بیوی کی زندگی میں پورے دو ماہ باقی ہیں۔ خروشوف کی بجائے خلیل کی بیگم کا حساب بند کردو۔

خلیل: (کانپتے ہوئے) لیکن سُرخ سیاہی تو...... سرخ سیاہی تو... میرے خالق...... میری بیوی! اب میں کدھر جاؤں۔

خالق: اب خلیل میاں کو ساتویں روز بھی چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔

خلیل: کیا ہفتہ میں ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کام کرنا پڑے گا؟ آپ جانتے نہیں تحریک شروع ہے کہ دُکانوں کے ملازموں اور بینک کے کلرکوں سے ہفتہ میں چون گھنٹہ سے زیادہ کام نہ لیا جائے؟

فرشتہ: جب تک میری یہ اُنگلی سلامت ہے، یہاں کوئی تحریک جاری نہیں کی جاسکتی۔

(انگلی اُٹھاتا ہے)

خلیل: بس بس...... بزرگوارم......لیکن کیا اوور ٹائم کا الاؤنس ملے گا؟

فرشتہ: (نفرت سے) چھی! الاؤنس (بڑھ کر ایک چپت رسید کرتا ہے) لو...... یہی الاؤنس ملتا ہے یہاں، ہمیں تم سے بہت توقع ہے۔تم گریجویٹ ہو۔

خلیل: (سسکتے ہوئے) او! اس سے موت اچھی ہے۔

فرشتہ: تم حیات وممات سے پرے ہو۔

خلیل: (چیخ کر) کیا میں حیات وممات سے پرے ہوں؟

(بے ہوش ہو کر گرتا ہے۔ اس چیخ کے ساتھ ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے پھر منظر اوّل ہے۔ سب کام ویسے ہی ہو رہا ہے اور مسٹر گڈوانی ویسے ہی وحشت زدہ اِدھر اُدھر بھاگتے نظر آتے ہیں)

شریمتی: (کاؤنٹر پر)

گڈوانی: لیجیے اپنی کاپی ــــــ سردار امر سنگھ نے واپس بھیج دی ہے۔ دیکھیے نا یہ سب کچھ کلرک کی غلطی سے ہوا......کلرک کی غلطی سے......کلرک کی......

(شریمتی جی چلی جاتی ہیں)

خلیل: چہ خوب! کاپی تو آنجناب نے دی تھی اور غلطی میری۔

گڈوانی: دراصل کام ہی بہت ہے۔ ششماہی کے دنوں میں ایسے ہی ہوتا ہے......ایسے ہی ہوتا ہے......ایسے ہی......

خلیل: آپ کو شکر کرنا چاہیے کہ یہاں Dailies نہیں۔ یہاں سُرخ سیاہی بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہاں کے قوانین میں ترامیم ممکن ہیں۔ یہاں ہفتہ میں ایک سو اڑسٹھ گھنٹہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں موت ممکن ہے۔ یہاں............

گڈوانی: (کلرک سے) خلیل میاں پاگل ہو رہے ہیں (گھبرا کر) خلیل میاں...... میں تمھیں اپنی ذمہ داری پر ایک دن کی چھٹی دیتا ہوں۔

(پردہ)

بے جان چیزیں

کردار:

ڈاکٹر قدوائی..................ایل ڈی ایس سی، دندان ساز

ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ..................ایل ایس ایم ایف لیڈی ڈاکٹر

بختیار..................ڈاکٹر قدوائی کا ملازم

خادمہ..................سلیمہ کی خادمہ

پہلا منظر

پردہ اُٹھنے پر ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ کا کلینک دکھائی دیتا ہے۔ دیواروں پر ''ڈاکٹر صاحبہ اندر ہیں، تشریف رکھیے'' اور آنکھوں کے طبی معائنہ کے لیے اردو اور انگریزی کے حروف ابجد اور اسی نوع کے پلے کارڈ دکھائی دیتے ہیں۔ میز پر گلیسرین میں تھرما میٹر وغیرہ ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ایک طرف اسٹیتھسکوپ پڑا ہے۔

مس سلیمہ قدوائی ایک سادہ اور سفید ساڑی پہنے، ایک خوش پوش وخُوبرو نوجوان ڈاکٹر قدوائی کے ساتھ چائے پی رہی ہیں ——— اس وقت وہ کلینک سے ''اوف'' ہیں۔

کلینک ایسے زاویے پر رکھا جائے کہ ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ ایل ایس ایم ایف، لیڈی ڈاکٹر کا بورڈ انگریزی حروف میں لکھا ہوا صاف دکھائی دے۔
تیزی تندی اور جذباتیت اس تمثیلچے کی خصوصیت ہے کیونکہ دونوں کردار جوان اور جذباتی ہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہنستے ہیں اور بلاضرورت رو بھی دیتے ہیں۔ ان کی کسی حرکت سے چائے کی پیالی یا گلدان کا ٹوٹ جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔

ڈاکٹر قدوائی: (چائے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے) تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو —

سلیمہ: اونہہ! مجھے یاد ہے، سب کچھ اچھی طرح سے یاد ہے۔

قدوائی: ہنستی ہو؟ —— کیا یاد ہے بھلا؟

سلیمہ: وہی پُرانا قصہ، جسے سینکڑوں نہیں ہزاروں بار دُہرایا گیا ہے۔

قدوائی: (سرتاپا سوال بن کر) آخر کون سا پُرانا قصہ؟ — یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ سلیمہ خدا کی قسم مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

سلیمہ: وہی سائنسداں کیوری اور مادام کیوری والا قصہ —— اور اُن کے بیسیوں مرتبہ دہرائے گئے الفاظ — ''آؤ، ہم کیوں نہ سائنس اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے ایک ہو جائیں۔''

قدوائی: (ہنستے ہوئے) پہلے تم نے کہا تھا اس قصے کو سینکڑوں نہیں ہزاروں بار دُہرایا گیا ہے۔ اب کہہ رہی ہو بیسیوں مرتبہ دہرائے گئے الفاظ —— یعنی ہزاروں سے بیسیوں پر آ گئیں۔ اسے ہی مضحک یا Gloteeu عنصر کہتے ہیں اور پھر خاص طور پر جب کہ وہ قصہ جسے مادام کیوری اور کیوری کے وقت سے نہیں بلکہ ازل سے دُہرایا جا رہا ہے، میرے ذہن سے بالکل مفقود تھا۔ اس کا میں یہی مطلب لے سکتا ہوں نا کہ اب تم خود بھی اس کا دُہرایا جانا پسند کرتی ہو۔

(پھر بے تحاشا ہنستا ہے اور چائے کی ایک پیالی فرش پر گر کر ٹوٹ جاتی ہے)

سلیمہ: اُوف — ڈاکٹر! کتنے بدتمیز ہو تم۔ دیکھو میرا سارا سیٹ خراب کر دیا چائے کا — اور خدارا اس بات کو سینکڑوں بار مت دُہراؤ۔ مجھے اس سے نفرت ہے، کد ہے (سخت

نفرت کے اظہار میں)——— چھی!

قدوائی: (اس پر سلیمہ کی نفرت کا کوئی اثر نہیں۔ ویسے ہی تالیاں پیٹ پیٹ کر ہنس رہا ہے) پھر دنیا میں ایسی باتیں بھی ہیں جو سو بار کہے جانے پر بہرے کانوں پڑتی ہیں۔ البتہ جب ایک سو ایک بار کہی جاتیں تو ان کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یعنی بہت سے کام ''ایک سو ایک'' دفعہ کہے جانے کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

سلیمہ: (پُرشکوک لہجے میں) تمھارا مطلب ہے کہ ایک سو ایک کوئی بہت ہی مُبارک ہندسہ ہے؟

قدوائی: چ چ——— تم میرا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔ یعنی عمداً نہیں سمجھنا چاہتیں۔ میرا مطلب تو فقط یہ ہے کہ پتہ نہیں کس وقت کسی خوبصورت عورت کا دِل قبولیت کے لیے کھلا ہو۔ ہوسکتا ہے ایک سو ایک دفعہ کہے جانے پر آواز دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے۔ اور ہاں——— میری بات سنو، یہ بھی عین ممکن ہے کہ گیارہ، تیرہ، سترہ کی طرح ایک سو ایک بھی منحوس ہندسہ ثابت ہو۔

سلیمہ: (شرارتاً) بالفرض وہ واقعی منحوس ہندسہ ثابت ہو تو———

قدوائی: (اُسی طرح پُرشرارت انداز میں) تو محترمہ پھر (تامل کے بعد) ———ایک سو دو———

(دونوں مل کر ہنستے ہیں)

سلیمہ: (ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے) ایک سو ایک یا ایک سو دو بار کہے جانے پر وہی عورت مانے گی جو اس منوائے جانے کے مسلسل اور مستقل عذاب سے جان چھڑانا چاہے، وگرنہ میرے خیال میں عورت کو صرف ایک دفعہ ہی کہہ دینا کافی ہے، یا زیادہ سے زیادہ دو دفعہ——— وہ بھی اس صورت میں اگر عورت کا سماجی مرتبہ بہت بلند ہو اور وہ اپنی بلندی کی وجہ سے مرد کو اپنے پانو میں محسوس نہ کرے یا پھر وہ یادداشت کی کمزور اور نسیان کی مریضہ ہو۔

قدوائی: مجھے یاد ہے میں نے اپنی مرحومہ، مغفورہ بیوی کو بیس مرتبہ کہا تھا، اب تم ہی بتاؤ وہ کون سے اُونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھی یا نسیان کی مریضہ تھی؟

سلیمہ: میں سمجھتی ہوں وہ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہوگی جو ایک سو ایک بار کہے جانے پر مان جاتا ہے۔ بہت سی عورتیں انتظار ساغر اتنا کھنچواتی ہیں کہ ایک سو ایک بار تک کی نوبت پیش آتی ہے اور بہت سی عورتیں بیسویں بار ہی اپنا صبر وسکون کھو بیٹھتی ہیں۔ مرد کی ڈھٹائی سے گھبرا کر مان جاتی ہیں۔ ایسی عورتیں عموماً ایڑی والے جوتے نہیں پہنتیں ——

قدوائی: (داد دیتے ہوئے) بھئی واہ! ایسے میں بھی شاید تم اپنے نئے جوتوں کی داد چاہتی ہو —— خیر، میں تمھارے صبر کی داد دیتا ہوں۔ لیکن سنو سلیمہ، مجھے ایک ہزار تک گننا آتا ہے ——

سلیمہ: (گھبرا کر) اوہ!

قدوائی: ڈر گئیں؟

سلیمہ: توبہ! میرے اللہ —— لیکن سنو تو ڈاکٹر۔ تم اس بات پر غور نہیں کر سکتے کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور تم محض ایک دندان ساز۔ میرا اور تمھارا اشتراک ہی کیا؟

قدوائی: واہ! اشتراک کیوں نہیں —— اب تم کہوگی کہ ہونٹوں اور دانتوں کا کیا اشتراک ہے۔ خوبصورت لب موتیوں ایسے دانتوں کے بغیر اچھے نہیں لگتے اور خوبصورت دانت اچھے ہونٹوں کے بغیر بیکار ہیں ——

سلیمہ: اے ہے! اس میں بھی تم نے ہمیشہ کی طرح اپنی ہی تعریف کی ہے۔ دانتوں کی موتیوں کے ساتھ تشبیہ اچھی ہے۔ کیا ہونٹوں کے لیے تمھیں مناسب تشبیہ نہ ملی؟

قدوائی: میں اس تشبیہ واستعارے کے علم میں قدرے کمزور ہی واقع ہوا ہوں۔

سلیمہ: یہ علم اکتسابی نہیں، قدرتی ہے —— جب کوئی کسی سے واقعی محبت کرتا ہو تو تشبیہ اور استعارے خود بخود چلے آتے ہیں...... لیکن...... میں پوچھتی ہوں۔ تمھیں مجھ سے لگاؤ ہی کیا ہے؟

قدوائی: (خوش ہو کر) اچھا، اب اس انداز سے سوچنے لگیں۔ شکر ہے اللہ کا!

سلیمہ: (برہمی سے) اس انداز میں! —— کس پھیر میں پڑے ہوئے ہو؟ میں تم سے وابستہ

ہونا ہر گز ہر گز نہیں چاہتی۔

قدوائی: (گھبرا کر) اچھا، اچھا —— نہ چاہو —— لیکن یوں خفا نہ ہو جاؤ سلیمہ! میں تمھیں اس طرح مضطرب حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح تمھارے چہرے کے حسین خدو خال بگڑنے لگتے ہیں۔ تمھارے جونک ایسے ہونٹوں پر جو عمودی لکیریں ہیں، وہ بے تحاشا سمٹنے اور کھلنے لگتی ہیں۔ اور پھر اسی طرح غائب ہو جاتی ہیں، جیسے جونک میں سے سارا خون نکل چکا ہو۔

سلیمہ: خیر تشبیہ اچھی ہے اور —— قدرتی!

قدوائی: کاش تم انہی معنوں میں سوچو ——

سلیمہ: ہاں، انہی معنوں میں —— بس ایک شادی کے سوا میں تمھاری سب باتیں ماننے کے لیے تیار ہوں۔

قدوائی: وعدہ کرتی ہو —؟ اچھا تو پھر میری ایک بات مانو۔

سلیمہ: ضرور مانوں گی —— مجھے تمھاری دوستی پر فخر ہے۔ میں وہ دن بھول نہیں گئی جب ہم میڈیکل کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد تم کسی وجہ سے کالج چھوڑ کر چلے گئے اور میں ...... میں .....

قدوائی: میں تمھارا شکر گزار ہوں —— اب بات یہ ہے کہ وہ جو سامنے بورڈ دکھائی دیتا ہے —— وہ جس پر ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ لکھا ہے —— اس پر سلیمہ قدوائی لکھوا دو اور بس ——

سلیمہ: (ہنستے ہوئے) میں کہتی ہوں تم بھی ——

قدوائی: سچ سچ، میں شادی کے لیے بالکل مجبور نہیں کرتا —— بالکل مجبور نہیں کرتا۔

سلیمہ: چہ خوب! (ہنستی ہے) میں کہتی ہوں تم بھی تو وہ ہو ——

(ہنستی ہے)

قدوائی: تم مان گئیں، وعدہ کیا تھا نا —— کتنی دوست نواز ہو تم اور وعدہ وفا کرنے والی —— خادمہ —— اے خادمہ ——

خادمہ: (اندر آتے ہوئے) جی سرکار۔

قدوائی: جاؤ وہ یعقوب پینٹر ہے نا ——— وہ جو زرد کوٹھی کے سامنے بورڈ لکھتا ہے۔ اُسے بُلا لاؤ ——— اری دیکھتی کیا ہو، جلدی جاؤ۔

خادمہ: بہت اچھا سرکار!

سلیمہ: (رومال سے اپنا مُنھ چھپاتے ہوئے) اوہ! میری ہنسی بند نہیں ہوتی۔ یہ تم کیا کر رہے ہو......؟ تم......تم......

قدوائی: بس اب تم چپ ہو جاؤ۔ میں تمھیں شادی کے لیے نہیں کہتا۔

سلیمہ: (ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے)

بجز دیوانگی، واں چارہ ہی کہو کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

قدوائی: (اُچھل کر) بس بس ——— گویا اب تم شادی کے لیے بھی رضامند ہو گئیں۔

سلیمہ: چلو ہٹو ———

قدوائی: واللہ دیکھ لیا تمھیں ——— یہ میری ایک سو ایک بار ہے۔ آخر تم بھی عام عورتوں کی طرح ہی ہونا۔ یہ عورتیں بھی خاصی دلچسپ مخلوق ہیں۔ کبھی کسی کی آہ وزاری پر رحم کھا کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ جو انھیں تنگ کرے، ستائے، اسے بہت جلد پسند کرنے لگتی ہیں۔

سلیمہ: بس بس ——— اب چپ بھی رہو گے؟

دوسرا منظر

پردہ اُٹھنے سے پہلے شہنائیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور آوازیں آتی ہیں ———
''وقفِ بہارِ دائم ہو یہ سہرا'' ——— مبارک، مبارک، صد مبارک ———
پردہ اُٹھنے پر وہی پہلا منظر دکھائی دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کلینک کے سائن بورڈ پر ڈاکٹر مس سلیمہ سلطانہ کی بجائے اب ڈاکٹر مسز سلیمہ قدوائی، ایل ایس ایم

ایف لیڈی ڈاکٹر لکھا ہے۔ لفظ ڈاکٹر کی 'ڈی' نفیس گوتھک اسٹائل میں اور باقی کے حروف رومن میں لکھے ہوئے ہیں۔ سلیمہ اور قدوائی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتے ہیں۔

قدوائی: یعقوب نے بورڈ اچھا بنایا ہے —— ڈاکٹر مسز ..... سلیمہ ..... قد ..... و ..... آ ..... ئی ..... ایل، ایس ایم ایف۔ کتنا اچھا دکھائی دیتا ہے!

سلیمہ: ڈاکٹر کے حرف ڈی کا گوتھک اسٹائل کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور باقی کے رومن ہند سے بھی ..... لیکن ..... لیکن مجھے اچنبا ہوتا ہے۔

قدوائی: اچنبا کس بات کا؟

سلیمہ: اچنبے کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک خوبصورت بائیس پچیس برس تک اپنا نام سلیمہ سلطانہ لکھتی رہتی ہے اور ایک سہانی صبح کو ایکا ایکی وہ مسز سلیمہ قدوائی بن جاتی ہے۔ تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ جب میں اپنا نام مسز سلیمہ قدوائی لکھتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا۔ میں کہتی ہوں، یہ جھوٹ، سب جھوٹ ہے —— غلطی سے کہیں میرا قلم پھسل گیا ہے اور میں نے سلیمہ سلطانہ کی بجائے سلیمہ قدوائی لکھ دیا ہے۔

قدوائی: یہ جذبہ بالکل قدرتی ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اب تو یہ اس قدر حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہے کہ تم اور میں اور دُنیا کا کوئی بھی بشر اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ دیکھو میں تمھارے کس قدر قریب بیٹھا ہوں۔ مجھے تمھارے اور تمھیں میرے سانس کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔ تمھارا ہاتھ مجھے کس قدر جلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ حقیقت نہیں ہے۔ جس کے بعد باور نہ کرنے کا امکان ہی نہیں۔ ایک خاوند کے سوا دوسرا شخص اتنا قریب کیسے ہو سکتا ہے؟

سلیمہ: (استعجاب سے) میں کہتی ہوں، یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا ہے کہ.....

قدوائی: لیکن ہو گیا —— مجھ میں بھی کبھی کبھی یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب میں اخباروں میں پڑھتا ہوں کہ لندن میں فلاں واقعہ ہوا تو میرے کان اس میں یقین نہیں رکھتے۔ میں سوچتا ہوں —— لندن دراصل روئے زمین پر موجود نہیں۔ فقط

جغرافیہ کے پروفیسروں، تاریخ دانوں، سیاحوں اور عوام نے مل کر مجھے دھوکا دینے کے لیے ایک وسیع و منظم سازش کر رکھی ہے —— دُور کیوں جاتی ہو، مجھے بمبئی کے وجود میں بھی شک ہے!

سلیمہ: (استعجاب سے) ہے؟...... (ہنستے ہوئے) ہٹو، تم مذاق کرتے ہو!

قدوائی: خدا کی قسم میں مذاق نہیں کرتا۔

سلیمہ: اب میں تمھاری ہوگئی ہوں —— کیا یہ سچ ہے؟ ہمارے عقیدے کے مطابق اب تمھاری لونڈی ہوں ——

قدوائی: تم میری جان و ایمان کی مالک ہو...... دراصل شادی کے بعد عورت قید سے آزاد ہوجاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، اس سے پہلے تم کھلے بندوں کسی مرد سے بات چیت کرسکتی تھیں؟ کسی محفل میں آزادانہ جاسکتی تھیں! اب تم ماتھے پر قدوائی کا لیبل لگا کر جہاں جی چاہے جاؤ ——

سلیمہ: فرق صرف اتنا ہے کہ اب والدین کی جگہ تم خفیہ پولس کی طرح میری نقل و حرکت دیکھتے رہوگے۔ گویا میں نے ایک خوبرو، مستعد اور نوجوان سارجنٹ بھرتی کرلیا ہے اور ——

قدوائی: اس لیے نہیں کہ مجھے تمھارے اُوپر کسی طرح کا شک ہوگا —— بلکہ اس لیے کہ تمھارے دشمنوں کا کوئی بال بھی بیکا نہ کرسکے۔ خاوند ایک سارجنٹ کی طرح بیوی کی عصمت و عفت کی حفاظت کرتا ہے —— ایک بات بتاؤ سلیمہ! جب میں تمھاری طرف دیکھتا ہی ہوں تو میرا جائداد پرستی کا جذبہ جاگ اُٹھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں تم میری ہو اور فقط میری۔ یہ گورے گورے بازو، یہ حسین دلنشیں چہرہ —— یہ جونک ایسے ہونٹ...... یہ سب کچھ میرا ہے...... اور مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگتا ہے —— جب میں نے تمھارے ہاتھ کی بنی ہوئی پہلی روٹی کھائی تھی تو اُس کا لطف ہی کچھ اور تھا —— کیا تمھیں بھی کچھ ایسے ہی محسوس ہوتا ہے؟

سلیمہ: محسوس کیوں نہیں ہوتا؟ —— مثلاً میں نے آج تک کسی مرد کے کپڑے کو ہاتھ نہیں

لگایا۔اب میری خواہش رہتی ہے کہ تم لاپروائی سے اپنا کوٹ کھونٹی پر ٹانگنے کی بجائے کہیں اِدھر اُدھر صوفے یا قالین پر پھینک جاؤ، میں تمھیں پیاری پیاری گالیاں دوں۔ بدمذاق، غیر صفائی پسند انسان کہوں اور پھر کوٹ اُٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دوں۔ اگر تم میری دشنام طرازی سے تنگ آ کر اپنا کوٹ خود ہی کھونٹی پر لٹکا دو تو پہلے میں بہت خوش ہوں گی لیکن بعد میں اسے اپنی حق تلفی کہوں گی —— تمھاری قمیص پر بٹن ٹانک کر جو مجھے خوشی ہوتی ہے، وہ کسی مریض سے دس روپے فیس وصول کر کے نہیں ہوتی۔ قاعدہ کہتا ہے کہ میں اپنا حکم جتاؤں۔ نوکروں کی مدد سے تمھارے کام کرواؤں، لیکن میرا خود بخود ایک لونڈی کی طرح تمھارا کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کل جب تم بُوٹ پہن رہے تھے تو میرا جی چاہنے لگا کہ تم تسمے باندھنے کے لیے کہو، لیکن تم نے نہ کہا۔ پہلے میں دو قدم خود ہی بڑھی، لیکن پھر نہ جانے کیوں رُک گئی——

قدوائی: سلیمہ! میں کہتا ہوں یہ قلم سے سلیمہ سلطانہ کی بجائے سلیمہ قدوائی لکھنا، یہ تمھارا میرا کوٹ کھونٹی پر ٹانگنا، یہ تسمے، یہ تمھارے ہاتھ کی بنی ہوئی پہلی روٹی، یہ سب بظاہر معمولی چیزیں ہماری زندگی پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں۔

تیسرا منظر

قدوائی اور مسز قدوائی کا رہائشی کمرہ۔ سامنے چمنی پیس پر بہت سی تصویریں پڑی ہیں۔ چمنی پیس کے نیچے قدوائی کی بیڈ ہے جس کی پائنتی ایک مہاگنی رنگ کے میز کی طرف ہے۔ میز پر ایک خوبصورت عورت کی تصویر رکھی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر سلیمہ قینچی ہاتھ میں لیے کسی چیز کو کاٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دائیں طرف سے قدوائی داخل ہوتا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ سیدھا اپنے بستر میں دھنسنے کے لیے بڑھتا ہے کہ اُسے بستر میں کوئی چیز پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

قدوائی: (بآواز بلند) میں کہتا ہوں۔ یہ پن کشن بھلا یہاں کیوں پڑا ہے ——— کیا پن کشن رکھنے کی یہی جگہ ہے؟

سلیمہ: (گھبرا کر) میں نے پن کشن نہیں رکھا تمھارے بستر پر۔

قدوائی: تم نے نہیں رکھا تو کیا تمھارے فرشتوں نے رکھا ہے؟ ایسی چیز رکھنے کے لیے ساری دنیا میں کیا تمھیں میرے بستر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ملتی تھی؟ فرض کرو میں اپنی عادت کے بموجب دھم سے بستر میں گھس جاتا تو ——— ؟ کیا میرا بدن لہولہان نہ ہو جاتا؟

سلیمہ: اے ہے، میں کہتی ہوں تم بھی کوئی نہ کوئی لڑائی کا بہانہ ہی تلاش کرتے ہو۔ کہہ جو دیا کہ میں نے نہیں رکھا۔

قدوائی: (چیخ کر) یہ لڑائی کا بہانہ ہے؟ میں کہتا ہوں ——— کیا یہ محض بہانہ ہے؟ چار پائی پر پن کُشن رکھ کر کسی شریف آدمی کو لہو لہان کر دینے کے متعلق سوچنا— کیا یہ محض لڑائی کا "بہانہ" ہے۔

سلیمہ: (گھبرا کر) کس نے رکھ دیا یہ پن کُشن میں حیران ہوتی ہوں۔ اللہ جانے— کیا ہے، کون سا پن کُشن ہے، دکھاؤ تو ———

قدوائی: وہ پڑا ہے سامنے ——— تمھیں کچھ دِکھائی بھی دیتا ہے۔

سلیمہ: یہ پن کُشن ہے ——— کون اسے پن کُشن کہتا ہے۔ یہ تو میرا پوڈر لگانے کا پف ہے۔

قدوائی: (خفیف ہو جاتا ہے اور آواز مدھم ہو جاتی ہے) تعجب ہے!

سلیمہ: (منہ بسورتے ہوئے) جب کوئی آدمی کسی عورت سے محبت نہ کرے تو اس کے پوڈر کا پف بھی اُسے پن کُشن دکھائی دینے لگتا ہے—

قدوائی: تعجب ہے سلیمہ، میں...... میں...... میں...... نے ———

سلیمہ: جی ہاں، میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ کاش! مجھے تمھاری طبیعت کا پتہ ہوتا۔ آج سے سال بھر پہلے بھی میں جانتی کہ تم میرے پوڈر پف کو بھی پن کُشن کہو گے تو...... تو......

(رونے لگتی ہے)

قدوائی: سلیمہ!

سلیمہ: چھوڑو! میں نے تمھاری فطرت کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے۔

قدوائی: سلیمہ جانے دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی—

سلیمہ: توبہ توبہ! پھر کبھی سہواً ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ میرا پف نکل آیا، وگرنہ تم مجھے پھانسی پر لٹکا ہی چکے تھے—

(رونے لگتی ہے)

قدوائی: سلیمہ میں معافی چاہتا ہوں۔

سلیمہ: یوں کھڑے کھڑے توہین کر دینا اور پھر چپکے سے کہہ دینا مجھ سے غلطی ہوئی— جی، میں تمھارے کوتکوں سے واقف ہوں۔ آج میرے پوڈر پف کو پن کُشن کہہ دیا۔ کل میری کنگھی کو چُھری کہہ کر چلانے لگو گے——

(پھر رونے لگتی ہے)

قدوائی: سلیمہ! بخش دو خشمگیں ہونے سے صرف جسم کام کرتا ہے لیکن معافی مانگنے سے جسم کا بال بال، روح کا ذرّہ ذرّہ دکھنے لگتا ہے۔ معافی مانگنا صرف منھ ہلا دینا ہی نہیں ہوتا—— یہ بہت مشکل کام ہے۔

(بدستور رونے کی آواز آتی ہے)

قدوائی: (گڑگڑا کر) مجھ سے بُھول ہوئی—— میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں خواب میں بھی تمھارے پوڈر پف کو اب ''مکھن کی ٹکیہ'' کہا کروں گا—— اب جانے بھی دو سلیمہ۔

'منھ میں کف لا کر ڈرانا ان سے کوئی سیکھ جائے'

جانے دو سلیمہ! اپنی ''مکھن کی ٹکیہ'' اُٹھا لو—— لو...... لو...... میری وجہ سے تمھیں کوئی ذاتی نقصان تو پہنچا نہیں—— اِن چھوٹی چھوٹی بے جان چیزوں کی طرف اتنی توجہ دیتی ہو تم کہ............

سلیمہ: (سسکیاں لیتے ہوئے) میرے پف کو پن کُشن کہہ دیا —— اور کیا تم مجھے پھانسی پر لٹکا دو گے؟ (رونے لگتی ہے) تمھارے نزدیک یہ باتیں چھوٹی چھوٹی اور بے وقعت ہیں۔ میں کہتی ہوں ان کا انسانی زندگی میں بہت اہم حصّہ ہے۔ تم جن چیزوں کو خاموش، بے جان اور بے حس سمجھتے ہو، تم نہیں جانتے ان میں کتنی قوتِ گویائی، کتنی حس و حرکت ہے۔ اگر تم اس کے قائل نہیں تو بھلا کیوں اس تصویر کو پائنتی کی طرف رکھتے ہو۔ کیوں نہیں اسے چمنی پیس پر رکھ دیتے۔ تمھاری مرحومہ بیوی کی یہ تصویر تمھیں زندہ رہنا سکھاتی ہے تو کیا پف کو پن کُشن کہہ دینے سے میری دل آزاری نہیں ہوتی؟

قدوائی: (معذرت کے انداز میں) اس میں شک نہیں کہ یہ میری زندگی میں عمل پیدا کرتی ہے۔ لیکن ایک یادداشت کے طور پر بھی تو اسے رکھا جا سکتا ہے۔

سلیمہ: اچھا، تو میں اسے اُٹھا کر چمنی پیس میں دوسری تصویروں کے درمیان رکھ دیتی ہوں۔

(تصویر کو اُٹھا کر چمنی پیس پر رکھنے کے لیے جاتی ہے)

قدوائی: (سلیمہ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے) تم میرے جذبات کی توہین کر رہی ہو۔

سلیمہ: دیکھے ہیں میں نے تمھارے جذبات! —— کیا تم نے میرے جذبات کا احترام کیا ہے؟ (نفرت سے) ہر رنڈوے کے لیے اُس کی مرحومہ بیوی خوبصورتی اور نیک سیرتی کا مجسمہ بن جاتی ہے اور پھر وہ اس کی تصویر کو ایسی جگہ آویزاں کرتا ہے جہاں سوتے ہوئے اُسے دیکھ سکے اور جب اُٹھے تو پہلی نظر اُس پر پڑے۔

قدوائی: دیکھو تم مجھے سخت مجروح کر رہی ہو —— (اُٹھ کر خشمگیں انداز میں اِدھر اُدھر گھومتا ہے) تم جانتی ہو کہ میں نے تمھارے ساتھ شادی کرنے کے فوراً بعد تمھاری تصویر اس چوکھٹے میں لگوانی چاہی لیکن وہ پوری نہ آئی۔

سلیمہ: میری تصویر کا چوکھٹے میں نہ آنا محض ایک علامت ہے، میرے ساتھ محبت نہ کرنے کی۔ جب میری ہی صورت و سیرت تمھارے دل کے چوکھٹے میں پوری نہیں آتی تو——

قدوائی: دیکھو، میں دل کا چوکھٹا نہیں کہہ رہا۔ لکڑی کا چوکھٹا کہہ رہا ہوں۔

سلیمہ: تمام قلبی اور رُوحانی چیزیں مادی جسموں سے متعلق ہیں۔ مادے اور روح کے اس رشتے کو جھٹلانا نہیں چاہیے۔ سامنے لٹکتی ہوئی تصویر محض لکڑی سے کچھ زیادہ نہیں ہے ......تم چاہتے تو آسانی سے میری تصویر پر ایک خوبصورت سیاہ بارڈر لگوا کر فریم میں رکھ لیتے۔ لیکن تم نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا۔ اس کا یہی مطلب ہے نا کہ میں تمھارے دل کے فریم میں پوری نہیں سماتی۔

قدوائی: (آناً فاناً آواز وحشت ناک ہو جاتی ہے) بس ختم کرو اس فلسفیانہ بکواس کو۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ تم بھی ایک اَن پڑھ گنوار عورت کی طرح حاسد ہو۔ کمینی ہو۔

سلیمہ: (بلند آواز میں) خاموش! زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں تمھاری منکوحہ عورت ہوں۔ بھگائی ہوئی نہیں ——— مجھے بھی یہ روز کی دانتا کلکل نہیں بھاتی —— میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تمھاری زبان سے گالی سُنی ہے۔ بس میں ایک بار بھی گالی برداشت نہیں کر سکتی۔ خوب ڈھنگ ہیں —— باہر کہیں سے ڈانٹ ڈپٹ کھا کر آئے اور گھر آ کر لگے ایک کمزور و ناتواں عورت سے اُلجھنے۔ بڑے جواں مرد ہو نا۔

قدوائی: (لفظوں کو چباتے ہوئے) ایک کمزور......اور...... ناتواں عورت! تمھارے ایسی کمزور اور ناتواں عورت دو چار پیدا ہو جائیں تو ساری دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔
(ایک پیالی سلیمہ پر پھینک دیتا ہے جو زمین کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے)
(دانت پیستے ہوئے) اگر اس سے زیادہ کچھ کہو گی سلیمہ تو نیچے پھڑکتی ہوئی نظر آؤ گی۔ اگر زیادہ کچھ کہنا ہے تو تمھارا وہ راستہ ہے ———

سلیمہ: (شدید غصّے میں کانپتی ہوئی) بس بہادری یہی ہے نا —— عورت پر ہاتھ اُٹھانے لگے۔ اپنے گنوار پن کا مظاہرہ کرنے لگے —— تم شاید بُھول گئے ہو کہ آج کل تم جو کچھ بھی دکھائی دے رہے ہو یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہے۔ بیس روپے مہینے کی پریکٹس نہیں تھی۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا —— لو! اس سے پہلے میں تمھاری دُھول مٹی سے اَٹی ہوئی سڑک پر چل رہی تھی۔

آج میں اپنا پختہ اور راہِ راست اختیار کرتی ہوں اور تمھاری منحوس شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں گی ـــــ (آواز میں رقت پیدا ہو جاتی ہے) زندگی میں سب سے بڑی ذہنی کوفت یہی رہے گی کہ تم ایک معصوم عورت کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہے۔

(ایک بچے کی طرح رونا شروع کر دیتی ہے)

قدوائی: (چڑ اکر) معصوم عورت! ـــ ایسی جگہ چلی جاؤ جہاں تمھاری معصومیت اور پنپ سکے ـــ (چلا کر) دفان ہو جاؤ ـــــ میں ایسی دھمکیوں میں نہیں آنے کا۔ میں تم ایسی بدزبان عورت سے کوئی راہ و رسم نہیں چاہتا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک بدزبان عورت کے ساتھ رہنے کی نسبت ایک لق ودق صحرا میں رہنا اچھا ہے ـــ جاؤ، چلی جاؤ ـــــ تم نے مرد کے وقار کو ٹھکرایا ہے، سمجھ لو کہ تم آج سے پھر سلیمہ سلطانہ ہو۔ سلیمہ قدوائی نہیں ـــــ

(سلیمہ تیزی سے باہر چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

وہی کمرہ جو تیسرے منظر میں دکھائی دیتا ہے۔ قدوائی ایک بے بازو کرسی پر بیٹھا اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دیے گنگنا رہا ہے ـــــ منع کرتے تھے بُری ہے راہِ عشق۔ دل نے مانا ہی نہیں ہم کیا کریں ـــــ اس کے بعد مضطرب ہو کر ٹہلنے لگتا ہے...... کہنے کو تو یوں بختیار نے گھر میں صفائی کر رکھی ہے لیکن اس 'نفاست' میں عورت کا ہاتھ غائب ہے، جس کا زیادہ تر احساس چیزوں کے غیر مناسب جگہوں پر پڑے ہونے سے ہوتا ہے۔

قدوائی: (سرد آہ بھر کر) ـــــ دو ماہ ہوئے سلیمہ کو یہاں سے گئے ہوئے (ٹہلتے ہوئے میز کے قریب جاتا ہے اور میز پر پڑے ہوئے جھاڑن کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے)

(غصے سے) ابے بختیار، او بختیار کے بچے۔

بختیار: (دائیں طرف سے داخل ہوتا ہے) حکم سرکار۔

قدوائی: حکم کے بچے، ادھر آ —— کتنے پیسے لیتا ہے تو؟

بختیار: حضور کو عالم ای ہے —— پندرہ روپے۔

قدوائی: اور تو ان پندرہ روپوں کے عوض کام یہ کرتا ہے —— (جھاڑن بختیار کے مُنھ پر مار دیتا ہے) کیا تم پندرہ روپوں کو کم سمجھتے ہو؟ افوہ اتنی بدتمیزی —— تم نے جھاڑن رکھ دیا ہے میری میز پر۔ افوہ —! تم جانتے ہو بیگم کی اور میری لڑائی محض چارپائی پر پوڈر پف رکھ دینے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود تم میں اتنی جرأت ہے کہ ——

بختیار: حضور! —— صفائی کرتے وقت غلطی سے جھاڑن میز پر رہ گیا ——

قدوائی: (بالوں میں ہاتھ ڈال کر پریشانی کا اظہار کرتا ہے) —— ارے جھاڑن کو میز پر دھر دیا گیا۔ بس تو اُسے غلطی کہہ کر ٹال دینا چاہتا ہے اور —— (چارپائی کی طرف دیکھتا ہے تو فوراً بختیار کو گریبان سے پکڑ کر چارپائی کی طرف گھسیٹتا ہے) اُوف میرے اللہ! میں اس گھر میں نہیں جی سکتا —— وہ اب میرے بستر پر جُوتا کیسے پڑا ہے؟

بختیار: (کانپتے ہوئے) حضور! —— جب آپ باہر سے تھک کر آتے تھے اور جُوتوں سمیت بستر میں گھس جاتے تھے، تو بیگم آپ کے جُوتے اُتار دیا کرتی تھیں —— کل آپ نے خود ہی تسمے ڈھیلے کیے اور پھر انھیں اُتارے بغیر ہی سو گئے ——

قدوائی: (دانت پیس کر) تو اُلّو کے پٹھے کیا تمھارا جسم مفلوج ہو چکا تھا؟ تمھیں نے اُسے اُٹھا کر شو اسٹینڈ میں رکھ دیا ہوتا —— ارے بختیار...... او بختیار...... (آناً فاناً آواز میں تفکر اور رقت سی پیدا ہو جاتی ہے) —— بیگم —— ہاں بیگم ——! جاؤ بختیار، چلے جاؤ —— جاؤ!

(بختیار جاتا ہے)

قدوائی: (اپنے آپ سے) اُس دن کتنی حماقت ہوئی —— آج میری یہ حالت ہے کہ میرے بستر پر پوڈر پف کی سی چیز کے مقابلے پر جُوتا پڑا ہے —— سلیمہ! —— سلیمہ! —— اب میں کس منھ سے تمھارے پاس آؤں؟

(ٹہلتا ہے ـــــ پھر اسے کچھ خیال آتا ہے)

ارے ہاں! ـــــ میں نے بختیار کو ایک پیغام بھی دیا تھا ـــ (آواز دیتے ہوئے)
ـــــ اے بختیار ـــــ

بختیار: (ایک بھیگے ہوئے کُتّے کی طرح داخل ہوتا ہے) ہجور!

قدوائی: کیا تم اُدھر گئے، جدھر بیگم کا شفاخانہ ہے؟

بختیار: جی سرکار! میں اُدھر گیا تھا۔

قدوائی: پھر کیا خبر لائے ہو؟

بختیار: جی ہاں ـــــ سرکار ـــــ وہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے ـــ اس پر بارش کے پانی کا اثر ابھی تک دکھائی دیتا ہے۔

قدوائی: (اطمینان کا ایک سانس کھینچ کر) میرے لیے ابھی تک مصالحت کا راستہ کُھلا ہے ـــ سلیمہ سچ کہتی تھی کہ ان بے جان چیزوں میں کتنی قوتِ گویائی ہے ـــ وہ بے جان چیز زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

میں ابھی جاتا ہوں۔

(کوٹ کندھے پر ڈال کر نکل جاتا ہے)

پانچواں منظر

سلیمہ کا رہائشی کمرہ ـــــ ایک عام کمرے کی مانند ہے۔ لیکن اس میں نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ سلیمہ ایک اچھی ساڑی پہنے کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کھوکھلی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد نہ جانے اسے خیال آتا ہے کہ وہ اپنا منہ گھٹنوں سے ڈھانپ لیتی ہے۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آتی ہے ـــــ

(ایک طرف سے خادمہ دوڑی ہوئی آتی ہے)

خادمہ: (فوراً آنسو پونچھتے ہوئے) کیا ہے خادمہ —؟ کوئی مریض آیا ہے کیا —؟ کہہ دو مس صاحبہ ابھی نہیں آسکتیں ——

خادمہ: نہیں بی بی جی —— قدوائی آئے ہیں۔

سلیمہ: (حیرانی سے) قدوائی آئے ہیں — کیا کہہ رہی ہو — قدوائی آئے ہیں؟

خادمہ: جی ہاں —— قدوائی صاحب ہی تو ہیں —

سلیمہ: اری ٹھہرو — میں خود جاتی ہوں —

(دروازے کے قریب جا کر پھر واپس آجاتی ہے اور اُسی کھڑکی میں بیٹھ جاتی ہے)

مجھے ملنے آئے ہیں! —— دو ماہ بعد ——! (خشمگیں ہوتے ہوئے) انھیں کہہ دو کہ مس صاحبہ کے پاس ملنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ جاؤ کہہ دو ——

خادمہ: بی بی جی —— غصہ مت کیجیے —— یہ بات کہنے کے لائق نہیں۔ اب وہ اتنی دُور سے آئے ہیں۔

سلیمہ: میں جو کہہ رہی ہوں، وہ ٹھیک ہے۔

(قدوائی خود ہی اندر چلے آتے ہیں)

قدوائی: سلیمہ!

سلیمہ: (تن کر کھڑی ہو جاتی ہے) معاف کیجیے — آپ ایک غیر عورت کے کمرے میں بلا اجازت چلے آئے ہیں۔

قدوائی: (ایک دھچکا سا محسوس کرتا ہے) غیر عورت! —— میں اس کا حرجانہ دینے کو تیار ہوں۔ (سلیمہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) —— لیکن، لیکن تم رو رہی تھیں سلیمہ —— تمھاری آنکھیں ——

سلیمہ: آپ کو میری آنکھوں سے غرض؟ (آواز بھرّا جاتی ہے) میں روؤں یا نہ روؤں۔ اب تم کیوں آئے ہو۔ اب تم کیوں آئے ہو؟

قدوائی: شاید میں یہاں تک پہنچنے کی جرأت نہ کرتا سلیمہ — لیکن تمھارے سائن بورڈ نے

مجھے کانوں میں کچھ کہہ دیا۔

مہرباں ہو کے بُلا لو، مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

دو مہینے سے دن رات یہ سڑک پر کھڑا مسں سلیمہ سلطانہ کے نام کو جھٹلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم میری ہو، فقط میری ——— سچ مچ یہ خاموش چیزیں کتنی قوتِ گویائی رکھتی ہیں۔ ان بظاہر بے جان چیزوں میں کتنی جان ہے۔

سلیمہ: لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی کے پاس اسے درست کروانے کے لیے وقت نہ ہو یا پیسے ہی نہ ہوں ———

قدوائی: تمھاری یہ سوجی ہوئی بے جان آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تمھارے پاس تنہائیوں میں رونے اور جلنے کے لیے وقت ہے، جسے تم دوسری طرف استعمال کرسکتی تھیں ——— تمھارا لباس، تمھارا ٹھاٹ، تمھاری خادمائیں یہ سب چغلی کھا رہی ہیں کہ تمھارے پاس پیسے بھی تھے ——— سلیمہ!

سلیمہ: میرا تمھارا کوئی تعلق نہیں ——— کوئی تعلق نہیں ——— تم نے میرے پف کو پن کُشن کہا تھا ——— تم نے ———

(رونے لگتی ہے)

قدوائی: نہ نہ، چُپ ہو جاؤ ——— چُپ سلیمہ ——— یوں نہیں کیا کرتیں اچھی لڑکیاں ——— سلیمہ۔

سلیمہ: تم نے میرے پف ———

قدوائی: اب میں اسے ''مکھن کی ٹکیہ'' کہا کروں گا ——— چُپ ہو جاؤ۔ (خادمہ سے) دیکھو...... اے خادمہ! تم جا سکتی ہو ———!!

(پردہ)

خواجہ سرا

افراد:

کاشفہ............... اُردابیگنی محل میں ڈولیوں کی تنقیح کرتی ہے

قباد..............خواجہ سرا

مرزا کوچک سلطان..........نواب ثالث زمانی بیگم کا چھوٹا بھائی

نواب ثالث زمانی بیگم..............بیگم نواب کاؤس شاہ

نواب ننھی بیگم خورد.................. بیگم نواب کاؤس شاہ

نواب شرافت محل.................. بیگم نواب بلند بخت

نواب بلند بخت.................. نواب کاؤس شاہ

بابا طاہر.................. شاہی طبیب

داروغنی.................. مہتمہ محلاتِ شاہی

خیر صلا والی..............بیگمات سے خیر وعافیت دریافت کرنے والی

آچا..............صاحبزادیوں کو پڑھانے والی

تین ڈولی بردارنیاں

(مذکورہ بالا نام فرضی ہیں اور کرداروں کی اہمیت کے لحاظ سے دیے گئے ہیں)

منظر

حرم کا بیرونی دروازہ۔ سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور مُغلیہ صنعت کا اچھا نمونہ ہے۔ دروازے کے عین بغل میں ایک پانی کی پکھال دکھائی دیتی ہے، جس سے پانی نیچے باؤلے ——— ایک حوض میں گر رہا ہے۔ کبھی کبھی کوئی سقنی پانی بھر کر حرم میں لے جاتی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر اُڑدابیگنی باؤلے پر ایک ٹانگ رکھے، داہنے ہاتھ کی کُہنی گھٹنے پر ٹکائے، اسی ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت میں اپنی ٹھوڑی لیے خلا میں گھور رہی ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور دوپٹا لاپروائی سے گلے میں ڈالا ہوا ہے ——— فقط ایک قمیص اور ایک چوڑی دار پاجامہ زیبِ تن ہے۔

اڑدابیگنی کو اس جگہ اور اس حالت میں کھڑے چند ثانیے گزرتے ہیں کہ دارو غنی، ایک ادھیڑ عمر، سیاہ فام عورت ایسے ہی لباس میں بھاگی ہوئی آتی ہے۔

داروغنی: اڑدابیگنی ——— اڑدابیگنی ——— کاشفہ! اری تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟

اُڑدابیگنی: (چونک کر) کیوں، کیا ہے داروغنی بی؟

داروغنی: کیا ہے! تعجب ہے! محل میں زنانہ سواریاں آنا چاہتی ہیں اور تم پکھال کے پاس کھڑی کیا مزے سے کہہ رہی ہو ——— کیا ہے؟ اری آج ڈولیوں کی تنقیح نہ ہوگی کیا؟

اُڑدابیگنی: اوہ! ——— ڈولیاں بھی آگئیں؟ داروغنی بی! اللہ جانے، آج مجھے کیوں چکّر سے آرہے ہیں۔ کئی رنگارنگ حلقے میری کنپٹیوں کو چھو کر دُور دُور پھیل رہے ہیں ——— یہ باؤلا ہے نا ——— پانی کی پکھال ——— اور بس ——— اس سے آگے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تنقیح کیا ہوگی، خاک؟

داروغنی: چکّر سے آرہے ہیں ——— اُوئی! اب میں نے جانا کیوں یہ نُمن برستا ہے تمھارے چہرے پر۔ سچ بتاؤ، قباد کو دیکھے کے دن ہوئے ہیں تمھیں؟

اُڑدابیگنی: قباد ـــــ قباد! اللہ اس کا ذکر نہ کرو، داروغنی بی! اب تم نے قباد کا نام لیا اور میرے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی ـــــ میرا جسم پھنکنے لگا ـــــ اور اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے اور گہرا ہو گیا ـــــ دیکھو خالہ، اگر کوئی باریدارنی نظر پڑتی ہے تو اسے کہہ دو کہ گلی سے میری کیانی اچکن اور انگرکھا لے آئے ـــــ ذرا جلدی آ جائے، بی داروغنی ـــــ ڈولیاں آ رہی ہیں (گھبرا کر) گھنٹیوں کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔

(گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

داروغنی: قباد کو دیکھو گی کاشفہ تو تمھارے دل میں اور ٹیسیں اُٹھیں گی۔ اب تو سقنی بھی یہاں کوئی نہیں۔ البتہ خیر صلا والی گھوم رہی ہے ـــ (ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے) اری بھلا اس وقت یہ کہاں؟ ـــــ بے حیا کی بلا دُور، یہ گو مڑی پھر لگائی بُجھائی کرنے آئی ہوگی۔ (آواز دیتے ہوئے) ـــــ اری او خیر صلا والی!

خیر صلا والی: (دُور سے) داروغنی بی آئے ہائے ـــــ بُلاتی کس طرح ہو جیسے میں کوئی تمھاری وہ ہوتی ہوں ـــــ

داروغنی: اے لو اور سنو ـــــ کتنی پھٹی ہوئی عورت ہے۔ کس مزے سے رنگ جماتی ہے اور میں ہوں کہ اس کی قبر تک سے واقف ہوں ـــــ نہ جانے انھیں اور کوئی کیسے بُلائے ـــــ اجی سرکار! ایک عرض بندی کی بھی سُنتے جایئے گا، اے ہے!

خیر صلا والی: تم ہمیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتی ہو خالہ! ہم روج بہو بیٹیوں میں جانے والے ـــــ ہماری روجی پہ یوں ہات ڈالنا اچھا نہیں۔

اُڑدابیگنی: خیر صلا والی بہن! ـــ جا تو ذرا میری کیان اچکن اور انگرکھا، گلی سے لے آ۔ (دائیں طرف دیکھتے ہوئے) سواریاں آ بھی گئیں ـــــ جا جا ـــــ جلدی ذرا ـــــ اچھی بہن ـــــ

(خیر صلا والی جاتی ہے اور مطلوبہ لباس لے کر لوٹ آتی ہے۔ ایک

حقیر سے وقفے کے بعد گھنٹیوں کی آوازیں بہت قریب سے سُنائی دیتی ہیں)

اُڑدابیگنی: (گھبرائی ہوئی آواز میں) پہنا دو —— باندھ دو تکمہ ادھر بھی، ہاں ہاں —— جاؤ خیر صلا والی! —— بڑی ڈولی آگئی ——

(پہلی ڈولی گھنٹی کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

اُڑدابیگنی: ڈولی بردارنی؟

ڈولی بردارنی نمبر 1: بلند اقبال نواب شرافت محل، ان کی صاحبزادی اور آچا ہیں۔

اُڑدابیگنی: (پردہ ہٹاتے ہوئے) اللہ رسول کی امان! بیگم، لونڈی سلام عرض کرتی ہے۔

نواب شرافت محل: کہو کاشفہ! اچھی تو ہو۔ یہ میرے ساتھ صاحبزادی اور دوسری ان کو پڑھانے والی اور آچا ہیں۔ یہ نئی ہی آئی ہیں لکھنؤ سے (آچا کو مخاطب ہو کر) آچابی! یہ اُڑدابیگنی ہیں۔ ان کا کام یہاں ڈولیوں کی تنقیح ہے۔ ہر روز ادھر گزرنے سے پہلے ان سے ملاقات ہوا کرے گی تمھاری۔

آچا: آداب عرض کرتی ہوں، بہن اُڑدابیگنی۔

اُڑدابیگنی: خوش آمدید! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ محل کی رونق میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اللہ صاحبزادی نیک اختر کی عمرِ دراز عطا کرے —— ان کے صدقہ ہمیں بھی بڑے بڑے آدمیوں کا نیاز حاصل ہوا۔

(بیگمات اُتر کر اندر چلی جاتی ہیں۔ جس کے بعد دوسری ڈولی داخل ہوتی ہے)

اُڑدابیگنی: ڈولی بردارنی؟

ڈولی بردارنی نمبر 2: بخت بلند تا بہ ثریا — نواب ثالث زمانی بیگم اور ان کے ساتھ چٹھی نویسنی ہیں۔

اُڑدابیگنی: (پردہ ہٹاتے ہوئے) اللہ رسول کی امان، بیگم! لونڈی آداب بجالاتی ہے۔

نواب ثالث زمانی: کہو کاشفہ! تمھاری والدہ تو اب اچھی ہیں نا؟

اڑدابیگنی: حضور کی لاانتہا کرم فرمائیوں کی بدولت اچھی ہیں۔ وہ آپ کا ارشاد کردہ جوشاندہ پلا دیا تھا جس سے کھانسی کو تو بالکل افاقہ ہے اور تپ بھی چلا جائے گا۔ گلے میں خراش بدستور قائم ہے — خیر، فرمایئے۔ مرزا کوچک اچھے ہیں۔ پچھلے دنوں دشمنوں کی طبیعت کے ناشاد ہونے کا خط آیا تھا۔

نواب ثالث زمانی: ہاں کاشفہ! بھائی مہم پر جاتے ہی بیمار ہو گئے —— بنگلہ میں بارشیں بہت ہوتی ہیں نا۔ وہاں کی نم کو وہ سہ نہ سکے —— اب اِن دنوں وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ چٹھی نویسنی کو انھیں ہی خط لکھنے کے لیے لائی ہوں۔

(اُتر کر حرم میں چلی جاتی ہیں)

(تیسری ڈولی داخل ہوتی ہے)

اڑدابیگنی: ڈولی بردارنی؟

ڈولی بردارنی نمبر 3: بیگم عالی جاہ ننھی بیگم خورد اور پیچھے —— خواجہ قباد!

اڑدابیگنی: اللہ رسول کی امان، بیگم! غلام تسلیمات عرض کرتی ہے۔

(قباد کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) پپوٹے کُھل جاتے ہیں اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں)

—— قباد! —— خواجہ قباد!

نواب ننھی بیگم خورد: ہاں اڑدابیگنی —— یہ ہمارے نئے خواجہ سرا ہیں۔ آئیں ہائیں! حیران کیوں کھڑی رہ گئیں تم؟ نئے فرمان میں نام نہیں دیکھا خواجہ قباد کا —؟ تعجب ہے! داروغنی ——

داروغنی: ہاں نواب صاحبہ! چند دن ہوئے خواجہ سرا قباد کا نام شائع ہوا تھا۔ خدا جانے اڑدابیگنی کی توجہ اس طرف کیوں نہیں دلائی گئی —— آپ تشریف لایئے۔

(نواب ننھی بیگم اور خواجہ سرا حرم میں داخل ہوتے ہیں)

اڑدابیگنی: —— قباد! — قباد خواجہ سرا ہو گیا۔ داروغنی! تمھاری کاشفہ پاگل ہو جائے گی — قباد نے یہ کیا کیا، قباد نے یہ کیا کیا ——

دارو غنی: (آہستہ سے) تم نہیں جانتیں کاشفہ، قباد کو تم سے کتنی محبت تھی۔ وہ تمھارے کتنا قریب ہونا چاہتا تھا۔ وہ چوگانِ محبت میں تم سے گوئے سبقت چھین لے گیا ہے۔ تمھاری محبت کا یہ عالم ہے کہ شاہی محل سے نکل کر گولندازوں کی ایستادگاہ تک بھی نہ پہنچ سکیں، جہاں کہ وہ ساری ساری رات منڈلایا کرتا تھا—— نواب ثالث زمانی کو اکثر شجاعت خان کے بھوت کا دھوکا ہوتا—— کئی اندھیری راتیں، کئی چاندنی راتیں گزر گئیں اور وہ متواتر گولندازوں کی ایستادگاہ میں آیا کیا—— اور تم، تم پانی کی پکھال سے آگے نہ بڑھ پائیں——

اڑدا بیگنی: قباد! تو نے یہ کیا کیا۔ تم نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ قباد! تو ہمیشہ سچی اور پاک محبت کا نام لیا کرتا تھا—— سچی اور پاک محبت، جس میں جسم کو کوئی دخل نہیں، جو حرص و ہوا کے بغیر ہے—— قباد! میں پاگل ہو جاؤں گی۔

دارو غنی: اب شجاعت خاں کے بھوت کو گولندازوں کی ایستادگاہ پر منڈلانے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ نواب شرافت محل کے بغلی کمرے میں جہاں اڑدا بیگنی کا حجرہ ہے، وہاں منڈلایا کرے گا—— (آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہوئے) لو، کاشفہ! میرے خیال میں وہ شجاعت خاں کا بھوت آرہا ہے — شجاعت خاں کا بھوت—— میں جاتی ہوں!

(دوسری طرف غائب ہو جاتی ہے)

قباد: کاشفہ ——

اڑدا بیگنی: قباد تم ہو—— قباد—— میرے کمسن محبوب! تم نے یہ اقدام کیوں کیے —— بتاؤ، بتاؤ——

قباد: اپنی کاشفہ کے قریب ہونے کے لیے، قریب تر ہونے کے لیے۔ وہاں محل کے نیچے منجمد کر دینے والی سردی تھی، کاشفہ! وہاں پانی اور کیچڑ تھی، جس میں سردیوں کی طویل راتیں پھنس کر رہ جاتی تھیں—— یہاں مونگ اور سَن کی فصلیں ہیں۔ اور تمھارا گرما دینے والا حُسن—— کاشفہ!

اژدابیگنی: آہ! قباد ــــــ میرے معصوم محبوب! تُو نہیں جانتا تو نے کیا کیا ہے۔ تیری معصومیت کے صدقے! میں تیری قربانی کا جواب قربانی سے دوں گی۔ لیکن (نفرت سے) خواجہ سرا، قباد! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسی ذلیل حرکت پر کیسے اُتر آئے ــــــ تم عورت ہی ہوتے ــــــ اب تم مرد ہو نہ عورت ــــــ تم کیا ہو، تم کچھ بھی نہیں ہو (محبت سے) لیکن آہ ــــــ قربان جاؤں تمھارے بھولے پن کے ــــــ میرے قباد! اِدھر دو مجھے اپنا ہاتھ ــــ (چیخ مار کر ہاتھ کو پرے دھکیل دیتی ہے) اوہ! مجھے اس سے کتنا ڈر آتا ہے۔ اِس برف ایسے ٹھنڈے اور منجمد ہاتھ سے ــــ!

قباد: (کچھ خواجہ سرایانہ انداز میں) اے ہے کاشفہ!

اژدابیگنی: (سر پر ہاتھ رکھ کر جیسے وہ اس بات کی تاب نہ لا سکتی ہو) اُوف میرے اللہ! تمھارا لب ولہجہ بھی کس سرعت سے بدل رہا ہے۔ اس سے پہلے تم کتنے دُبلے پتلے انسان تھے۔ اب گوشت تمھارے جسم اور گردن پر جمع ہو رہا ہے ــــ (روتے ہوئے) قباد! مونگ اور سَن کی فصلوں میں نواب بلند بخت آئے، نواب کاؤش شاہ آئے اور نواب کوچک سلطان آتے ہیں۔ لیکن تم ایسے آئے کو گولندازوں کی کیچڑ بھی ساتھ ہی لیتے آئے جس میں کاشفہ کا گرما دینے والا حُسن بھی سردیوں کی طویل راتوں کی طرح پھنس کر رہ جائے گا ــــ قباد! قباد ــــــ تم نے یہ کیا کیا؟

قباد: میں تم سے کل کی بات کہتی ہوں ــــــ کہتا ہوں، کاشفہ! کل جو کہ اب عدم آباد والوں کا حصّہ ہو چکا ہے۔ کل جب کہ مجھ میں مرد کا صائب حسد زندہ تھا اور کوچک سلطان کے ساتھ نبرد آزمائی میں میں نے اُسے سرنگوں کر دیا تھا ــــ کل جب کہ اپنے نئے پیشے کی تعلیم پانے کے لیے خواجہ سراؤں کے سامنے میں نے زانوئے ادب تہ نہیں کیا تھا ــــــ آنے والے کل کو شاید میں اپنی جنس کھو دینے سے کیا کچھ کھو دوں ــــــ مرزائے کوچک نے تمھیں مشروع کا تھان اور مونگے کی مالا دی اور یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم بھی اس کی

مالا میں مونگا بن کر لٹک جاؤ گی —— خواجہ سراؤں کی آمدنی کے پیش نظر مجھے خیال تھا کہ میں تمھیں ایک موتیوں کی مالا نذر کرسکوں گا۔ موتی جو مونگے سے گراں تر ہوتے ہیں —— اور شاید تم موتی بن کر لٹکنا زیادہ پسند کروگی۔

اژدابیگنی: تم کس قدر بھولے ہو قباد! عورت خواہ مونگا بن کر لٹک جائے خواہ موتی بن کر —— لٹکنا وہیں رہتا ہے۔ میرے محبوب! عورت دولت نہیں چاہتی۔ جاہ وحشمت کی طلبگار نہیں ہوتی۔ وہ محبت چاہتی ہے۔ لیکن محبت کسے کہتے ہیں...... یہ تم نہیں جانتے...... محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ شاید میں بھی نہیں جانتی ——

قباد: مجھے تم سے محبت ہے —— پاک اور بے لوث محبت۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں بھی مجھ سے بے غرض محبت ہوگی۔ تم میری قربانی کا جواب قربانی سے دیتے ہوئے پاسِ ناموسِ وفا بھی ہورہی ہو اور مجسمہ نفرت بھی —— لیکن اس میں تمھارا کیا قصور ہے کاشفہ! —— اب میں محبت کے اس مقامِ ہُو میں داخل ہو چکا ہوں جہاں اپنا نفس ہی محسوس ہوتا ہے۔ جہاں سب کچھ اپنا ہی قصور دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر تمھارے لیے یہ سب کچھ ایک حادثہ ہے اور میرے لیے محض ایک واقعہ!

اژدابیگنی: جسے تم محبت کہتے ہو، وہ محبت نہیں ہے —— رفاقت ہے۔ جیسے دو مسافر ایک ہی منزل کو روانہ ہوں اور انھیں منزل کی یک جہتی کی وجہ سے ایک نوع کی محبت ہو جائے، جیسے ایک انتہائی بدصورت انسان سے کوئی اتنا مانوس ہو جائے کہ اس سے خوف کھانے کے بجائے اس سے اُنس ظاہر کرنے لگے۔ لیکن تمھارے اس فعل کے پس منظر جو اخلاص ہے، میں اِس کی قدر کرتی ہوں —— قباد —— لیکن...... قباد! ——

قباد: (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) میں کچھ نہیں جانتا —— میں اس وقت نہیں جاننا چاہتا کہ میں نے کیا کیا ہے کاشفہ —— میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں تمھیں چاہتا ہوں —— تمھیں چاہتا ہوں ——

دوسرا منظر

حرم کا اندرونی منظر۔ نواب ثالث زمانی کے محل کا ایک کشادہ سا کمرہ جس کا ماحول پردوں اور ہر قسم کے سازوسامان کے اعتبار سے نہایت پُر تکلف ہے۔ سامنے دو تین سیڑھیاں ایک بڑے مسند کے ساتھ ملحق ہوتی ہیں۔ اس مسند پر بیسیوں گاؤدم تکیے اور کئی ایک پیچوان اور کٹوریاں دکھائی دے رہی ہیں۔

پردہ اُٹھنے پر دروازے کے قریب باریدارنیاں حکم کی منتظر کھڑی ہیں اور بیگمات کھڑکیوں سے نیچے ایک جلوس کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ جلوس مرزائے کوچک کے محلوں میں فاتحانہ داخلے کے سلسلہ میں ہے۔ پردے کے پیچھے سے نفیریوں اور شادیانوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

نواب شرافت محل: (کھڑکی سے ہٹ کر) مبارک ہو بہن ثالث زمانی —— سچ کہتی ہوں، مجھے تو تم پر رشک آتا ہے۔

نواب ننھی بیگم: شرافت محل ٹھیک کہتی ہیں ثالث! اللہ کرے کوچک میاں کا سا بھائی ہر ایک ہی کا ہو۔

اڑدا بیگنی: میں پہلے نہ کہتی تھی بیگم —— کوچک مرزا بڑے شہزور آدمی ہیں ——

خواجہ قباد: (ایک سرد آہ بھرتا ہے) آہ!

شرافت محل: ایں آہِ جگر دوز چہ معنی؟ ——

خواجہ قباد: (گھبرا کر)......م......م...... میں کہتی ہوں بیگم۔ کوچک میاں بھلا شکست کا نام ہی کیا جانیں۔

آچا: کون کون سے شہر لیے ہیں؟ پہلے جوڑا گاؤں کا پرگنہ لیا ہے اور ندھیرا اور پھر بردوان کا کوئی قصبہ —— یہ کوئی معمولی سی بات تھوڑے ہی ہے۔

نواب ثالث زمانی: اپنوں کو خوشی نہ ہوگی تو پھر کیا دوسروں کو ہوگی۔ جب کوچک بھائی یہاں پڑے انڈے مرغیوں کے لڑایا کرتے تھے تو نواب صاحب کا خیال ہو چلا تھا کہ بس

انڈے لڑانے ہی تو جانتے ہیں۔

ننھی بیگم: ان کی کیا بات کرتی ہو بہن ثالث۔ بیٹھے بٹھائے پھبتیاں کسنا تو اِن کا کام ہی ہے ــــ اور جو میں ان سے اِتی وہ نہ کروں تو میرے سر پہ بھی چکّی دَلا کریں ــــ سچ!

ثالث زمانی: (متفق ہوتے ہوئے) ہاں ــــ وہ تو ان کی بات ہی ہے۔

نواب شرافت محل: اری بی قباد ــــ جا تو میرا پاندان اُٹھالا۔

خواجہ قباد: جاتی ہوں بیگم صاحبہ ــــ پان تراش بھی لاؤں گی ــــ ذرا سموسہ گلوری لاؤں تھی؟

نواب شرافت محل: میرے لیے اور ننھی بہن کے لیے سموسہ لے آؤ یا تعویذی (ثالث زمانی کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اور ثالث بہن کیا لیں گی؟

ثالث زمانی: بیڑا لے لوں گی اور کیا۔

خواجہ قباد: بیڑا وہ کاٹ کے لاؤں گی کہ بیضہ ماند پڑ جائے ــــ اور نہیں تو۔

اژدا بیگنی: (آہستہ سے) قباد ــــ خدا کے لیے اس لہجے میں باتیں نہ کرو، مجھے دُکھ ہوتا ہے۔

نواب شرافت محل: اور دیکھ بی قباد ــــ آج آخری چہار شنبہ ہے۔ انگوٹھی اور چھلّے بھی لیتی آنا۔ آج خیر سے کوچک میاں کو بھی انگوٹھی دوں گی۔

ثالث زمانی: اور ہاں دو گی کیوں نہیں پچھلی دفعہ سر ہو رہا تھا خواہ مخواہ۔ کہہ رہا تھا بڑی آپا مجھ سے کچھ کھنچی ہوئی ہیں۔

اژدا بیگنی: کوچک میاں انڈے لڑاویں۔ بیگم تو وہ بھی ایک قرینے کے ساتھ ــــ اِن میں جو بڑی بات ہے وہ ان کے بازو کا زور ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ بنگلہ فتح کر کے ہی لوٹیں گے۔

ثالث زمانی: (پروانہ کرتے ہوئے) ہاں کاشفہ ــــ لو کوچک میاں آگئے (استقبال کے لیے اُٹھتی ہے اور سیڑھیوں سے نیچے آتی ہے۔ ایک طرف سے کوچک میاں داخل ہوتے ہیں۔ ہاروں سے لدے پھندے ہیں۔ سر پر ململ کی ٹوپی ہمیشہ کی طرح ترچھی رکھی ہوئی ہے۔ ذرا بانکے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح

انڈا ہے)۔

مرزائے کوچک: آداب عرض کرتا ہوں آپا — (مسند کی طرف دیکھتے اور جھکتے ہوئے) اور بڑی آپاؤں کو بھی تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

شرافت محل: کوچک میاں کو بنگلہ کی فتح مبارک ہو۔

(کوچک میاں جھک کر سلام کرتے ہوئے ہاروں کا بوجھ اُتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ نواب کاؤس شاہ اور نواب بلند بخت داخل ہوتے ہیں۔)

ننھی بیگم: اب طبیعت کیسی ہے کوچک میاں — سُنا تھا پچھلے دنوں طبیعت خراب ہے۔

نواب کاؤس شاہ: خیر سے۔ اچھا بھلا ہے — تم عورتیں بھی تو خوب رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہو۔

ننھی بیگم: اُونہہ! آپ کی تو عادت ہے کہ بات منھ سے نکلی اور پکڑ لی۔

نواب کاؤس شاہ: اچھا بھئی! جو منھ میں آئے کہے چلی جاؤ۔

ننھی بیگم: اچھا تو میں چپ ہو جاتی ہوں۔ میری باتیں کہاں اچھی لگتی ہیں آپ کو۔

مرزا بلند بخت: اور ثالث زمانی تو چپ ہیں۔ مبارک باد بھی نہیں دے سکیں، بھائی کوچک کو۔

نواب ثالث زمانی: (گلے میں رقت ہے)...... مجھ سے بولا نہیں جاتا۔

کاؤس شاہ: اوہ اتنی خوشی ہے کہ رو رہی ہیں واللہ!

(سب ہنستے ہیں)

ثالث زمانی: یہ آپ ہی تھے جو کہتے تھے کہ بس انڈے لڑانے ہی آتے ہیں کوچک میاں کو۔

کوچک میاں: (انڈا دکھاتے ہوئے) اور ٹھیک ہی تو کہتے تھے — (پھر) نہیں آپا! وہ تو مذاق میں تھا۔

ثالث زمانی: جی ہاں، جانتی ہوں۔

کاؤس شاہ: اے لو! ارے بابا! ان عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ وہ ہیں جو کنوئیں میں گرے ہوئے عاجز کا نکیلا بٹہ لے آتی ہیں — ارے بابا! ابھی ننھی سر ہو رہی تھیں، اب تم ہُوتے لگاؤ —

ثالث زمانی: آئے ہائے! میں کیوں دشمنوں کے مُوتے لگانے لگی۔

بلند بخت: ہاں دشمنوں کو کیوں لگانے لگی۔ (سب ہنستے ہیں)

شرافت محل: تم تو اپنی اپنی — برسوں کی لے بیٹھے ہو۔

کاؤس شاہ: ہاں کفر کی ہی تو چل نکلی ہیں۔ اب اللہ ہی بچائے۔

ننھی بیگم: خود ہی واویلا کرتے ہو اور خود ہی ڈرتے بھی ہو — مگر تم سے کون کہے۔

کوچک سلطان: (ہنستے ہوئے) اور کہہ بھی دیا —— کیا ادا ہے۔

ننھی بیگم: چلو چھوٹے میاں —— آج ہی آئے اور آج ہی......

ثالث زمانی: ارے کوئی بنگلہ کی بات کہو۔

بلند بخت: ڈیگیں چل نکلیں گی۔

کاؤس شاہ: مشکل سے بھاگ کر آیا ہے اور تم ہو کہ پھر اسے بنگلہ میں واپس بھیج دینا چاہتی ہو۔

شرافت محل: یہ یہیں بنگلہ کا رن نہ پڑ جائے کہیں، مجھے تو ڈر ہے ——

ثالث زمانی: میں تو کاشفہ کو کہتی ہوں —— وہ اپنی رُباعی سُنائے۔

اڑدابیگنی: (کوچک کی طرف دیکھ کر شرماتے ہوئے) بیگم! مجھے گانا نہیں آتا۔

ثالث زمانی: چل ہٹ مُردار — چار پانچ روز سے وہ سر کھایا ہے۔ وہ مشق کی ہے ——
اور اب......

کاؤس شاہ اور بلند بخت: اڑدابیگنی — گاؤ ہم تمھیں اور مشروع کے تھان دیں گے۔

اڑدابیگنی: حضور، آپ کی جوتیوں کے صدقہ بہت کچھ ہے۔

بلند بخت: جو تمھاری اماں یہی فقرہ کہا کرتی تھیں تو ہم شرم سے گردن جھکا لیا کرتے تھے —
ان کی چندیا پر ایک بھی بال نہ تھا۔

کوچک سلطان: لیکن یہاں کاشفہ کے ڈیڑھ گز لمبے بال ہیں ——
(کاشفہ کی طرف عاشقانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کاشفہ شرم وحیا
سے گردن جھکا لیتی ہے —— خواجہ قباد پاندان لے کر داخل
ہوتا ہے۔ وہ کوچک اور کاشفہ کی ملی ہوئی نظریں دیکھتا ہے۔ لیکن

ایک سرد آہ بھرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا)

خواجہ قباد: لیجیے حضور پاندان ——

کاؤس شاہ: بیگم —— خواجہ سرا کیسا ہے؟

ننھی بیگم: اچھا ہے، (کاؤس کے کانوں کے قریب مُنھ کرتے ہوئے) اکیلے میں بتاؤں گی۔

بلند بخت: اور ہم کیا پرائے بیٹھے ہیں ننھی بیگم، جو ہم سے چُھپاتی ہو۔

شرافت محل: تعجب ہے ——!

ننھی بیگم: ایسی بھی باتیں ہیں جو مردوں سے چُھپانے کے لائق ہوتی ہیں۔

ثالث زمانی: گویا ہمارے نواب کوئی وہ ہیں ——

کوچک سلطان: تھکا ہوا ہوں —— کوئی بات ہو جائے۔

ثالث زمانی: کاشفہ کا گانا ——

بلند بخت: فرمائشی؟

ثالث زمانی: ہو سکتا ہے کیا کاشفہ بی ——؟

اڑدابیگنی: جی ہاں سرکار ——

خواجہ قباد: (نواب کاؤس سے) نواب صاحب —— بندی تعویذی پیش کرتی ہے۔

کاؤس شاہ: واللہ خوش کر دیا —— لاؤ تعویذی۔

شرافت محل: کیا گلوری ہے!

خواجہ قباد: (نواب بلند بخت سے) نواب صاحب —— بندی قمی پیش کرتی ہے۔

بلند بخت: لاؤ تو —— قباد ——

کوچک سلطان: اوہ قباد! (حیران ہوتے ہوئے) —— تم ہو قباد —— گولنداز وں کی ایستادگاہ میں آنے والے؟

خواجہ قباد: جی میں ہی ہوں ——

کوچک سلطان: (ہنستے ہوئے) واللہ، کیا صورت نکالی ہے۔ کیا لہجہ ہے۔

ایک وہ ہیں کہ جنھیں تصویر بنا آتی ہے......

(ہنستا ہے)

آخر تم نے میرا کہنا مان ہی لیا——

خواجہ قباد: ہاں نواب صاحب! مان لیا...... لیکن...... لیکن — یہ لیجیے گلوری — سموسہ گلوری!

کوچک سلطان: شکریہ! —— تم کتنے اچھے دکھائی دیتے ہو — میں نے کہا تھا کہ میں اپنی شکست کا بدلہ لوں گا —— سو میں نے لے لیا ہے۔

خواجہ قباد: اس کے لیے بندی شکریہ ادا کرتی ہے۔

نواب کاؤس شاہ: تم کن باتوں میں پڑ گئے ہو۔

ثالث زمانی: اب سنو گے بھی اپنی دل پسند چیز۔

نواب بلند بخت: ارے بھائی وہ گاؤ —— علاج تشنگیِ کے شوز رآتشِ عشق

نواب شرافت محل: اچھا ہے کہ کاشفہ کو وہی چیز گانے دی جائے جو اُس نے تیار کی ہے۔

ثالث زمانی: داروغنی —!

داروغنی: جی سرکار۔

ثالث زمانی: سازندے ہیں نا؟

داروغنی: یہی دروازے کے پاس بیٹھے ہیں۔

ثالث زمانی: بھیج دو —— اور دروازہ بند کردو۔

داروغنی: بہت اچھا سرکار ——!

کوچک سلطان: (ہنستے ہوئے) خواجہ قباد —— خواجہ قباد!

کاؤس شاہ: کاشفہ — اب کہو گی بھی — سازندے آگئے۔

اڑدابیگنی: جو حکم حضور ——

(گاتی ہے)

تو بکار کسے نمی آئی　　بکنار کسے نمی آئی

بچہ اُمید متیواں مُردن　　بمزارے کسے نمی آئی

(درمیان میں تحسین وآفریں کی صدا بلند ہوتی ہے)

کوچک سلطان: واہ وا — واہ ہی وا — کیا میٹھا گانا تھا، سفر کی تکان جاتی رہی۔

کاؤس شاہ: بول تھے نشتر تھے ——

ننھی بیگم: نشتر؟ او ہو، نشتر ہی تھے کہیں ——

بلند بخت: یہ ننھی بیگم جانے بہت اچھا گاتی ہیں۔

ننھی بیگم: نہیں —— یہ تو میں نہیں کہتی۔

بلند بخت: اماں چھوڑو اس کو اب۔

ثالث زمانی: بھئی اب چلا جائے —— کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔ داروغنی کب سے منتظر ہے۔

کاؤس شاہ: چلو —— چلیں۔

بلند بخت: ہاں بھئی —— بہت دیر ہو گئی۔

شرافت محل: اُٹھو —— لو کوچک میاں، یہ چہار شنبے کی انگوٹھی ہے۔ تم نہیں چلو گے کیا؟

کوچک سلطان: انگوٹھی کے لیے شکریہ۔ اس پہ کیا لکھا ہے —— شیر بنگال (کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے) اجی کہاں، آپا، میں اس خطاب کا سزاوار ہوں۔ —— اور ہاں، میں کھانے پہ ابھی نہیں جا سکتا۔ ذرا آرام کروں گا۔ کاشفہ مجھے کوئی ہلکا پھلکا گانا گا کر سُلا دے گی اور قباد — تم بھی یہیں ٹھہرو۔

(سب کے جانے کی آواز آتی ہے)

کوچک سلطان: سناؤ بی قباد —— ! عرصہ تک میں تمھیں گولندازوں کے ہاں دیکھتا رہا اور میں نے تم سے دوستی گانٹھی —— وگرنہ کہاں تم اور کہاں میں ——

خواجہ قباد: جی سرکار —— کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔

اڑدابیگنی: نواب صاحب — خدا رائیوں بات نہ کیجیے۔ قباد آپ کی میں ہاں ملائے چلا جائے گا —— جو کچھ کہ وہ کر رہا ہے اور جو کچھ وہ کہ ہے، اس کی نوعیت قباد خود بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔

قباد: اے ہے تم کیا کہہ رہی ہو کاشفہ!

کوچک سلطان: (احساسِ فتح مندی سے) میں کاشفہ سے محبت کرتا تھا اور تم بھی کاشفہ سے محبت کرتے تھے۔ ہمارے دونوں کے درمیان ایک بات مشترک تھی۔ اس لیے تمھیں اِس بات کا فخر بھی حاصل ہو سکا کہ تم میرے ساتھ بات کر سکو۔ میں نے تمھاری حوصلہ افزائی کی —— اور تمھیں کاشفہ کے قریب ہونے کا طریقہ بتا دیا۔

(ہنستا ہے)

اب تم کاشفہ کے کس قدر قریب ہو گئے ہو، کس قدر قریب۔

خواجہ قباد: کاش میں قریب نہ ہوتی، بالکل کاشفہ ہو جاتی، لیکن......

نواب کوچک: ہاہاہاہا ——!

اژدا بیگنی: نواب صاحب —— آپ کو گریبان میں منھ ڈال کر سوچنا چاہیے۔ اب قباد میں مرد کے حسد اور مرد کے انتقام کو کچل کر آپ قہقہے لگاتے ہیں —— کیا آپ وہ دن بھول گئے ہیں، جب قباد کے ساتھ نبرد آزمائی میں آپ کو منھ کی کھانی پڑی تھی؟ اب آپ اسے ذلیل کرتے ہیں، جسے آپ نے مرد بھی نہیں رہنے دیا —— اور جو نہ عورت ہے۔ کاش! آپ کسی مرد سے باتیں کرتے اور پھر دیکھتے وہ کیسے شیر بنگلہ کو روباہ اودھ میں تبدیل کر دیتا۔ آپ کسی عورت سے باتیں کرتے تو وہ آپ کا منھ سیاہ کر کے ڈکڑی پر بٹھا بھیجتی۔

مرزا کوچک: (بلند آواز میں) کاشفہ! تم ایک دو پیسے کی چھوکری ہو کر یوں منھ کو آتی ہو۔

اژدا بیگنی: دو پیسے کی عورت! آپ کے مرتبے سے بھی میں واقف ہوں۔ بہن کی بدولت دوشالے پھڑکاتے پھرتے ہو...... اور جب ایک دو پیسے کی چھوکری کو منھ لگایا جاتا ہے تو وہ آپ کی والدہ مرحومہ سے بھی زیادہ ذی وجاہت ہو جاتی ہے۔

مرزا کوچک: ہوں! —— اب میں سمجھا! میں اپنی دانست میں قباد کو مار ہی چکا تھا، لیکن اب دیکھتا ہوں قباد اژدا بیگنی کے دل میں بدستور زندہ ہے ——

خواجہ قباد: اجی حضور! کیا کبھی بے لوث محبت بھی فنا ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو بندی عرض

کرتی ہے۔

مرزا کوچک: (ہنستے ہوئے) بے لوث محبت —— آہاہاہا...... اور کاشفہ پوری رعنائی سے انگڑائیاں لیتی ہوئی گاتی ہے ——تو بکار کسے نمی آئی —— بکنار کسے نمی آئی ——ہاہاہا——

اژدا بیگنی: (شرما کر) اس کا یہ مطلب نہیں ——

مرزا کوچک: چھ دن سے تیاریاں ہو رہی ہیں ——اور اس کا یہ مطلب نہیں......

اژدا بیگنی: آپ——

مرزا کوچک: (غصّے سے) ہوں! میں دیکھتا ہوں، ابھی تک قباد میرے راستے میں حائل ہے—— میں اسے جہنم واصل کیے دیتا ہوں۔

(اُٹھتا ہے اور تیزی سے قباد کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے)

خواجہ قباد: ای خدا کے لیے مجھے بچاؤ، کاشفہ بی!—خدا کے لیے! رسول کریم کے لیے۔

اژدا بیگنی: لو مجھے مارو کوچک میاں—پھر قباد کو ہات لگانا۔ قباد میرے پیچھے ہو جاؤ۔

(قباد ہائےاللہ اللہ کرتا ہوا کاشفہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

(شور سن کر نواب ثالث زمانی داخل ہوتی ہیں)

ثالث زمانی: (غصّے سے) کوچک میاں!—شہر بنگلہ! تمھیں عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ندامت نہیں ہوتی۔

کوچک سلطان: عورت نہیں آپا جان ——یہ وہ مردود ہے جو عورت کی پناہ لے رہا ہے——قباد!

ثالث زمانی: یہ اور بھی باعثِ ننگ ہے۔ آج بنگلہ سے لوٹتے ہوئے تمھارے پہلے اقدام یہ ہوں کہ ایک خواجہ سرا پر ہاتھ اُٹھاؤ—— کیا یہ تمھاری شان کے شایاں ہے؟—— چل اُٹھ——جا مسند پر واپس——چل——

کوچک سلطان: (زیرِلب) ——یہ ایک ایسے جذبے کے تحت ہوا، جو مرد کو بیک وقت بہادر بھی بنا دیتا ہے اور بُزدل بھی۔

ثالث زمانی: آپا — میں..... تم..... نہیں جانتیں —

خواجہ قباد: کاشفہ! میں تمھارا کتنا ممنون ہوں — مم......

اڑدا بیگنی: چل ہٹ — میں تمھارا منھ نہیں دیکھنا چاہتی......

خواجہ قباد: کاشفہ — کیوں؟ — تم نے اپنی زندگی کو جوکھم میں ڈال کر مجھے بچایا۔
اب میرا منھ دیکھنا نہیں چاہتیں — کاشفہ —!

اڑدا بیگنی: چلی جاؤ — بی قباد — مجھے تم سے نفرت ہے!

تیسرا منظر

نواب بلند بخت کا محل۔ کمرہ قریب قریب ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے منظر میں..... پردہ اُٹھنے پر خواجہ قباد دوڑا ہوا آتا ہے۔

خواجہ قباد: بیگم، بیگم — چلیے، چلیے —

ثالث زمانی: کیا ہے بی قباد؟

شرافت محل: کیا ہے بی قباد؟

کاؤس شاہ: اری کیا ہوا؟

خواجہ قباد: (گھبراتے ہوئے) بیگم دارو غنی سے پوچھیے — خیر صلا والی سے — آچا سے — بندی عرض کرتی ہے —
......ہائے! آگ لگے ایسی جوانی کو — مُوئی جوانی!

نواب بلند بخت: اری کچھ کہے گی بھی؟

ننھی بیگم: کیا ہوا جوانی کو — جو اسے کوسنے دیے جا رہی ہو؟

خواجہ قباد: امی بیگم، کیا بتاؤں — کاشفہ بی، دروازے میں کھڑی تھی — کہہ رہی تھی — اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ اب جب کہ کاشفہ مرنے کے قریب ہے تو آپ کیا کہیں گی — اجی، وہ کہہ رہی تھی۔ بی قباد مجھے تم سے عشق ہے۔

کاؤس شاہ: (ہنستے ہوئے) تبھی تو مرنے چلی ہے —

بلند بخت: خواجہ قباد سے محبت ہے ——— اڑ دا بیگنی کاشفہ کو؟

(ہنستے ہیں)

شرافت محل: کاشفہ سی پری کو دیوزاد قباد سے محبت ہے ——— یہ دیو پری کا قصہ ہے گویا۔

(ہنستے ہیں)

کاؤس شاہ: اور درمیان میں آدم بُو ———!

ننھی بیگم: آدم! عموماً جسے مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیا جاتا ہے۔

ثالث زمانی: بیگم! مکھی نہیں ———

خواجہ سرا: (ہانپتے ہوئے) جی نہیں ——— اُسے محبت ہے۔ بے لوث محبت!

(سب ہنستے ہیں)

خواجہ قباد: ای تو حضور! ——— اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ ہمیں بچپن سے ایک دوسرے سے محبت ہے۔ ہم ازبکوں کے احاطے میں اکٹھے کھیلے، اکٹھے پلے اور پل کر جوان ہوئے۔ ابھی کاشفہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ میری ہو چکی تھی۔

(سب ہنستے ہیں)

شرافت محل: اب تم قبر میں جاؤ تو پھر شادی کر لینا۔

خواجہ قباد: ای بیگم صاحبہ ——— جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ کاشفہ کی ماں نے کہا تھا کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو تمھارے قباد کو دے دوں گی اور اگر ہوا لڑکا تو پیر غضنفر کے مجاوروں کے حوالے کر دوں گی ——— لیکن یہ طویل قصے ہیں ——— یہ باتیں پھر ہو جائیں گی ——— حضور! کاشفہ سے باتیں کرتے ہوئے نواب کو چک کا ذکر آیا ——— تو نہ جانے وہ کیا ہوا، غشی جو آتی ہے تو بس دھم سے نیچے گرتی ہیں۔

بلند بخت: اوہو! تو شاہی طبیب کو کیوں نہیں بُلایا؟

خواجہ قباد: عرض بندی کی یہ ہے کہ حکم نہ تھا سرکار کا۔

کاؤس شاہ: جاؤ، کاشفہ کو یہاں لے آؤ۔

خواجہ قباد: خدا آپ کا اقبال بلند کرے (جاتا ہے)

کاؤس شاہ: یہ بات کیا ہوئی آخر؟
ننھی بیگم: آنکھوں سے دیکھے انسان تو صاف پتہ چلتا ہے۔
ثالث زمانی: میری طرف کیوں دیکھتی ہو بہن ——— اس سے تو صاف کہہ دو تو اچھا ہے۔
شرافت محل: کہہ دو ننھی بہن ———!
ننھی بیگم: بات یہ ہے کہ کوچک میاں کو اڑدابیگنی ——— کاشفہ سے محبت ہے!
ثالث زمانی: دیکھو اُلٹی بات تو نہ کرو۔ چاند پر مت تھوکو بیگم، کہے دیتی ہوں۔ کاشفہ کو اس سے محبت کہ کوچک میاں کو کاشفہ سے ———
کاؤس شاہ: ہیں؟
بلند بخت: ہیں! ایک اڑدابیگنی کو اتنی جرأت کہ کوچک میاں سے آنکھیں لڑاوے۔
شرافت محل: چھنال!
ننھی بیگم: مال زادی ——— اور کٹنیوں کے ذریعے نامہ و پیام ہوتے ہیں۔ کاشفہ کی بوڑھی ڈھڈو ماں کی پانچوں گھی میں ہیں ——— ای بڑی فضیحتا ہے وہ دلالہ۔
کاؤس شاہ: (بلند آواز سے) بیگم! چراغ تلے اندھیرا رہا۔ اور تم نے بات تک نہیں کی۔
ننھی بیگم: ای گویا آپ میری باتیں سنتی ہیں!

(کوچک سلطان قباد کی طرح ہانپتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

کوچک سلطان: کاؤس بھائی، کاؤس بھائی میں آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں ——— گردن زدنی ٹھہرائیں یا کچھ اور ——— میں اس کی تمہید نہیں باندھنی چاہتا۔ ——— مجھے کاشفہ، اڑدابیگنی سے محبت ہے ———
ننھی بیگم: یہ رہا تمھارا چاند ——— ثالث زمانی بیگم!
کاؤس شاہ: تمھیں کاشفہ سے محبت ہے؟
شرافت محل: کاشفہ سے؟
بلند بخت: کیا کہہ رہے ہو کوچک میاں؟
کوچک سلطان: (گھبراتے ہوئے) میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ للہ اُسے

بچائیے ــــ وہ تو لکھنے کے قریب بے ہوش پڑی ہے ــــ اللہ۔

(خواجہ قباد کاظمہ کو اُٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے)

خواجہ قباد: یہ ہے ــــ کاظمہ ــــ ای حضور، اسے کسی طرح ہوش میں لائیے۔ ہائے میں لٹ گئی!

(سر پر دو ہتڑ مارتا ہے)

نواب شرافت محل: داروغنی۔

داروغنی: جی سرکار۔

نواب شرافت محل: جا تو ذرا ــــ اُس طاق پر سے وہ مراد آبادی ڈبّہ لے آ۔ اس میں لخلخہ ہے ــــ بہن ثالث زمانی تُو خود جا ــــ داروغنی کی بینائی کمزور ہے ذرا۔

(ثالث زمانی جاتی ہیں)

کاؤس شاہ: اس کے ہاتھ باہر کو مڑے ہوئے ہیں۔

بلند بخت: دانت بھینچے ہوئے ہیں۔

شرافت محل: آئے ہائے ــــ کتنی گلفام تھی۔ اب منہ پر سیروں ہلدی بکھر رہی ہے۔

ننھی بیگم: اس کی ماں کو اطلاع کرو ــــ پھول ایسی بیٹی ہاتھوں سے جا رہی ہے۔

کاؤس شاہ: ہاں ہاں داروغنی جاؤ ــــ دیکھتی کیا ہو

داروغنی: جاتی ہوں سرکار ــــ

خواجہ قباد: آئے ہائے ــــ میری عمر بھر کی کمائی ــــ

کوچک سلطان: جلدی کرو۔

(ثالث زمانی واپس آتی ہیں)

ثالث زمانی: یہ لیجیے لخلخہ ــــ اور بید مُشک ــــ اور نہ جانے کیا کیا ہے اِس میں ــــ؟

شرافت محل: رُوئی کا ایک پھاہا چاہیے۔

کوچک سلطان: اس وقت رُوئی کہاں سے ملے گی۔ اس لحاف میں شگاف کر لیجیے۔

ننھی بیگم: کوچک بھائی ــــ دیکھنا، میرا ایرانی لحاف!

کوچک سلطان: آپا مجھ سے دوگنی قیمت وصول کر لینا۔ کاشفہ بچ جائے کسی طرح۔

ننھی بیگم: قیمت کی کوئی بات نہیں۔ ایران سے لحاف روز روز تھوڑے آتے ہیں۔

کوچک سلطان: آپا! تمھیں لحاف کی پڑی ہے۔

ننھی بیگم: اوہو! میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ اب کوچک میاں کی وجہ سے اڑدا بیگنی ایک بیگم کا رتبہ رکھتی ہے ——

کوچک سلطان: تم عورتوں کو اپنی جنس کے لیے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہوتی۔ آپا، معاف کیجیے گا اگر آپ کو یہ الفاظ ناگوار گزریں تو۔

ننھی بیگم: کہہ دو — کہہ دو — ناگوار گزرتے ہیں تو تمھیں اس سے کیا، آخر اپنی جنس کے لیے ہمدردی تم ایسوں کو جو سونپ رکھی ہے۔

کوچک سلطان: للہ اِن طعنوں کے لیے کوئی اور موقع اُٹھا رکھنا۔ تم بھی کنوئیں میں پڑے ہوئے عاجز پر نکیلا پتھر پھینکنے آنکلیں ——

بلند بخت: خاموش ——! کاشفہ کو ہوش میں آنے دو۔ ہوا چھوڑ دو — ہوا چھوڑ دو —

(کاشفہ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

اڑدا بیگنی: ہائے —— ہائے —— میں کہاں ہوں؟ قباد —— میرے قباد۔

(اِدھر اُدھر دیکھ کر) بی قباد —!

شرافت محل: ہات سیدھے ہوگئے ہیں۔

ثالث زمانی: دیکھو، قباد کو یاد کرتی ہے یہ —— بی قباد ٹھیک کہتی تھی —

قباد: جل تُو جلال تُو ——

کوچک سلطان: الحمدللہ!

ننھی بیگم: منھ کا رنگ آرہا ہے۔

اڑدا بیگنی: چھوڑ دیجیے — چھوڑ دیجیے —

(داروغنی داخل ہوتی ہے)

داروغنی: حضور شاہی طبیب آئے ہیں —— پردے میں ہو جائیں۔

کاؤس شاہ: تم سب پردے میں ہو جاؤ ـــــ اور ہاں، داروغنی بابا طاہر کو فوراً اندر آنے دو۔

(داروغنی بابا طاہر کو لاتی ہے)

شاہی طبیب: حضورِ پُرنور، رعایا آداب و تسلیمات عرض کرتی ہے۔

مرزا کوچک: چھوڑو اِن آداب و رُسوم کو بابا طاہر ـــــ اس عورت کی جان بچاؤ۔

شاہی طبیب: کِس کی طبیعت خراب ہے؟

مرزا کوچک: محل کی اڑدا بیگنی کی ـــــ

شاہی طبیب: ان کی نبض پر دھاگا لپیٹ کر ایک سرا مجھے دے دیجیے گا۔

کاؤس شاہ: یہ لیجیے ـــــ

(ایک حقیر سا وقفہ جس کے دوران میں کاشفہ کراہتی ہے)

شاہی طبیب: پہلے انھیں کیا شکایت ہوئی تھی؟

خواجہ سرا: یُوں ہی کھڑی کھڑی ایک دم نیچے آ رہیں جناب، اور ہاتھ پانو اندر کو مُڑ گئے، نسیں تن گئیں۔ دانت بھینچ گئے اور منھ پر سیروں ہلدی بکھر گئی۔

شاہی طبیب: ہاں (ایک وقفہ) اب ان سے پوچھیے کیسے محسوس ہوتا ہے؟

خواجہ سرا: کہہ رہی ہیں کہ دشمنوں کا جسم پھٹا جاتا ہے؟

شاہی طبیب: کچھ اور تکلیف ہے؟

خواجہ سرا: کہہ رہی ہیں کہ دشمنوں کے ہات پانو سُوجے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ـــ سب کچھ پُھولا سا دکھائی دیتا ہے ـــ اور اعضا تھکے ہوئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بازو کے دو ہو جائیں ـــ ایک منھ کے دو منھ ـــ اور نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔

شاہی طبیب: اِن سے پوچھیے گا کہیں متلی تو نہیں محسوس ہوتی۔

خواجہ سرا: اے ہے متلی کا ہے کو محسوس ہونے لگی۔ کہہ رہی ہیں کہ نہیں۔

شاہی طبیب: (کچھ سوچ کر) میں کچھ تخلیہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں ـــ اِدھر ہی دروازے کے قریب تشریف لے آیئے۔

نواب بلند بخت: ارشاد ـــــ (اُٹھ کر شاہی طبیب کے ساتھ دروازے تک آتے ہیں)

شاہی طبیب: گستاخی معاف! انھیں کسی سے محبت تو نہیں ہے؟

نواب بلند بخت: آ......آ......نہیں تو......

شاہی طبیب: میرا مطلب ہے، محبت ایک حیاتیاتی سا جذبہ ہے۔ ایسا جذبہ جس کا لازمی نتیجہ افزائش نسل ہے ــــــ قدرت اپنی تخلیقی قوتوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس عورت کو آلۂ کار بنانا چاہتی ہے ــــــ آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں شاید ــــــ نہیں ــــــ بات یہ ہے کہ اس عورت کی فوراً شادی کر دیجیے ــــ

چوتھا منظر

وہی جو دوسرے منظر میں ہے۔ نواب ثالث زمانی ایک گاؤ تکیے پر بازو رکھے اپنا منہ چھپائے ہچکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں ــــ قریب کوچک سلطان بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ بڑھے ہوئے ہیں جیسے آپا جان کو رلانے کی کوشش کر رہے ہیں ــــ

نواب ثالث زمانی: میں نے تو سب اُمیدیں تمھیں پر لگا رکھی تھیں، کوچک میاں۔

کوچک سلطان: اور میں آپ کی کون سی اُمیدوں پر پورا نہیں اُترا؟ بنگلہ میں نے تمھارے کہنے پر فتح کیا (آہستہ آواز میں) تخت و تاج تمھارے قبضے میں رکھنے کے لیے میں نے خواجہ سراؤں اور پنج ہزاریوں سے سازش کی۔ تمھارے حقوق کو بچانے کے لیے میں نے تخت کے وارث کو گولکنڈہ کی طرف بھجوا دیا ہے۔ دکن ایک ایسی جنگلی دلدل ہے جس میں پھنس کر کوئی بھی نہیں نکل سکا ــــــ

نواب ثالث زمانی: یہ تو سب ٹھیک ہے، کوچک میاں۔ لیکن اتنا وقار، اتنی وجاہت حاصل کرنے کا یہ عبرت ناک انجام کہ تُو شاہی خاندان میں سے باہر جا کر ایک اڑدابیگنی سے محبت کرے ــــــ تم میری جگ ہنسائی کروا رہے ہو۔ اُس دن جب کہ تم پر کاشفہ سے محبت کا الزام لگ رہا تھا تو میں ننھی بیگم سے کہہ رہی تھی ــــ ننھی بیگم ــــ تم چاند پر تھوک رہی ہو..........

کوچک سلطان: (التجا آمیز لہجے میں) ـــ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں میں بالکل بے دست و

پا ہوں آپا۔ میں ہفت اقلیم کی بادشاہت حاصل کر سکتا ہوں، لیکن کاشفہ کی محبت کو نہیں چھوڑ سکتا...... میں خود نہیں جانتا، آپا، مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے جسم کا رُواں رُواں اس اتصال کا قائل ہے —— آپا ——

نواب ثالث زمانی: اور پھر سوچو تو سہی کاشفہ کو کسی زمانے میں قباد سے محبت تھی۔

کوچک سلطان: اِس قصرِ محبت کے ستون منہدم ہو چکے ہیں۔

ثالث زمانی: خواجہ قباد نے کاشفہ کے لیے جو قربانی کی ہے اس کا جواب وہ قربانی سے دینا چاہتی ہے۔

کوچک سلطان: مجھ سے یہ بات نہ کہو۔ آپا—— للہ مجھے اس خوشگوار دھوکے میں مبتلا رہنے دو۔ اس کبوتر کی مانند مجھے آنکھیں بند کرنے دو جو یہ کہتا ہے کہ مجھے بلی نہیں دیکھتی ——

ثالث زمانی: ہم کو رتی رتی خبر پہنچتی ہے۔ یہ نہ جانتا، ہم نے بھی مخبر چھوڑ رکھے ہیں۔ کاشفہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ خواجہ سرا قباد کو اور تمھیں بیک وقت محبت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی۔ خواجہ سرا قباد کی وہ صرف قربانی کی معترف ہے لیکن وہ کاشفہ کی محبت کے اہل نہیں —— تم اس کی محبت کے اہل ہو۔ لیکن خواجہ قباد کے ساتھ جو تم نے کیا ہے، وہ کاشفہ کے دل سے دھوئے نہیں دُھلے گا ——

کوچک مرزا: یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو آپا—— مجھے اس بات کا ثبوت دو۔ مجھ میں کوچک مرزا بیدار ہو رہا ہے۔ مجھے جلدی بتا دو وگرنہ میرے غصّے کی آگ میں یہ محل، یہ خواجہ سرا، یہ کاؤس شاہ و بلند بخت، یہ شرافت محل اور ننھی بیگم۔ یہ اژدا بیگنی، سب جل جائیں گے۔

ثالث زمانی: لو سنو —— جس دن تم قباد کو مارنے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو کاشفہ نے محبت کی پاسداری کی اور اپنی اوٹ دے کر اُسے بچا لیا اور جب اُس نے اِس مہربانی کا شکریہ ادا کیا تو اس نے نفرت سے کہا —— پیچھے ہٹ جاؤ، قباد، مجھے تم سے نفرت ہے۔

کوچک مرزا: گویا قباد کی جان بچا کر کاشفہ اس کی قربانی کا جواب قربانی سے دے چکی ہے۔

ثالث زمانی: ہر گز نہیں ــــــ وہ جانتی ہے کہ اگر قباد مرد ہوتا تو اس کے پیچھے نہ چُھپتا۔ وہ تمھاری شجاعت کی معترف ہوتے ہوئے، تم سے نفرت کرتی ہے کہ تم نے قباد میں مرد کو فنا کرتے ہوئے کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ بیماری کے دنوں میں قباد نے اس کی بہت خدمت کی لیکن اس نے قباد کی موتیوں کی مالا ٹھکرا کر تمھاری مونگے کی مالا پہن لی اور تم خوش ہوئے۔ لیکن جب تصفیہ کا موقع آیا تو اس نے تمھیں ہات دینے سے انکار کر دیا ــــ

کوچک مرزا: کیا عجب ہے وہ ابھی تک ڈرتی ہو۔ آپا ــ اچھی آپا۔ اس طلسم کو بنا رہنے دو ــــ میں اپنے سامری کو اور دیکھنا چاہتا ہوں ــــ میں اتنی حقیقت جاننا نہیں چاہتا۔

(محل میں شور سُنائی دیتا ہے اور داروغنی آتی ہے)

داروغنی: نواب صاحبہ ــــ نواب صاحبہ ــــ

نواب ثالث زمانی: کیا بات ہے داروغنی بی ــــ

داروغنی: محل میں نواب لامیہ سلطان۔ قمر النسا اور شرافت محل اور ان کی صاحبزادیوں کی ڈولیاں آ رہی ہیں اور راڑ دا بیگنی محلوں میں نہیں ہے ــــ

کوچک مرزا: (چلا کر) کا صفہ تنقیح کے لیے نہیں ہے؟

داروغنی: نہیں ہے۔

نواب ثالث زمانی: داروغنی ــــ کسی باریدارنی کو پکڑ لو اور اُسے کیانی اچکن اور انگرکھا پہنا دو ــــ

داروغنی: لیکن ــــ؟

نواب ثالث زمانی: لیکن کیا ــــ؟

داروغنی: اگر جان کی امان چاہوں تو عرض کروں ــــ

کوچک سلطان و نواب ثالث زمانی: کہو، جلدی کہو۔

داروغنی: یہ اچھا نہیں ہو رہا ــ نواب صاحبہ ــ میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے اور اس کی

بھی خواہ ہوں۔ اس خاندان ذی وجاہت کی خاطر میری دادی نے اپنی جان تک قربان کردی تھی اور میں بھی، اگر ضرورت پڑے تو جان تک دینے کے لیے تیار ہوں ——— بات یہ ہے کہ اس معاشقے کی بدولت محلوں کی بدنامی ہورہی ہے۔ شہر میں لوگ چہ میگوئیاں کررہے ہیں۔

نواب ثالث زمانی: (غصّے سے) تمھیں اس سے غرض؟ ——— ہماری آنکھیں نہیں کیا؟ مت منھ لگوایے ——— جاؤ کسی باریدارنی سے تنقیح کروالو۔

داروغنی: جاتی ہوں ——— (جاتی ہے)

نواب ثالث زمانی: (روتے ہوئے) تم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا کوچک میاں ——!

کوچک سلطان: کاشفہ چلی گئی —— کاشفہ نے خودکشی کرلی؟ —— یہ نہیں ہوسکتا —— یہ نہیں ہوسکتا —— میری کاشفہ ——

(نواب ننھی بیگم داخل ہوتی ہیں)

ننھی بیگم: تمھاری کاشفہ!

کوچک سلطان: آپا چلی جاؤ ——— رِستے زخموں پر زیادہ نمک نہ چھڑکو۔ میں کاشفہ کو سمندر کی تہ سے لاؤں گا، پہاڑوں کی چوٹیوں سے تلاش کرلوں گا ——

نواب ننھی بیگم خورد: سمندر کی تہوں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانے کی ضرورت نہیں —— اڑدابیگنی ——— وہ شہر میں ہی دیکھی گئی ہے —— خلجی سردار کے ہاں۔

کوچک سلطان: کون سا خلجی سردار؟

ننھی بیگم خورد: وہ سردار قولیش کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ باریدارنیوں نے اُسے وہاں دیکھا تھا۔

کوچک سلطان: کاشفہ وہاں کیسے پہنچ گئی ———؟

ننھی بیگم: پہنچ گئی ——— محل کی عزت و افتخار کو لات مار کر پہنچ گئی۔ ایسے میں محلوں کی دیواریں راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں ——— اُس نے سردار قولیش کو صرف ایک دو بار دیکھا اور معاً اُس کے دماغ نے فیصلہ کرلیا کہ اُس کے مقدر میں جو بچہ لکھا ہے، سردار قولیش اس کا باپ ہوگا۔

کوچک سلطان: آپا، آپا جان ـــــ یہ نہیں ہونے کا۔ جب تک مرزا کوچک سلطان زندہ ہے ـــــ
(بھاگا چاہتا ہے لیکن ثالث زمانی پکڑ لیتی ہیں۔)

ثالث زمانی: دیکھا، اپنی محبت کا عبرت ناک انجام ـــــ ؟ رُک جاؤ۔ خلجی سردار تم سے کہیں طاقتور ہے کوچک میاں ـــــ رُک جاؤ۔

ننھی بیگم: وہاں مت جاؤ کوچک بھائی ـــــ مت جاؤ ـــــ اللہ ـــــ !

کوچک سلطان: مرد ـــــ ایک جواں مرد ایسی بات کی تاب نہیں لاسکتا۔ آپا جان ـــــ مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو ـــــ مر جاؤں گا، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا ـــــ ؟ مجھے جانے دو ـــــ جانے دو ـــــ

(بہت شور بپا ہوتا ہے اور مرزا کوچک بھاگ جاتے ہیں)

ثالث زمانی: آہ ـــــ ! ننھی بہن۔ تُو نے نہ بتایا ہوتا۔ تُو کوچک کو نہیں جانتی تھی کیا؟ نہیں جانتی تھی کیا؟ اب انھیں خبردار کردو جلدی سے وگرنہ ـــــ

ننھی بیگم: میں تو اس ارادے سے آئی تھی کہ کاشفہ کی بے وفائی کے متعلق سُن کر کوچک سُلطان اپنے ارادے کو ترک کردے اور محلوں کے متعلق جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔

ثالث زمانی: تم نے مجھ سے دشمنی کی ہے ـــــ ننھی بہن ـــــ ہائے کوچک ـــــ

ننھی بیگم: قباد ـــــ اری قباد بی ـــــ (قباد داخل ہوتا ہے)

قباد: بیگم! کیسا حکم ہے؟

ننھی بیگم: اری جا ـــــ بھاگ کر جا اور انھیں خبر کردے کہ مرزا کوچک سردار قویش سے لڑنے کے لیے تنہا بھاگ نکلے ہیں۔

ثالث زمانی: ہاں جا جلدی ذرا ـــــ اور سُن!

قباد: حکم سرکار!

ثالث زمانی: تو نہیں جانتی بی قباد ـــــ تیری کاشفہ اڑدابیگنی سردار قویش کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

قباد: اے ہی سرکار، میں نے بھی مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ رتی رتی کی خبر پہنچتی ہے مجھے۔

ثالث زمانی: اور تُو ابھی تک یہیں ہے —— قباد!

قباد: (مکمل خواجہ سرایانہ انداز میں) آئے ہائے بیگم —قربان جاؤں! اِتی بات کے پیچھے اب مر تھوڑے ہی جائے آدمی —— جینا بھی تو مقدم ہے!

(پردہ)

چانکیہ

افراد:

چندرگپت موریہ.......... بھارت سمراٹ

چانکیہ.................... مہامنتری

دُردھر..................... چندرگپت کی رانی

پروتک..................... ایک ساتھی راجا

انورادھا.................. وِش کنّیا

راج دوت، انگ رکھشکائیں، پنڈت اور دوسرے لوگ

وقت...................... موریہ خاندان کا عروج

پہلا منظر

رات کا پچھلا پہر۔ مہاراج چندرگپت رنواس میں سوئے پڑے ہیں۔ ان کی شیا پر دونوں طرف انگ رکھشکائیں کھڑی ہیں۔ ایک سندری ستار لے کر آتی ہے اور بہت مدھم سروں میں ساز چھیڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہیں دور سے آواز آرہی ہے——

جاگو، جاگو راج نریش

تم جاگو دنیا سوئے

مہاراج آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں اور پھر لیٹ جاتے ہیں۔ وہ ابھی اور سونا چاہتے ہیں۔ اُن کے پہلو میں پڑی ہوئی مہارانی دُردھر بھی آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ مہاراج جماہی لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر چاندنی میں نہاتے ہوئے شہر پاٹلی پُتر کی طرف دیکھتے ہیں——

چندرگپت: ابھی کتنی ہی رات باقی ہے۔ دُردھر — میری رانی اور پاٹلی پُتر — میری راجدھانی دونوں کیسے شانت مئی مدرا میں کھوئے پڑے ہیں اور اپنے سپنوں میں اور بھی سندر ہوگئے ہیں...... لیکن...... (فیصلہ کُن انداز میں) یہ راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سوئے۔

دُردھر: (جاگتے ہوئے) مہاراج!

چندرگپت: مہارانی، جگ گئیں؟

دُردھر: مہاراج! آپ کدھر جا رہے ہیں؟ (جماہی لیتی ہیں)

چندرگپت: (بیزاری سے) دن بھر کی محنت کے لیے (ہلکی سی ہنسی ہنس کر) سمراٹ چندرگپت کو لوگ جانے کتنا سکھی سمجھتے ہیں۔

دُردھر: ابھی بہت رات باقی ہے پر یہ —— پڑے رہیے چُپکے سے۔

چندرگپت: سنہری تیتر کارگار میں پھڑ پھڑانے لگے ہیں۔ تال کے کنارے سوئے ہوئے موروں نے بھی اپنی چونچیں پروں سے نکال لی ہیں —— اور تم مجھے پڑا رہنے کے لیے کہہ رہی ہو، دُردھر...... دُردھر! کتنا انجبت ہے تمھارا پریم! جیسے سوتے میں ششو اپنا ہاتھ جننی پر رکھ دیتا ہے اور اسے ذرا بھی ہلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح تم بھی اپنا ——

دُردھر: ہاں مہاراج! اس کو بھی میری طرح پریم کے چور کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس بات کے گیان کو من میں بسائے کہ پتا، پتر اور ماتا کے پریم میں بادھک ہے، وہ آشنکا کا ہاتھ اپنی ماں پر رکھ دیتا ہے۔

چندرگپت: (فتح مندی کے احساس سے) اوہ! دُردھر کی سی سندری کو بھی اپنی وجے میں سندیہہ ہے۔

ڈردھر: (سرد آہ بھرتے ہوئے) میری سندرتا وہ تھامنے والا ہات نہ ہوئی۔ آہ! اس بات کا آپ کی ڈردھر کو شوک ہے۔

چندرگپت: ڈردھرے! کہو، تم اپنے پریم کا چور کسے سمجھتی ہو؟

ڈردھر: یہ میں خود بھی نہیں جانتی پربھو۔ شاید جاننا بھی نہیں چاہتی۔ اس پنچھی کی نائیں کی جو گھاتک کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے...... میں اس بھرم میں خوش ہوں کہ آپ مجھے جی سے چاہتے ہیں۔

چندرگپت: شاید تمھارا اشارا انورادھا کی طرف ہے۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ میں نیتی میں پریم کو کچھ نہیں سمجھتا۔

ڈردھر: نیتی سمراٹ کے لیے ہے۔ منشیہ کے لیے نہیں اور منشیہ کے لیے پریم ہی سبھی کچھ ہے۔

چندرگپت: چندرگپت سمراٹ ہی تو ہے۔

ڈردھر: رنواس سے پرے —— سنگھاسن آپ سے بہت دُور ہے اور تاج دوار سے باہر ایک انگ رکھشکا تھامے کھڑی ہے۔ اس وقت شیا پر آپ کے چرن ہیں اور اُن پر ڈردھر کا سیس۔

چندرگپت: جس سمراٹ نے اپنے آپ کو بھاوناؤں میں کھویا، اس نے اپنے پانو پر آپ پرشا جلایا۔ ڈردھرے! مجھے ان سونے کی زنجیروں سے نکلنے دو۔

ڈردھر: (نراش ہو کر اور غصّے میں) چانکیہ کے بشش سے اور کسی کو کیا آشا ہو سکتی ہے؟ لیکن چانکیہ نے جیون بھر پریم نہیں کیا۔ نند سے بدلہ لینے کے لیے اس نے کرودھ سے نہ صرف اپنی چٹیا کھولے رکھی، بلکہ اس اگنی میں اپنے آپ کو بھسم کر ڈالا، اب وہ راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں —— جس طرح وش کنیا کے شریر میں وِش دھیرے دھیرے بس جاتی ہے، اس طرح کرودھ اور بدلے کی آگ اُس کی نس نس میں سلگ رہی ہے۔ وہ تکشک ناگ کی طرح کالا بھجنگ ہے۔ وش کنیا سمان وہ جسے بھی چھوئے گا، جلا ڈالے گا۔

چندرگپت: تم یہ سب باتیں اُسے بتا رہی ہو جس نے اس کے ساتھ برسوں تپسیا کی اور جس کی

سنگت سے چندر گپت نے پاٹلی پتر کا راج پراپت کیا —— چھوڑ دو مجھے، آج بیلوں کی دوڑ ہے اور میں اپنے مہا نندی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

دُردھر: چانکیہ نے منشیہ کی سروا اُچ اُوستھا سے گرا کر آپ کو صرف ایک سمراٹ بنا دیا۔ اِس کُٹل کٹھور براہمن کا ارتھ شاستر تمام کھُرّنا اور سند یہہ سے بھرا پڑا ہے۔ پریم سے نہیں۔ اُپرادھی کو چھما کر دینے میں جو آنند ہے، اُس کی پراپتی اس نے کبھی نہیں کی۔ پریم کے پرم آنند کا اُسے کوئی انوبھو نہیں۔ آپ نے تو جیون میں پریم رس چکھا ہے۔ آپ کے مُنھ کو ایسی باتیں شوبھا نہیں دیتیں۔

چندر گپت: چانکیہ کا درشن ایک مہان پنڈت کا تتو گیان ہے۔ جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے، اس طرح چانکیہ کا گیان بھی اٹل رہے گا۔ جن لوگوں کو میں نے چھما کر دینے کا (طنزاً) پرم آنند حاصل کرنے کے لیے چھوڑا، انھوں نے ہی میری جڑیں کاٹیں —— چانکیہ کے سدّھانت اپواد نہیں جانتے ——

دُردھر: (طنزاً) اپواد نہیں جانتے؟ —— جس سے آپ نے کرودھ وش چانکیہ کو راج دربار سے الگ کیا، تو اسے موت کی سزا کیوں نہ دی؟

چندر گپت: اس لیے کہ وہ براہمن ہے۔ چانکیہ کی مہانتا کا تم اس بات سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ راج دربار میں پھر سے مان پاتے ہوئے اس نے میری اس بھول کو جتا دیا تھا۔

دُردھر: میں اسے بُھول نہیں کہتی۔ اگر آپ نے اُسے مرتیو ڈنڈ دیا ہوتا تو پاٹلی پتر نواسی آپ کے وِردھ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ براہمن کا گھات کون سہن کر سکتا ہے اور اگر آپ چانکیہ کے سچے شِشش ہیں تو اَب بھی اُسے مار دینا چاہیے۔ نہ جانے وہ کب وشواس گھات کرے۔

(وقفہ)

''راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سوئے'' —— یہ بھی چانکیہ کے ارتھ شاستر میں لکھا ہوگا۔

چندر گپت: مجھے اس بات کے مان جانے میں کوئی لجا نہیں مہارانی —— چانکیہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔

مجھے گوادھیا کش کے پاس اپنے مہانندی کو دیکھنے جانے دو۔ آج وہ پروتک کے بیل کو ہرا دے گا۔۔۔ مجھے جانے دو، نیتی میں پریم بھاوایک کمزوری ہے۔

دُردھر: پریم، جس پر سوراج پاٹ کا بلیدان دیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ مہاراج! آپ بھی تو وچاریے۔ آخر آپ چانکیہ سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں؟ پاٹلی پُتر کے مانسرو ور ایسے تال، ان کے اندر ڈبکیاں لگانے والی مچھلیاں، ان کے کنارے ناچنے والے مور، ہاتھی دانت کے ستون، یہ دوڑنے والے بیل، ہاتھی، گینڈے، یہ وشال دیش کس کا ہے؟

چندر گپت: جس طرح یہ محل اور ان کے اونچے اونچے سنہری کلس کلا کاروں کے ہاتھوں سے بن کر سماپت ہوئے، لیکن ان کا سوامی چندر گپت ہے، اسی طرح نیم اور نیتی کے ستونوں کا رچیتا مہامنتری چانکیہ ہے، لیکن ان کو لاگو کرنے والا یا نہ کرنے والا میں ہوں۔ پریشد اور اٹھارہ اماتیہ بنائے ہوئے چانکیہ کے ہیں لیکن وہ وہاں میری اِچھا انوسار ہیں...... نوادھیا کش، گوادھیا کش، ہست، اسو، رتھ ادھیا کش سب سمراٹ چندر گپت کے اشارے پر ناچتے ہیں۔

دُردھر: یہ میں مانتی ہوں پاٹلی پتر کا تاج مہاراج چندر گپت کے سر پر ہے، چانکیہ کے سر پر نہیں، لیکن آپ بھوجن تک وہی کرتے ہیں جو چانکیہ نشچت کرتا ہے۔ وہی وستر پہنتے ہیں جنھیں پہننے کے لیے چانکیہ کہتا ہے۔۔۔۔ اسی استری سے پریم کرتے ہیں جس کے ساتھ پریم کرنے کی چانکیہ پریڑنا کرتا ہے۔۔۔۔ دوسرے شبدوں میں پریم کی بھیک مانگنے کے لیے مجھے اپنا آنچل مہاراج چندر گپت کے سامنے نہیں، چانکیہ کے سامنے پھیلانا چاہیے۔

(گلا رُندھ جاتا ہے)

نہیں نہیں میں اپنا آنچل اس کالے بھجنگ براہمن کے آگے کبھی نہ پھیلاؤں گی۔۔۔ میں پریم کے بندھن آپ کے پاؤں میں ڈال دوں گی۔ آنسوؤں کے ساگر آپ اور آپ کی نیتی کے درمیان بادھک بنا کر پھیلا دوں گی۔۔۔

چندر گپت: یوں پگلی نہ بنو، دُردھر!...... ارتھ شاستر نے مجھے آنسوؤں کے ساگر کو پاٹنا سکھا دیا ہے

......اچھا، میں چلتا ہوں......

(مہاراج دائیں طرف جاتے ہیں۔ وُردھر شیا پر اپنا منھ چھپائے سسکیاں لے رہی ہے، جب کہ پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا منظر

رنگ بھومی کا دشرانتی استھان۔ سامنے کا دروازہ رنگ بھومی میں کھلتا ہے جہاں گوادھیا کش رتھوں کی دوڑ کروا رہے ہیں۔ دروازے سے لوگوں کی آوازیں آتی ہیں جو کبھی مدھم اور کبھی اونچی ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی راج دوت کسی راجے یا راجکمار کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ شور میں رتھوں کے دوڑنے کی آواز بھی شامل ہے۔ ایکا ایکی لوگ یوں بول اُٹھتے ہیں جیسے کسی جیتتے ہوئے رتھبان کا جے جے کار کر رہے ہوں۔

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راج راجیشور، چکرورتی سمراٹ شریمان مہاراج چندر گپت اور مہارانی وُردھر رنگ بھومی میں پدھارتے ہیں۔

(شور)

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راج راجیشور شریمان مہاراج پرونتک اور کماری انورادھا۔

(زیادہ شور)

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راجکمار بندوسار، راجکمار ملیہ کیتو۔

(شور)

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: مہامنتری چانکیہ۔

(بہت زیادہ شور)

اس عرصے میں وشرانتی استھان میں انگ رکھشکائیں ڈری سہی کھڑی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک دوسری کو اشارا کر لیتی ہیں کچھ دیر بعد وہی شور پھر سنائی دیتا ہے اور رتھوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور بھی اونچی ہو جاتی ہے۔

ایک پل بعد چانکیہ وشرانتی استھان میں سامنے کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ دُبلے پتلے اور لمبے انسان ہیں۔ رنگ کالا، گال اندر کو پچکے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں شک اور تجسس کی جھلک ہے۔ ایک ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کو اضطراب کے عالم میں جنیو پر پھیرتے ہیں۔ پھر دونوں ہاتھوں سے سر پر کی لمبی چٹیا کو گانٹھ دیتے ہیں اور دروازے کی طرف جھانکتے ہیں۔ انگ رکھشکاؤں کے پران خشک نظر آتے ہیں............

تھوڑی دیر بعد مہاراج چندر گپت وشرانتی استھان کے سامنے دروازے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ابھی تک رنگ بھومی میں بیٹھی ہوئی دُردھر سے باتیں کر رہے ہیں......

چندر گپت: (طفلانہ انداز میں) دونوں دُھول میں غائب ہیں! — رتھ اور مہانندی! دُردھرے، کیا تمھیں نظر آ رہا ہے؟

چانکیہ: مہاراج! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

چندر گپت: کیا کوئی بہت ضروری بات ہے مہامنتری چانکیہ؟ اس سے میرا مہانندی، رنگ بھومی میں ہے — وہ دوڑ رہا ہے — وہ دیکھو دونوں دُھول میں غائب ہیں۔

چانکیہ: مہاراج مجھے سے کے انوسار کچھ پرارتھنا کرنی ہے۔ کچھ دیر کے لیے ادھر وشرانتی استھان میں آیئے — ہاں، مہاراج!

(مہاراج اندر آتے ہیں)

چندر گپت: آج موسم بھی تو کتنا خراب ہے مہامنتری! سوریہ اپنا سارا تیج پاٹلی پتر پر ہی ختم کر دے گا کیا؟

چانکیہ: یہ پرماتما کی دیا اور ورشا کا انومان ہے۔

چندرگپت: استھان کے کواڑ بند کرلو۔ انگ رکھشکا! خیال رکھنا کوئی اِدھر نہ آنے پائے ——

چانکیہ: اس کی دیکھ بھال میں نے پہلے ہی کرلی ہے، مہاراج! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے مہانندی کو آج وجے پراپت نہیں ہوگی۔

چندرگپت: مہانندی کو وجے پراپت نہیں ہوگی؟ — میرا مہانندی اوشیہ وجئی ہوگا! پروتک کا بیل پہلے ہی چکر میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ جیوتش ودّیا تم نے کب سیکھی؟

چانکیہ: یہ جیوتش نہیں مہاراج! میں یہ سب کچھ اُسی بدھی کے بل بوتے پر کہہ رہا ہوں جو میں نے اتنی تپسیا کے بعد پراپت کی ہے۔

چندرگپت: اگر مہانندی رنگ بھومی میں ہار بھی جائے تو کیا ہے۔ مجھے ایک اچھے کھلاڑی کی طرح پروتک کو بدھائی دینی چاہیے۔

چانکیہ: (زور سے) یہ اسنبھو ہے —— یہ نہیں ہوگا، پاٹلی پتر کے مہاراج کو لوگوں کے من کا ویر ہونا چاہیے۔ یہ اس کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے جیون کے لیے سانس لینا۔ دُنیا جیتنے والے کا ساتھ دیتی ہے۔ ہارنے والے کا نہیں۔

چندرگپت: مہامنتری، ہمیں رنگ بھومی کی وجے اور پاٹلی پتر کی وجے، دونوں کو گھال مال نہیں کرنا چاہیے۔

چانکیہ: مہاراج! پاٹلی پتر نواسیوں نے آپ کے آنے پر اتنا شور نہیں مچایا جتنا پروتک کے آنے پر۔ اس بات پر میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔

چندرگپت: (ہنس کر) لوگ استھر اور من موجی ہوتے ہیں۔

چانکیہ: (کرودھ سے) مہاراج! آپ نہیں جانتے کہ رنگ بھومی کی وجے، پاٹلی پتر کی وجہ سے کہیں زیادہ ضروری ہے...... میں اس وقت آپ کو بُری خبر سنانے آیا ہوں۔

چندرگپت: بُری خبر! —— میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ٹھہرو مجھے چبوترے سے ایک دفعہ مہانندی کو دیکھ لینے دو۔

(چندرگپت کے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی یک لخت شور سُنائی دیتا ہے)

جیسے انھوں نے کمرے کے بند کواڑ آناً فاناً کھول دیے ہوں ـــــ شور مدھم ہو جاتا ہے، گویا مہاراج واپس آتے ہیں)

چندرگپت: دوسرے چکّر میں بھی مہانندی آگے ہے اور پورتک کے رتھ کا نشان تک نہیں ملتا۔ ہاہاہا ـــــ!!!

چانکیہ: یہ پرسنتا اکارن ہے مہاراج! ابھی چھ چکّر باقی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ میرے کتھن کی ستیتا کو جان لیں گے...... میں دراصل آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مہاراج پرونک کے کانٹے کو ہمیں ہمیشہ کے لیے دُور کر دینا ہوگا۔

چندرگپت: (زمین پر پاؤں مار کر) کیا مطلب ہے تمھارا؟ سب کچھ ہوگا مہامنتری لیکن پرونک کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اس سے پہلے میں نے آنکھیں موند کر تمھاری سب باتیں مانی ہیں لیکن اب میں تمھارے ہاتھوں کٹ پتلی بننا نہیں چاہتا ـــــ میرے کچھ پرشنوں کا اُتر دو ـــــ یہ رنگ بھومی، یہ سنہری ستون اور اس کے کلس کس نے بنائے ہیں؟

چانکیہ: کلاکاروں نے۔

چندرگپت: لیکن اس کا سوامی کون ہے؟

چانکیہ: مہاراج چندرگپت۔

چندرگپت: اس نیَم اور نیتی کا رَچیتا کون ہے؟

چانکیہ: داس ـــــ منتری چانکیہ۔

چندرگپت: ان کا لاگو کرنے والا یا نہ کرنے والا کون ہے؟ پریشد، اماتیہ دیہوہارک، سمہرت کس کے اشارے پر چلتے ہیں؟

چانکیہ: نیتی کے لاگو کرنے والے آپ ہیں۔ سب دیہوہارک آپ کے اشارے پر چلتے ہیں۔ لیکن ان کے بیوہار کے ارتھ جانے بنا آپ ایک پگ بھی نہیں چل سکتے اور ان کے ارتھ جاننے کے لیے داس کو مہامنتری بنایا گیا ہے۔ میں یونہی کچھ بھاوناؤں کے آدھار، ایسے نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا مہاراج! ـــ یہ چانکیہ نیتی ہے۔ ارتھ شاستر نیتی، جس میں کوئی سنکلپ وِکلپ نہیں۔ دو راجے ایک راج میں نہیں سما سکتے اور (قطعیت

سے) جب تک چانکیہ یہاں نہیں سمائیں گے۔

چندرگپت: (بلند آواز میں) چانکیہ! میں جانتا ہوں کہ تم راج دربار کے مان کی تجھ برابر پروا نہیں کرتے۔ تم جانتے ہو کہ میں براہمن ہتیا کا پاپ مول لینا نہیں چاہتا۔ لیکن تم بھول میں ہو چانکیہ ——

چانکیہ: میں آپ کی بھاوناؤں کو سمجھتا ہوں ورشل! لیکن مجھے اپنے جیون کی پروا نہیں، میرا آدرش ایک بڑا راجیہ قائم کرنا تھا سو میں نے اپنے آدرش کو پورا کرلیا ہے۔ مجھے صرف افسوس ہوگا کہ یہ راجیہ نادان ہاتھوں میں جا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور بس — جب تک چانکیہ پاٹلی پتر میں موجود ہے، وہ پروتک کو یہاں نہیں رہنے دے گا —— (بلند آواز میں) نہیں رہنے دے گا!

چندرگپت: (کچھ ڈھل کر) تمھیں اچھی طرح سے گیان ہے مہامنتری کہ یونانیوں کے ٹڈی دل اور اس کے بڑے سیناپتی سیلوکس کو پروتک کی مدد سے کھشٹے کیا۔ تم جانتے ہو کہ نند کو پروتک کی وجہ سے شکست ہوئی۔ دوسرے رجواڑوں کو پروتک کے ساتھ مل کر ہرایا۔ کیا تم پروتک کو میرے ہاتھوں مروا کر مجھے وشواس گھاتک بھی بنانا چاہتے ہو؟ کیا تمھاری یہ اِچھا ہے کہ میں اس منشیہ کے لہو سے ہاتھ رنگوں جس کی وجہ سے میں اس سنگھاسن پر براجمان ہوا۔

چانکیہ: جو ہاتھ آپ کے سر پر تاج رکھ سکتے ہیں، وہ اُتار بھی سکتے ہیں۔ اگر مہاراج پروتک ایسا کرنے سے چُوک بھی گئے تو اُن سے بڑھ کر مورکھ نہ ہوگا۔ انھوں نے ایسا نہ کیا تو اُن کا پُتر لیہ کیتو اپنے پتا کے ادھورے کام کو پورا کرنے میں تن من لڑا دے گا۔ وہ اسے اوشیہ کرے گا —— اوشیہ! پرنتو وہ ابھی چھوٹا ہے۔ ہمارے راجکمار بندوسار سے بھی چھوٹا۔

چندرگپت: (شاہانہ ضد اور غصّے سے) مہامنتری چانکیہ! اس سنسار میں سب کچھ سنبھو ہے لیکن پروتک کی موت ان ہاتھوں سے سنبھو نہیں۔ اس سے میں ایسے ہی پریم کرتا ہوں جیسے اپنے بندوسار سے۔ پروتک میرے ہی شریر کا ایک انگ ہے۔

چانکیہ: جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ آپ کی مرگ نینی انورادھا سے پریم کرتا ہے، رنگ بھومی میں انورادھا پروتک کی اِچھا انوساراس کے دائیں طرف بیٹھی ہے۔ میں شوک سے کہتا ہوں کہ میرے شش مہاراج چندر گپت ابھی تک بھاوناؤں کے سنسار میں براج رہے ہیں۔

چندر گپت: ٹھہرو، مجھے ایک نظر مہانندی اور رنگ بھومی پر ڈال لینے دو۔

(پھر یک لخت شور بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ کمرے کے کواڑ ایکا ایکی کھول دیے گئے ہیں۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد مہاراج کواڑ بند کر دیتے ہیں)

چندر گپت: انورادھا!—!—انورادھا پروتک کے ساتھ بیٹھی ہے! لیکن مہامنتری چانکیہ، مجھے اس بات کی کلپنا سے بھی بھے آتا ہے کہ میں ان ہاتھوں سے یہ اپرادھ کروں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ پروتک کا خون ان ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ اس کے چنتن ہی سے میرے شریر میں ایک کنپن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مہاپاپ ہے——یہ گھور اپرادھ ہے۔

چانکیہ: اس پاپ اور پنیہ کا پھل مجھے لینے دیجیے——مجھے، جو اس پاپ اور پنیہ سے اوپر ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے مہاراج کی طرح ارجن نے بھی اپنا گانڈیو دھرتی پر ڈال دیا تھا، اس لیے کہ اسے رن بھومی میں اپنے ہی بھائی بندھو، باپ دادا نظر آتے تھے۔ لیکن بھگوان کرشن نے گیتا اپدیش سے اُسے پاپ پنیہ کی اوستھا سے اوپر اُٹھا دیا۔ آج پھر گانڈیو کو دھرتی پر ڈال دیا گیا ہے جس کے لیے میں گیتا نہیں، ارتھ شاستر مہاراج کے سمکھ رکھتا ہوں۔

چندر گپت: پروتک جو کچھ ہے، اپنی سینا کی وجہ سے ہے۔ کیوں نہیں اس کی سینا کو اپنی عقل کے چکرویوہ میں ڈال دیتے؟ اُس کے سرداروں کو سندر بالاؤں کی بھجاؤں میں دے کر ان کا باہوبل کیوں نہیں توڑ دیتے؟ اس کے بعد پروتک کا باقی رہ ہی کیا جاتا ہے؟—
(کانپتے ہوئے) نہیں نہیں، میں پروتک کو مارنے کی کلپنا نہیں کر سکتا۔

چانکیہ: مہاراج! ایک بڑے اُدیش کے سامنے پروتک کوئی مولیہ نہیں رکھتا۔ وہ کیول شطرنج کی ایک گوٹ ہے۔ آپ کو اُنتی کی سیڑھی پر چڑھنا ہے، اس کے لیے ایک پروتک تو کیا

اگر آپ کو سہنسروں پروتک بھی مارنے پڑیں، تو بھی آپ کو سنکوچ نہیں کرنا چاہیے!

چندرگپت: (غور کرتے ہوئے) سہنسروں پُروتک!——اس کے لیے جو ایک پروتک کو مارنے سے بھی گھبراتا ہے۔

چانکیہ: آپ نہیں سمجھتے مہاراج! جب آپ کو چھت پر جانا ہوتا ہے تو آپ کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ آپ کے پانو تلے جو سیڑھی ہے، وہ دیودار کی ہے یا آبنوس کی۔ سمراٹ کو سروسریشٹ ہوتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے پانو تلے کھوپڑیاں ہیں یا اینٹ اور پتھر ——!! (نسبتاً بلند اور مصمّم آواز میں) اور سمراٹ چندرگپت کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ دوسری سیڑھی ہمیشہ پہلی سیڑھی سے اونچی ہوتی ہے......۔

(راج دُوت بھاگا ہوا آتا ہے)

راج دُوت: مہاراج!——مہاراج!!

چندرگپت: (گھبرا کر) کہو دُوت کیا ہوا۔ کیا خبر لائے ہو؟

راج دُوت: (گھبرا کر) مہاراج! پانچویں چکّر میں مہانندی پیچھے رہ گیا۔

چندرگپت: مہانندی پیچھے رہ گیا؟——مہامنتری چانکیہ——

راج دُوت: ہاں مہاراج! چھٹے چکّر میں اُس کے منھ سے خون کے ڈکلے آنے لگے اور جب وہ چھٹا چکّر سمپورن کر رہا تھا——

چندرگپت: چھٹا چکّر سمپورن کر رہا تھا تو——؟

راج دُوت: مہانندی گرا اور گرتے ہی اُس نے پران دے دیے——

چندرگپت: پران دے دیے——مہانندی مر گیا؟——راج دُوت!!

راج دُوت: اور اب وہ رنگ بھومی کی دائیں طرف ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح سرد اور سخت پڑا ہے۔

چانکیہ: اور یہ چندرگپت پروتک پریم کی دوسری بلی ہے۔ مہانندی کو کوار گھاس کھلائی گئی جس سے اس کی انتڑیاں کٹ کٹ کر باہر آئیں اور اس نے پران تیاگ دیے۔

چندر گپت: مہامنتری چانکیہ! کیا یہ تمھیں سب کچھ پہلے معلوم تھا؟ ہمارے پریم میں یہ دوسری بلی کیسے ہوئی؟ ـــــــ

چانکیہ: پہلی بلی مرگ نینی انورادھا ہے۔

چندر گپت: اوہ چانکیہ! آج سے پہلے میں اپنے آپ کو ایک سمراٹ سمجھتا تھا، لیکن مجھے انوبھو ہوتا ہے کہ میں ایک انسان بھی ہوں۔

چانکیہ: اور اسی میں سمراٹ کی ہار ہے۔

چندر گپت: اِس سے مجھے اپنی ہار کا آبھاس دینا اچھا نہیں چانکیہ۔ میرا سب سے زیادہ پیارا مہانندی رنگ بھومی میں مرا پڑا ہے۔ دُوت کے کہنے کے مطابق ''ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح سرد اور سخت!!!'' اور پھر انورادھا ـــــ؟ (کچھ سوچ کر) چانکیہ! پُروتک بیچارہ نردوش ہے۔ اگر وہ انورادھا کی سی سُندری کو چاہنے لگا ہے تو یہ ایک سوبھاوک بات ہے۔ لیکن انورادھا ـــــــ تم انورادھا کو ٹھکانے کیوں نہیں لگا دیتے، اُسے کیوں نہیں دیتے؟ (لہجہ بدل کر) اس وقت سمراٹ چندر گپت بول رہا ہے چانکیہ ـــــ!

چانکیہ: (دیوانہ وار ہنستا ہے) پُروتک کو مرنا ہوگا ـــــــ اور ساتھ ہی انورادھا کو بھی ـــــــ سمراٹ چندر گپت! ہاہاہا ـــــــ!!!

چندر گپت: مجھے بہت زیادہ نہ ڈراؤ چانکیہ! تم جو جی چاہے کرو، لیکن میرے ہاتھوں کو پروتک کے خون سے بچاؤ۔ میں تمھاری منت کرتا ہوں۔

چانکیہ: آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں مہاراج! میں عرصے سے انورادھا کو بس پر پال رہا ہوں اور پروتک اُسے چاہتا ہے ـــــــ

چندر گپت: (سخت حیران ہو کر) تم نے یہ کب سے شروع کیا ہے؟

چانکیہ: جب سے آپ پاٹلی پتر کے تخت پر مہاراج پروتک کی مدد سے بیٹھے ہیں......

چندر گپت: (بلند آواز میں) چانکیہ!

چانکیہ: ہاں مہاراج!! انورادھا کی پُروتک سے شادی ہوگی۔ اِس وقت آپ مہانندی کو مرگھٹ

میں لے جانے کے لیے اُٹھیے ——

(چندر گپت غم اور فکر میں بسے ہوے سامنے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں۔ پیچھے چانکیہ کے نپے تلے مستحکم قدم بڑھتے ہیں، ہلکی ہلکی دردناک ٹیون کے ساتھ پردہ گر جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

انورادھا کا گھر —— اس کے یودن کا مادھوی کنج!

شنگار کی چیزوں کے ساتھ ہی پلنگ پڑا ہے جس کے کنارے ایک جڑاؤ تھال میں دھوپ اور ملیان جل رہے ہیں۔ ملیان کی لو اور انورادھا ایک دوسرے کے متوازی کھڑے ہیں۔ جیسے جیسے انورادھا ہلتی ہے، ملیان کی لو بھی ہل جاتی ہے۔ انورادھا انیس بیس کی ایک بے چین یُوتی ہے۔ اس کی جوانی سرما کی ٹھنڈی آگ کی طرح ہے —— کوئی دُور ہٹے تو جم جائے، قریب آئے تو جل جائے۔ اس وقت انورادھا نے اپنے لمبے لمبے کیش کندھے پر رکھے ہیں۔ یوں معلوم ہوتی ہے جیسے صندل کے پیڑ پر شہد کا چھتہ ہے......

دروازہ تھپتھپایا جاتا ہے جس کے ایک پل بعد ایک انگ رکھشکا اندر آتی ہے۔

انگ رکھشکا: کماری انورادھا!

انورادھا: کون ہے؟ —— دیویانی تم ہو —— کہو کیا ہے؟

انگ رکھشکا: مہارانی دُردھر پدھارتی ہیں —— انھیں آپ سے ملنے کی اِچھا ہے۔

انورادھا: کون؟ —— مہارانی دُردھر؟...... میرے سوبھاگیہ، میں آتی ہوں ——

(سب کام چھوڑ چھاڑ دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور بڑی عزّت سے مہارانی کو اندر لا کر بٹھا دیتی ہے۔ انگ رکھشکا باہر چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دُور سے ہَون یگیہ اور منتروں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں)

انورادھا: مہارانی! داسی پرنام کرتی ہے۔

دُردھر: انورادھا! میں تمھارے درشن کرنے آئی ہوں۔

انورادھا: (حیرانی سے) میرے درشن؟ ——— (ہنستی ہے) مہارانی، میں بڑی بھاگیہ شالی ہوں۔

دُردھر: میں تم سے اریشا کرتی ہوں انورادھا! یہ جان کر شاید تم بہت حیران ہوگی۔

انورادھا: اریشا؟ مہاسمراٹ چندرگپت کی پتنی ایک تچھ جیو انورادھا سے اریشا کرتی ہے۔ آپ مجھے بنا رہی ہیں مہارانی!

دُردھر: یہ میرا دُربھاگیہ ہے کہ تم یوں سمجھتی ہو۔ میں خوش ہوں کماری انورادھا کہ تم ایک سمراٹ سے نہیں بیاہی جا رہی ہیں، ایک منشیہ سے بیاہی جا رہی ہو—— پردتک سے جو تمھیں دل سے پریم کرتا ہے۔ تم اُس سے شادی پر خوش ہو نا؟

انورادھا: میں بھلا خوش کیوں نہ ہوگی، مہارانی!

دُردھر: میرے من میں پردتک کی بہت عزّت ہے۔ وہ پریم کرنا جانتا ہے، لیکن وہ نہیں جانتا اِن چند گھڑیوں میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے............

انورادھا: (گھبراتی ہے اور اس کے سر کے بال بکھر جاتے ہیں) یہ آپ نے کیا کہا مہارانی جی! ——اِن چند گھڑیوں میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

دُردھر: میں تم پر ستیہ کا بھید کھولنے آئی ہوں، انورادھا! تم سہاگ کی رات دیکھنے نہ پاؤ گی!

انورادھا: مہارانی جی!

دُردھر: ہاں انورادھا! میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں پردتک کو ایک مہان آتما سمجھتی ہوں اور میں نہیں چاہتی تمھارے ساتھ چھو کر وہ مرتیو کو پراپت ہو جائیں۔

انورادھا: میرے ساتھ چھو کر مرتیو کو پراپت ہو جائیں گے؟...... یہ کیوں ہو جائے گا مہارانی جی؟ کیا میں ایسی دُربھاگنی ہوں کہ میرے انگ سے انگ ملا کر مہاراج —— میں مہاراج پردتک سے پریم کرتی ہوں اور آپ پریم کو سرداوچ بھاونا سمجھتی ہیں، اس پریم کی سوگند دیتی ہوں، مجھے سب کچھ سنائیے، اس بات کا کوئی اُپائے بتا دیجیے۔

دُردھر: بھولی یُوتی—— تم نہیں جانتیں کہ برسوں سے تمھیں کھانے کے ساتھ زہر دیا جاتا

رہا ہے اوراب وہ زہر تمھاری نس نس میں ویاپت ہو چکا ہے۔ تمھارے انگ سے انگ
ملاتے ہی مہاراج پروتک مرتیو کو پراپت ہو جائیں گے۔ اُپائے یہ ہے کہ تو بیاہ سے یہ
بات ان کے کانوں تک پہنچا دے تاکہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔ پروتک ابودھ ہیں،
اُنھیں اس بات سے سچیت کر دینا چاہیے۔

انورادھا: (رو کر) اوہ! یہ کس نے کیا؟ —— کیا مجھے اب تک زہر پر پالا گیا؟ مجھے وشواس ہے
یہ سب کچھ مہاراج چندر گپت نے نہیں کیا؟

دُردھر: اس زہر کو تمھارے شریر میں ویاپت کرنے والا وہی تکشک ہے، جسے لوگ مہامنتری
چانکیہ کہتے ہیں۔

انورادھا: (سوچ کر —— اور غصّے میں) تبھی میرا دل اور دماغ ایک نہ بُجھنے والی اگنی میں جلا کرتے
تھے۔ تبھی میری آنکھوں سے ہر سمے ایک جوالا سی نکلا کرتی تھی ——

دُردھر: ہم سب مہامنتری چانکیہ کے ہاتھوں میں کھیلنے والی کٹ پتلیاں ہیں۔ کون کہہ سکتا
ہے، مہانندی کو پروتک نے مارا ہے......

انورادھا: مہاراج پروتک ابودھ ہیں مہارانی! اُن کے ہاتھوں سے کوئی ایسی بات سنبھو نہیں......
لیکن مہارانی جی! میں اپنے پریمی کو نہیں مرنے دوں گی۔ میں ہَون کنڈ کے پاس پہنچتے
ہی مہاراج پروتک کو سب کچھ بتا دوں گی...... میں انھیں مہامنتری چانکیہ کے پھیلائے
ہوئے جال میں نہیں پھنسنے دوں گی ——

دُردھر: میں اسی بات کا گیان پیدا کرنے کے لیے تمھارے پاس آئی ہوں۔

انورادھا: لیکن مہارانی......!

دُردھر: لیکن کیا؟

انورادھا: میں مہاراج پروتک کو بچا دوں گی —— لیکن مہارانی، میرا کیا ہوگا، میں جیون میں
کوئی سُکھ نہ دیکھ پاؤں گی، میری کوئی اُمنگ پوری نہ ہوگی۔ ابھی میرا من پریم پرلاپ
کر رہا تھا —— اور ابھی......

(ایک ہلکی سی تھپتھپاہٹ کے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ راج دُوت اندر آتا

ہے۔ ساتھ ہی منتروں اور ہون یگیہ کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔)

راج دُوت: کماری انورادھا! ـــــــ یہ ہار مہامنتری چانکیہ نے بھیجا ہے۔

دُردھر: مہامنتری نے جے مال بھیجی ہے۔

انورادھا: (روتے ہوئے) مہامنتری نے وئید ھویہ کا سندیش بھیجا ہے۔ پہلی رات ہی دُر بھاگ کی رات ہو گی (جے مال لے لیتی ہے) لیکن مجھ سے کوئی میرا سہاگ نہیں چھین سکے گا ــــــ کوئی نہیں چھین سکے گا۔ مہارانی میں آپ کے پانو پڑتی ہوں۔ آپ نے اتنا بڑا اُپکار کیا ہے کہ میں اسے جنم جنم نہیں بھول سکوں گی۔

(انگ رکھشکا آتی ہے)

انگ رکھشکا: مہارانی جی! ــــــ مہاراج آپ کو اور کماری انورادھا کو یاد کر رہے ہیں، کماری جی کنڈ کے قریب پہنچے............

دُردھر: چلو انورادھا! بھگوان تمھیں بَل دیں۔ کماری انورادھا اور مہارانی دُردھر دروازے کی طرف بڑھتی ہیں۔

(پردہ گرنے سے پہلے منتروں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔)

چوتھا منظر

منڈپ

منڈپ کے دائیں طرف لوگ بیٹھے ہیں۔ شاید ان میں ملیہ کیتو اور بندوسار بھی ہیں۔ بائیں طرف منڈپ سے ذرا پرے مہاراج چندر گپت اور مہامنتری چانکیہ ایک تخت پوش پر براجمان ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر مہارانی دُردھر، مہاراج چندر گپت کے پہلو میں آ بیٹھتی ہیں۔

درمیان میں ہون کُنڈ کے دو طرف براہمن گھرت اور سامگری کُنڈ میں پھینک رہے ہیں۔ ایک طرف مہاراج پروتک شادی کا سیندوری جوڑا پہنے بیٹھے ہیں۔

آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے اُن کا چہرہ بھی سیندوری ہو رہا ہے...... کچھ دیر بعد کماری انورادھا، جے مال لیے آہستہ آہستہ آتی ہے۔

منڈپ کے چاروں طرف زبردست پہرہ ہے۔

چندر گپت: (انورادھا کو دیکھ کر) چانکیہ!

چانکیہ: مہاراج!

چندر گپت: انورادھا —— کیسے شرد رِتو کے بادل کی طرح آہستہ آہستہ چلی آرہی ہے...... وہ کتنی سُندر دکھائی دیتی ہے، کتنی سُندر اور پروتک......

چانکیہ: (استہزا سے) دو پریمی مل رہے ہیں (ہنستے ہیں)

(پھر منتروں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں)

انورادھا: (آہستہ آواز میں) مہاراج!

پروتک: انورادھے!

انورادھا: مہاراج! مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے جو شاید آپ کو آج تک نہیں معلوم۔

پروتک: کہو پریہ۔

انورادھا: (رُندھے ہوئے گلے سے) میں یہ سہن نہیں کر سکتی۔ پرماتما میرے سُہاگ کو امر رکھے مہاراج! مجھے برسوں سے بِس پر پالا جا رہا ہے —— میں وِش کنیا ہوں، آپ میرے شریر کو چھو کر............

پروتک: (ہنستے ہوئے) ...... باولی!...... انورادھے! کیا تم سمجھتی ہو کہ پروتک ان باتوں کو نہیں جانتا؟

انورادھا: مہاراج —— آپ ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی؟...... مہاراج، مہامنتری چانکیہ آپ کو اپنے راج پاٹ کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

پروتک: (پھر ہنستا ہے) اور پروتک راج پاٹ کو پریم کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ انورادھے! آؤ آج اِن راج پاٹ کے لوبھیوں کو بتادیں کہ پریم پر جیون نچھاور کرنا پریمی، ایک کچھ وستو سمجھتے ہیں...... آؤ مجھے اپنا ہات دو——

انورادھا: مہاراج! آپ نے راج پاٹ......

پروتک: راج پاٹ کے لیے میں نے لڑنا ملیہ کیتو کو سونپ دیا ہے...... ملیہ کیتو اِن سب باتوں کو سمجھتا ہے——

انورادھا: (آواز میں رقّت ہے) مہاراج! آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اپنا ہات آپ کے ہاتھ میں دیتی ہوں...... مجھ ایسا سہاگ نہ کسی کو ملا ہے، نہ ملے گا۔

(پھر منتروں کی آوازیں آتی ہیں۔ انورادھا اپنا ہاتھ پُروتک کے ہاتھ میں دینے سے پہلے اُن کے گلے میں جے مال ڈال دیتی ہے...... پھر آگ کے سامنے بیٹھے ہونے کی وجہ سے زہر پروتک کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے—— آناً فاناً پُروتک لوٹنے لگتے ہیں)

انگ رکھشکا: مہاراج پروتک لوٹنے لگے!

راج دُوت: مہاراج پروتک!

انورادھا: سوامی!

دُردھر: منّشتا کے اوتار، مہاراج پروتک کی جے! (چندر گپت سے) مہاراج آپ نے دیکھا؟

چندر گپت: ہاں مہارانی، میں نے دیکھا (اُٹھ کر) پریم پر بلیدان دینے والے پروتک، تیری جے!

چانکیہ: پہرہ دارو! ملیہ کیتو کو گھیرے میں لے لو...... دو پریمی!...... ہاہاہا......!! دیوانے...... پاٹلی پتر سمراٹ کی جے!

(منظر پر فوراً پردہ گر جاتا ہے)

کھیل ’’چانکیہ‘‘ کے چند ہندی الفاظ کا ترجمہ ذیل میں دیا گیا ہے

انچیت	بے یقین
ششو	بچہ، شاگرد
جننی	ماں
بادھک	حائل
آشنکا	شک وشبہ
سندیہ	شک
سروا ُچ اوستھا	سب سے اونچی منزل
کُٹل	جھوٹا
کٹھور	سخت دل
گھرنا	نفرت
درشن	نقطۂ نظر
تتوگیان	فلسفہ
سدھانت	کلیہ
اپواد	استثنیٰ
مرتیوڈنڈ	موت کی سزا
پریشد	قانون ساز مجلس
گوآدھیاکش	گائے بیلوں کے محکمے کا مہتمم
نوآدھیاکش	جہازوں کے محکمے کا مہتمم
ہستادھیاکش	ہاتھیوں کے محکمے کا مہتمم
اسوادھیاکش	گھوڑوں کے محکمے کا مہتمم
رتھ آدھیاکش	رتھوں کے محکمے کا مہتمم
وشرانتی ستھان	آرام گاہ
رنگ بھومی	کھیل کا میدان
انومان	پیش خیمہ، اندازہ
اسنبھو	ناممکن
استھر	سیمابی، ایک جگہ قائم نہ رہنے والا۔
اکارن	فضول، بے فائدہ
ستیا	سچائی
اماتیہ	مشاورتی وزرا
ویہوہاوک	کارکن
سمہرت	ریاست کے مختار
ورشل	راجے کا خطاب
گانڈیو	ارجن کی کمان
چکرویوہ	نرغہ جس میں کورووں کی فوج نے ویر ابھیمنیو کو گھیر لیا تھا۔
اُدّیش	مقصد
اُنتی	ترقی
سہنسروں	ہزاروں
سنکوچ	احتراز، شک
مرگ نینی	ہرن کی سی آنکھوں والی
آبھاس دینا	جتادینا
یُوتی	نوجوان لڑکی

لفظ	معنی
کوکل	کوئل، پنچھی
مدھو	شراب
کمپت ادھر	کانپتے ہوئے ہونٹ
مدھومدرا	میٹھی شراب
بھاگیہ شالی	اچھی قسمت والی
ایرشا	حسد
تچھ جیو	بے بضاعت ہستی
ابودھ	بے قصور، بے خبر
سُچیت	آگاہ
وئیدھویہ	بیوگی، دوھاگ
ششر رِتو	سردیوں کا موسم
امر	غیر فانی
لوبھی	لالچی

تلچھٹ

افراد:

ماں.......................... ایک بیوہ عورت جس نے یوگ کو پالا ہے
یوگ.......................... ایک 'یتیم' لڑکا
جوتن کی ماں.................. محلّے کی ایک عورت
شری پت رائے..................یوگ کا باپ

منظر

ایک معمولی سا کمرہ، جس میں سامان قدرے بے ترتیب پڑا ہے۔ مثلاً ایک کُرسی پڑی ہے تو اس کے بازو پر دھوئے جانے والے کپڑے رکھے ہیں۔ پلنگ کے قریب ایک تھال پڑا ہے جس کا مطلب ہے ابھی کسی نے کھانا کھایا ہے لیکن برتن نہیں اٹھوائے۔ الگنی پر ایک چھتری لٹکی ہوئی ہے جس کی تانیں نظر آ رہی ہیں وغیرہ۔

درمیان میں ایک سلائی مشین ہے جس کے اِردگرد کترن بکھری ہوئی ہے۔ اس کمرے میں کھڑے ہونے سے نظر رسوئی میں جاتی ہے۔ رسوئی بھی دراصل اُسی کمرے کا ایک حصّہ ہے لیکن اسے کھوکھے کی بیکار لکڑی سے کمرے سے علاحدہ

کرلیا گیا ہے۔ رسوئی کے پاس سے ایک راستہ سامنے ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پاس جا کر رُک جاتا ہے جہاں ایک نالی ہے۔ نالی کے پاس دائیں طرف ایک ٹاٹ لٹکا ہے جس کے پیچھے غسل خانہ ہے۔

پردہ اُٹھنے پر ماں ——— یوگ کی ماں، کتر بیونت میں مشغول نظر آتی ہے۔ روشنی کم ہونے سے آنکھوں پر زور دینا پڑتا ہے۔ وہ ستائیس برس کی ایک جوان عورت ہے، لیکن بیوگی کی مصیبتوں کے باعث زیادہ عمر کی دکھائی دیتی ہے۔ آج بھی اگر اچھے کپڑے پہنے تو خوبصورت نظر آئے۔

یوگ ایک چودہ سال کا ذہین لڑکا ہے جو کسی بات سے خفا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ماں: نہیں بیٹا یوگ! میں تمھیں اتنا پیسا نہیں دے سکتی..... میں ایک غریب عورت ہوں۔

یوگ: اگر یہی بات تھی ماں، تو تم نے مجھے لکھانے پڑھانے کی کوشش ہی کیوں کی تھی؟ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ تھوڑی بہت شُد بُد حاصل کرنے کے بعد میں چچا کے کارخانے میں نوکر ہو جاتا اور وہاں اسپرنگ بنانے کا کام سیکھ لیتا۔

ماں: بیٹا، مجھے کیا پتا تھا، ہر دوسرے روز میرے لیے نیا پروانہ آئے گا۔

یوگ: نیا پروانہ کیسا؟

ماں: یہی کبھی تمھیں سیر تماشے کے لیے پیسے دینا ہوں گے اور کبھی اسکاؤٹنگ کی وَردی سِلوانے کے لیے پیسے درکار ہوں گے۔ اگر تمھیں رومال کی اتنی ضرورت ہے تو کیوں نہیں ایک سادہ سا......

یوگ: نہیں ماں! مجھے ایک خاص کپڑے کا اسکارف چاہیے۔

ماں: مجھے تمھاری ان ضرورتوں کا کیا پتا؟ تم دیکھتے ہو میں سارا دن سلائی کرتی رہتی ہوں۔ جب سے بِدھوا ہوئی، رو رو کر میں نے آنکھیں خراب کرلیں اور اب میری نگاہ سلائی پر نہیں رُکتی...... میری نگاہیں ایک جگہ جم کر رہ جاتی ہیں۔

یوگ: تو تم عینک کیوں نہیں لگوا لیتیں ماں؟...... اسپتال سے نمبر تو لے آئے تھے۔

ماں: ہاں نمبر تو لے آئے تھے لیکن عینک خریدنے کے لیے پیسے چاہییں۔

یوگ: اوہ! پھر پیسے......

ماں: ہاں پیسوں کے بغیر کیا ہو سکتا ہے اس سنسار میں؟

یوگ: ماں، دُنیا میں پیسوں کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا؟......گانو میں تو لوگ ابھی تک گندم لے آتے ہیں یا عورتیں دکاندار کو کپاس دے جاتی ہیں اور اس کے عوض انھیں آٹا دال اور نمک پیسے سب کچھ مل جاتا ہے...... ہمارے ہاں جو گندم پڑا ہے......

ماں: ہاں بیٹا! وہاں اس قسم کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ شہر میں لوگ پیسے کے عوض کوئی چیز دے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر نہیں......

یوگ: جوتن کی ماں بیوہ ہے۔ وہ کیسے کما لیتی ہے؟ جوتن کو کبھی کتابوں کے لیے نہیں رونا پڑا، اور نہ کبھی......

ماں: (جھڑک کر) خاموش! سوچ کر بات کیا کرو۔ جوتن کی ماں جس طرح پیسے کما لیتی ہے، میں اس طرح پیسے نہیں کمانا چاہتی۔

یوگ: (حیران ہو کر) وہ کیسے کما لیتی ہے؟—— جوتن کی ماں!

ماں: خبردار آیندہ کبھی جوتن کی ماں کا نام لیا۔ سمجھ گئے؟

یوگ: کیوں ماں، جوتن کی ماں کا نام لینا گناہ ہے؟

ماں: ہاں گناہ ہے!

یوگ: (رو کر) میں نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا، مجھے اسکارف چاہیے اور سلسلہ حساب نمبر 8 اور بس...... ماں! تمھیں اس کے بعد کچھ بھی لانے کے لیے نہیں کہوں گا۔

ماں: میرے لال تم ہی بتاؤ...... میں کیا کروں، کل میں نے جمنا لال کے ہاں سے بوتلیں اکٹھی کیں۔ ان سے سخت بدبو آتی تھی۔ میں نے انھیں دھویا اور اس کے بعد پچھلے تین مہینے سے اکٹھا کیا ہوا چھان نکالا اور ان کو بیچ ڈالا۔ سوا تین روپے ملے......اب تم ہی بتاؤ کہ کھانے پکانے کے لیے کیا رکھوں اور تمھارے حساب اور رومال کے لیے کیا دوں......؟

یوگ: (روتے ہوئے) تم نے کہا تھا نا، تمھارا باپ لڑائی سے پہلے بدیس چلا گیا......اور وہاں مر کھپ گیا اور اس کے جاتے ہی تمھاری ماں صدمے سے مر گئی اور تم نے مجھے لے کر پال لیا......

ماں: ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس بات سے تمھارا کیا مطلب ہے؟

یوگ: میں کئی بار سوچتا ہوں......تم نے مجھے آخر کیوں بچا لیا؟ کیوں اپنا بیٹا بنا لیا؟ تم مجھے نہ لاتیں تو میں بھوک اور پیاس سے تنگ آ کر مر جاتا، زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا۔ تمھارے دُکھ کا کارن تو نہ ہوتا۔

ماں: (لرزتی ہوئی آواز میں) اچھا بیٹا میں نے جو تمھیں بچا لیا——بڑی بھاری غلطی کی۔ کبھی کسی انسان سے غلطی بھی ہو ہی جاتی ہے۔

(وقفہ——ایک ٹھنڈی سانس لے کر)

کاش میں ایک بار اپنی کوکھ سے بیٹا جن لیتی......چاہے وہ پیدا ہونے کے فوراً بعد مر ہی کیوں نہ جاتا۔ کبھی دوسرے کا بیٹا بھی اپنا ہوا ہے۔ لاکھ کرے کوئی۔

یوگ: (گھبرا کر) یہ بات نہیں ماں......ایسا کرو گی تو میں کہیں چلا جاؤں گا۔

ماں: چلے جاؤ گے تو کیا ہوگا؟ اب بھی کیا تم میرے ہو؟ یہ جو باتیں تم نے کی ہیں......

یوگ: (لپٹ کر) نہیں ماں......میں تیرا ہوں تیرا۔ اور کسی کا نہیں۔ آج میری اپنی ماں بھی آ جائے تو میں اس کے پاس نہ جاؤں۔ تم نے مجھے پالا ہے۔

ماں: آئے ہائے۔ میں احسان جتا رہی ہوں نا!

یوگ: نہیں ماں، میں نے یہ کب کہا؟ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں اتنا کلیش ہوتا ہے۔ میں بڑا ہو رہا ہوں اور میری ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میرا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے......

ماں: بیٹا، پیٹ کی بات نہ کرو۔ پیٹ بھر کھانے کے لیے تو ہمارے پاس کمی نہیں ہے، ہاں پیٹ کے علاوہ یہ رومال اور کتابیں......

یوگ: کتابوں کے بغیر بھلا کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے؟

ماں: میں نے سُنا ہے کہ پڑھنے والوں نے دوسروں سے مانگ تانگ کر کتابیں پڑھی ہیں۔ لائبریریوں میں جاجا کر کام کیا ہے۔ تمھارے ہی چچا اتنے بڑے کیسے بن گئے؟ اُن کے گھر میں کھانے کو روٹی تھی نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ ماں باپ نے انھیں ان کی بُوا کے ہاں گجرانولہ بھیج دیا۔ جہاں یہ اپنے پھپھیرے بھائی کِھلایا کرتے تھے اور روٹی کھا لیتے تھے۔ گھر پڑھنے کے لیے بتی نہ تھی اور تمھارے چچا سڑکوں کی روشنیوں کے نیچے جاجا کر پڑھا کرتے تھے......

یوگ: ماں میں سمجھ گیا...... سب کچھ سمجھ گیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم نے مجھے بہت پیار کیا ہے۔ جب بھی میں نے رو دھو کر تم سے کچھ مانگا ہے۔ تم نے کسی نہ کسی طرح مہیا کر دیا ہے۔ اس سے میری عادت بگڑ گئی...... اب میں جانتا ہوں۔ تم بہت مجبور ہو......

ماں: ہاں بیٹا۔ میں اِن دنوں بہت مجبور ہوں۔ تمھارے سامنے میں گھر دائی بُلواتی رہی اور پیٹ ملواتی رہی۔ میں نے اس مہینے سینے پُرونے کا کام ہی نہیں کیا اور نہ موزے بُنے ہیں۔

یوگ: نہیں ماں...... مجھ سے بُھول ہوئی۔

ماں: تو اب تم اپنے ماسٹر کو کیا جواب دو گے؟

یوگ: میں کہوں گا میں اسکاؤٹ نہیں بنتا...... اگر چہ وہ مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔...... اُنھیں دُکھ ہوگا۔ پر ماں جو دُکھ تمھیں ہو رہا ہے......

ماں: اچھا وہ تمھیں اتنا چاہتے ہیں کہ تمھارے اسکاؤٹ نہ ہونے پر انھیں دُکھ ہوگا؟

یوگ: ہاں ماں!

ماں: ہائے گھر بھر میں ایک مرد کے نہ ہونے سے یہ کچھ ہو جاتا ہے...... مرد بیس قسم کے کام کر سکتا ہے، عورت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ پھر وہ مہینے میں بیس دن بیمار رہتی ہے۔ میں تو روتی ہوں کہ میں عورت کیوں ہوئی!

یوگ: اس میں تمھارا کیا قصور ہے ماں......؟

ماں: نہیں اس میں میرے ہی کرموں کا دوش ہے۔

یوگ: دنیا میں لاکھوں عورتیں ہیں جو راج کرتی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی ہے، وہ ہیڈ ماسٹرنی ہوگئی۔ پوچھو بھلا اس نے ہیڈ ماسٹرنی بننے میں کون سا کالج پاس کیا ہے۔ ان دنوں گورنر کی بیوی اسکول کی عمارت کا پتھر رکھنے آئی تھی تو......

ماں: ہاں بیٹا۔ عورت مرد ہی سے رتبہ پاتی ہے۔

یوگ: ایسا کیوں ہے؟

ماں: کیوں ہے؟...... جب سے دُنیا بنی ہے ایسے ہوتا آیا ہے۔ مرد کے بغیر عورت کچھ بھی نہیں۔

یوگ: مرد تمھارے بغیر سب کچھ ہیں؟

ماں: ہاں سب کچھ۔

(وقفہ ——— ماں کچھ سنبھل جاتی ہے)

یوگ: تو میں مرد بنوں گا۔ اور سب کچھ ہوں گا۔

ماں: ہاں، اور میرے بیٹے کی دُلھن آئے گی۔

یوگ: نہیں ماں...... میں اُس کے لیے نہیں۔ تمھارے لیے سب کچھ ہوں گا۔

ماں: جیتے رہو بیٹا! بھگوان تمھیں بہت بڑا آدمی بنائے۔ اچھا تو وہ تمھیں بہت چاہتے ہیں۔ تمھارا اپنا جی بھی چاہتا ہے کہ اسکاؤٹ بنوں اور......

یوگ: واہ!...... تو میں اتنی دیر سے رو کیا رہا ہوں؟

ماں: نہیں بیٹا مجھے ایک بات یاد آگئی۔ میں نے تمھاری شادی کے لیے روپے جمع کرنے شروع کیے تھے۔

یوگ: میری شادی کے لیے؟

ماں: ہاں تمھاری شادی کے لیے...... اور چار پانچ سال میں تمھارا بیاہ ہوگا یا نہیں؟

یوگ: تو اس کے لیے میں آپ کماؤں گا۔

ماں: اچھا اس کے لیے تم آپ کماتے رہنا...... یہ میں نے روپے اکٹھے کرنے شروع کیے تھے...... ابھی تک میرے پاس باون روپے جمع ہوئے ہیں۔ اس سے تم رومال

اور کتابیں ـــــــ

یوگ: ....ماں!

ماں: انھیں جہاں چاہو خرچ کرلو۔ میرے پاس یہی پونجی تھی ..... جو میں نے تمھارے سامنے بڑی محنت سے جمع کی ہے۔

یوگ: نہیں نہیں ماں...... میں اسے خرچ نہیں کروں گا (خوش ہوکر) لیکن مجھے رومال بنادو۔ اور باقی پیسے جمع رکھو۔ میری شادی کے لیے نہیں، اپنے دردِ سر کا علاج کرو۔ یہ درد جو تمھارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔

ماں: اور کتابیں؟

یوگ: میں ایسے ہی پڑھ لوں گا، مانگ تانگ کر گلی کی روشنیوں کے نیچے.....

ماں: نہیں بیٹا۔ میں یہ نہ ہونے دوں گی۔ تم ضروری ضروری کتابیں خرید لو...... اور باقی......

(دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے)

ماں: یہ ہمارے گھر کون آیا؟

یوگ: گونگی ہوگی۔ تم نے اس کے کپڑے سی دیے ہیں؟ وہ کہہ رہی تھی، مجھے دیاس پوجا سے پہلے کہیں پہنچنا ہے۔

ماں: (زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے، میں مرگئی! میں نے تو شروع ہی نہیں کیا...... میں اسے بھول ہی چکی تھی!

یوگ: تو اب کیا ہوگا؟

ماں: (گھبرا کر) نہ جانے کیا ہوگا۔ اُسے کیا منھ دکھاؤں گی میں؟

یوگ: میں کہتا ہوں ...... ماں تم بیمار بن جاؤ۔ اس چارپائی پر پڑ جاؤ۔ تم نے اس کے کپڑے کاٹے بھی ہیں یا نہیں؟

ماں: میں کہتی ہوں بالکل بھول گئی تھی اس کے کپڑے۔

یوگ: کسی کے بھی کاٹے ہیں یا نہیں؟

ماں: ہاں چاند کی قمیض کاٹی ہے، وہ پڑی ہے......

یوگ: اُٹھو اُٹھو...... میں تمھاری مشین رکھ دیتا ہوں۔ تم مشین کے اندر وہ قمیض رکھ دو۔ بس اس طرح کہ پتا چلے بخیہ نکالنے کی مہلت نہیں ملی اور پیٹ میں درد ہونے لگا۔

ماں: نہیں نہیں بیٹا...... یہ بُری بات ہے۔ میں رات کو جاگ کر سی دوں گی اور تھوڑی سی لعنت ملامت سہہ لوں گی۔ اس کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔

یوگ: جب تم وقت پر کام کر دیتی ہو تو پھر بھی لعنت ملامت ہوتی ہے؟

ماں: لوگ میری سلائی کا درزیوں کی سلائی سے مقابلہ کرتے ہیں نا اور میں اُن ایسا نہیں سی سکتی۔ اگر چہ درزی قمیض کے اڑھائی روپے تک لے لیتے ہیں اور میں کل چھ آنے سے آٹھ تک لیتی ہوں۔

(پھر دستک ہوتی ہے)

ماں: کھڑکی سے دیکھو تو کون ہے؟

یوگ: (دور جاتے ہوئے)...... اچھا میں دیکھتا ہوں۔

(ماں سلائی مشین چلانے لگتی ہے)

ماں: کون ہے؟

یوگ: (گھبرایا ہوا آتا ہے) ماں...... ماں، یہ جوتن کی ماں آ گئی۔

ماں: اُسے ہمارے ساتھ کیا کام آن پڑا؟ بیٹھے بٹھائے، یہ کیا مصیبت آ گئی؟ میرے ہاں اس کا آنا جانا اچھا نہیں............

یوگ: میں خود نہیں چاہتا وہ ہمارے ہاں آئے...... میں اسے رُوک دوں؟

ماں: اس طرح کیسے روکا جا سکتا ہے...... چلو یہ بھی اچھا ہوا، گونگی نہیں آئی؟

یوگ: صاف کہہ دوں گا کہ ماں کو فرصت نہیں۔

ماں: نہیں نہیں...... ایسا نہ کہو...... (سوچ کر) اچھا اُسے آنے دو۔

(جوتن کی ماں اپنے آپ چلی آتی ہے)

جوتن کی ماں: (بہت خوش ہے) یوگ کی ماں؟

ماں: ہاں کرشنا۔کہو کیا بات ہے؟

جوتن کی ماں: میں تمھیں ایک خوش خبری سُنانے آئی ہوں۔ ایسی بات جو تم نے زندگی بھر نہیں سُنی ہوگی۔

ماں: ہمارے لیے کیا خوش خبری ہوسکتی ہے؟ لاٹری ہم نے نہیں ڈالی اور......

جوتن کی ماں: لاٹری سے بڑھ کر بات ہے۔

یوگ: تم ایسے ہی باتیں کرتی ہو جوتن کی ماں۔ جانے کیا ہو جائے گا۔ اور جب اصل بات ہوتی ہے تو ٹھس سے رہ جاتے ہیں سب۔

جوتن کی ماں: نہیں یوگ! خاص طور پر تمھارے لیے بہت بڑی بات ہے۔ اس سے تمھیں بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ آج تم فقیر ہو اور کل راجا بن جاؤ گے تو تم مان لو گے؟

یوگ: نہیں۔ میں راجا نہیں بن سکتا اور نہ ہی بننا چاہتا ہوں۔

جوتن کی ماں: لیکن اگر تم راجا بن جاؤ تو............

ماں: اوہو، راجا ہی نہ بن جائے کہیں......

یوگ: لیکن ماں کیا کرے گی؟......(کچھ یاد آتا ہے) اوہ نہیں...... ماں میرے ساتھ جا سکتی ہے۔ راجے کی ماں بن کر چلو۔ سمجھ لیا، میں راجا ہوں گا۔ ہماری آٹھویں جماعت میں اس طرح کے سوال نکالتے ہیں۔ فرض کیا کہ "U" لڑکوں نے امرود کھائے...... ہاں جوتن کی ماں! تمھیں اپنے امرودوں کا وعدہ یاد ہے نا......؟

جوتن کی ماں: ہاں اچھی طرح سے۔ میں تمھیں اپنے باغ سے ٹوکروں کے ٹوکرے منگوا دوں گی۔

ماں: اوہو، ایکا ایکی اتنی مہربان کیسے ہوگئیں؟——اصل بات کیا ہے؟

جوتن کی ماں: بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ یوگ کی ماں! تم دیکھ نہیں رہی ہو۔ میری آنکھوں میں نیر بھر آیا ہے۔ دراصل مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ بات تم لوگوں سے بیان کرسکوں——ہے بھگوان! مجھے اتنی شکتی دے کہ......

ماں: یہ کیا پاکھنڈ ہے——؟ میں کہتی ہوں کرشنا، کوئی بات ہمیں اتنا خوش نہیں کرسکتی کہ ہم

اُسے سُن کر پاگل ہو جائیں اور نہ کوئی بات اتنا غمگین کر سکتی ہے کہ......

جوتن کی ماں: یوگ بیٹا!

یوگ: یہ تمھیں کیا ہو گیا جوتن کی ماں —— جوتن کیا کر رہا ہے؟

ماں: یوگ کی یہ بہت بُری عادت ہے کہ جو آخری چیز اس کے دماغ میں آتی ہے، اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ باتیں کسی خوش خبری کی ہو رہی تھیں۔ بیچ میں امرودوں کا ذکر آ گیا۔ اب امرودوں کا ذکر ہو رہا ہے تو جوتن کا قصہ لے بیٹھے ——

یوگ: ہاں! میں کہہ رہا تھا، میں اپنے آپ کو "ل" فرض کر لیتا ہوں یعنی راجا!

جوتن کی ماں: فرض کرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم اب سچ مچ راجا ہو!

ماں: اور میں؟

یوگ: تم راجا کی ماں؟

جوتن کی ماں: راج ماتا!

ماں: اچھا چلو گپ ختم ہوئی۔ اب اصلی بات بتاؤ —— (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) ہماری ایسی قسمت کہاں ——؟ ابھی کل ہی کیرل ودیا کا ایک پنڈت آیا تھا، اُس نے کچھ ہندسے لکھے اور اصل پنڈ میں 24 کانون (قانون) کے جمع کرائے اور اُسے تین پر تقسیم کرایا، سب کچھ تقسیم ہو گیا —— جس کا مطلب تھا، لابھ کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گا۔ میں ان باتوں کو مانتی نہیں پر......

جوتن کی ماں: بات یہ ہے کہ...... یوگ کا باپ زندہ ہے!

یوگ: ماں میں انھیں جا کر لے آتا ہوں۔

جوتن کی ماں: انھیں وہیں رہنے دو۔ یوگ بیٹا! —— اپنی ماں کو لے جاؤ۔

ماں: نہیں میں نہیں جاؤں گی —— میں ان کی کون ہوتی ہوں؟ انھیں میری عزت کے لیے یہاں آنا چاہیے۔ میں ایک بدھوا عورت ہوں۔ مجھے پرائے مردوں سے ملنے کے لیے ایسے نہیں چلے جانا چاہیے۔

یوگ: میں جاتا ہوں —— لیکن مجھے بھی شرم آتی ہے۔ مجھے رونا آ جائے گا۔

جوتن کی ماں: اس میں شرم کی کیا بات ہے؟

یوگ: نہیں نہیں ــــ میں جاؤں گا (خوشی میں) میرے پتاجی آئے ہیں۔ میرے پتاجی......

(جاتا ہے اس کی آواز بڑی تیزی کے ساتھ دُور ہٹتی جا رہی ہے)

جوتن کی ماں: ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں بہن؟

ماں: یہی کہ پرائے مردوں سے ملنے کے لیے مجھے ایسے نہیں چلے جانا چاہیے۔

جوتن کی ماں: پرائے مرد تمھارے یہاں بے شک آجائیں؟

ماں: نہیں ــــ وہ یوگ کے پتا ہیں، اُن کے سوا اور کوئی نہیں آسکتا۔

جوتن کی ماں: جیسے تمھیں ان کے پاس جانے سے شرم آتی ہے، ایسے ہی اُنھیں بھی......

ماں: نہیں ہم دونوں کی بات ایک سی نہیں!

جوتن کی ماں: میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمھیں اُدھر چلے جانا چاہیے۔ وہ ایک پل میں اِدھر پہنچ جائیں گے۔ تب تک تمھارے ہاں صفائی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ دیکھو سب کوڑا کباڑ۔ یہ دیکھو مشین ــــ کپڑے اور کترن، اور یہ تصویریں، جیسے پنواڑیوں کی دکانوں پر ہوتی ہیں۔ اور یہ جنتری......

ماں: یہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ میرا گھر ہے......

جوتن کی ماں: تمھارا ابھی تک خیال ہے کہ میرے گھر جا کر شری پت رائے نے غلطی کی؟

ماں: ہاں ــــ مجھے اس بات کا گِلہ ہے کہ تم انھیں سیدھے اِدھر کیوں نہیں لے آئیں؟ اور پھر صبح سے تم نے انھیں اپنے پاس کیوں رکھا ہے؟ میں یہ تو نہیں کہتی کہ اس میں تمھارا کوئی لابھ ہے، لیکن یہ بات بنتی نہیں کہ تم............

جوتن کی ماں: میں نے بُرا کیا کیا؟ آتے ہی وہ نہائے، چاء پی۔ راستے کی مٹی اُتاری۔ تکان سے ان کی آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ اور وہ گرے پڑتے تھے اور پھر......

ماں: لیکن انھوں نے اپنے بیٹے اور پتنی کو یاد نہ کیا؟

جوتن کی ماں: کیا! وہ کمرے میں پاؤں رکھنے سے پہلے رُوئے۔ لیکن اس بات کا خیال کر کے کہ کسی کا گھر ہے، وہ چپ رہے۔ میں نے کہا نا، انھوں نے بہت دُنیا دیکھی ہے، وہ اچھا بُرا

سب سمجھتے ہیں۔

ماں: تم کہتی ہو اُس نے اپنی پتنی کو یاد کیا۔ ایسے میں اپنی طبیعت پر کوئی کیسے قابو پا سکتا ہے؟ ......(ٹھنڈی سانس لے کر) مرد ایسے ہی پتھر دل ہوتے ہیں ——!

جوتن کی ماں: انھوں نے اور بھی عورتیں دیکھی ہیں جن کے مقابلے اُن کی اَن پڑھ گنوار و بیوی کچھ بھی نہ تھی!

ماں: چاہے، اَن پڑھ گنوار و ہو کوئی، پھر بھی ......اور بیٹا!

جوتن کی ماں: بات دراصل یہ ہے کہ بیوی کے مر جانے کا انھیں بدیس ہی میں پتا چل گیا تھا —— اور بتانے والے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تمھارا بیٹا بھی چل بسا ہے۔ حالانکہ وہ جیتا تھا۔ سو جو اصل رونا دھونا تھا، وہ شری پت رائے پہلے ہی رو دھو چکے تھے۔

ماں: تو پھر وہ اپنے قصبے میں کیوں آئے؟

جوتن کی ماں: کوئی مڑھئی سادھ پہ کیوں جاتا ہے؟ —— اور پھر اپنے دیش کی یاد............

ماں: میرا دل ابھی تک کانپ رہا ہے!

جوتن کی ماں: تمھارا دل بھلا کیوں کانپ رہا ہے؟ شاید تم سمجھتی ہو کہ وہ ......

ماں: کیا سمجھتی ہوں؟......

جوتن کی ماں: (رک کر مسکرا کر) شاید تم سمجھتی ہو کہ وہ (گویا بات پلٹ جاتی ہے) ...... وہ...... یوگ کو لے جائیں گے!

ماں: نہیں نہیں —— اس بات کی مجھے تسلی ہے —— وہ یوگ کو نہیں لے جا سکتے۔ دنیا میں اتنی اندھیر گردی نہیں۔ وہ تو اپنی طرف سے یوگ کو مار چکے تھے اور اگر میں یوگ کو لے کر نہ پال لیتی تو نہ جانے اس کا کیا ہوتا؟ ......میں نے سات آٹھ سال مصیبتیں سہہ کر یوگ کو پالا ہے۔ پڑھایا ہے...... تمھیں یاد ہے جب اسے محرقہ بخار ہوا تھا...... جب اس کا بخار پہلی بار ٹوٹا تو اس نے سخت سی ناشپاتی کھالی اور پھر وہ اکیس دن کے لیے بیمار ہو گیا۔ میں اس کے لیے راتوں جاگتی رہی —— میں آدھی رات کے وقت ہری داس کی سادھ پر ایک ٹانگ کھڑے ہو کر پرارتھنا کرتی رہی —— میں......

جوتن کی ماں: تم نے یہ سب باتیں کہہ ڈالیں!

ماں: میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یوگ کو لے جائے اس کے پتا یوگ کے اتنے پتا نہیں جتنی میں ——— میں یوگ کی ماں ہوں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یوگ کی میں کچھ نہ رہ جاؤں؟ وہ سات سال کے بعد آئیں اور کسی اور کے ہاں ٹھہر جائیں ——— اور......؟

جوتن کی ماں: میں اُن کے لیے نئی نہ تھی۔ وہ پہلے بھی مجھے جانتے تھے...... میں ایک بات پوچھتی ہوں۔ اگر تمھیں یقین ہے کہ وہ یوگ کو نہیں لے جائیں گے تو پھر تمھارا دل کیوں کانپتا ہے؟

ماں: ——— میں نہیں جانتی ——— میرا دل کیوں اتنا کانپ رہا ہے؟

جوتن کی ماں: مثلاً ——— میرا دل نہیں کانپ رہا۔

ماں: تم پر کبھی کوئی مصیبت نہیں ٹوٹی۔ تم نے جیون میں سُکھ ہی سُکھ دیکھا ہے، لیکن میں نے......

جوتن کی ماں: دوسرے کو یہی معلوم ہوتا ہے۔ یوگ کی ماں!

ماں: اچھا میں پوچھتی ہوں ——— وہ اپنے بیٹے کے جیتے ہونے کی بابت سن کر بھی تمھارے ہاں بیٹھے رہے۔ اور پھر جیسا کہ تم نے بتایا سو گئے ———

جوتن کی ماں: میں کوئی اتنی مُورکھ تھوڑے ہی ہوں کہ ایک دم انھیں یہ بات بتا دیتی۔ ایسے ہی میں تو دھکا لگ جاتا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ انھیں یہ خوش خبری سنائی۔

ماں: پھر وہ خوش ہوئے؟

جوتن کی ماں: اور نہیں تو کیا، ارے میں کہتی ہوں، دیوانے ہوگئے۔ اس سے کہیں زیادہ دیوانے جتنے تم لوگ نظر آتے ہو۔

ماں: بات یہ ہے ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا ——— اچھا، اتنے خوش ہوئے!

جوتن کی ماں: بس اتنے ہی خوش، جتنا اب تم ایکا ایکی ہو گئی ہو۔

ماں: میں خوش ہو گئی ہوں ——— اچھا! تم نے میرا ذکر بھی کیا؟

جوتن کی ماں: تمھارا ذکر؟......اوہ میں بھول ہی گئی۔ زیادہ نہیں تھوڑا بہت ضرور کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بہت کام میں لگی رہی۔ پہلے چائے بنائی۔ پھر ان کے نہانے کے لیے پانی گرم کیا۔ پھر انھوں نے کھانا کھایا۔ میں بیکار باتیں کرتی رہی۔ حالانکہ وہ سور ہے تھے۔ پھر......

ماں: (افسوس سے) ارے! تم نے میرا نام بھی نہ لیا؟

جوتن کی ماں: نام تو لیا تھا۔

ماں: یہ سب بیکار ہے۔ بیہودہ ہے۔ اس میں تمھاری کوئی چال ہے ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی یوگ کا نام لے اور میرا نام نہ لے ...... بھلا تم نے ان کی اتنی خاطر داری کیوں کی؟

جوتن کی ماں: (برہم ہو کر) تم ناحق منھ کو آتی ہو یوگ کی ماں! تم اس سے پہلے اشارے میں اپنا جلاپا دکھا چکی ہو۔ زیادہ باتیں بناؤ گی تو مجھ سا بُرا کوئی نہیں ہوگا۔

ماں: نہیں تم لاکھ کہو اس میں کوئی بھید ہے...... تمھارا کوئی حق نہ تھا کہ تم اسے اپنے گھر میں رکھو اور پھر صبح سے شام تک...... میں جانتی ہوں تم کس طرح کی عورت ہو......

جوتن کی ماں: بس ...... اس سے زیادہ زبان چلائی تو سر کا ایک بال نہ چھوڑوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔

ماں: اس سے پہلے تم نے میرے ساتھ کم بُرا سلوک کیا ہے؟ بدکاری آپ کرتی رہی ہو اور سر میرے تھوپتی رہی ہو۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا تو میرا بھگوان تو جانتا ہے۔

جوتن کی ماں: (فوراً ڈھل کر) یوگ کی ماں، آج تمھیں ہوا کیا ہے؟ تم تو ایسی نہ تھیں کبھی......

ماں: (بدستور ہسٹریا کے مریض کی طرح) ہاں میں ایسی نہ تھی لیکن تم نے مجھے ایسا بنا دیا...... اگر تم نے یہی وطیرہ رکھا تو شاید مجھے اس سے بھی بُرا بننا پڑے۔ شریف انسان کو آزمانا نہیں چاہیے۔ وہ چُپ رہتا ہے۔ لیکن جب وہ بولتا ہے تو...... بہت بولتا ہے۔

جوتن کی ماں: خیال تو کرو...... یوگ کی ماں! شری پت آتے ہی ہوں گے۔

ماں: میں کیا کروں۔ تم ہی نے یہ اول جلول کہلوائی ہے مجھ سے۔

(دروازے پر آہٹ......کوئی کھنکارتا ہے)

(ڈر کر) میں جانوں، وہ آ ہی گئے۔

جوتن کی ماں: تو اور کیا......دیکھو کیسے اٹھا رکھا ہے یوگ کو—! وہ اُتر رہا ہے!!

ماں: (گھبرا کر) اب کیا کروں؟......تمھارے اس کل کلیش نے چارپائی سے کپڑے بھی اُٹھانے نہیں دیے۔

یوگ: (بھاگ کر آتا ہے) ماں...پتاجی......پتاجی......ماں—!

شری پت: (شرماتے ہوئے) نمستے۔

ماں: (جھجکتے ہوئے)......ن......ن——نمستے......آیئے......آ......آ......یئے!

شری پت: کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھیے......میں اپنے آپ بیٹھ جاؤں گا......اس تپائی......

جوتن کی ماں: آپ ہی کا ذکر کیا تھا میں نے......انھوں نے یوگ کو پالا اور پڑھایا......اب یوگ اس طرح پشو بنا رہتا ہے تو ان کا کیا قصور؟ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں۔ سلائی پر ان کی گزر ہوتی ہے۔ یہ بھی شکر ہے بھگوان کا، محلے والے پرماتما سے ڈرتے ہیں اور......

ماں: جوتن کی ماں......!

جوتن کی ماں: کیا بات ہے......رُک کیوں گئیں......؟

ماں: (گھبرا کر) انھیں بیٹھنے تو دے......پھر باتیں ہو لیں گی......یوگ......یوگ بیٹا! بات سُن......

یوگ: کیا ہے؟

ماں: (کان میں) جا بازار سے چاء کی پتّی تو لے آ۔ پیسے اس دھوتی کے پلو سے کھول لے۔

جوتن کی ماں: (ہنس کر) تم چائے کی پتّی بھی نہیں رکھتیں۔

شری پت: نہیں۔ میں ابھی چائے نہیں پیوں گا......آپ تکلیف نہ کیجیے......جی میں چائے......

ماں: (کھسیانی ہو کر) ختم ہو گئی......چیز ختم بھی تو ہو جاتی ہے۔

جوتن کی ماں: (نصیحت کرتے ہوے) ایک بڑا پیکٹ منگوالیا کرو نا۔ کہو تو میں بھیج دوں؟

ماں: نہیں کرشنا! یوگ اپنے آپ لے آئے گا۔ اسے بھی تو ماں باپ کی خدمت کا موقع دینا چاہیے۔

جوتن کی ماں: تو کون سا پیکٹ منگواؤ گی؟

ماں: جو چائے کا پیکٹ ہوتا ہے...... چھوٹا پیکٹ!

جوتن کی ماں: چھوٹے پیکٹ میں تو بس خاک دھول ہوتی ہے۔ میرے پاس ہرے لیبل کی چائے ہے۔

شری پت: میں کہہ رہا ہوں ابھی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ٹھہر کر چائے پی لوں گا۔ باہر جا کر مجھے چائے پینے کی عادت ضرور ہوگئی ہے، لیکن......

جوتن کی ماں: تم سب شام کو کھانا ہمارے ہاں کھانا...... یوگ کی ماں!

ماں: نہیں بھائی — جیسا روکھا سوکھا ہوگا۔ میں کھلا لوں گی، لیکن کسی کے گھر نہیں کھانے دوں گی...... بھگوان نے وِدُر کا ساگ سویکار کیا تھا——۔

شری پت: آپ نہیں جانتیں، جنگ میں ہم کیا کچھ کھاتے رہے ہیں؟ بیس بیس دن ٹرنچوں میں پڑے سوکھی زمین کو ترس جاتے تھے۔ یہاں لوگ سمجھے ہیں ہرے لیبل کے بغیر چائے ہی نہیں پی جاسکتی......

ماں: یوگ بیٹا...... جا پھر چائے لے آ۔

شری پت: یوگ کو میرے پاس رہنے دیجیے اور چائے جوتن کے ہاں سے منگوا لیجیے۔

ماں: اس کی کیا ضرورت ہے...... میں خود......

جوتن کی ماں: آئے ہائے ...... اتنا ہی وہ ہے تو میں تم سے قیمت لے لوں گی — چائے تو اچھی پلاؤ نا۔

ماں: (غصے کو دباتے ہوئے) اچھا تو یوگ ان کے پاس رہے گا۔ تم آپ جاؤ اور کچھ پتی بھیج دو۔

جوتن کی ماں: (گھبرا کر) میں ...... میں (سنبھل کر) اچھا میں جا کر بھجواتی ہوں، لیکن شام کا کھانا......

شری پت: نہیں آپ تکلیف نہ فرمایئے۔ میں نے صبح کا کھانا جو آپ کے ہاں کھالیا۔ اب شام کو ان کے ہاں سہی۔

جوتن کی ماں: (جاتے ہوئے) اچھا...... اچھا...... تو میں تھوڑا کسٹرڈ پوڈر نہ بھیج دوں؟

ماں: نہیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

یوگ: میں پتا جی کے لیے سب کچھ بازار سے لے آؤں گا۔

شری پت: نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے، میرے بیٹے۔ آج تم سے مل کر میں نے سب کچھ پالیا ہے۔ میں سب کچھ کھو چکا تھا۔ میرے پاس چند سکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ سکے سب کھوٹے تھے۔ آج میں نے رتن، مانک، جواہر بھی کچھ پالیا ہے۔ آج میرے کھوٹے بھی کھرے ہو گئے۔

ماں: (آنکھیں پونچھتے ہوئے) آپ کو یوگ کا پتا نہ تھا؟

شری پت: کہاں؟ ـــــ میں سمجھتا تھا، اس سنسار میں میرا کوئی نہیں رہا۔ میں تو اِس وچار کے ساتھ آیا تھا کہ اپنا دیس ہے، چلو دیکھ آؤں اور اپنے پیاروں کی سمادھی پر دو پھول (رُک جاتا ہے)...... (وقفہ) اچھا ہوا میں اِدھر آ گیا۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ وہیں ہلڈانگ میں رہ جاؤں۔ سیام میں میرا کالی مرچ اور لونگ کا اجارہ ہے۔

یوگ: کالی مرچ سے بھی کوئی آمدنی ہوتی ہے پتا جی؟ یہاں رتُّو وہی بیوپار کرتا ہے، لیکن......

شری پت: میں اجارہ کہہ رہا ہوں بیٹا ـــــ!

یوگ: ماں یہ اجارہ کیا ہوتا ہے؟

شری پت: تم اُن سے کیوں پوچھتے ہو۔ بات میں نے کی ہے نہ کہ تمھاری ...... تمھاری ماں نے......

ماں: (شرماتے ہوئے) میں کیا جانوں ـــــ یہ اجارہ کیا بلا ہوتی ہے؟

شری پت: اجارہ ہوتا ہے...... حکومت سے ایک چیز کا اجارہ لے لینا! میرا مطلب ہے...... یعنی میرے سوا سارے ملک سیام میں کوئی لونگ اور کالی مرچ نہیں لا سکتا اور نہ بیچ سکتا ہے۔

ماں: تھوک مال بیچتے ہوں گے نا!

یوگ: ہاں ہمارے شہر میں کئی دکانوں پر بورڈ لگے ہیں۔ مثلاً ایک پر شیخ رحمت اللہ تھوک فروش۔ پہلے ہم تھوک فروش کا کوئی اور ہی مطلب سمجھتے تھے ——

شری پت: نہیں تھوک فروش نہیں ...... مثلاً کالی مرچ اور لونگ کا تھوک فروش تو وہ ہوتا ہے جو پرچون نہیں بیچتا —— پرچون کا مطلب ہے۔ پیسے پیسے اور ٹکے ٹکے کی چیز۔

یوگ: میں ہلڈانگ جاؤں گا —— پتا جی......

شری پت: —— بیٹا —— دنیا بھر میں جس جگہ میں جاؤں گا، تمھیں لے جاؤں گا۔

ماں: لیکن پڑھائی کا کیا کرو گے؟ —— اور تمھاری ریلی کا کیا بنے گا؟

یوگ: پتا جی — پتا جی — میں اپنے اسکول میں اسکاوٹ ہوں، کل ہماری ریلی ہے جس میں چیف جسٹس آئے ہیں، وہاں ہمیں انعام بھی ملیں گے۔ مجھے اس کے لیے رومال چاہیے اور مجھے حساب کی ایک کتاب خریدنا ہے۔

شری پت: بیٹا، ایک رومال چھوڑ، میں تمھیں بیس رومال لے دوں گا۔ کل تم میرے ساتھ جانا۔ میں تمھیں بہت سی اچھی اچھی کتابیں خرید دوں گا! بیٹا! پڑھائی ایسی کوئی دولت نہیں۔ تمھیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے جنھوں نے اتنی تکلیفیں سہ کر تمھیں علم کی روشنی دلوائی۔ تمھاری ماں مر چکی تھی...... لیکن...... (رُک جاتا ہے)

ماں: وہ بیچاری جیتی ہوتی تو آج اپنے لال کو دیکھتی (رُک جاتی ہے) اس کے بعد میں نے ماں بننے کا جتن کیا...... اور...... اور...... اب بھی کروں گی۔

یوگ: جو کچھ ماں نے میرے لیے کیا پتا جی، وہ میں جانتا ہوں یا میرا پرماتما!

شری پت: (ہنس کر) ارے یوگ بیٹا تو بہت عقلمندوں کی سی باتیں کرنے لگا ہے...... (اُسے چومتا ہے) ارے ایسے گھبراتے کیوں ہو؟ ٹھہرو مجھے اپنے گال کے ساتھ گال رگڑنے دو۔

یوگ: (جیسے پرے ہٹ رہا ہے) نہیں پتا جی! مجھے بہت کھردرے معلوم ہوتے ہیں۔

(ہنستے ہیں)

ماں: یوگ کے آنے سے پہلے میرے دن پہاڑ برابر ہو رہے تھے۔ جتنا بھی کام کر دیوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پل میں ختم ہو گیا اور اس کے بعد دن...... یوں پتا چلتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا اجگر منھ پھاڑے آ رہا ہے...... جو نہ کھاتا ہے اور نہ چھوڑتا ہے...... پھر یوگ آیا تو کام ہی کام نظر آنے لگا، جیسے اُدھڑے ہوے...... گچھے میں سے تار نکلتا ہی چلا آتا ہے......

شری پت: میں آپ کا بہت احسان مند ہوں۔ شاید میں پورے طور سے اس کا بدلہ نہ چکا سکوں۔

ماں: (شک میں پڑتے ہوے) آپ اس کا بدلہ کیوں چکائیں گے؟...... یوگ جیسے آپ کا بیٹا ہے، ویسا ہی میرا۔

شری پت: ......نہیں...... میں آپ کا احسان کبھی نہیں اُتار سکتا۔

(دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے)

ماں: اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں آپ سے؟ —— پھر مجھے چائے بنانا ہے۔ پتی آ گئی شاید......

شری پت: بڑے شوق سے پوچھیے ——

ماں: آپ جوتن کے ہاں کیسے چلے گئے؟

شری پت: یونہی!...... اور کہاں جاتا؟

ماں: آپ کو پتا نہیں تھا کہ یوگ یہاں رہتا ہے؟

شری پت: یوگ کے ہونے کا مجھے ابھی پتا چلا ہے۔

ماں: آپ نے کسی سے نہ پوچھا؟

شری پت: صرف جوتن کی ماں سے پوچھا تھا۔ اس نے کچھ اس طریقے سے جواب دیا کہ میں نے پہلی اطلاعوں کو درست سمجھ لیا۔ اب پرماتما کا شکر ہے کہ......

ماں: آپ جوتن کے گھر والوں کو پہلے سے جانتے تھے؟

شری پت: ہاں جانتا تھا —— جوتن کی ماں کو جانتا تھا۔ یہ آج سے دس سال پہلے بھی ایسی تھی جیسے آج ہے۔ دراصل کئی عورتیں بوڑھی ہی نہیں ہوتیں۔ بلڈانگ میں ایسی ہی ایک

عورت ہے تھئی (Thei) نام کی۔ جیسے اس کے لکڑی کے مکان کی بیل پر ہمیشہ بہار رہتی ہے، ویسے ہی اس پر......

ماں: جوتن کی ماں آج سے دس سال پہلے بھی ایسی ہی ''آزاد'' تھی۔

شری پت: ہاں...... بالکل ایسی ہی۔

ماں: گویا آپ کو پتا تھا، یہ ایسی عورت ہے تو پھر اس کے مکان پر......

شری پت: بات دراصل یہ ہے......

یوگ: ماں! پھر بازار بند ہو جائے گا، مجھے چیزیں خریدنا ہیں۔

ماں: لو، تم پیسے لو اور بازار چلے جاؤ——

شری پت: ابھی یوگ کو رہنے دیجیے......

ماں: کچھ کھانے کو بھی لیتا آئے گا۔

شری پت: میں نے کہا نا، مجھے کچھ ایسی بھوک بھی نہیں ہے۔ باقی رہی دوسری چیزیں، تو کل صبح میں آپ ساتھ جا کر ریلی کے وقت سے پہلے خرید دوں گا۔ کل اتوار تو نہیں؟

ماں: نہیں کل سنیچر ہے۔

شری پت: اچھا یہ کام ختم کر آتے تو اچھا ہے۔ میرا مطلب تھا کہ اتنی دیر کے بعد ملے ہیں...... تو ذرا پیار محبت کی ہی باتیں ہو جائیں۔ لیکن ساری رات پڑی ہے اس کے لیے۔

ماں: تو اچھا...... نہیں اسے نہ جانے دیجیے...... میرے خیال میں یوگ کو یہیں رہنا چاہیے۔

شری پت: یہ تو میں نے پہلے کہا تھا۔

ماں: آپ نے ٹھیک کہا تھا۔

شری پت: آپ خفا تو نہیں ہو گئیں——؟

ماں: میں کیوں خفا ہونے لگی——؟ اُلٹا مجھے خیال ہے کہیں آپ......؟

شری پت: نہیں میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ مجھ پر جو آدمی الزام لگائے، مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ وہ ضرور کسی نہ کسی حسد اور بغض کا شکار ہوتا ہے۔

ماں: آپ کا مطلب ہے، میں نے کرشنا کی بابت جو پوچھا ہے تو......

شری پت: نہیں نہیں ــــــ میرا کسی خاص بات کی طرف اشارا نہیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہر سکتا تھا۔ یہ بُری شہرت والے گھر ہی ہیں، جہاں مجھ ایسے آدمی کو پناہ مل سکتی ہے۔

ماں: مجھ ایسے کیوں کہا آپ نے؟

شری پت: ہاں بابا!! ایک آدمی جس کے کوئی عورت نہ ہو اور محلّے بھر میں جس کی واقفیت نہ ہو اور کون ٹھہرنے کے لیے جگہ دیتا ہے؟

ماں: آپ میرے ہاں بے کھٹکے آسکتے تھے۔

شری پت: میں نے پہلے عرض کیا نا کہ مجھے یوگ کی بابت پتا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ... مثلاً مجھے اب بھی کھٹکا ہے......

ماں: آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے؟

شری پت: نہیں، اپنی ذات کی فکر نہیں ــــــ مجھے آپ کا خیال ہے۔

ماں: نہیں، اس بات کا خیال نہ کیجیے۔ لوگ نہیں جانتے کہ آپ یوگ کے پتا ہیں اور میں اس کی ماں......؟

شری پت: یہی بات تو آپ کے لیے مفید نہیں۔

ماں: لیکن وہ جانتے ہیں میں اُس کی......اُس کی......سگی ماں نہیں ــــــ

شری پت: سگی ماں ہوتیں تو مجھے ڈر کا ہے کا تھا؟

ماں: اوہ! (وقفہ) ٹھہریے! میں آپ کے لیے چائے بناؤں ..... آپ ہلکی پیتے ہیں...... یا......سخت......

شری پت: تیز۔

ماں: تیز؟......اچھا......اچھا......(جاتی ہے)

شری پت: یوگ بیٹا! کہو کیا حال ہے؟ میں نے پچھلے چھ سات سال میں بہت دُکھ سہے بیٹا! تمھیں اپنی ماں کی شکل یاد ہے؟

یوگ: ہاں پتا جی۔ یونہی تھوڑی تھوڑی۔ اب جو یاد کرتا ہوں تو کبھی ان کی شکل سامنے آجاتی ہے اور کبھی نہیں اور اُن کی شکل ان کی شکل میں گھل مل جاتی ہے!

شری پت: تمھیں اپنی یہ ماں پسند ہے؟

یوگ: مائیں بھی پسند کی جاتی ہیں بھلا ــــــ؟ ماں تو ایک ہی ہوتی ہے۔ کالی ہو گوری ہو۔

شری پت: (گھبرا کر) ہاں! ماں کے چننے کا اختیار کس کو ہے؟ بیٹا! تم تو بہت سیانی باتیں کرتے ہو۔ اِدھر آؤ۔ میرے پاس۔

یوگ: ــــــ اوں ہوں!

شری پت: ارے گھبراتے کیوں ہو؟

یوگ: آپ میرا مُنھ تو نہیں چومیں گے؟

شری پت: باپ اپنے بیٹوں کا منھ چومتے ہیں اور جو باپ سات سال کے بعد اپنے بیٹے کو ملے اور پھر ایسے بیٹے کو جس کی بابت سُن رکھا ہو کہ اس دُنیا ہی میں نہیں۔

یوگ: لیکن میں بہت بڑا ہو گیا ہوں نا؟

شری پت: ارے کتنے بڑے ہو گئے ہو؟ (پکڑنے کی کوشش کرتا ہے) میرے لیے تو تم کچھ بھی نہیں۔

یوگ: اوں ہوں۔ ماں دیکھ رہی ہے۔

شری پت: (ہنستے ہوئے) تو دیکھتی رہے۔ وہ دُور بیٹھی ہے۔ ارے سنو۔ ماں جب باپ کو بیٹے کا منھ چومتے دیکھتی ہے تو وہ خوش ہوتی ہے۔

یوگ: نہیں پتا جی۔ ماں شرما رہی ہے۔ اس کے کان اِدھر ہی ہیں۔

شری پت: وہ تو آگ کے پاس بیٹھنے سے اس کا چہرہ لال ہے۔ اچھا میری بات سنو...... تمھاری ماں کو میں جانتا ہوں۔ اُن دنوں میں باہر گیا تھا ــــــ جب یہ بیاہ کر آئی تھیں۔ بدقسمت بیچاری! ــــــ ابھی عمر ہی کیا ہے تیس بتیس برس کی ہوں گی۔

یوگ: ہاں یہی عمر ہے۔

شری پت: جوتن کی ماں سے بہت چھوٹی ہیں ــــــ اور یوں بھی......

یوگ: جوتن کی ماں کا نام نہ لیجیے۔ اس کا نام لینا گناہ ہے۔

شری پت: لیکن وہ ہر انداز سے...... خیر چھوڑو۔ تم اسے ماں بنانا پسند کرتے ہو؟

یوگ: ماں تو ہیں ہی۔ بتانے کی کیا بات ہے؟

شری پت: نہیں بیٹا! شاید تمھیں......

(ماں چائے لے کر آجاتی ہے)

یوگ: میں کہتا ہوں پتا جی ——— ماں چائے لے آئیں۔

ماں: آپ ذرا کوٹ ووٹ اُتار کر بیٹھ جائیے، مجھے دے دیجیے۔ کوئی دھوتی ووتی دے دوں؟

(وقفہ ——— جس میں دھوتی تلاش کرتی ہے)

آپ اُدھر جا کر کپڑے تبدیل کر لیجیے۔ اور ذرا آرام سے۔

شری پت: نہیں دھوتی ووتی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم وہاں ایمرجنسی میں کپڑوں سمیت سونے کے عادی ہو چکے ہیں۔ البتہ مجھے غسل خانہ بتا دیجیے۔ کدھر ہے۔ میں چائے پینے سے پہلے......

ماں: وہ رہا برآمدے اور بچھے کے درمیان ——— وہ نالی کے ساتھ۔

شری پت: یہ لیجیے میرا کوٹ۔

ماں: آپ نے کوٹ کے نیچے صرف بنیان ہی پہن رکھی ہے۔

شری پت: دراصل یہ ملٹری کے انداز میں سِلا ہوا ہے۔ اسے کوٹ نہیں کہتے ——— (جاتے ہوئے) سامنے جیب میں پیسے ہیں ذرا۔

ماں: بے فکر رہیے، یہاں میرے اور یوگ کے سوا اور کون آتا ہے۔ (یوگ سے) تم مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گے بیٹا؟

یوگ: نہیں چھوڑ جاؤں گا ماں ——— اُلٹا تم ہی مجھے اُن کے حوالے نہ کر دینا۔

ماں: نہیں، میرے لال۔ تمھیں میرے ہاں سے کون لے جا سکتا ہے۔ وہ کیا پوچھ رہے تھے......؟

یوگ: کہہ رہے تھے، میں جانتا ہوں تمھاری ماں کو۔ جن دِنوں میں گیا تھا، اُنھی دِنوں بیاہ کر آئی تھیں۔ بدقسمت بیچاری؟

ماں: اچھا؟ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں......لیکن جب میں بیاہ کر

آئی تھی، تو میں نے انھیں نہیں دیکھا ——— ہاں تھوڑا بہت دیکھا تھا ...... اور کیا کہتے تھے؟

یوگ: کہتے تھے ابھی عمر ہی کیا ہے۔ یہی تیس بتّیس برس کی ہوگی۔ میں نے کہا ہاں، یہی عمر ہے۔

ماں: اچھا! عمر بھی پوچھی تھی ——— اور تم نے کہا اکتیس بتیس برس کی ہوگی؟

یوگ: ہاں تو اور کیا۔

ماں: ارے کہاں بیٹا۔ میں دُکھوں مصیبتوں کی وجہ سے اس عمر کی نظر آتی ہوں، ورنہ میری عمر ستائیس سال کی ہے، خیر۔

یوگ: کہہ رہے تھے جوتن کی ماں سے بہت چھوٹی ہیں ——— اور یوں بھی......

ماں: ——— یوں بھی......؟

یوگ: اس کے بعد چُپ ہو گئے۔

ماں: اچھا میں سمجھ گئی ——— جوتن کی ماں چالیس برس سے کم کی کیا ہوگی۔ اور پھر محلّے کے لوگ اسے جس طرح جانتے ہیں، تمھیں پتا ہی ہے۔

یوگ: ہاں ماں! مجھ سے کیا چھپا ہوا ہے۔

ماں: کوئی اور بات بھی پوچھی ہوگی؟

یوگ: اور پوچھتے تھے تم اُسے ماں بنانا پسند کرتے ہو؟ میں نے کہا ماں تو ہیں ہی، بنانے کی کیا بات ہے۔ اس کے بعد تم چلی آئیں۔

ماں: اچھا ...... (سوچتے ہوے) ...... بھگوان نے میری سن لی۔ اور تمھارے پتا گھر آگئے ...... بس میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تمھیں کہیں دیس بدیس نہ لیے پھریں ...... اور اگر تم جاؤ تو تمھارے ساتھ میں بھی جاؤں گی ...... میں اب اکیلی نہیں رہ سکتی۔ کسی نردئی کو میرا خیال نہیں آتا ...... میرے دیور، یوں میرے نام کی مالا جپتے ہیں۔ وہی تمھارے چچا، جو آج کل دیش کے آگوبنے ہوئے ہیں، جنھوں نے سڑک کی بتّیوں کی روشنی میں وِدّیا حاصل کی۔ کہتے ہیں، گھر کی لاج رکھے بیٹھی ہے اور یوں میرے

پہننے کے لیے ایک چیتھڑا تک دینے کو تیار نہیں۔ میں اس جھوٹی لاج کو کیا کروں......؟
اس مہنگائی میں جو مجھ غریب کا حال ہوا ہے، وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں—— لیکن
اب مجھ سے خالی خولی تعریف نہیں سنی جاتی۔

یوگ: ماں، تم بہت اونچی آواز میں بولنے لگی ہو اور تمھاری آنکھوں میں ...... ماں نہیں ......
نہیں......

یوگ: نہیں ماں، اب ہمارے اچھے دن آرہے ہیں۔

ماں: ہاں بھگوان بُری نظر سے بچائے...... اڑوس پڑوس نے پہلے ہی جلنا شروع کر دیا ہے۔

یوگ: وہ جوتن کی ماں—— بڑی فضول عورت ہے............!

ماں: دیکھو تمھارے پتا کتنے مضبوط آدمی ہیں! تمھیں بھی اُن ایسا بننا چاہیے بیٹا، لیکن تم ہو کہ
دودھ دہی کو منھ نہیں لگاتے اور تلی ہوئی دال کو پسند کیے جاتے ہو...... دیکھو اُن کے
بازو...... ان میں کیسی مچھلیاں سی نظر آتی ہیں۔ اور کتنا......

یوگ: کیا پتا جی میری عمر میں مجھ ایسے دُبلے پتلے ہوں—— ماں! پتا جی کی چھاتی پر اتنے بال
کیوں ہیں؟

ماں: مردوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب تم جوان ہو گے تو تمھاری چھاتی پر بھی بہت
سے بال ہوں گے۔ لو وہ آ گئے۔

شری پت: (قریب آتے ہوے) آپ نے چائے پینی شروع کر دی ہوتی۔

ماں: آپ کے بغیر ہی؟

شری پت: اوہ—— اور یہ سموسے آپ نے کہاں سے منگوا لیے ...... بڑے اچھے ہیں۔ یہ
چوپرتی سموسے......

ماں: صبح یوگ اسکول جاتا ہے نا—— اس کے لیے منگوا رکھے تھے...... میں کہتی ہوں۔
آپ لیٹ جائیے۔ ابھی آپ بہت تھکے ہوے نظر آتے ہیں۔ آپ کا بیٹا آپ کے
پانو دبا دے گا، کیوں بیٹا؟

یوگ: ہاں پتا جی! آپ لیٹ جائیے۔ میں آپ کے پانو دبا دوں گا۔

(کھاتے ہوئے)

شری پت: نہیں بیٹا۔ مجھے عادت نہیں......نہیں نہیں......اچھا......میں اس تپائی پر بیٹھتا ہوں۔
دیکھوں تو میرے بیٹے میں کتنا زور ہے۔

(یوگ دباتا ہے)

ارے آہستہ! تم تو بڑے شہزور نکلے۔

(ماں پیالی پیش کرتی ہے)

ماں: لیجیے ——— یہ پیالی۔

شری پت: اور آپ۔

ماں: میں آپ کے لیے بستر لگا دوں۔

شری پت: نہیں ابھی بہت وقت ہے۔ میں شاید یہاں سو نہ سکوں۔

ماں: آپ یہاں نہ سو سکیں؟ ——— کیوں؟..... اور کہاں جائیں گے آپ؟

شری پت: دیکھیے نا؟ یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا......آپ سب کچھ سمجھتی بوجھتی ہیں۔

ماں: لیکن اس میں حرج کیا ہے؟ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔

شری پت: یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔

ماں: نہیں آپ یہیں آرام کیجیے۔ میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، میں خود پچھواڑے
چلی جاؤں گی۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ اس کا مرد باہر گیا ہوا ہے۔

شری پت: نہیں میں آپ کو ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔ میں اس وقت کہیں رات کاٹ لوں گا۔ پھر
کل دن کو یہاں آجاؤں گا۔ پھر سارا دن آپ کے پاس رہوں گا۔

ماں: آپ جائیں گے کہاں؟

یوگ: کیا آپ جوتن کے ہاں جائیں گے؟

شری پت: ارے نہیں بیٹا! میں یہاں کسی ہوٹل ووٹل میں رات کاٹ لوں گا۔ پھر قریب کے محلے
میں میرا ایک دوست بھی رہتا ہے!

ماں: نہیں! میں آپ کو باہر نہ جانے دوں گی، خواہ مجھے خود کہیں جانا پڑے۔ دیکھیے ہمارا دل

نہ توڑیے۔ یوگ کیا کہے گا۔ اس معصوم بچّے کے دل پہ کیا گزرے گی؟ کیا دُنیا میں ہر جگہ پاپ اپرادھ ہی ہوتا ہے؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک چھت کے تلے سو سکیں اور ان کے نام پر کوئی دھبّہ نہ آئے؟

شری پت: ابھی تک دُنیا والے اتنے بڑے دل والے نہیں ہوئے۔ اور پھر اگر آپ اجازت دیں تو ایک رات کے لیے میں یوگ کو ساتھ لیتا جاؤں۔

ماں: اور میں یہاں اکیلی رہ جاؤں؟......

شری پت: (سوچتے ہوئے) اچھا! یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یوگ کے بنا مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔ آج آٹھ سال کے بعد میں اپنے بیٹے سے ملا ہوں۔ آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ کا کتنا احسان مند ہوں۔ مجھے شبد نہیں ملتے جن سے میں آپ کی تعریف کروں۔ میں اتنا بڑا قرض نہیں اُتار سکتا۔

ماں: لیکن یوگ کے بغیر میں بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ نے اپنی طرف سے یوگ کو...... آپ سمجھتے تھے یوگ اس سنسار میں نہیں ہے۔ میں نے اُسے لے کر پالا۔ اب آپ اُسے ایک رات کے لیے بھی نہیں لے جاسکتے...... مجھے کچھ وشواس نہیں آتا۔ ہائے، میں کیا کروں۔ میں بہت گھبرا رہی ہوں۔

شری پت: اچھا، اس بات کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں کہ میں یہیں رہ جاؤں صرف ——— صرف مجھے آپ کی عزّت کا خیال ہے............

ماں: نہیں۔ میری طرف سے آپ کو یہ آگیہ ہے کہ آپ باہر سو جائیں۔ لیکن بھگوان کے لیے یوگ کو نہ لے جایئے۔ میرا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اور اگر آپ یہاں سونے کے لیے تیار ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ مجھے اپنی عزّت کا زیادہ خیال ہے۔

شری پت: اچھا، لیکن مجھے آپ سے ایک بات اور کرنا ہے۔

ماں: کہیے ——— کس بارے میں، آپ......

ماں: (گھبرا کر) یوگ کے بارے میں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟

شری پت: یہی کہ ——— یوگ کو میں لے جانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا دھنوادی ہوں۔ آپ جو

خدمت کہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔لیکن یوگ میرا بیٹا ہے۔

ماں: نہیں! نہیں!! ـــــ یوگ میرا بیٹا ہے۔آپ اپنی طرف سے اُسے مار چکے تھے۔آپ آج صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں، لیکن اس شام تک آپ یوگ کے پتا نہیں تھے۔ لیکن اب جب کہ میں نے...... نہیں میں یوگ کے بارے میں......

یوگ: پتا جی ـــــ ماتا جی کا کیا ہوگا۔ میں ...... میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔آپ ماتا جی کو بھی ساتھ لے چلیے۔

ماں: نہیں، میں اِس گھر سے باہر نہیں جاؤں گی اور نہ میں یوگ کو جانے دوں گی۔ کچھ تو پرماتما سے ڈریے...... ہے ایشور! پہلے تو نے میرا سہاگ چھینا، اس کے بعد میں نے اپنا دل اس بچّے سے لگایا۔ میں نے دن رات اسے اپنا اپنا کہا، اور آج اُسے بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے............

یوگ: تو یونہی اتنا گھبرا رہی ہے ماں! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اگر میری سگی ماں بھی آ جائے تو میں اس کے ساتھ نہ جاؤں۔

شری پت: دیکھیے، آپ گھبرائیے نہیں۔ میں زبردستی یوگ کو آپ کے پاس سے نہیں لے جا رہا۔ میں آپ سے اس کی بھیک مانگتا ہوں۔ جب تک میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا، تب تک تو ٹھیک تھا۔اب جب کہ میں نے اُسے ایک نظر دیکھ لیا ہے تو میں اُسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ماں: (روتی ہوئی) نہیں نہیں......نہیں نہیں......

شری پت: اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اسے پالا ہے۔یہ بھی درست ہے کہ اگر آپ اسے نہ پالتیں، تو آج میں اس بچّے کا منھ نہ دیکھتا۔شاید یہ کہیں کسی ٹانگے، ٹم ٹم کے نیچے آ کر مر جاتا یا کسی یتیم خانے میں چلا جاتا۔اور زندگی بھر میں اس کا منھ نہ دیکھ سکتا۔لیکن اب ...... اب اصل حالات کو دیکھیے ...... اور قانون کی نظروں میں بھی یوگ میرا بیٹا ہے!

ماں: میں نے جب اسے لیا تو اسی لیے کہ اس کا دُنیا میں نہ کوئی ماں ہے نہ باپ...... ماں تو

اس کی مر چکی تھی، کاش باپ بھی...... نہیں میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں جانتی میں کیا کہہ رہی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ میں اَبھاگی جس چیز کو اپنا کہوں گی وہ پرائی ہو جائے گی۔

شری پت: یہ سمجھ لیجیے کہ آپ ہی اس کی ماں ہیں۔ آپ جب جی چاہے اس سے مل سکتی ہیں، اسے اپنے پاس بُلا سکتی ہیں اور اگر آپ کی طبیعت چاہے تو میں آپ کو اس بچّے کی خاطر ہلڈانگ لے جا سکتا ہوں۔

ماں: نہیں، میں اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی۔ میرے سواس یہیں ختم ہوں گے۔ میں اِس گھر کو نہیں چھوڑوں گی اور یوگ بھی یہیں رہے گا۔

یوگ: نہیں پتا جی! میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ سے ہو سکتا ہے تو اپنے کاروبار کو سمیٹ کر یہاں لے آیئے۔ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میری پڑھائی میں حرج ہوتا ہے۔

ماں: نہیں۔ آپ کو کسی نے بہکایا ہے، ورنہ آپ اتنے پتھر دل نہ ہوتے۔ آپ ہی کا بیٹا، آپ سے منت کر رہا ہے۔ وہ بیٹا جسے آپ نے کھو کر پالیا ہے، جسے آپ آٹھ سال کے بعد ملے ہیں۔ ہائے ایشور! اس سنسار میں دُکھ ہی دُکھ ہے!

شری پت: دیکھیے، آپ بھاوناؤں سے کام نہ لیجیے۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ محلّے، پنچایت سے صلاح کر لیجیے۔ سب یہی کہیں گے کہ شری پت اس بچّے کا باپ ہے۔ اس لیے وہ اسے لے جائے گا۔ باقی رہا اس آٹھ سال کا خرچ وغیرہ۔ سو آپ جتنا چاہیں، مجھ سے لے سکتی ہیں۔ یہ کچھ روپیا میں ابھی آپ کی بھینٹ کرتا ہوں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ آپ کی کچھ سیوا ہے۔

ماں: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے ان روپوں کی خاطر اس بچّے کو پالا؟ کیا میرا یہ خیال تھا کہ یوگ کا باپ آئے گا اور مجھے روپے دے کر اسے لے جائے گا۔ آپ ماں کی محبت کا مول دے رہے ہیں؟ آپ مجھے اتنا نیچ سمجھتے ہیں......

یوگ: پتا جی! آپ ماں کو رُلا رہے ہیں۔ اگر آج............

شری پت: نہیں میں ماں تا کا مول تول نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ پیسے اس لیے دے رہا ہوں کہ

شاید پیسوں سے یوگ کی کمی پوری ہو جائے۔ جیسے پیسے والی بیوہ اپنے رنڈاپے کے دن
تھوڑی آسانی سے کاٹ لیتی ہے......

ماں: نہیں، میں پیسے والی عورت ہوتی تو ایک دن بھی رنڈاپا نہ کاٹ سکتی (بلند آواز میں)
آپ ہٹا لیجیے میرے سامنے سے پیسے ــــــ ہٹا لیجیے ــــــ اُٹھا لیجیے ــــــ!

(پیسوں کے ساتھ تپائی پر سے دوسری چیزیں بھی گر جاتی ہیں)

شری پت: ان باتوں سے میں اپنے بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

یوگ: (روتے ہوئے) میں ماں کے پاس رہوں گا۔

ماں: لے جایئے ان پیسوں کو۔ جس نے آپ کو بہکایا ہے، اس کی بھینٹ کر دیجیے۔ شاید
اُسے پیسوں کی ضرورت ہو۔ مجھے نہیں۔ میں یہ ہانی نہیں جھیل سکتی۔ جایئے یہاں سے
چلے جایئے۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے جایئے۔ اگر میری چیز ہوتی تو میرے
پاس رہتی۔

شری پت: لیکن سُنیے تو......

ماں: نہیں، میں آپ کی کوئی بات سُننے کو تیار نہیں، چلے جایئے۔ اور اپنے بیٹے کو بھی لے
جایئے۔ میں اس کی ماں نہیں۔ میں اس کی ماں بننے سے انکار کرتی ہوں۔ میں نے
دس سال کا رنڈاپا کاٹا ہے تو اسے بھی سہہ جاؤں گی۔ اگر میں اتنے کڑے دل کی عورت
نہ ہوتی تو میں اس طرح بدھوانہ ہوتی ــــــ

یوگ: ماں ــــــ!

ماں: چلے جایئے یہاں سے۔ لے جایئے، اپنے بیٹے کو اور ان کاغذ کے پرزوں کو...... خبردار
جو اِس دہلیز پر شری پت اور اس کے بیٹے نے قدم رکھا تو...... میں ابھی پولس کو بُلواتی
ہوں ــــــ میں نہیں جانتی تھی، انسان اتنا کمینہ ہو سکتا ہے کہ وہ اِن چیزوں کا سودا
کرے...... جاؤ...... چلے جاؤ۔

شری پت: چلو بیٹا۔

یوگ: میں نہیں جاؤں گا ــــــ نہیں جاؤں گا!

شری پت: نہیں، ہم چلیں گے......(یوگ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے) لیکن مجھے بہت افسوس
ہے کہ......اچھا۔

ماں: ایک دم سیڑھیوں سے اُتر جائیے۔
(کچھ دیر کے لیے شری پت ٹھٹک جاتا ہے —— پھر یوگ کو —— اس
کے احتجاج کے باوجود دروازے کی طرف لے جاتا ہے)

یوگ: میں نہیں جاؤں گا —— میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔
(انتہائی غیظ یوگ کی ماں پر غلبہ پالیتا ہے)

ماں: ......شاید......شاید اس کمینے آدمی کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ اس نے غلطی کی۔
شاید وہ پشچاتاپ کے لیے پھر ان سیڑھیوں پر قدم رکھے۔ (دانت پیس کر)......ذرا
بات سنتے جائیے گا۔
(شری پت واپس آتا ہے اور یوگ کا راستہ روکنے کی غرض سے دروازے
میں کھڑا رہتا ہے)

یوگ: مجھے اس طرح نہ نکالو ماں —— میں مر جاؤں گا، ماں!

ماں: ٹھہرو......تم نے استری کی بھاوناؤں کا مول ڈالا ہے نا۔ ممتا کی قیمت لگائی ہے ——
تو میں تمھارا مول نہیں لگا سکتی؟ لاؤ روپے اِدھر پھینکو تا کہ میں تم ایسے کمینے رذیل انسان
کو کبھی بھولے سے نہ دیکھ پاؤں —— شاید کہیں پشچاتاپ پھر تمھارے نیچ قدم
میرے دروازے پر ڈال دے۔

شری پت: (پیسے دیتے ہوئے) لیجیے —— لیکن میری بات تو سُنیے۔

ماں: یہاں رکھ دیجیے پیسے —— اور اب جائیے (بلند آواز میں) دیکھ کیا رہے ہیں ——
چلے جائیے، اس سے......
(شری پت گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یوگ کی ماں غش کھا کر پلنگ پر
گر جاتی ہے —— پردہ گر جاتا ہے)

نقلِ مکانی

افراد:

نفیس: ایک معمولی آدمی جو محکمۂ نہر میں ملازم ہے

عذرا : نفیس کی قبول صورت بیوی—— گانے کا شوق رکھتی ہے

مراتب: کاٹھ بازار کا پنواڑی

سیّاں: ایک آوارہ اور ذہین طالب علم جس کا اصل نام امجد حسین ہے

بنواری لال: محلّہ دار

مرزا شوکت: محلّہ دار

سب انسپکٹر مائیکل

دو سپاہی

شیو برت: ایک عیّاش رئیس

پہلا منظر

محلّہ کاٹھ بازار کا ایک مکان۔ نفیس اور اُس کی بیوی عذرا اس مکان میں نئے آئے ہیں۔ ابھی ان کا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے، جسے دونوں میاں بیوی قرینے سے دھرنے میں مصروف ہیں۔

عذرا: (آرام کے لیے رُکتے ہوے) توبہ! کتنی خاک چھانی......اور جو ملنے کو آیا مکان تو

کیسے جھٹ سے مل گیا۔

نفیس: (چارپائی پر بیٹھ کر اپنا نیا جوتا اُتار دیتا ہے اور اپنے پانو سہلاتا ہے) ہاں، اسی بات پہ تو میں حیران ہو رہا ہوں۔ دراصل مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں کسی اور مکان میں بیٹھا ہوں ...... پانو ابھی تک دُکھ رہے ہیں۔ ایک سارے دن کی دوڑ دھوپ، دوسرے نیا جُوتا...... (پلٹ کر) عذرا تھوڑا پانی گرم کر دو بھئی۔

عذرا: معلوم ہوتا ہے حمام کا پیندا ادلا بدلی میں ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن پانی گرم ہو جائے گا۔

نفیس: جب بوجھے کو سر پر سے پھینک دیا جاتا ہے تو کتنی دیر یوں معلوم ہوتا ہے، جانے کوئی اوپر کی طرف اُٹھا رہا ہے۔ اتنی تھکن اور تکلیف کے ہوتے ہوئے بھی ایک طرح کا سبک پن......

عذرا: چشم بد دور! بس انہی دو کمروں کی ضرورت تھی اور اتنا ہی کرایہ دینے کی توفیق۔ مہنگائی کے اِن دنوں میں سولہ روپے بھی بھلا کوئی کرایہ ہے؟

(پھر کام میں مشغول ہو جاتے ہیں)

نفیس: اندازہ کرو۔ وہ حویلی بکائن والے اُن کمروں کے پچاس روپے بتاتے تھے۔ شاید سمجھنے والا نہیں کوئی۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ تنخواہ قرق کر لیا کرو صاحب۔ سوچو، اتنے کمروں کی ہمیں ضرورت بھی کیا تھی؟

عذرا: اور جونئی آبادی میں کمرے دیکھے تھے، یاد ہیں؟ سیل کتنی دور چھت کی طرف لپک رہی تھی اور پڑوس کی گوجرانی بضد کہ ہم اوپلے دیوار پر ہی تھاپیں گے۔ لے بھئی تو اب تھاپ لے اُپلے جی بھر کے (رُک کر) لیکن میں اگر وہاں رہ جاتی تو اُسے بتا دیتی ایک بار۔

نفیس: ہاں، وہ تو تمھاری بات ہے۔

عذرا: اور وہاں کوڑا کرکٹ جلانے والی چمنی بھول گئے ...... اُف ...... اُف ...... کتنی بُو آتی تھی!...... (ناک پر دوپٹا رکھ لیتی ہے)

نفیس: اس پنواڑی نے کس آرام سے چابیاں تھما دیں میرے ہاتھ میں (ایک دم رُک کر)

مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔

عذرا: اور کہہ رہا تھا کہ مہینے بھر سے خالی پڑا ہے مکان۔ کوئی گاہک نہیں لگا ہوگا مہینے بھر میں بھلا؟

نفیس: خدا جانے کیا معاملہ ہے؟ ——— یہ دیواریں کچھ خراب ہیں، لیکن......

(دیوار کو چھوتا ہے)

عذرا: کہاں خراب ہیں دیواریں؟...... بس ذرا سا شک پڑا تو دیواریں بھی خراب نظر آنے لگیں، چھت بھی گرتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کواڑ بھی پُرانے ہیں، تم کہنے لگو گے بالکل ٹوٹے ہوئے ہیں...... (بڑھاؤ کے اوپر اور نیچے سیاہ نشان دیکھتے ہوئے) شاید شمعدان بنا رکھا تھا ہم سے پہلے اِدھر رہنے والوں نے...... میں کہتی ہوں، یہاں بجلی نہیں ہے کیا؟

نفیس: ہے تو، لیکن شاید وہ لوگ بجلی استعمال نہ کرتے ہوں۔

عذرا: (ہنس کر) شاید اندھیرا پسند کرتے ہوں۔

نفیس: تمھیں اندھیرے کے معجزوں کا کیا پتا۔ جب اندھیرا ہوتا ہے تو بہت سی خدائی کا ایک طرح سے دن شروع ہوتا ہے (میز کو کونے کی طرف سرکاتے ہوئے)...... اِس میز کو ہات دیجیو ذرا......

(کونے میں پڑے ہوئے گھنگرو نفیس کے پانو کے ساتھ ٹکراتے ہیں)

ارے: ——— یہ کہاں سے آئے؟

عذرا: (میز رکھ کر) دکھاؤ۔

نفیس: ہم سے پہلے یہاں رہنے والے اسے یہیں بھول گئے۔

عذرا: ان میں سے کوئی ناچتا ہوگا۔

نفیس: تمھارے لیے چھوڑ گئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ نئے آنے والوں میں بھی کوئی گانے کا شوق رکھتی ہے اور گاہے ماہے ———

عذرا: گاہے ماہے کیا؟

نفیس: ——— تھرک بھی جاتی ہے۔

عذرا: اوہو، جانتے ہی نہ ہوں بھلا۔

نفیس: ذرا پانو میں باندھو اور......

عذرا: ہونہہ! اسباب جوں کا توں بکھرا ہوا ہے اور آپ کو اپنی پڑی ہے...... میں سوچتی ہوں اس شمعدان میں سرسوں کا تیل جلانے والے اتنے باذوق تھے؟

نفیس: تو کیا خوش مذاقی کا امیر لوگوں نے اجارہ لے رکھا ہے (عذرا کے سامنے میز پر بیٹھ جاتا ہے) اپنی طرف دیکھو تم......

عذرا: (شرما کر) چلو ہٹو۔

نفیس: بات یہ ہے تم بھی عام آدمیوں کی طرح باہر کی ٹیپ ٹاپ دیکھتی ہو۔ میں اگر اچھی شکل والا ہوتا اور اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا تو شاید مکان کے لیے مجھے اتنا پریشان نہ ہونا پڑتا۔ جس کے سامنے جا کر مکان کے لیے سوالی ہو، اُس نے پہلے مجھے سر سے پانوک ناپا اور پھر جھٹ سے کہہ دیا ——— کون زمانے کی بات کرتے ہو میاں، راستہ پکڑو...... گویا میں اُٹھائی گیرا ہی تو ہوتا ہوں۔ (غصہ کے ساتھ میز پر سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) بعض دفعہ جی چاہتا ہے اُٹھائی گیرا ہی تو ہو جائے آدمی......

(عذرا کی طرف دیکھتا ہے تو غصہ اُتر جاتا ہے)

دُور کیوں جاؤں، میں اپنی عذرا کے لیے وامق نہ ہوا......

عذرا: یہ وامق کون احمق تھا؟...... اور پھر اس بات کا تقاضا کرنا بھی تو سنک ہے کہ کوئی آدمی کو اندر سے دیکھے اور باہر سے نہ دیکھے۔ تمھارا کیا خیال ہے، رُوح جسم کو خوبصورت یا بدصورت نہیں بناتی؟

نفیس: یہ الگ بحث ہے عذرا...... لاؤ ذرا ہتھوڑی پکڑانا، کھڑکی پہ کیل گاڑ دوں (کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے) میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم کسی کی شکل دیکھ کر اس کی طینت کے متعلق شک کرو، تو اُس شخص کی بدطینتی پر افسوس نہیں کر سکتیں......

عذرا: دیکھو، دیکھو، دیکھو...... یہ باہر جو کھڑکی کھلتی ہے، پان کی پیک سے بھری ہوئی ہے۔ اِدھر ہات مت بڑھانا۔ میں کہتی ہوں...... یہ پان کی پیک، یہ شمعدان...... میرا ماتھا ٹھنکتا ہے، ذرا بلانا تو پنواڑی کو۔

نفیس: مراتب کو؟ —— میں بُلاتا ہوں۔ تو ابھی دیا جلا دے شام ہو رہی ہے۔

عذرا: دِیا تو نہیں ہے لیکن اِس کٹوری سے دیے کا کام چل جائے گا۔

نفیس: ہاں، ہاں اسی کٹوری کو شمعدان پر رکھ دو۔

عذرا: میں تو نہ رکھوں شمعدان پر کٹوری کو...... تم مراتب کو بُلا ؤ۔ یا تو اس جگہ چھوت کی بیماری کا کوئی مریض رہا ہے اور یا...... یا......

نفیس: ورنہ آج کل جنگ کے دنوں میں اتنی دیر مکان خالی رہنے کے کیا معنی؟

(دروازے سے باہر جھانک کر)

مراتب...... میاں مراتب، ذرا اِدھر آنا بھا——ئی!

(دور سے آواز آتی ہے)

پنواڑی: آیا صیب!

نفیس: (عذرا سے) جانے کیا ماجرا ہے...... چھوت کی بیماری کے علاوہ کیا اندازہ لگانے لگی تھیں تم؟

عذرا: اِس مکان میں کوئی پیر رہتا ہوگا اور یہاں رہنے والے اس کا دِیا جلاتے ہوں گے، اور جہاں تک میرا خیال ہے، ہفتہ بھر میں ایک دو دن ضرور پیر کا دِیا جلانا پڑتا ہوگا، نہیں تو بجلی والے اس مکان میں سرسوں کا تیل جلانا کیا مطلب رکھتا ہے؟

نفیس: اب تمھیں بھی اس مکان میں نقص نظر آنے لگے —— ایک برس ہوا ہمیں مکان تلاش کرتے ہوئے، تب کہیں جا کے یہ دو اچھے کمرے ملے ہیں۔

عذرا: میں خود اسے پسند کرتی ہوں لیکن......

نفیس: میں لیکن ویکن کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے اب مکان تبدیل نہ ہوگا۔ یہ سمجھ رکھیو...... چھوت کا مریض رہا ہوگا تو فرش فنائل سے دھولیں گے۔ سفیدی کروالیں گے،

دیواریں کھدوا کر نیا پلستر کروالیں گے ——— پیر ہوا تو روز سرسوں کا دیا جلالیں گے۔

(دروازے میں مراتب نظر آتا ہے)

مراتب: حکم سرکار۔

نفیس: بڑے میاں ہمیں ایک بات پوچھنا ہے۔

عذرا: (ڈرتے ہوئے) ہاں بڑے میاں۔ ٹھیک ٹھیک بتادو۔ تم نہیں بتاؤ گے تو ایک دن ہمیں اپنے آپ پتا چل جائے گا۔ کیا یہاں کوئی بیمار رہا ہے یا کوئی پیر ہے جس کا دیا جلانا پڑتا ہے یا کوئی اور بات ہے؟ دیکھو جھوٹ مت بولنا، آخر تم بھی بال بچے دار ہو!

پٹواڑی: دیکھیے، سرکار۔ جھوٹ بولنا اپنا اصول نہیں ہے اور پھر یہ مکان کون میرا اپنا ہے جس کی خاطر اپنا ایمان گروی رکھوں...... آپ سے پہلے یہاں شادو رہتی تھی۔

نفیس: شادو رہتی تھی، کون شادو؟ ———؟

پٹواڑی: شادو ——— شمشاد بائی! (عجیب سی ہنسی ہنستا ہے) آپ اسے نہیں جانتے؟ واہ۔ اس شہر میں کون بابو لوگ ہے جو شادو کو نہیں جانتا!

نفیس: (کچھ برہم ہو کر اپنے ہات کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیتا ہے) میں جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں، بڑے میاں! ہمیں تمھاری شادو سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔

پٹواڑی: اجی بابو صاحب! شادو کے قصے اخباروں میں چھپ گئے۔ اس کے نام کے اشتہار بازاروں میں لگ گئے اور آپ کہتے ہیں پتا ہی نہیں ...... نہیں نہیں، دراصل آپ مجھے بنا رہے ہیں ——— ہیں نا؟ شادو یہاں "جس طرح مجھ کو لگی ہے میرے یللہ کسو کی" گایا کرتی تھی اور بڑے بڑے لوگ اس کا مجرا کرواتے تھے۔ وہ بڑی امیر تھی لیکن تھی بڑی کنجوس ——— آخر اُسے سمجھ آگئی کہ بنا چوک میں جائے دھندا نہیں ہوگا۔

عذرا: تو شمشاد بائی کوئی طوائف......

پنواڑی: جی ہاں، طوائف ہی تو تھی،......اُس کے مقدمے کی بابت بھی آپ نے کچھ نہیں پڑھا۔ وہ دراصل بہت بڑی رنڈی تھی جو میرے یللہ کسو کی، گایا کرتی تھی—— شادو! کاٹھ بازار کے بیچ میں سرکار نے بھی پسند نہ کیا۔ اور اُسے نوٹس دیا، پولس آئی لیکن شادو کو کوئی نہ ہلا سکا۔ پھر وہ اپنی مرضی سے چلی گئی......

نفیس: تم نے پہلے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

پنواڑی: مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور میرا خیال تھا، آپ جانتے ہی ہوں گے۔ دراصل آپ نے اتنی جلدی کی—— چار بجے شام آپ نے چابیاں لیں اور چھ بجے یہاں آدھمکے۔ اب کیا بگڑ گیا ہے، مکان پر آپ کی مُہر تو لگ ہی نہیں گئی۔

عذرا: لیکن اب ہم جائیں کہاں۔ جو مکان ہم نے خالی کیا، اس کے بیسیوں گاہک تھے۔ اِدھر ہم نے سامان نکالا، اُدھر انھوں نے رکھ لیا۔

نفیس: یہ بات چابیاں دیتے ہی بتا دینی چاہیے تھی، مراتب صاحب!

پنواڑی: میں نے تو سمجھا تھا، آپ اس قصے کو جانتے ہی ہوں گے۔

نفیس: (چمک کر) پھر وہی بات۔ کیا ہمیں بھی تم ایرے غیرے سمجھتے ہو جو یہ جانتے ہوئے بھی چلے آئیں—— جاؤ، کتھا اور چونا لگاؤ اور شادو کے گیت گاؤ...... معلوم ہوتا ہے تمھیں بھی شریف اور بدمعاش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

پنواڑی: دیکھیے ذرا سنبھل کر بات کیجیے۔ کسی کے ماتھے پہ شریف تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے۔ میں نے جانا جیسے دوسری دُنیا ہے، ویسے ہی آپ ہوں گے۔

عذرا: اب زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے بڑے میاں!

پنواڑی: میں نے کوئی بُری بات نہیں کی سرکار۔ دوسرے لوگ کہیں جیب کترے نہیں ہیں۔ آپ کی مرضی ہے آپ رہیں، نہیں مرضی، تو نہ سہی—— چابیاں میرے حوالے کر دیں اور نیا مکان تلاش کر لیں۔ میں جاتا ہوں، شام ہی کا تو وقت ہوتا ہے تھوڑے پیسے کمانے کا—— (جاتا ہے)

عذرا: (مایوسی سے) اب کیا کریں؟

نفیس: (سرد آہ بھر کر) چلو، یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا، مجھے یقین ہو چلا تھا کہ تمام دُنیا ایک سی نہیں ہے۔ کم سے کم ایک آدمی ایسا ہے جس نے ہماری شرافت کی قدر کی ہے......
(کھڑکی کی طرف جاتا ہے) پان کی پیک سے بھری ہوئی یہ کھڑکی بتا رہی ہے کہ شادو اس بنواڑی کی آمدنی کا ذریعہ تھی اور اس کے چلنے جانے کا مراتب کو افسوس ہے......(سوچتا ہے)......عذرا ان گھنگروؤں کو وہاں رکھ دو اور آؤ بیٹھ جاؤ۔

عذرا: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) خدا جانے یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے! (سہم کر نفیس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے)

نفیس: جانے کون جاگیریں اُجڑتی رہی ہوں گی اور کن کن کے سہاگ کا مذاق اُڑایا گیا ہوگا۔

عذرا: بھانت بھانت کے آدمی آتے ہوں گے یہاں......

نفیس: یونہی تھوڑے ہمارا سنگِ اسود کالا اور کثیف ہوتا جا رہا ہے......لیکن دیکھو عذرا، اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ طوائفوں کی بستی جب شہر کے بڑھنے سے باہر چلی جاتی ہے، تو ان کی جگہ تمھارے ایسی گرہستنیں ہی تو رہتی ہیں——

عذرا: (سمٹ کر) یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے ڈر سا لگتا ہے، جیسے میرا دل کسی بات کو مان نہیں رہا۔

نفیس: مجھے تو اس بوڑھے کی بیوقوفی پر ہنسی آتی ہے (ہنس کر) ''تم شادو کو نہیں جانتے؟'' لیکن عذرا جب تک اپنا دل صاف ہے، ہمیں کسی بات سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ دوسرے کے گناہوں کا حساب ہمیں تھوڑے ہی دینا ہے—— میں بستر کھولتا ہوں، تم دیا سلائی سے ذرا بتی اوپر کر دو۔

عذرا: یاد آیا۔ تم نے گرم پانی کے لیے کہا تھا۔ شاید ٹوکری میں کوئلے ہوں...... مجھے یہ سارا گھر جانے بیماری کے کیڑوں سے پٹا ہوا معلوم ہوتا ہے—— میں کیا کروں، میرا دل یونہی کانپ رہا ہے۔

نفیس: عذرا—— میری جان! اب ایک نیا مکان تلاش کرنا خالہ جی کا باڑا تو ہے نہیں۔

یہاں سب طرح سے صفائی ہو جائے گی۔ فنائل، سفیدی سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر جس جگہ پر بیٹھ کر اللہ کا نام لیں گے، وہ جگہ پاک اور صاف ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہے......

(دروازے پر دستک سُنائی دیتی ہے)

عذرا: یہ کون ہوا بھلا؟

نفیس: خدا جانے کون ہے —— اور اسے ہمارے یہاں ہونے کا کیسے پتا چل گیا؟

عذرا: دیکھو تو —— کہیں تمھارا بھانجا ہی نہ ہو۔ میں نے کہا تھا اِدھر ہم نئے ہیں۔ ذرا خبر لیتے رہنا۔ اور ہاں تمھاری بھانجی کی شادی طے ہو گئی ہو گی —— نصیرہ کی۔ دیکھو تو۔

(نفیس جاتا ہے اور دروازہ کھولتا ہے)

نفیس: آیئے صاحب!

سیّاں: السّلام علیکم۔

نفیس: وعلیکم السّلام: کہیے کیسے تشریف لائے، آپ کا نام......؟

(عذرا اُٹھ کر اندر چلی جاتی ہے)

سیّاں: میرا نام؟ ...... میرا اصلی نام امجد حسین ہے۔ میں یہاں طالب علم ہوں۔ ...... یہاں کا مطلب، یہ مکان نہیں۔ میری مراد اس شہر سے ہے...... لیکن مجھے سیّاں کے نام سے پکارتے ہیں۔

نفیس: کہیں آپ اِس مکان کے مالک تو نہیں؟

سیّاں: نعوذ باللہ —— نہیں!...... لیکن ایک طرح سے مالک ہی سمجھیے......

نفیس: معاف کیجیے، میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا...... اور نہ آپ کا اس وقت تشریف لانے کا مدعا جان سکا ہوں۔

سیّاں: دیکھیے، ایک وقت میں ایک سوال کیجیے تا کہ آپ کو سوال کرتے ہوئے اُلجھن ہو اور نہ مجھے جواب دیتے ہوئے کوفت محسوس ہو۔ یہی تو ظلم ہوتا ہے میرے ساتھ کہ

ایک سانس میں لوگ مجھ سے بیسیوں سوال کر جاتے ہیں،...... کالج میں، گھر میں، بازار میں ہر جگہ یہی ظلم ہوتا ہے...... تو پہلے آپ میرا نام پوچھ رہے تھے۔

(آگے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن نفیس اسے اشارے سے وہیں چارپائی پر بٹھا دیتا ہے)

نفیس: جی ہاں، نام پوچھ رہا تھا ـــــ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو......

سیّاں: میں نے عرض کیا نا، میرا اصل نام امجد حسین ہے۔

نفیس: نہیں صاحب! اس سے پہلے نام کے بارے میں قطعاً کوئی بات نہیں ہوئی۔

سیّاں: (پرشکوک انداز میں) کوئی بات نہیں ہوئی؟...... مگر اس کا کیا مطلب ہے، آج یہاں نام کیوں پوچھا جا رہا ہے؟...... خیر، میرا نام امجد حسین ہے، لیکن مجھے سب سیّاں کے نام سے پکارتے ہیں۔

نفیس: آپ کی ماں بھی آپ کو سیّاں کے نام سے پکارتی ہوگی؟

سیّاں: جی ہاں (کچھ سمجھتے ہوئے) لیکن...... لیکن...... سو آپ سے درویش صورت انسان بھی یہاں...... سچ ہے بابا، سب سچ ہے......

(اُٹھ کر اندر جانے کی کوشش کرتا ہے)

نفیس: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... دیکھیے آپ زبردستی اندر جا رہے ہیں، اور آپ پیے ہوئے ہیں۔

سیّاں: ش ش۔ خاموش۔ میں سیّاں ہی تو ہوں، جاؤ اندر جا کر شادو کو اطلاع کر دو۔

نفیس: دیکھیے سیّاں صاحب۔ اب آپ کی شادو یہاں نہیں رہی۔ یہ شریف آدمیوں کے رہنے کی جگہ ہے۔

سیّاں: شکل سے تو آپ شریف ہی نظر آتے ہیں واللہ۔ ابھی میں ہر روز تھوڑے ای ادھر آتا ہوں۔ جب ڈپٹی صاحب منی آرڈر بھیجتے ہیں اور امتحان کے دن نزدیک آتے ہیں...... اوہ ڈپٹی صاحب کے نام سے ڈر گئے؟ ارے سیّاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا۔ تم یہ بازو راستے سے ہٹالو......

نفیس: دیکھو، دیکھو میاں صاحبزادے تم کیا کر رہے ہو؟

(پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیتا ہے)

سیاں: سو تم ویرکا کے رئیس ہو۔ تمھی نے شادو کو گھر ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تم نے اس گھر کو اپنا گھر بنانا اچھا سمجھا۔ میں سمجھ گیا، سب کچھ سمجھ گیا۔

نفیس: دیکھو، زیادہ باتیں مت بناؤ، کہے دیتا ہوں۔ یہاں سے فوراً نکل جاؤ، ورنہ میں شور مچاؤں گا۔

سیاں: شور مچاؤ گے اور لوگوں کو اکٹھا کرو گے؟ بس اسی بات سے تمھاری شرافت کا پتا چلتا ہے۔ کیا تم خود بدنام نہ ہو گے۔ لوگ آٹھ مجھے کہیں گے اور دس تمھیں سنائیں گے۔ لوگوں کو سچ اور جھوٹ کی طرف بٹ جانے کا ملکہ ہے، ارے؟ کبھی شریف لوگ بھی شور مچاتے ہیں؟ وہ ہر قسم کی ذلت چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ شریف ہیں۔ (ایک ہچکی آتی ہے) نفیس کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن سیاں اسے روک دیتا ہے)

میرے باپ کی کچہری میں روز عزت کے لیے مقدمے لڑے جاتے ہیں اور عزت چاہنے والوں کی خوب بے عزتی ہوتی ہے۔ ان کی ماں اور بہن کے متعلق وہ کچھ کہا جاتا ہے کہ سن کر کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ اسی لیے شریف آدمی اپنی بیٹی تک کی بے حرمتی دیکھ کر عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ——

نفیس: میاں صاحبزادے، یہ سب درست ہے، اسی لیے میں تمھیں منت سے ٹل جانے کے لیے کہتا ہوں، ورنہ شاید مجھے شور مچانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔

(سیاں کو ڈھکیلتا ہے)

سیاں: دیکھو —— مجھے ڈھکیلو مت۔ باتیں کرنے سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا (قدرے بلند آواز میں) شادو، مجھ سے یہ بدسلوکی دیکھ کر تم چپ بیٹھی ہو؟ (اندر دیکھتے ہوئے) تم اتنی دبلی کیوں ہو گئی ہو! یا شاید یہ میری آنکھوں کا قصور ہے۔ (لرزتی ہوئی آواز میں) مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا...... کتابیں لکھنے والوں نے

ایک ہی چیز کے متعلق متضاد باتیں کہہ کر میرے دماغ کو الجھاؤ میں ڈال دیا ہے...... میری آنکھوں میں نقص ہے۔ (ڈر جاتا ہے) وہی چیز جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں نظر نہیں آتی — اردگرد کی سب چیزیں دکھائی دیتی ہیں، لیکن وہ چیز جس پر میں نگاہ ڈالتا ہوں، درمیان سے غائب ہو جاتی ہے......

کیا اس سے بڑی بیماری بھی ہے کہ تم جو چاہو تمھیں دکھائی نہ دے اور جو نہ چاہو نظر آتا رہے۔ دیکھو، تم پھر دھکیلنے لگے۔ باتیں سننے میں کیا حرج ہے بھائی؟...... شادو! تمھیں دیرکا کے اس رئیس نے گھر ڈال لیا ہے (اندر دیکھتے ہوئے) کیا یہ سچ ہے کہ یہ خبیث تمھیں باہر کی روشنی نہیں دکھاتا اور اسی لیے تم اتنی مریل ہو گئی ہو — لیکن تمھارا رنگ اور بھی کھل گیا ہے...... نہیں، مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا — تمھیں دیرکا کے رئیس نے نہیں، تمھیں اس بڑے دیرکا کے رئیس نے مجھ سے چھین لیا ہے — خدا جانے بے رحم خدا نے...... (رونے لگتا ہے)

نفیس: خدا جانے میں تمھاری باتیں کیوں سنتا جا رہا ہوں؟ تم شکل سے شریف خاندان کے لڑکے نظر آتے ہو، شاید اس لیے۔ لیکن تم ہو کہ برابر شور مچائے جا رہے ہو۔ لوگ سن کر کیا کہیں گے؟

سیاں: لوگ؟ لوگ کیا کہیں گے؟...... دیکھو مجھے گھورو مت۔ ہر جگہ مجھے یہی "لوگ" گھورتے نظر آتے ہیں۔ ان "لوگوں" نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ انھوں نے میرے ایک دوست کو پاگل کر دیا۔ وہ ذہین تھا، بلا کا ذہین تھا — اسے "لوگوں" نے بتایا کہ عورت کا ننگا جسم ایک ناپاک شے ہوتی ہے اسے مت دیکھو، اپنی آنکھیں بند کر لو۔ خوبصورت چیز کو دیکھنے کی خواہش کو دبا دو، کچل دو — انھوں نے کہا، پھول کو کپڑے پہنا دو، یہ آرٹ ہے...... میرے دوست نے پانی میں چند کلیوں کو نہاتے دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے پھر ان کلیوں کو سیل شبنم میں نہاتے دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں، دیکھا، آنکھیں بند کر لیں — خواہش نے آنکھیں کھولیں "لوگوں"

نے بند رکھیں ــــ کھولیں، بند کیں، کھولیں، بند کیں ــــــ اور آج اس کی آنکھیں پل میں سو بار کھلتی اور بند ہوتی ہیں ــــ وہ ان کا کوئی بھی علاج نہ کرسکا...... (آناً فاناً) شادو! مجھے اس شہدے سے بچاؤ ــــــ مجھے یہ تمھارے پاس نہیں آنے دے رہا، پھر تم نہیں گاؤ گی؟ ــــــ

سیّاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی

(نفیس سیّاں کو اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن سیّاں برابر اپنی بات کہے جا رہا ہے)

سیّاں: امتحان سے ڈر کر آج میں نے بے اندازہ پی (زبان لبوں پر پھیرتے ہوئے) شراب میرا کلیجہ چٹ کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ پانو کانپ رہے ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے...... تم بھول گئیں ــــــ

جو تورے سیّاں کو بھوک لگے گی

لڈّو پیڑا جلیبی بن جاؤں گی ــــــ سیّاں توری گودی میں ــــ

(نفیس سیّاں کو دروازے تک ڈھکیلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن سیّاں مضبوطی سے دروازہ پکڑ لیتا ہے)

سیّاں: میں کرسی اور پلنگ کے درمیان دیکھ رہا ہوں ــــــ اور تمھاری پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ مجھ سے اندھا اچھا ہے شادو۔ ہائے، یہ سب کچھ نظر بھی آ رہا ہے اور نہیں بھی آ رہا...... میرے اللہ......

نفیس: دروازے کے ایک طرف منھ نکالتے ہوئے) مراتب ــــــ مراتب میاں!

(دروازے پر عذرا نمودار ہوتی ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے رُک جاتی ہے لیکن پھر ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھتی ہے)

عذرا: صاحب آپ کون ہیں؟ ــــــ آپ باہر کیوں نہیں جاتے۔ یہ شریف آدمیوں کا مکان ہے۔ شادو نے یہاں سے مکان تبدیل کرلیا ہے۔ آپ نکل جایئے فوراً یہاں سے......

سیّاں: (پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) یہ آواز بھی گھر اور بازار کی آوازوں میں کھو کر رہ گئی۔ یہ شادو کی آواز نہیں، اس سے اچھی آواز ہو گی لیکن یہ شادو کی آواز نہیں ــــ شادو کی آواز ــــ!

(مراتب آتا ہے)

مراتب: ابے کون ہے تو؟ ــــ نکل باہر شہدے، کمینے......

نفیس: مراتب! گالی مت دو اسے ــــ فقط باہر نکال دو ــــ

عذرا: دیکھو، مارو نہیں، گمراہ طالب علم ہے بیچارہ ــــ

مراتب: کئی بیچارے گمراہ طالب علم آتے تھے اس کے یہاں ــــ نکل باہر چھوکرے......

(کشمکش۔ مراتب اُسے دھکا دے کر باہر گرا دیتا ہے۔ لڑکے کے گرنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ بند ہوتا ہے)

دوسرا منظر

اسی مکان کا سونے کا کمرہ۔ رات کا وقت ہے اور نفیس باہر سے آ کر کپڑے بدل رہا ہے۔ عذرا اُس کا کوٹ، اس کے موزے وغیرہ لے کر باری باری مناسب جگہ رکھ رہی ہے۔

عذرا: بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہو، آج کام بہت تھا کیا؟

نفیس: دفتر میں کوئی کام نہیں ہے۔ البتہ دوسری باتیں تھوڑی ہیں پریشانی کے لیے۔

عذرا: دوسری باتیں؟ ــــ کوئی اور مکان دیکھا؟

نفیس: مکان کے لیے بہت کوشش کی لیکن کوئی ہو تو بات بنے۔ یہ غریب ہونا بھی ایک لعنت ہے، ورنہ ایسے ہی دو کمرے پینتیس روپے میں ملتے تھے۔

عذرا: پینتیس تو ہم کسی صورت میں نہیں دے سکتے ــــ کھانا؟

نفیس: تمھارا خیال ہے میں ابھی تک بھوکا ہوں گا۔ دفتر کی ٹک شاپ سے بھتیرا الّم غلّم کھا لیا اور چائے پی ــــ اس دفعہ بل بھی بہت بن جائے گا۔ جب کوئی

گھبراہٹ ہوتی ہے تو کھانے پر زور دیتا ہوں۔

عذرا: اور مجھے کھانا پینا سب بھول جاتا ہے (کچھ یاد کرتے ہوئے) میں نے تو بیس بار کہا ہے کچھ پراٹھے ساتھ لے جایا کرو۔

نفیس: کون مصیبت کرے (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) اور پھر دفتر میں لیموں نچوڑ بابو ہے۔

عذرا: لیموں نچوڑ بابو؟

نفیس: ہاں، اپنا ایک لیموں کسی کی دال میں نچوڑ کر برابر کا حصّہ دار بن جاتا ہے———

(دونوں خفیف سی ہنسی ہنستے ہیں)

عذرا: تو پھر دو باتیں تو نہیں ہو سکتیں کہ بل بھی نہ بنے اور بھوک بھی اُتر جائے۔

(نفیس اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں دے لیتا ہے)

کیوں چُپ چاپ بیٹھ گئے؟

نفیس: اور تو کیا شور مچاؤں؟ دیکھو مجھے یوں تنگ نہ کرو عذرا——— مجھے آرام سے سو جانے دو۔

عذرا: آئے ہائے——— راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پک جاتی ہیں۔ شادو کے کاکوں سے ڈرتے ہوئے، سارا دن کواڑ بند کیے اندر پڑی رہتی ہوں اور اب———

نفیس: (چڑ کر) نہ اندر پڑی رہا کرو۔ میں دیکھنے آتا ہوں کیا۔ خوب رنگ رلیاں منایا کرو مجھ سے یہ ناز برداری نہیں ہونے کی۔

عذرا: (روٹھی ہو کر) تم بھی یوں کہو گے تو میں زندہ نہ رہوں گی۔

نفیس: اور میں کون زندوں میں سے ہوں۔ مُردوں سے بدتر ہوں۔ محلّہ والے الگ بدنام کرتے ہیں۔ اُن کا تو خیال ہے کہ ایک شادو گئی اور اس کی جگہ دوسری آ گئی۔

عذرا: محلّہ والے جو جی چاہے کہتے پھریں۔ تمھارے سوا میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔ اگر تم بھی ایسی باتیں کرنے لگے تو میرا کون ٹھکانا ہے؟...... اب جو لوگ آتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تھوڑے ہی کسی کو بُلانے جاتی ہوں۔

نفیس: یہی تمھاری بھول ہے کہ تم صرف میرے آگے جواب دہ ہو۔ تمھارا کیا خیال ہے ہم خودکشی میں حق بجانب ہیں۔ ہم اپنے آپ کو نہیں مار سکتے اگرچہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے۔ اس کے لیے ہم حکومت کے سامنے جواب دہ ہیں ...... اس جسم کے علاوہ ہمارا اخلاقی جسم بھی ہوتا ہے جسے پامال کرنے کے لیے ہم گلی کوچے کے ہر کتے بلّے، بچے بوڑھے کے حضور میں جواب دہ ہیں ——

عذرا: لیکن ہم نے کون سی اخلاقی خودکشی کی ہے؟

نفیس: اوہ تو تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ تم نے سنا ہے خلق کی آواز نقارۂ خدا ہوتی ہے۔ بس وہ نقارہ بج رہا ہے۔ اگر تمھارے کانوں میں اس کی آواز نہیں گونجتی تو تم بہری ہو —— اس میں تمھارے کانوں کا قصور ہے۔

عذرا: بُرا نہیں ہوا لیکن بُرائی سے آلودہ ضرور ہو گیا۔ میرا ایمان ہے کہ دس آدمی مل کر تمھیں کہیں تمھارے چہرے پہ ناک نہیں ہے، تو تم ضرور سمجھ لو کہ خدا نے تمھارا چہرہ ناک کے بغیر ہی بنایا تھا، اگرچہ آئینہ اس کے خلاف ہی گواہی دے ——

عذرا: (زہر خند سے) اچھی بات ہے —— اگر اُن دس آدمیوں نے کسی کو پاگل کر دینے کی سازش کی ہو تو ......

نفیس: نہیں نہیں۔ تم اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ جس آدمی کو یہ بات کہنے کے لیے دس آدمی اکٹھے ہوں گے، اپنا وقت صرف کر سکیں گے، اس آدمی میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہوگا۔ کم از کم وہ اس قابل ضرور ہوگا کہ اس کا مذاق اُڑایا جائے ...... اور جب یہ ہو جائے تو پاگل پنے اور ناک کے نہ ہونے میں صرف عقیدے کا فرق ہے نا —— ؟ دیکھو تم پھر ہنس رہی ہو ......

عذرا: اچھا اگر تمھیں میرا ہنسنا ناگوار گزرتا ہے تو میں نہیں ہنستی۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے اور اگر میرا قصور ہے تو تم بھی اس قصور میں برابر کے حصہ دار ہو۔

نفیس: آہ! .... (سرد آہ بھر کر لیٹ جاتا ہے)

عذرا: دیکھو اب جانے دو۔

نفیس: نہیں میں ہنس نہیں سکتا، جب کہ میرا دل رو رہا ہے۔ محلہ والوں نے ہمارے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔

عذرا: آج کی سازش ہے وہ۔ دو مہینے ہمیں یہاں آئے ہو گئے۔ تب سے یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

نفیس: تمھارے خیال میں تو صرف باتیں ہو رہی ہیں۔

عذرا: اور نہیں تو کیا ہو رہا ہے؟

نفیس: چہ میگوئیوں کی حد سے گزر کر محلّے کے معتبر آدمیوں نے ایک جلسہ کیا ہے جس میں یہ طے پایا ہے کہ ہمیں یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا جائے۔

عذرا: (گھبرا کر) سچ؟

نفیس: اور تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

عذرا: نہ جائیں تو وہ کیا کریں گے؟

نفیس: کوئی ایک طریقہ ہے تنگ کرنے کا۔ وہ کئی طریقوں سے ہمیں پریشان کر سکتے ہیں۔

عذرا: مثلاً............

نفیس: مثلاً ......مثلاً...... وہ حاکمانِ شہر کو شکایت کر سکتے ہیں کہ اس مکان میں در پردہ فحاشی ہوتی ہے۔ جو شادو کا کوئی گاہک آئے تو وہ پولس کی معرفت ہمیں پکڑوا سکتے ہیں۔ وہ ہمارا حقہ پانی بند کر سکتے ہیں۔

عذرا: حقہ پانی کو تو میں پروا نہیں کرتی۔ ہاں ــــ دوسری باتیں البتہ......لیکن تمھیں ان باتوں کے لیے لڑنا چاہیے۔ میں نہیں مان سکتی، قانون ایسا ہی موم کی ناک ہے کہ ان کی مرضی کے مطابق......

نفیس: دماغ میرا بھی ان باتوں کو قبول نہیں کرتا، لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اگر دفتر والوں تک بھی یہاں کی باتیں پہنچ گئیں تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا...... کتنے آدمی ہوں گے جو سمجھیں گے

کہ یہ شریف انسان ہے۔ زیادہ تعداد اُن آدمیوں کی ہوگی جو یہی سمجھیں گے کہ اپنی بیوی سے......

عذرا: بس چپ رہو...... کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ۔ خواہ ہمیں کسی چھپر کھٹ کے نیچے ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

نفیس: ہاں، میں چلا جاؤں گا۔ میں اپنی عزت کے لیے لڑوں گا نہیں۔ شور نہیں مچاؤں گا، میں شریف انسان ہوں۔ تم جانتی ہو جب ہم نئے نئے اس مکان میں آئے تھے تو اس روز ایک طالب علم — کیا نام؟ — نام یاد نہیں رہا۔ بہر حال ایک طالب علم شادو سے ملنے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ شریف آدمی اپنی بیٹی کی بے حرمتی دیکھ کر بھی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے — بس اس کے الفاظ میں آدمی کی جگہ خاوند اور بیٹی کی جگہ بیوی کرلو —

عذرا: اُس شرابی چھوکرے کی باتوں پر جاتے ہو؟

نفیس: باتیں بڑی کام کی کرتا تھا وہ شرابی چھوکرا۔

عذرا: اپنی عزت کو بچانے میں دامن پر جو داغ لگ جاتے ہیں، وہ مبارک ہیں۔ تم زیادہ پروا نہ کرو۔ آؤ میں تمھیں کچھ سناؤں، جی بہل جائے گا ذرا......

نفیس: گویا پڑوسیوں کو اس بات کا ثبوت دیں — یہاں یہی دھندا ہوتا ہے۔

عذرا: آئے ہے، اور تو کیا بالکل گھٹ کے مر جائیں۔

(طنبورا لے آتی ہے اور اسے چھیڑتی ہے)

نفیس: عذرا تم نہیں سوچتیں ہم یہاں پردیسی ہیں — کل کلاں کو کوئی بات ہوئی تو ہماری حمایت میں یہاں ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوگا۔

عذرا: کوئی نہ ہو — خدا جو ہمارے ساتھ ہے۔

نفیس: خدا بہت دور کی بات ہے...... عذرا، ٹھہرو — یہ آواز کدھر سے آرہی ہے؟

(کھڑکی سے باہر دو آدمی باتیں کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی شکلیں بھی دھندلی نظر آتی ہیں)

بنواری: دیکھ لو، میں نہ کہتا تھا۔ صاف آواز آ رہی ہے۔ اندر کوئی آدمی بھی ہے۔

مرزا شوکت: ہاں اور کوئی ساز معلوم ہوتا ہے، ستار کے موافق۔

بنواری: میں نہ کہتا تھا ـــــ ان کا یہاں ہونا ہمارے محلّے کی بہو بیٹیوں کے لیے بہت خراب ہے۔ مشکل سے شادو کو یہاں سے نکالا تھا......

(وقفہ)

تو اب کیا ارادہ ہے؟

مرزا شوکت: میرے خیال میں اندر چل دو ـــــ جو روکا تو محلّے کے نام پر شور مچا دیں گے اور جو نہ روکا تو ہمارا کام بنا بنایا ہے ـــــ عورت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اس دن اسے لفافہ خریدتے ہوے دیکھا تھا!

(مل کر ہنستے ہیں)

مرزا شوکت: اب کرو ذرا ہمّت......

(نفیس یہ باتیں سُن کر کھڑکی کی طرف آتا ہے)

نفیس: خبردار کسی نے کھڑکی پر آنے کی کوشش کی، یہاں اب نہ شادو رہتی ہے اور نہ ایسی کوئی عورت۔

بنواری: (آہستہ سے) صاحب! ہمیں کوئی شادو سے کوئی خاص وہ نہیں ہے۔

مرزا شوکت: ہم تو دو گھڑی......

نفیس: میں کہتا ہوں یہاں سے بھاگ جاؤ ـــ اب شادو کی جگہ یہاں گرہستی ہے اور ان کے متعلق آپ کا اندازہ سراسر غلط ہے۔

بنواری: چلو یار ـــــ چلو دو ـــــ جانے کیا مصیبت ہے۔

مرزا شوکت: یونہی چل دیں؟ اس محلّے میں چراغ تلے اندھیرا ہم نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ ہم کل امام صاحب کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ پر دیکھیں گے یہ لوگ کس طرح محلّے میں رہ کر بدکاری کر سکتے ہیں۔

(کچھ سوچ کر)

لیکن یار تم تو یونہی ڈر گئے ——— جتنا یہ آدمی اچھل اچھل کر آتا ہے، مجھے اتنا ہی دال میں کالا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا ڈھنگ ہوتا ہے اور میری بات سُنو (کانوں میں کچھ کہتا ہے جو نفیس اور عذرا کو سُنائی نہیں دیتا)

نفیس: بیہودہ لوگ ہیں ——— کب تک ان کی باتیں سُنے جائے آدمی؟

عذرا: میں کہتی ہوں سُن کر بھی کچھ نہیں سننا چاہیے۔ کسی کا منہ تھوڑے باندھا جاتا ہے۔ چپکے سے سو جاؤ۔

نفیس: ہاں سو جاؤ۔

(آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

لیکن یہ ہولے ہولے زنجیر ہلا رہا ہے کوئی۔

عذرا: وہی لوگ ہوں گے ——— اور ہوا کریں۔

نفیس: ہاں سو جاؤ۔

عذرا: لیکن ——— مجھے نیند نہیں آتی۔

نفیس: تمھیں فکر کس بات کی ہے؟ گہنا پاتہ تمھارے پاس نہیں ہے۔ کواڑ بند ہی ہیں۔ کھپ کھپا کر چلے جائیں گے۔

عذرا: خود تو مریں کھپیں، ہمیں ناحق پریشان کرتے ہیں ——— جب تک چلے نہ جائیں، مجھے تو نیند نہیں آنے کی۔

نفیس: جو تمھارا مطلب ہے کہ فساد بپا کیا جائے تو میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ البتہ اصرار کرو گی تو سر پھٹول کے لیے تیار ہوں۔ (اٹھنا چاہتا ہے)

عذرا: نہیں نہیں ——— پڑے رہیے چپکے سے۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی کہ مجھے نیند نہیں آرہی۔ آپ تو سارا دن دفتر میں کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، آپ سو جائیں۔ (کچھ دیر بعد ڈر کر)

میں کہتی ہوں جی ——— کواڑ ہل رہے ہیں۔ جیسے کُھل گئے ہیں!

نفیس: ——— ہیں ——— سُنو اقدموں کی آوازیں آرہی ہیں، گویا کوئی ڈیوڑھی میں کھڑا ہے

یا......اندر چلا آ رہا ہے——(بلند آواز میں) — کون ہے؟

مرزا شوکت: ہم ہی ہیں صاحب— آپ کے محلّے دار بنواری لال اور مرزا شوکت۔

نفیس: آپ کیسے اندر چلے آئے؟ آپ کو یہاں آنے کی کس نے اجازت دی؟

بنواری: (گھبرا کر) ہم کیسے اندر چلے آئے؟ ہم یونہی چلے آئے اندر۔

(کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہے)

مرزا شوکت: ہم آپ کے پڑوسی ہیں۔ ہمیں امام صاحب نے بھیجا ہے۔

نفیس: لیکن یہ کون سا وقت ہے یہاں آنے کا—؟ اور میرے خیال میں دروازہ بند تھا جس کا مطلب ہے آپ دروازہ توڑ کر داخل ہوئے ہیں۔

(عذرا سہمی ہوئی نظر آتی ہے)

بنواری: ہم نے دروازہ توڑا نہیں—بس ڈھکیلا ہی تھا کہ وہ باہر آ گیا۔ بات یہ ہے، کہ پرانے کواڑ......

نفیس: آپ محلّے دار ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔ آپ یقیناً چور ہیں—اور مداخلت بیجا کر رہے ہیں—— آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس وقت کسی شریف آدمی کے مکان پر اجازت کے بغیر چلے آئیں۔ میں نے کھڑکی سے آپ کی گفتگو سن لی تھی...... میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور اپنی بیوی کے ساتھ یہاں رہ رہا ہوں۔ میری بیوی ایک گرہستن ہے، کوئی بھگائی عورت نہیں، داشتہ نہیں (قریب پڑی ہوئی ایک لاٹھی اُٹھا لیتا ہے) یہاں سے فوراً چلے جایئے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

بنواری: (ڈرتے ہوئے) دیکھیے صاحب، ہم یوں چلے جائیں گے لیکن آپ کی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

مرزا شوکت: بابو صاحب——ہم سب معاملہ سمجھتے ہیں (ذرا درشت لہجہ میں) آپ نے بہو بیٹیوں والے محلّے میں یہ اڈّا بنا رکھا ہے۔ محلّے والے سب آپ کو جانتے ہیں۔ آپ ایسا ہر آدمی، یوں اپنے آپ کو گرہستی ہی کہتا ہے۔

عذرا: (گھبرائے ہوئے) اللہ مارو! اللہ کے قہر سے ڈرو! ہم گرہستی لوگ ہیں۔ ہمیں یوں تو بدنام نہ کرو ...... تم لوگوں کی بھی کوئی ماں ہوگی، بہن ہوگی۔ اندازہ کرو اگر کوئی......

مرزا شوکت: اجی ہم خوب سمجھتے ہیں یہ باتیں ——

بنواری: ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے لیے آئے تھے اور ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔

نفیس: میں کہتا ہوں —— یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

عذرا: (نفیس کو روکتے ہوئے) خدا کے لیے —— پروردگار کے لیے......

بنواری، مرزا شوکت: پہلے یہ لاٹھی رکھ دیجیے —— پھر ہم سے بات کیجیے۔

(ڈیوڑھی کی طرف سے پولس انسپکٹر مائیکل اور ایک کانسٹیبل داخل ہوتے ہیں)

سب انسپکٹر مائیکل: ٹھہر جاؤ —— رُک جاؤ —— تم سب لوگ حراست میں ہو۔

نفیس: (لاٹھی چھوڑ کر) مدد ——— مدد، میں کہیں کا نہ رہا انسپکٹر صاحب (تقریباً روتے ہوئے) میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ مجھے اور میری بیوی کو حراست میں لے لیجیے ——— ہم دونوں آپ کی حراست میں آزادی سے اچھے رہیں گے۔

عذرا: میں آپ کے پانو پڑتی ہوں انسپکٹر صاحب (جھکتی ہے) ہمیں اس مصیبت سے بچایئے ——— ہم بے گناہ ہیں ———

سب انسپکٹر مائیکل: دیکھیے —— آپ خاموش رہیے، میرے پانو پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کانسٹیبل: یہ سب عیاری ہے، انسپکٹر صاحب ——— ان سے پوچھیے کہ یہ آدمی کون ہیں؟

سب انسپکٹر مائیکل: پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو صاف ظاہر ہے۔ آج تک میں نے کسی مجرم کو......

نفیس: (وحشیانہ انداز میں) کون مجرم ——؟ انسپکٹر صاحب، میں مجرم ہوں اور میری بیوی؟......

سب انسپکٹر مائیکل: نفیس صاحب آپ ہی ہیں؟

مرزا شوکت: جی ہاں، یہ انہی کی نفاست ہے۔

سب انسپکٹر مائیکل: آپ چپ رہیے۔

نفیس: نفیس میرا ہی نام ہے ——— لیکن میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی رُو سے میں مجرم گردانا جاؤں۔ یوں جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ کی قید میں آنے کے لیے تیار ہوں۔

بنواری: جھگڑے کی نوبت یہی ہے جناب کہ بہو بیٹیوں کے اس محلے میں......

سب انسپکٹر مائیکل: بکومت! ان باتوں کو میں تم لوگوں سے زیادہ سمجھتا ہوں ——— یہ درست ہے کہ ان لوگوں نے اس مکان کو فحاشی کا اڈا بنا رکھا ہے لیکن آپ اس وقت یہاں کیسے تشریف لائے؟ کیا آپ دن کے وقت اِن لوگوں کو اخلاق کا سبق نہیں پڑھا سکتے تھے؟

نفیس: فحاشی کا اڈا ——— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مرزا شوکت: دن کے وقت؟ ——— یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہم لوگ دن بھر اپنے کام دھندے میں مشغول رہتے ہیں۔

کانسٹیبل: دن کے وقت محلے دار انھیں کس طرح پکڑ سکتے ہیں؟

سب انسپکٹر مائیکل: اگر اس کمرے میں محلے داروں کے علاوہ کوئی اور شخص ہوتا جس کی بابت ان لوگوں کو تفصیلات نہ پتا ہوتیں تو یہ لوگ مجرم تھے، لیکن اب یہ محلے دار بغیر کسی بیّن ثبوت کے اندر چلے آئے ہیں اور مداخلت بیجا کے مرتکب ہوئے ہیں ———۔

نفیس: جناب والا ——— میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

عذرا: ہائے میرے اللہ!............

سب انسپکٹر مائیکل: (نفیس اور عذرا سے) میں آپ سے بات کرتا ہوں ——— (بنواری سے) آپ کا نام کیا ہے؟

بنواری: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) میرا نام ——— لیکن میں تو............

سب انسپکٹر مائیکل: میں آپ کو نگلے نہیں جا رہا ——— میں صرف نام پوچھ رہا ہوں، اتنا گھبرائیے نہیں۔

بنواری لال: میرا نام ب......بنواری لال ہے!

سب انسپکٹر مائیکل: (مرزا شوکت سے) آپ کا اسم گرامی؟

مرزا شوکت: لیکن انسپکٹر صاحب، ہمارا گناہ کیا ہے؟ طوائف کے دروازے تو خلق خدا کے لیے کھلے ہوتے ہیں، جو ہم اندر چلے آئے تو کیا جرم کیا——؟

سب انسپکٹر مائیکل: خوب!——یہ خلق خدا کے الفاظ کا بھی خوب استعمال ہوا——لیکن صاحب آپ تو محلے دار کی حیثیت سے تشریف لائے تھے تا کہ یہ اڈا اٹھوا کر محلے کے لوگوں کی بہو بیٹیوں کی آبرو بچائی جائے——

مرزا شوکت: (گھبرا کر) نہیں، میرا مطلب ہے......

سب انسپکٹر مائیکل: آپ! نام بتایئے؟

بنواری لال: (ڈرتے ہوے) آپ کا نام مرزا شوکت ہے!

(مرزا شوکت غصے سے بنواری لال کی طرف دیکھتے ہیں)

مرزا شوکت: لکھ لیجیے——میں کوئی ڈرتا تھوڑے ہی ہوں۔ ہمیں امام صاحب نے بھیجا ہے تا کہ اس بات کی تحقیق کی جائے۔

سب انسپکٹر مائیکل: چلیے اس بات کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ (کانسٹیبل سے) سردار حسین! انھیں باہر لے جاؤ تا کہ دوسرے محلے داروں کے ساتھ ان کی بھی گواہیاں پیش کی جائیں۔

مرزا شوکت: لیکن ایک بات کا خیال رکھ لیجیے گا، ہم باعزت شہری ہیں اور......

سب انسپکٹر مائیکل: جی ہاں، میں خوب جانتا ہوں، آپ تشریف لے جایئے۔

(کانسٹیبل، بنواری اور مرزا شوکت کو باہر لے جاتا ہے)

(نفیس سے)

نفیس صاحب! آپ کے آبائی گھر کا پتا میرے پاس ہے۔ آپ پہلے جس جیوری ڈکشن میں رہتے تھے وہاں تفتیش کی جا چکی ہے۔ اس جگہ آپ کب سے رہ رہے ہیں؟

نفیس: عرصہ دو ماہ سے۔

سب انسپکٹر مائیکل: نہیں، آپ کو غالباً یہاں آئے دو ماہ اور چودہ دن ہوتے ہیں۔

عذرا: جی ہاں، بس اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔

سب انسپکٹر مائیکل: (نفیس سے) جب آپ یہاں آئے تو آپ کو پتا نہیں تھا کہ اس مکان میں شمشاد بائی طوائف رہتی تھی؟

نفیس: نہیں صاحب! میں بنا جانے بوجھے اسباب اُٹھوا کر اِدھر چلا آیا، تب سے ہر روز یہی قصہ ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہی رہتا ہے اور محلے والوں کو ہم پر شک کرنے کا موقع دیتا ہے —— اور یہ چپقلش جاری ہے۔

سب انسپکٹر مائیکل: چپقلش سے آپ کا کیا مطلب؟

نفیس: یہی —— نیا مکان تلاش کرنے اور نہ ملنے کی اور بنواری اور مرزا ایسے لوگوں کے ساتھ جھگڑنے کی۔ آج تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ ہمیں اپنے ہی گناہوں کا حساب دینا ہوتا ہے۔ لیکن نقل مکانی کے اس تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنے بچوں، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی کے کردار کا ہی ذمے دار نہیں ہوتا، بلکہ اپنے پڑوسیوں کے قول اور فعل کے لیے بھی گردن زدنی ہے۔

عذرا: تمام دن ہمارا دروازہ بند رہتا ہے —— ہم ڈر کے مارے کواڑ کھولتے ہی نہیں۔ آپ کواڑ دیکھ کر پتا کر لیجیے کہ یہ لوگ دروازہ اکھاڑ کر اندر آئے ہیں یا نہیں —— ہم اور کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے —— جتنا ہم زیادہ بولتے ہیں، اُتنے ہی گناہ گار معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ بھی ہمیں قصوروار سمجھتے ہیں تو جو سلوک آپ چاہیں کریں ——

سب انسپکٹر مائیکل: آج کا واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے —— میں سب معاملے کی جانچ پڑتال کر چکا ہوں، آپ بے حد شریف ہیں اور یہی آپ کا جرم ہے —— (نفیس سے) آپ کل تھانے میں تشریف لائیے نفیس صاحب اور نیک چلنی کی ضمانت داخل کیجیے ——

نفیس: نیک چلنی کی ضمانت؟

عذرا: نیک چلنی کی ضمانت!............(روکر) میرے اللہ!

نفیس: انسپکٹر صاحب...... مجھے بدچلن ہی سمجھ لیجیے۔ لیکن میں نیک چلنی کی ضمانت داخل نہیں کرسکوں گا۔ اس سے پہلے رشتہ داروں میں یہ بات نہیں پھیلی، پھر اُن میں بھی پھیل جائے گی۔ آپ مجھے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟ میں حاضر ہوں (دونوں ہاتھ بڑھا دیتا ہے) میرے پاس کوئی ضامن نہیں، اس محلے میں میرا کوئی واقف نہیں، کوئی ہمدرد نہیں۔

(عذرا بدستور رو رہی ہے)

سب انسپکٹر مائیکل: آپ سمجھتے نہیں ہیں —— صرف ایک کاغذی کارروائی مکمل کرنی ہے۔ اگر کوئی ضامن نہ ملا تو میں آپ کو مہیا کردوں گا۔ آپ محلے والوں سے ڈریں نہیں...... میں آپ کی پوزیشن کو خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے آج سے اپنا ہی سمجھیے۔

نفیس: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب؟ —— ہم آپ کے قابل نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے ہم آپ کے کتنے ممنون ہیں......

سب انسپکٹر مائیکل: آپ خوف نہ کھایئے۔ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں...... (عذرا سے) میری بیوی بھی آپ کی طرح گانے بجانے کا شوق رکھتی ہے (نفیس سے) کیا آپ دونوں پیر کے روز میرے ساتھ چائے پی سکتے ہیں؟

عذرا: ہم آپ کے بہت شکرگزار ہیں —— آپ ان محلے والوں سے ہماری خلاصی کروا دیجیے۔ آپ کو بہت بڑا ثواب ہوگا...... مجھے خود آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے! آپ جب چاہیں گے، ہم آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔

سب انسپکٹر مائیکل: (قدرے گھبرا کر) چائے گھر پہ ممکن نہیں ہوسکے گی...... دیکھیے نا ذرا میری بیوی بیمار رہتی ہیں، چائے باہر پی سکیں گے کہیں...... پھر سیر تماشا ہوجائے گا، بہرحال —— میں عرض کروں گا۔ کل آپ تھانے تشریف لا رہے ہیں نا؟ —— میں چلتا ہوں —— خدا حافظ!

(جاتا ہے)

نفیس: جی ہاں، میں کل صبح حاضر ہو جاؤں گا.........خدا حافظ!

(وقفہ)

نیک چلنی کی ضمانت!.........چائے کی دعوت!— کہیں اس سے بڑا گڑھا تو نہیں کھودا جا رہا؟

عذرا: میں کا جانوں؟——ہائے، میرے اللہ!

(پردہ)

تیسرا منظر

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں نظر آتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب سب چیزیں قرینے سے رکھی ہیں۔ کونے میں طنبورا پڑا ہے۔ تپائی پر ایک نفیس پاندان رکھا ہے جس کے قریب گھنگرو پڑے ہیں۔ عذرا اس وقت کچھ کپڑے صندوق میں ڈال رہی ہے۔ کپڑے ڈالنے کے بعد وہ صندوق کو چارپائی کے نیچے ڈھکیل دیتی ہے تاکہ جگہ اور کشادہ ہو جائے۔ نفیس ایک کھڑکی کے پاس بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی بازار میں جھانک لیتا ہے، گویا کسی کے آنے کا منتظر ہے۔

عذرا: اب بالکل سر پہ آ گئی تمھاری بھانجی کی شادی——

نفیس: ارے ہاں!......میں تو بالکل غافل تھا—— کب بیاہی جا رہی ہے نصیرہ؟

عذرا: ہفتہ ہفتہ آٹھ آٹھ اور آٹھ سولھا اور تین دن اوپر— آج سے بیسویں روز شادی ہے۔ بلاوے پر بلاوا آ رہا ہے اور تمھیں کوئی خبر ہی نہیں ہے۔

نفیس: تم نے یہ جتا کر مجھے فکر میں مبتلا کر دیا۔

عذرا: تین سے کم جوڑے دو گے تو عزت نہیں رہے گی اور ایک سوٹ دولھا کے لیے۔ کہیں گے دس برس سے ماموں کما رہا ہے اور اتنا بھی نہ ہوا جو بھانجی کو جوشن ہی پہنوا دیتا۔

نفیس: دو جوڑے، ایک سوٹ اور پھر ایک جوشن — یہ کیا بات کر رہی ہو تم؟ ہم مسلمانوں میں......

عذرا: میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ہم ٹھیک مسلمان ہیں، لیکن راجپوت ہونے کی وجہ سے ہماری تمام رسمیں تو ہندوانہ ہیں نا۔

نفیس: میں کوشش کر رہا ہوں عذرا، لیکن دیکھنے والے اندھے ہیں کیا؟ تمہارے اپنے پہننے کو کپڑا نہیں ہے، اوپر سے سردیاں منہ پھاڑے آ رہی ہیں۔ مجھ سے تو جو ہوگا بنوا دوں گا۔

عذرا: یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے کم عزت نہ رہے گی، کہے دیتی ہوں، آپا کہیں گی — بھانجی کا بیاہ کب روز روز ہوگا، اس سلسلے میں تو ہمیں تھوڑے بہت اُدھار سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے...... بہت نہیں تو گزارے موافق ہی سہی۔

(وقفہ)

نفیس: دیکھو، میں کچھ انتظام کرتا ہوں...... دراصل میں تمہارے متعلق ایک عرصے سے سوچ رہا تھا۔

عذرا: میرے متعلق مت سوچو — میرا تو گزارا ہو ہی رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تم بھی بھلا دفتر کے دوسرے لوگوں کی طرح کیوں نہیں ہو جاتے؟...... اس تنخواہ میں گزارا تو ہونے سے رہا۔ کبھی کبھار پیسے لے لینے سے کیا ہو جاتا ہے — یہ غریبی بھی تو سو گناہوں کا گناہ ہے۔

نفیس: رشوت کے نام پر جسے اسرافیل کا صور سنائی دینے لگے وہ کیا کرے؟ مر کر ہمیں خدا کو جواب دینا ہے۔

عذرا: تمہارا کیا خیال ہے باقی خدائی تمہاری طرح ہی ہے؟ وہ لوگ آخر کیا جواب دیں گے؟ جو جواب وہ دیں گے وہ تم بھی دے لینا — پھر تم اسے عادت نہ بناؤ۔ ہوا ایک آدھ بار کسی سے کچھ لے لیا۔ جب کام نکل گیا تو پھر منہ نہ لگایا کسی کو —

نفیس: ہاں عذرا! میں تم سے پہلے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔ بلکہ میں نے ٹھیکیدار عرفانی کو گانٹھ

بھی لیا تھا ـــــ اس نے یہاں چھ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت ساڑھے چھ بجے ہیں اور اس کی شکل تک نظر نہیں آتی۔

عذرا: (قدرے آسائش کے احساس سے) کتنے پیسوں کی اُمید ہے؟

نفیس: یہی سات آٹھ سو کی ـــــ ارے ایک پُلیہ کا ٹھیکہ تو ہے۔ کہیں بڑے صاحب سے براہِ راست نہ لے لے۔ میں نے پہلے تمھیں نہیں بتایا کہ کہیں تم مجھے بُرا بھلا نہ کہو۔ بلکہ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ تمام بات کھل جانے پر میں تمھیں کیا منھ دکھاؤں گا ـــــ کچھ تمھیں حیران کر دینے کا ارادہ بھی تھا...... اب تم خود ہی اس کی تائید کر رہی ہو۔

عذرا: (کھڑکی طرف جاتے ہوئے) کس قسم کا آدمی ہے؟ ـــــ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔

نفیس: یہی دُبلا پتلا سا آدمی ہے ـــــ لوکی سے سر پر ایک ڈھیلی ڈھالی ڈگمگاتی ہوئی ہیٹ پہنتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ پائجامے کے ساتھ ہیٹ۔

عذرا: (کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے) ابھی تک تو دُور گلی کے اس سرے پر بھی کوئی نظر نہیں آرہا ـــــ

نفیس: (سوچتے ہوئے) عذرا! تمھاری اس تائید کے بدلے ایک قسم کی تسکین تو ضرور ہوگئی ہے، لیکن مجھے ایک طرح کا رنج بھی ہوا ہے!

عذرا: (ہنستے ہوئے) نفیس تم ساری زندگی اس قدر شریف رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، تمھیں اس سے کیا حاصل ہوا؟ یہاں محلّے میں جو ہماری بدنامی ہوئی ہے اور اب تک رسوائی ہوتی ہے، اس کے لیے ہماری شرافت ہی تو ذمّے دار ہے...... ابھی کل ہی امام باڑے کی ایک عورت سے میری لڑائی ہوئی۔ اس نے جو کچھا کہا ـــــ الٰہی پناہ! اللہ دے اور بندہ لے۔ لیکن اب تو یہ باتیں دل پر اثر ہی نہیں کرتیں......
(پان لگاتے ہوئے) یہاں آکر ہمیں بھی پان کھانے کی عادت ہوگئی ہے۔

نفیس: (پان لیتے ہوئے) تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں عذرا!

عذرا: کیا نہیں بتایا؟

نفیس: یہی لڑائی کے متعلق۔

عذرا: تم دفتر سے تھکے ماندے آتے ہو — میں نہیں چاہتی، میں تمھیں اس قسم کی باتیں سُنا کر پریشان کروں اور وہ عورت خود محلّے بھر میں مشہور ہے۔ پہلے پہل لوگوں نے اس کے متعلق واویلا کی، لیکن جب اس نے سب کی ماں بہن کو دھر لیا تو سب چُپ ہو گئے —— اب کوئی اس سے الف سے ب تک نہیں کہتا......

نفیس: یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے سب کچھ شرافت سے سُن لیا ہے —— اور اس لیے انھیں ہمارے منھ آنے کا موقع بھی مل گیا۔

عذرا: (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) ٹھہرو گلی میں کوئی آرہا ہے — ٹھیکیدار عرفانی......

نفیس: میں دیکھتا ہوں۔ (کھڑکی کی طرف جاتا ہے)

اوں ہوں —— یہ تو کوئی کبوتر باز ہے۔ دونوں ہاتھوں میں کبوتر تھامے اور گامے شاہی جوتا پہنے جارہا ہے۔ حمیدو کا پٹھا ہے — حمیدو پہلوان کا...... (وقفہ)

اب تو کافی دیر ہوگئی۔ عرفانی نے کہا تھا جو میں چھ بجے تک پہنچ گیا تو بہتر، ورنہ نہیں آؤں گا (مایوسی سے) شاید بڑے صاحب سے مل لیا ہو۔

عذرا: (مایوسی سے) ہاں شاید بڑے صاحب سے مل لیا ہو۔ پیسا ہماری قسمت میں نہیں۔

نفیس: تو اب کیا ہوگا —— ؟ نصیرہ کی شادی پہ......

عذرا: (منھ لمبا کرتے ہوئے) تو گویا اب وہ نہیں آئے گا؟

نفیس: معلوم تو یہی ہوتا ہے —— اچھا اگر وہ کل دفتر میں مجھ سے ملنے آیا تو میں ٹھیکے سے انکار کر دوں گا۔ صاف کہہ دوں گا، میں نے ٹھیکہ وکرم سنگھ کو دے دیا ہے۔

عذرا: یہ وکرم سنگھ کون ہے؟

نفیس: وہ دوسرا ٹھیکیدار ہے۔

عذرا: وہ کچھ نہیں دے گا؟

نفیس: اگر عرفانی نے کچھ نہ دیا تو پھر میں وکرم سنگھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ میں ہر ایک آدمی کو نہیں کاٹ سکتا۔ اس سے میری نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے اور خود میں بھی......

عذرا: ہاں یہ بات درست ہے۔

نفیس: اچھا تو وہ کون تھی امام باڑے والی عورت؟

عذرا: اجی وہی قاضی صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ گز بھر کی لمبی زبان والی۔ خود گھر گھر جھانکتی پھرے اور میرے منہ آئے ــــ میں کیا پروا کرتی ہوں؟

نفیس: تم نے کچھ سُنا دی ہوتیں۔

عذرا: اور تو میں کیا کم کرتی ہوں ــــ اب نہیں میں ڈرتی کسی سے!

(دروازے پر دستک سُنائی دیتی ہے)

لو، تمہارے عرفانی آ گئے ــــ ٹھہرو، میں کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں۔

نفیس: نہیں نہیں میں جاتا ہوں۔ (جاتا ہے)

عذرا: یہ تمہارا عرفانی نہیں ہے ــــ یہ تو کوئی اور ہی ہے موٹا سا آدمی ــــ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے۔

نفیس: (دروازے میں رک کر) ہیں! ــــ ٹھہرو، میں خود دیکھتا ہوں (جاتا ہے)

عذرا: جانے یہ کون بلا آ گئی پھر...... ہاں شاید عرفانی نے اپنا کارندہ بھیجا ہو، لیکن شکل سے تو کارندہ نہیں دکھائی دیتا ــــ اوہ! یہ چادر کس قدر میلی ہے!

(اُٹھ کر کمرے کو درست کرنے لگتی ہے، جلدی جلدی ایک صاف چادر بچھا دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد نفیس گھبرایا سا داخل ہوتا ہے)

نفیس: ارے بھئی یہ کوئی اور ہی صاحب ہیں۔ سیٹھ شیو برت نام ہے۔

عذرا: عرفانی کے کارندے نہیں؟

نفیس: نہیں ــــ کہتے ہیں کہیں برس ایک کے بعد آتا ہوں۔

عذرا: اس شہر میں؟

نفیس: ہاں ـــــ اور شادو کے یہاں......

عذرا: تو آپ نے انھیں بتا دیا ہوتا......

نفیس: (وقفہ) ـــــ (کچھ مجرمانہ انداز میں) میں کہتا ہوں............

عذرا: کہو ـــــ

نفیس: اِدھر لے آؤں ـــــ دوسرے کمرے میں بٹھا رکھا ہے انھیں۔

عذرا: اِدھر کس لیے؟ ـــــ خدا کے لیے یہاں سے مکان تبدیل کرو،...... پہلے اسے نکال دو۔

نفیس: اتنا امیر آدمی ہے میں اُسے یونہی کیسے نکال دوں...... (ڈرتے ہوئے) سیٹھ ہے کوئی چور تو نہیں ہے، اسے کچھ دیر عزّت اور تکریم سے بٹھاتے ہیں، اس کے بعد چلا جائے گا۔

عذرا: تو بٹھا دو یہاں ـــ میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں ـــ اوّل تو تمھیں معلوم ہی ہے محلّے میں......

نفیس: تم ہی نے کہا تھا کبھی کبھار رشوت لینے سے کیا ہو جاتا ہے؟ یہ غریبی بھی تو سو گناہوں کا گناہ ہے!

عذرا: اچھا، تو یہ بھی ٹھیکہ دار قسم کا آدمی ہے اور اس سے بھی رشوت ممکن ہے؟

نفیس: نہیں، ایسی رشوت نہیں۔

عذرا: (گھبرا کر) تو پھر کیا ہے؟

نفیس: تم ہی نے تو کہا تھا ''تم ساری زندگی اس قدر شریف رہے ہو، مجھے بتاؤ ـــ تمھیں اس سے کیا حاصل ہوا؟'' محلّے میں جو ہماری بدنامی ہوئی، اس کے لیے ہماری شرافت ہی تو ذمّے دار ہے۔

عذرا: تو پھر تمھارا مطلب کیا ہے؟

نفیس: (ڈرتے ہوئے) میں کہتا ہوں ـــ ایک گانا سنا دو۔ سیٹھ صرف گانے کا شوقین ہے۔ سَو ایک روپیا ہو جائے گا۔ گانا سنانے میں کیا حرج ہے؟

عذرا: یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ ـــــ لوگ کیا کہیں گے؟

نفیس: لوگ پہلے کیا کچھ نہیں کہتے ——— اور پھر ابھی تم کہہ رہی تھیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی ——— آہستہ سے کچھ سُنا دینا۔

عذرا: نہیں، میں کہتی ہوں تم بھی۔

نفیس: ارے صرف گانا ہی تو ہے ——— دیکھنا پتا نہ چلے، ذرا اچھی طرح پیش آنا۔ (آواز دیتے ہوئے) سیٹھ جی! (سیٹھ شیو برت اندر چلے جاتے ہیں)

شیو برت: آداب عرض کرتا ہوں۔

عذرا: (سخت گھبراہٹ میں) آداب عرض ہے ——— آپ (کچھ سوچ کر تپائی کی طرف اشارا کرتے ہوے) اِدھر بیٹھ جائیے۔

نفیس: (پلنگ کی طرف ہاتھ کرتے ہوے) تشریف رکھیے۔

شیو برت: (بیٹھتے ہوئے) کہیے مزاج اچھے ہیں...... (بغیر جواب کا انتظار کیے) سال میں ایک بار شمشاد کے یہاں آتا ہوں ——— اب کے پتا چلا اُس کی جگہ آپ تشریف رکھتی ہیں ——— اور آپ ——— آپ کے سازندے کہاں ہیں؟

نفیس: (مجرمانہ گھبراہٹ کے ساتھ) دراصل ان کی طبیعت اچھی نہ تھی اس لیے سازندوں کو رخصت کر دیا۔

(طنبورا اُٹھا کر عذرا کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے...... عذرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے طنبورا لے لیتی ہے)

لیکن اب جب کہ آپ تشریف لے آئے......

عذرا: (گھبرا کر) میں نہیں گا سکوں گی۔

نفیس: ——— ذرا وہ سُنا دو ——— جلد آجا کہ جی ترستا ہے!

(عذرا بڑی کوشش سے طنبورا چھیڑتی ہے۔ دروازے میں مراتب نمودار ہوتا ہے)

مراتب: (خفیف سی مُسکراہٹ کے ساتھ) کتے پان درکار ہوں گے سرکار کو؟

(پردہ گر جاتا ہے)

آج

افراد:

زندگی: کھرے ''زندگی اور موت'' میں زندگی کی اداکار۔قوم کی امریکن ہے۔

موت: کھرے ''زندگی اور موت'' میں موت کی اداکار۔ ایک خوبصورت ، انگریز لڑکی۔

منیجر: ریستوران کا منیجر — ایک معمر انگریز جو اپنے بھاری چہرے کی وجہ سے چرچل معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: ایک ماضی پرست انسان جو اپنے آپ کو گاندھی سے کم نہیں سمجھتا۔

بلانوش: امرت اور شنکر، ہندستانی طالب علم جن میں شنکر کیمونسٹ ہے۔

صفدر آرٹسٹ: ایک گراموفون کمپنی میں ملازم ہے۔

بیرا — اور ہوٹل کے دوسرے مہمان۔

وقت: 1944 جب کہ روزویلٹ کے ذاتی سفیر فلپس نے ہندستان کے متعلق انکشافات کیے تھے اور مسٹر چرچل بہت سیخ پا ہوئے تھے۔

مقام: کسی پریذیڈنسی کا ایک بڑا ریستوران۔

پردہ اُٹھنے پر کھرے "زندگی اور موت" دکھائی دیتا ہے۔ حاضرین بڑے انہماک سے اس ناچ کو دیکھ رہے ہیں ...... "زندگی" بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے ہے اور "موت" نے ایک سیاہ فرغل اوڑھ رکھا ہے۔ 'موت' "زندگی' کا پیچھا کرتی ہے لیکن شوخ و شنگ زندگی بار بار طرح دے کر نکل جاتی ہے۔ آخر 'موت' 'زندگی' پر چھا جاتی ہے۔

ناچ کے فوراً بعد، تالیوں کے شور میں 'زندگی' اور 'موت' ایک طرف ہو جاتی ہیں، کچھ دیر بعد کیفے کے ایک کونے میں 'زندگی' لوگوں کی نظروں سے چھپی ہوئی، منیجر سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔

زندگی: اِس وقت کے بجے ہیں؟ منیجر!

منیجر: (اس نے نہیں سنا)——فرمایئے۔ محترمہ!

بیرا: (آگے بڑھ کر) جی میم صاحب!

زندگی: (بیزاری سے) اُف میرے خدا!—— معلوم ہوتا ہے، آج سب لوگ بہرے ہو گئے ہیں ...... میں پوچھ رہی ہوں، اس وقت کے بجے ہیں؟ (ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے) آدھی رات کا عمل ہے اور اس بے ہنگم ہجوم میں سے ایک بھی شریف آدمی اُٹھتا نظر نہیں آتا۔

منیجر: اوہ! تو گویا خاتون 'زندگی' اپنے آپ وقت نہیں دیکھ سکتیں؟

زندگی: میں اکثر مردوں کو خاتون نوازی کا موقع دیتی ہوں، منیجر، اگرچہ کچھ مرد...... خیر، قصہ یہ ہے کہ میں اوٹ سے باہر نہیں آسکتی۔ دیکھتے نہیں میں نے ابھی تک 'زندگی' کا لباس پہنا ہوا ہے۔

منیجر: تو پھر کیا ہے؟

زندگی: اُونہہ! تو پھر کوئی بات نہیں؟ ...... کیفے کی بتیوں میں جگمگانے لگے گا یہ لباس اور یہ سب تمہارے چینی کے برتنوں سے غافل ہو کر میری طرف دیکھنے لگیں گے۔

منیجر: ہاں، یہ ... ہے...... لیکن کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے (کلاک دیکھتے ہوئے) اس وقت بارہ بجنے میں چھ منٹ باقی ہیں۔

زندگی: (ہنستے ہوئے) خوب! گویا پانچ منٹ اور سینتالیس سیکنڈ نہیں (پھر ہنستی ہے)...... بہر حال ......'موت'! ......'موت' نہ جانے کدھر چلی گئی ہے۔ آج کس خوبصورتی سے اس نے اپنے چمگادڑ ایسے کالے کالے پر مجھ پر پھیلا دیے، کس انداز سے 'زندگی' پر جھپٹی اور آخر دم تک مجھ پر جھکی رہی۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر کان بہرے کر دیے —— (طالب علموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ ہندستانی طالبِ علم بہت جھومے......

منیجر: (حسد سے) مجھے بھی خیال ہے، انھوں نے کھرے 'زندگی اور موت' پسند کیا ہے...... 'موت' نہ جانے کدھر چلی گئی ہے۔ ابھی وہ اُدھر کھڑی لباس تبدیل کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنے دو لمبے لمبے اور کالے ناخن علاحدہ نہیں کیے تھے......

بیرا: (دخل در معقولات) 'موت' کٹہرے کے قریب کھڑی ہے، ڈرم کے پاس —— میم صاحب! آپ فرمائیں تو......

منیجر: (ڈانٹتے ہوئے) بیرا!

بیرا: معافی چاہتا ہوں حضور! (لوری سنبھالتا ہوا چل دیتا ہے)

زندگی: بیرا! 'موت' سے کہہ دو 'زندگی' تمھارا انتظار کر رہی ہے (ہنستی ہے) کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ بات! 'موت' ایکا ایکی کسی کونے سے نکل آئے گی۔ بالکل موت کی طرح!...... انسان زندگی میں موت کے سائے کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ نہیں جانتا، اگلے ہی موڑ، اگلے ہی نکّڑ پہ کالی کلوٹی، بھیانک موت ایک معمولی سے چھکڑے پر سوار ہو کر آ رہی ہے —— اچانک چھکڑا اسے روند ڈالتا ہے۔

(ہندستانی طالب علموں کا شور سنائی دیتا ہے)

شنکر: ہمیں زندگی چاہیے۔

بلانوش: ایک چھوٹا اور ! ـــ میں اپنے آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہوں ـــ مجھے موت کی ضرورت ہے۔

صفدر: (شراب کا پیگ اٹھا کر ناچتا ہے) ارے ہاں۔

بغل میں رہتی ہے بوتل کتاب کے بدلے
جو ہم نے مشق بڑھائی ہے بادہ خواری کی

بغل میں......

زندگی: یہ کون لوگ شراب پی رہے ہیں؟ ـــ شراب مانگ رہے ہیں کیا؟ کیا بار ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے بند نہیں ہو جاتا، نئے آبکاری قانون کے مطابق؟

بیرا: (اس کے ہاتھ میں ٹرے ہے۔ لیکن وہ متوجہ ہو جاتا ہے) ـــ بند ہو جاتا ہے میم صاحب! لیکن......

منیجر: شٹ اَپ، فُول! (زندگی سے) ہاں محترمہ! معلوم ہوتا ہے، آپ کہیں جانا چاہتی ہیں، لیکن شاید بھول گئی ہیں۔ آج ہفتے کی رات ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ گھاگرا پلٹن کے آدمی بھی یہاں موجود ہیں اور آپ کو گاہکوں کی خاطر ابھی یہیں ٹھہرنا ہے۔

زندگی: میں نے جانے کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ میں صرف یہ پوچھ رہی ہوں، کیا یہ شور مچانے والے وہی نوجوان ہیں......؟

منیجر: وہی ہندستانی طالب علم ہیں۔ سب کے سب پیے ہوے ہیں۔ اگرچہ بار ساڑھے بارہ بجے بند ہو جاتا ہے، لیکن یوں بے دریغ پیسے لٹانے والے گاہکوں کو ہم رد نہیں کر سکتے۔ کیا آپ ان کا ساتھ دیں گی، یا خاتون 'موت'؟

زندگی: اوہ منیجر! مجھے تو ان کی کمسنی پر رحم آتا ہے! یہ بالکل نوعمر ہیں۔ شراب ان کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دے گی۔ ان کے دل اور دماغ کو ـــ بالکل ناکارہ بنا دے گی۔ مجھے یقین ہے، شباب و شراب نے انھیں پہلے ہی بے عمل بنا رکھا ہے۔

منیجر: شاید وہ سب طالب علم نہ ہوں۔ مثلاً اس آدمی کو میں جانتا ہوں جس کے ماتھے پر بالوں کا ایک بڑا سا گچھا ہے۔ وہ شاید کسی گراموفون کمپنی میں نوکر ہے۔ لیکن یہ ٹھیک

ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں، سب کھوئے کھوئے معلوم ہوتے ہیں، جیسے کسی کو پتا نہ ہو اُسے کیا کرنا ہے (ہنستے ہوئے) ہمارے حق میں کس قدر اچھی بات ہے! دیکھو وہ پھر شور مچانے لگے ہیں!

پروفیسر ٹھاکر: تمھارا بیٹھنے کا طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں، بلانوش!

بلانوش: (ہنستے ہوئے) گویا پروفیسر ٹھاکر ابھی تک اپنے آپ کو کلاس روم ہی میں سمجھتے ہیں۔

امرت: ٹانگیں کرسی کے بازوؤں پر رکھنا بدتمیزی ہے؟ ابھی تک آپ اخلاقیات میں الجھے ہوئے ہیں پروفیسر صاحب!

صفدر: یہ اخلاق کس بلا کو کہتے ہیں۔ مجھ سا دھات اور پتھر کے زمانے کا آدمی تو اسے نہیں سمجھ سکتا، بلانوش! تم پروفیسر سے کہہ دو۔ (گاتے ہوئے)..........

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

(ہنستے ہیں)

پروفیسر ٹھاکر: نہیں، میں اخلاق کے متعلق کچھ نہیں کہہ رہا صفدر صاحب۔ میں...... میں......

شنکر: اس طرح بیٹھنے کا انداز روسی ہے۔ روسی ہمیشہ کوئی نہ کوئی زاویہ بنا کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی کیفیت ہوتی ہے اور آپ کی طرح کورے نہیں دکھائی دیتے۔ اس سے ان کی سوبھاوک آزادی کا پتا چلتا ہے وہ سمٹ کر نہیں بیٹھتے۔ بعض وقت وہ زمین پر لیٹے ہوتے ہیں تو اُن کی ٹانگیں کرسی پر ہوتی ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: اسی بات پر مجھے اعتراض ہے شنکر! تم لوگ کچھ بھی ہندستانی ڈھنگ میں نہیں کرتے۔ تم بیٹھتے ہو تو روسی انداز میں، کھاتے ہو تو انگریزی طرز پر اور بولتے ہو تو فرانسیسیوں کی طرح۔ مثلاً اگر تمھیں IT IS A MIRACLE کہنا ہے، تو تم منہ کو کچھ اس طرح بگاڑو گے کہ تم کہتے ہوئے معلوم ہو گے C'ESTUNE MIRACLE۔

امرت: میرے خیال میں ٹھاکر ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں مشرقی آداب کو نہیں بھولنا چاہیے۔

صفدر: مشرقی آداب کو میں بھی پسند کرتا ہوں۔ گاؤ تکیے، مسند اور پیچوان کی تہذیب کا میں

بھی قائل ہوں۔ لیکن آخر اس کھرے میں آنے کا مطلب؟ کس قدر لطیف چیز ہے
شراب سے پہلے ہی سرور کا سامان ہے۔

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

(بلند آواز میں) ہمیں زندگی کی ضرورت ہے!

بلانوش: بیرا! ایک پیگ اور لاؤ۔ میں اپنے آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت چاہیے!

بیرا: حضور! بار اس وقت بند ہو چکا ہے۔

صفدر: بکواس بند کرو پاجی کہیں کے۔ جاؤ منیجر سے ہمارا نام بول دو۔

پروفیسر ٹھاکر: ہم انگریزی اوپیرا کو پسند کرتے ہیں، لیکن ہم کرشن یاترا کو بھول گئے ہیں جنھیں کرشن پجاری اپنے مذہبی تہواروں میں کھیلا کرتے تھے۔ جن میں جیدیو چنڈی داس اور ودیاپتی کے گیتوں کو گایا جاتا تھا، جن میں رادھا اور کرشن روح اور اس کا سوامی مدھر وچنوں میں نہ مرنے والا پریم جتایا کرتے تھے۔ آہ! جیدیو کا گیت گووند ——— 'کنو بنا گت نہیں......'

شنکر: ہم پرانی روایتوں کے کندھے پر ضرور آئے ہیں، لیکن ہم لکڑ بگڑ نہیں ہیں، جو گڑے مُردوں کو اُکھاڑتے پھریں۔ تمھارا باپ سلطان تھا تو تمھیں کیا؟

صفدر: امرت بلانوش (اُٹھ کر) کُراچہ؟ تراچہ؟ تراچہ؟

پروفیسر ٹھاکر: (میز پر مُکّا مارتے ہوئے) یہ آپ کے مینی فیسٹو میں لکھا ہے— آپ اپنے ماضی کو نہیں بُھلا سکتے۔

شنکر: ہم اپنے ماضی کے وارث ضرور ہیں، لیکن ماضی پرست نہیں ہیں اور یہی فرق ہے جسے ہم کمیونسٹ واجب سمجھتے ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: میں صفدر ایسے ادیبوں کی پروا نہیں کرتا، جنھوں نے پُرانے ادب کو اپنے آپ میں حل نہیں کیا۔ میں امرت، شنکر اور بلانوش جیسے کمیونسٹوں کا قائل نہیں، جو کسان کانفرنس میں کوفتے لے جاتے ہیں اور وہاں بھی کودسوں میں کھانا کھاتے ہیں۔

شنکر: اس کا سیدھا سادا مطلب ہے کہ ٹاپ اور پیاز ہماری طبیعت کے موافق نہیں...... آپ ذراDIALECTICALLYبات کیجیے۔

پروفیسر ٹھاکر: (برہم ہوکر) پھانسی پر لٹکانے کے لیے بہترین آدمی ایک کمیونسٹ ہے۔ سب جانتے ہیں اور سب کے ساتھ وہ بھی جانتا ہے کہ فلاں طریقہ غلط ہے، لیکن اس نے سب باتوں کے لیے ایسا جواز پیدا کر رکھا ہے کہ آپ اُسے بحث میں کسی طرح قائل نہیں کر سکتے۔

(شور)

امرت: خوب!......تو پھر اس بحث کو جانے دیجیے۔

صفدر: ارے بلانوش، بے ہوش ہونے والا ہے۔ زندگی کو بلاؤ۔

شنکر، صفدر، امرت: زندگی — زندگی — خاتون زندگی!

(دوسری طرف)

زندگی: لیجیے۔ وہ زندگی کے لیے پکار رہے ہیں اور یہ ''موت'' آ گئی۔

موت: اُ......ف! میں کتنی تھک گئی ہوں۔ ''زندگی!'' (ہنستی ہے) مارنا، بگاڑنا، بنانے اور سنوارنے سے کہیں آسان ہوتا ہے۔ لیکن بنانے میں تخلیق کو جو خوشی ہوتی ہے، وہ اس کا بدل آپ ہوتی ہے۔ بگاڑنے کی آسانی کس قدر بوجھل ہوتی ہے کہ اس کے بعد تمھیں توڑ ڈالنے کا افسوس ہوتا ہے — کیوں ''زندگی''؟ (بدستور ہنستے ہوئے) آج کے کہرے نے جسم میں جان نہیں چھوڑی۔ پٹھے بالکل اکڑ گئے ہیں۔

(بلانوش کے رونے کی آواز آتی ہے)

زندگی: منیجر! — وہ طالب علم رونے لگا ہے۔ شاید وہ زیادہ پی گیا ہے (کچھ سوچ کر) کیا اس کے لیے کوئی بھی ذمّے داری محسوس نہیں کرتا منیجر؟ — اس نئی پود کے لیے، جس کو اس ملک کے بچوں کا باپ بننا ہے اور جس سے اس ملک کی تمام اُمیدیں وابستہ ہیں۔ کیا انھیں یوں تباہ کر دینے والی زندگی سے کوئی نہیں روکتا؟

موت: اوہ! تم اِن چھوکروں کی قسمت پر آنسو بہا رہی ہو؟......میرے خیال میں یہ سب بالغ

ہیں ـــــ اپنی رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ انھیں ہر طرح کی شخصی آزادی ہے۔ انھیں اپنا نفع اور نقصان خود سمجھنا چاہیے۔

منیجر: میں خاتون 'موت' سے متفق ہوں! (مسکراتا ہے)

زندگی: (کٹ کر) اس لیے کہ یہ چیز آپ دونوں کے لیے مفید ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں منیجر، ایسی آزادی نوجوانوں کو ہمارے مغربی ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ انھیں زبردستی کھلی ہوا میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کی ورزش، خوراک اور صحت کے لیے حکومت ذمّہ دار ہے۔ آخر انھیں لوگوں کو اس ملک کی نسل بڑھانی ہے۔

منیجر: آپ کیسے کہتی ہیں، ان لوگوں کے لیے کوئی پابندی نہیں؟ ان کی نقل و حرکت پر بھی قید ہے۔ مثلاً یونی ورسٹی پراکٹور یل!.......... لیکن اس کے باوجود یہ کسی نہ کسی طرح سینما گھروں، ہوٹلوں اور بازاری اڈّوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔

زندگی: تم کیوں نہیں تعلیمی اداروں سے تعاون کرتے؟ کیوں نہیں کالجوں، اسکولوں میں اطلاع دے دیتے؟

موت: (قہقہہ لگا کر) 'زندگی' بڑی خوش فہم خاتون ہیں۔ اس کام کے لیے ہم لوگوں کو فرصت ہی کہاں ہے؟

منیجر: ہم اتنے نیک ہو کر اپنے کاروبار کو تباہ کرنا نہیں چاہتے۔ خاتون ''زندگی''۔ پھر جیسے ''موت'' فرما چکی ہیں، ان لڑکوں کو خود اپنا نفع نقصان سوچنا چاہیے۔

زندگی: منیجر! تم بڑے ٹھنڈے انسان نظر آتے ہو۔ تم جوانی کی خودسری کو نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے تمھاری جوانی کڑے ماں باپ کی آنکھوں تلے گزری ہے ـــــ

منیجر: تعجب ہے! آپ نے بالکل درست فرمایا۔

زندگی: خاتون موت اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ خود نوجوان ہیں۔

موت: خوب! میری کم نظری کے متعلق بھی آپ نے ٹھیک کہا۔ (ہنستی ہے)

زندگی: موت، زندگی کی سب باتوں پر ہنس سکتی ہے۔ زندگی، جس کے چہرے کی لکیریں

غازے نے چھپا رکھی ہیں، جس کا پیٹ یوں ہے، جیسے کسی خشمگیں بلی نے پنجوں سے زمین پر لاتعداد نشان بنا دیے ہوں اور جسے اُس نے خوب صورت کپڑوں میں لپیٹ رکھا ہو...... جوانی کی ہٹ میں، میں نے جسم پر ناپاک حملے کیے، جسم جو پاک اور مقدس ہے!...... تین بار اسقاط کے بعد مجھے پتا چلا، جسم ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت، پرستش کرنی چاہیے۔ یہ ایک ایسی شے ہے جسے بگاڑنے کا میرا کوئی حق نہیں۔ یہ جسم میرا اپنا نہیں ہے۔ یہ میری اولاد اور اس کے بعد میری اولاد کی اولاد کا ہے۔ یہ ملک اور قوم کی امانت ہے (اُداس خاطر ہوکر)...... لیکن اس خیانت، اس غدّاری کے بعد میں تجربے کے بوجھ سے جھک چکی تھی۔

(طالب علم زیادہ شور مچانے لگتے ہیں اور بار بار زندگی کا نام لیتے ہیں)

منیجر: خاتون 'زندگی'! لڑکے آپ کو بُلا رہے ہیں۔ آپ ان کا ساتھ دیجیے (کچھ سوچ کر) دیکھیے! آپ ان پر رحم اور کرم کی بارش نہ فرمایئے گا۔ آپ وہ کام کیجیے گا جس کے لیے آپ کو ادا کیا جاتا ہے۔

زندگی: (کھوئے کھوئے سے انداز میں) میں نہیں جانتی۔ وہ مجھے بلا رہے ہیں یا صرف زندہ رہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں!

موت: جو کچھ بھی ہو، آپ ان کے پاس جائیں تو......

منیجر: ہاں! میں پھر یاد دلاتا ہوں، آپ ان سے وہی بات کیجیے جس کی اشد ضرورت ہے، ورنہ مجھے خاتون 'موت' کو بھیجنا ہوگا۔

موت: لیکن منیجر! آج ہم نے پورٹ شراب کے چار آنے بڑھا دیے ہیں۔ تم فقط رنگ دار پانی دے دینا۔ بارہ آنے تم رکھو گے اور آٹھ آنے ہم۔ دیکھیے صاف پانی نہ دکھائی دے۔ اگر خاتون کو ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا تو آٹھ دس پیگ پلا ہی دیں گے۔

زندگی: (بیزاری سے) لیکن کیا بار بند نہیں ہوا؟

موت: نہیں! بار بند نہیں ہوا۔

منیجر: (خفیف سے غصّے سے) نہیں محترمہ! ان لوگوں کے لیے بار کُھلا ہے۔

زندگی: (طالب علموں کی طرف جاتے ہوئے) میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ لیکن جب تک وہ مجھے بلائیں گے نہیں، میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔

(بلانوش سسکیاں لے رہا ہے)

شنکر: ہونہہ! کس قدر بیہودہ انسان ہے۔ بچّوں کی طرح بے تحاشا رو رہا ہے (قدرے اونچی آواز میں) بلانوش! رونا بند کرو۔ ہم تمھاری یہ احمقانہ حرکت برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر رونا نہیں بند کر سکتے تو باہر چلے جاؤ۔

صفدر: شنکر! اتنی سختی مناسب نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کا ہنسنا پسند کیا ہے تو اس کے رونے کو بھی تمھیں برداشت کرنا ہوگا۔ وہ ہر لحاظ سے تمھارا ساتھی ہے۔

شنکر: میں کسی کو جذبات میں بہتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

پروفیسر ٹھاکر: ایک اور بات، جس سے کمیونسٹوں کو نفرت ہے۔ جذبات! گویا یہ انسانی محسوسات کا حصہ ہی نہیں ہیں۔

صفدر: وہ ہر طرح سے تمھارا ساتھی ہے۔ تم اپنی مرضی سے زندگی میں اس طرح کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ تمھیں کیا حق ہے کہ جس کو چاہو قبول کر لو اور جس کو چاہو ردّ کر دو۔ تمھیں زندگی کو بحیثیت مجموعی قبول کرنا پڑے گا۔ ہنسنے کے ساتھ رونا، پاکیزگی کے ساتھ غلاظت، زندگی کے ساتھ موت، ورنہ زندگی تمھیں رد کر دے گی۔

پروفیسر ٹھاکر: مجھے پینے والوں کی برداری ہی سے نفرت ہے۔ یہ خود پیتے ہیں لیکن پیے ہوئے انسان کو کس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

شنکر: وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ سب کام ہوش اور حواس میں کیے جائیں۔ پینے پر کسی کو اعتراض نہیں۔ البتہ پی کر بدرَو میں لڑھکنے والے سے ضرور نفرت ہے۔

امرت: کیوں، نفرت کیوں ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ پیتے ہوئے، آدمی پیمائش کا خیال رکھے۔ انسان کا اندازہ غلط ہو سکتا ہے۔

صفدر: اس تنفّر کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اپنے اُبکائیاں لیتے ہوئے بھائی کو ردّ کرنا سراسر ناجائز ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: یہ بالکل SNOBBISH ہے!

بلانوش: نہیں نہیں، مجھے چھوڑ دو۔ میں تم سب لوگوں کو رد کرتا ہوں۔ وہ جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں، اُن کو بھی اور جو ہمدردی جتاتے ہیں، اُن کو بھی (گلاس اونچا کرتے ہوے) آہ! شراب کس قدر اچھی چیز ہے۔ جو مجھ ایسے انسان کے احساسات کو تیکھا کر دیتی ہے! اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کو مکمل طور پر تباہ کر لیا ہے (رُک کر) میں نے اسی شہر کے ایک کالج سے پہلے ایک ایم اے کیا، پھر دوسرا ایم اے اور اپنے چچا کی مدد سے ایک مذہبی یونیورسٹی میں لیکچرار کی آسامی پر مامور ہو گیا............

پروفیسر ٹھاکر: اوہ بلانوش! ــــــ تم پروفیسر بھی رہے ہو؟

بلانوش: (سر اُٹھاتے ہوے) ہاں ٹھاکر! میں بھی تمھاری طرح ایک مذہبی یونیورسٹی میں لڑکوں کو پڑھاتا رہا ہوں۔ لیکن اس وقت میرے دماغ میں جوانی کا جوش تھا۔ میں اس وقت بائیں خیالات سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ میں نے لڑکوں کو وہ پڑھایا جسے میں سچ سمجھتا تھا۔ میں نے کہا، وہ سب کچھ غلط ہے جو اس مذہبی درس گاہ کے لوگ کہتے ہیں۔ میں نے بغاوت کی اور بے دریغ کی۔ لڑکوں نے یہ چیزیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ یونیورسٹی کے ناخداؤں نے ایسے پڑھانے والے کبھی نہیں دیکھے تھے اور ان کے اعتراض کرنے پر میں نے نوکری کو لات ماردی۔

شنکر: اور تمھیں اپنے کیے پر افسوس ہے؟

بلانوش: نہیں شنکر! مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے اس دارالتعلیم کے آستانے پر سر نہیں جھکائے رکھا۔ البتہ مجھے اس بات کا دُکھ ضرور ہے کہ وہ عقیدے، جن کی غرض سے میں نے اس ملازمت کو ترک کیا، انھیں عملی طور پر نبھا نہ سکا۔ اس کے بعد مجھے نائب تحصیلدار کی آسامی پیش کی گئی۔ لیکن میں نے اُسے رد کر دیا۔ (پتھرائی نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوے)...... آہ! ایک مقصد کی خاطر ان چیزوں کو رد کرنا میری روح کو کس قدر بلند کیے دیتا تھا۔

امرت: (بلانوش کے اور قریب ہو جاتا ہے) پھر کیا ہوا، بلانوش؟

بلانوش: میں نے پارٹی کے لیے کام کیا، لیکن ہمیشہ گرفت سے بچ کر۔ میری ایک ماما ہے، ماں! جسے کی امیدوں کا میں مرکز تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں گرفتار ہو کر اسے اس حد تک مایوس کروں کہ وہ، وہ...... لیکن شاید میں نے اسے اپنی بے عملی کا ایک بہانہ بنالیا تھا۔ میرے عملی کام کے بعد اگر وہ مر بھی جاتی تو میری روح کو بیک وقت دُکھ اور سکون ہوتا، لیکن تم جانتے ہو، ہمارے ملک میں سیاست ایک کھیل ہے جسے صرف امیر لوگ ہی کھیل سکتے ہیں۔ مجھے اپنی کوششیں ایک مچھر کی اُڑان نظر آئیں......

شنکر: اور تم نے پارٹی میں کام کرنا چھوڑ دیا؟

بلانوش: میں کبھی کبھی اُن کے اسٹڈی سرکل میں جایا کرتا تھا اور میں نے ارادہ کیا کہ کتابیں لکھنے اور ترجمہ کرنے کا کام شروع کروں۔ لیکن عملی طور پر سیاسی کام اور اس کام میں انتخاب کے متعلق ہمیشہ میرے ذہن میں کشمکش رہی۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک دوراہے پر محسوس کیا۔ پھر اس دماغی الجھن میں میں سب کچھ بھول گیا۔ میں اُن عقیدوں کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو بھول گیا۔ میں کوئی کام بھی جی لگا کر نہ کر سکا۔ میں نے گھبرا کر جب انھیں چیزوں کو پکڑنے کی کوشش کی جنھیں میں رد کر چکا تھا، تو مجھے پتا چلا کہ وہ میری گرفت سے نکل چکی تھیں ——— ان چیزوں نے مجھے رَد کر دیا تھا! ...... چند مالی مشکلات میں مبتلا ہو کر اب میں ایک کلرک ہو گیا ہوں اور بس! اور جب میرے حاکم بیہودہ باتیں کرتے ہیں، تو میں جی میں کہتا ہوں، کس قدر لغو ہے، دماغی طور پر یہ لوگ مفلوج ہیں۔ لیکن...... وہ اپنی بات منواتے ہیں اور مجھے ان اپاہجوں کے سامنے سر جھکانا ہوتا ہے۔ آہ! وہ شخص جسے اپنے آدرش کا راستہ نہ مل سکے، اس شخص سے کہیں ذلیل زندگی گزارتا ہے جس کا کوئی آدرش ہی نہ ہو۔ (بلانوش پھر رونا شروع کر دیتا ہے۔)

صفدر: مت رُوؤ، بلانوش! مت رُوؤ۔ تمھارا بھی دن آئے گا۔

بلانوش: (روتے ہوے) اب میں کس قدر فرار ڈھونڈتا ہوں۔ میں اچھے سے اچھے سگریٹ

تلاش کرتا ہوں اور انھیں اپنے فرصت کے لمحوں کا ساتھی بناتا ہوں۔ سگریٹ بھی ایک ٹھوس چیز ہے میری طرح اور پھر دھوئیں اور راکھ میں تبدیل ہونا شروع ہوتی ہے! پھر میں عورت کی آغوش ڈھونڈتا ہوں، شراب پیتا ہوں۔ ایک بڑی بیماری چھوٹی بیماری کو کچل دیتی ہے۔ لیکن بڑی بیماری......؟

صفدر: صبر کرو، بلانوش......اس میں مجھے اپنی دُکھ بھری کہانی نظر آتی ہے۔

بلانوش: کرنے کے لیے کوئی بھی کام حقیر نہیں، عمل کے لیے کبھی دیر نہیں — میں اس بات کو جانتا ہوں، لیکن کر نہیں سکتا۔ مجھ میں عمل کی قوت نہیں رہی اور اب میری یہ حالت ہے! — (رونے لگتا ہے)

صفدر: مجھے اپنے انجام سے ہمیشہ خوف آتا رہا ہے۔ ایک فنکار سے زیادہ اچھی زندگی کسی کی نہیں۔ وہ عوام پر حکومت کرتا ہے، انھیں احمق کہہ کر اُن ہی سے داد وصول کرتا ہے، لیکن فنکار کی زندگی سے زیادہ ذلیل زندگی نہیں۔ جب وہ اپنے عروج سے گزر جاتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہیں رہتا۔

بلانوش: لیکن تم عمل سے غافل بھی ہوئے؟

صفدر: آہ! تمھیں کیا معلوم بلانوش! اگر میں عامل ہوتا تو میں آج یہاں موجود نہ ہوتا۔ میری صحیح جگہ میرا ڈیسک ہے۔ جب میں نے ادب میں حصّہ لینا شروع کیا تو میں سمجھتا تھا میں پیغمبر ہوں۔ کوئی برتر طاقتوں کا پیغام لیے آیا ہوں۔ شروع شروع میں میں ڈاک کے محکمے میں منشی کا کام کیا کرتا تھا۔ ٹکٹیں اور لفافے بیچا کرتا تھا۔ لیکن ٹکٹیں اور لفافے بیچتے ہوئے بھی جب کوئی خیال آتا تو میں اُسے لکھ لیتا۔ کئی بار یہ ہوا کہ میں نے ٹکٹیں زیادہ دے دیں اور شام کو خسارا برداشت کیا۔ لیکن میں عامل ضرور تھا۔ اُس وقت کام کرتا تھا۔ آدھی رات کو بھی لکھنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا۔

شنکر: لیکن اب کیا ہوا صفدر؟

صفدر: میں نے وہ حقیر ملازمت چھوڑ دی تاکہ اپنا مقصد حل کر سکوں۔ چند دنوں کے لیے بیوی بچے بھوکے مرے اور میں گھبرا گیا۔ مجھے دن رات محنت کرنی چاہیے تھی۔ لیکن

میں نے نہ کی۔ میں نے کم سے کم مزاحمت کا راستہ اختیار کرلیا۔ میں بازاروں میں گھومنے لگا۔ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ...... کہ کچھ ہونے والا ہے! مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھوکوں مریں گے۔ میں گھومتا رہا گھومتا رہا۔ گویا آسمان سے میرے لیے من وسلویٰ اُترے گا۔ جب آسمان سے کچھ نہ اُترا تو میں ایک دوست کے ہاں مہمان ہوگیا۔ اِدھر اُدھر سے چند پیسے بنا کر میں بیوی بچوں کو بھیج دیتا اور خود اس دوست پر بوجھ بنا رہا۔ وہ میاں بیوی میری خاطرداری کرتے اور شام کو آپس میں جھگڑتے۔ میرا دوست اپنی بیوی کو مارا کرتا اور میں سمجھتا، شاید ان کا کوئی نجی تنازعہ ہے۔ لیکن ایک دن خیال آیا کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میرے دوست کی بیوی نے جو آلو اپنے خاوند کو دیے، وہ زیادہ مرغّن تھے۔ میں چلا گیا اور وہ میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے......

امرت: اور پھر تم گراموفون کمپنی میں کیسے آئے؟

صفدر: اسی طرح کام سے جی چُراتا ہوا میں اتفاقاً گراموفون کمپنی کے منیجر کو مل گیا۔ اُس نے میری پہلی تنخواہ سے تین گنا زیادہ پیسے پیش کیے۔ میں نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ لیکن میں اپنے دل کی کیفیت جانتا تھا، اس کے ہاں نوکر ہوگیا۔ معاہدہ تھا کہ وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھوائے گا اور انھیں ریکارڈ کرے گا۔ لیکن وہ مجھ سے رائٹ اَپ اور اشتہار کے سوا اور کچھ نہیں لکھواتا۔ وہ میری قیمت نہیں سمجھتا۔ بارہا مجھے وہ شعر یاد آتا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

اِن چند کلیوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں اگر مصیبتوں کا مقابلہ کرتا، تو میں وہ ادب پیدا کرسکتا تھا جو......

شنکر: لیکن تم اپنے فرصت کے لمحوں میں کام کیوں نہیں کرتے صفدر؟

صفدر: وہاں اس قسم کا کام کرنے سے دماغ تھک جاتا ہے شنکر! لیکن نہیں، اُن کلیوں، اُن

نکلیوں نے مجھے آرام کے قابل بنا دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر ماہ کی سات تاریخ کو مجھے برابر پیسے مل جائیں گے۔ رات ہوتی ہے تو میں آرام کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔ صبح اٹھوں گا اور کچھ کام کروں گا۔ لیکن رات کو میں بستر کا ادب تخلیق کرتا ہوں اور صبح اُٹھنے کی سکت نہیں ہوتی۔ چھٹی کے دن کوئی رشتہ دار آ جائے تو مجھے ایک آسان سا بہانہ مل جاتا ہے، میں خود ہمیشہ بری الذمہ ہوتا ہوں۔ قصوروار دفتر کا منیجر ہوتا ہے، یا میری بیوی اور بچے ...... یا میرا نکما بھائی، جو دس سال سے میرے ٹکڑوں پر پَل رہا ہے۔

بلانوش: ایسے ہی ہوتا ہے صفدر۔ ایسے ہی ہوتا ہے......

صفدر: اور میں منیجر سے خوف کھانے لگا ہوں، گویا اس نے میری اس کمزوری کو بھانپ لیا ہے۔ اب وہ بالکل میری پروا نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنے اور ماتحتوں کے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھتا ہے۔ وہ کسی کے سامنے نہیں مسکراتا۔ نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ کسی خوبصورت لڑکی کی طرف بھوکی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ کس قدر کم گو ہے۔ جب کسی ماتحت سے قصور ہو جائے تو اس وقت اُسے کچھ نہیں کہتا، وہ اپنا کیس تیار کر لیتا ہے اور پھر اپنے شکار کو بے خبری کے عالم میں جھپٹ لیتا ہے۔ ماتحت بیچارہ تلملانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا...... وہ ڈریفس کے اعزازی وکیل زولا کے انداز میں کہتا ہے! I Accuse——......اور مجرم اس کینچوے کی طرح تڑپتا ہے جس پر کسی کا پاؤں آ جائے، اور میں کسی قدر ذلیل ہو چکا ہوں۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے ندامت نہیں محسوس ہوتی کہ پرسوں ایک کاروباری رائٹ اَپ اچھا نہ لکھے جانے پر اُس نے مجھے بُلایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک دم کہا—— ''تم احمق ہو'' اور مجھے کمرے سے باہر نکال دیا اور یہ وہی دن تھا جس دن مجھے آج کی شراب کے لیے پیسے ادا کرنے تھے!

(میز پر گردن جھکا لیتا ہے)

شنکر: صفدر، صفدر۔ دیکھو واقعی احمق نہ بنو......

صفدر: اگر میں نے ایک فل اسکیپ ورق بھی ہر روز لکھا ہوتا تو مہینے بھر میں ایک کتاب پیش کر سکتا تھا اور ٹیگور کو چیلنج کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے نہیں کیا۔ میں اپنی رذالت میں خوش ہوں۔ میں آرام، صبر اور تشکر کا قایل ہو گیا ہوں اور یہی سب سے بڑی لعنت ہے۔

شنکر: تم نہیں جانتے صفدر! ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میں بھی تم لوگوں کی طرح زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں۔ جیسے ٹھاکر نے کہا ہے، ہم شراب اور شباب کا جواز پیدا کرتے ہوئے بھی جانتے ہیں کہ قوم میں جاگرت پیدا کرنے والوں کی جگہ شراب خانہ نہیں ہے......

پروفیسر ٹھاکر: مدھوشالا نہیں ہے، اچھا ہوا تم بھی سیدھے راہ پر آئے۔

شنکر: لیکن سنو! یہ باتیں صرف اس کمیونسٹ سے متعلق ہیں، جسے شنکر کہتے ہیں۔ میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ پیسہ وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کا ہر آرام تعلیم، پیار اور پریم کے حاصل ہونے کے باعث مجھ میں کمتری کا کوئی خیال نہ تھا۔ میں نے آسانی سے نوجوانوں کی سربراہی اور لیڈری حاصل کر لی۔

امرت: گویا، اب تم لیڈر نہیں ہو!

شنکر: اب میں صرف نام کا لیڈر ہوں۔ لیکن میں عمل سے غافل ہوں۔ میں اب بھی کام کرتا ہوں۔ لیکن جانتا ہوں میرا دل اس میں نہیں ہے۔ شروع کے دو سال میں نے پسماندہ علاقوں اور گانووں میں جا کر بہت کام کیا۔ مجھے وہ دن یاد ہیں، جب میری وجہ سے میرے باپ کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ چپکے سے میرے کمرے میں آئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ وہ صرف دیکھتے رہے۔ ایکا ایکی انھوں نے اپنی پگڑی اُتار کر میرے پانو میں رکھ دی اور پھر خاموش ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میں نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ میرا باپ بیس سال اور بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ان کی گردن جو زندگی میں کسی کے سامنے نہیں جھکی، اس دن میرے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ اپنے عقیدوں کی خاطر اپنے دوسرے بھائی بہنوں کا مستقبل تاریک کر دوں۔ اپنے ماں باپ کا بڑھاپا خراب کر دوں۔ میں نے اُن

لوگوں سے اپنے آپ کو علاحدہ کرلیا اور خود بھاگ گیا۔ انڈر گراؤنڈ چلا گیا۔ اپنے آپ کو عاق کرلیا۔ گویا میرے ماں باپ مجھے نہیں چاہتے، اپنی دولت چاہتے ہیں۔ میری ماں مرگئی۔ وہ ایک دن میرا نام پکارتی ہوئی گھر کی دہلیز تک آئی، گری اور پھر نہ اُٹھی۔ میرے عزیز کہتے ہیں، اُس کی آنکھیں کھلی تھیں، وہ مرچکی تھی۔ لیکن شاید اس کی آنکھیں اور وہ پردہ جس پر نقش مرتسم ہوتے ہیں، زندہ تھا......!

صفدر: چپ ہو جاؤ شنکر!...... مجھے حبس سا محسوس ہو رہا ہے (قمیص کے بٹن کھول دیتا ہے)

شنکر: میں نے اس غم کو دیش سیوا میں مدغم کرنے کی کوشش کی۔ میں نے خون پسینہ ایک کردیا۔ میں کئی بار پکڑا گیا۔ لیکن میرے دل کی شمع روشن رہی۔ میں نے کئی دفعہ جہالت کی چٹان پر سر پھوڑا۔ لیکن میں نے پھر کمر ہمت باندھ لی۔ گانو کے لوگ سمجھتے ہیں، جب سے دُنیا بنی ہے ایک راجا ہوتا رہا ہے۔ زمین اس راجا کی ہوتی ہے جس میں ہل چلانے کا معاوضہ وہ لگان، مالیہ کی صورت میں دیتے ہیں، درمیان میں یہ لیگ، کانگریس کہاں سے آ ٹپکتی ہیں؟ انھیں یقین ہی نہیں آتا کہ یہ زمین اُن کی اپنی ہے۔ وہ ہنس دیتے ہیں۔ ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ آخر ایک دن ایسا آیا، میں مایوسی کی کھائی میں گر گیا۔

بلانوش: گویا کوئی خاص واقعہ ہوا؟

شنکر: سُنو بلانوش! ایک دن میں نے تین دن سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ انگارے برس رہے تھے۔ تپش کی وجہ سے کھیت کانپتے نظر آتے تھے۔ پسینے کا ایک قطرہ، جو میری گردن سے نکلتا تھا اُسے میں پیٹھ پر سے گھٹنوں پر اور گھٹنوں سے ٹخنوں پر ٹپکتے محسوس کررہا تھا۔ میری حالت بہت بُری تھی، میں بالغوں کو پڑھا کر اُن میں جاگرت پیدا کررہا تھا اور وہ اُونگھ رہے تھے، سو رہے تھے، خرّاٹے لے رہے تھے، میں نے انھیں جھنجھوڑ کر پڑھانا شروع کیا۔ میں نے دیہاتیوں سے سرکار کے متعلق کچھ کہا۔ اچانک اُن کے چہروں کا رنگ بدلا۔ وہ سُرخ ہوگئے۔ سُرخ! میں نے کہا۔ اب ڈھا اور بنا دینے والی، رُوسی نفرت پیدا ہوئی۔ لیکن ایک

اُٹھ کر بولا، اگر سرکار مجھے کہیں سڑک پر جاتی ہوئی مل جائے، تو میں اُسے چوٹی سے پکڑ کر پٹخنی دوں ــــــــ وہ سمجھتا تھا سرکار کوئی عورت ہے! اور اسی دن میں نے بددل ہو کر گاؤں چھوڑ دیا۔ ٹاپ اور پیاز کھانے کے بعد میں پھر قورمے اور کوفتے، انہی کورسوں میں کھانے لگا۔ شراب اور شباب کے حق میں بھی میں نے دلیلیں تلاش کرلیں۔ اس قدر تاریکی! اتنی جہالت! ...... میں نے کہا۔ ان لوگوں کا کیا ہوا جنھوں نے اپنی زندگی، دوبارہ نہ ملنے والی زندگی، ان لوگوں پر قربان کردی؟ پھر میں نے کہنا شروع کیا، ہمارے ملک میں چھ ماہ اس قدر ذلیل موسم ہوتا ہے۔ اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ روس؟ روس میں سخت سردی کے باوجود لوگ کپڑے پہن کر گھوم سکتے ہیں۔ واڈکا اور کیومس پی کر اپنے آپ کو گرم رکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بہانہ تھا کام نہ کرنے کا، سردی اتنا ہی منجمد کر دیتی ہے، جتنا گرمی خون پانی کر دیتی ہے۔ میں نے عمل سے منہ موڑ لیا، اور آج......

صفدر: بس ...... بس ــــ شنکر! اس سے زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔ ہم سب کو درحقیقت عامل ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمیں زندگی سے ٹکر لینی چاہیے۔

بلانوش: ہمیں اپنے ماحول سے جنگ کرنی چاہیے۔

پروفیسر ٹھاکر: ہمیں بھارت کی پُرانی روایتوں کو زندہ کرنا چاہیے۔ ہمیں پُران، وید پڑھنے چاہییں۔ وہی ہمیں عمل کی راہ بتا سکتے ہیں۔ اس بدیشی روش نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔

امرت: ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ حرکت میں برکت ہے صفدر! تم اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔

بلانوش: (استغراق سے اُٹھتے ہوئے) صفدر آرٹسٹ ہے! وہ سب کے لیے کُوھتا ہے، روتا ہے۔ اُسے رُو لینے دو۔ اُسے ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے دو۔ اس کے یہ آنسو مبارک ہیں۔ شاید ان کے بعد ہم عملی انسان بن جائیں!

صفدر: آہ، بلانوش! ایسے آنسو ہم اس سے پہلے بھی بہا چکے ہیں۔

شنکر: خاموش صفدر! صبر! ہم ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ لیکن تم ایک یان ہو۔

GENRE! زمانے کی رُوح! تم ایک آئینہ ہو جس میں ہمارا سماج اپنا منھ دیکھ سکتا ہے۔ جانے دو، جانے بھی دو، دوست! اگر چہ ہم نے ایسے آنسو کئی بار بہائے ہیں، لیکن ان آنسوؤں کے بعد ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے!

امرت: آج سے ہم ایک نیا راستہ اختیار کریں گے۔

پروفیسر ٹھاکر: آج سے، ورتمان سے ہم کچھ بھی نہیں لے سکتے۔ بہائے ہوئے آنسوؤں کا کرودھ ساتھ نہ ہوگا تو یہ آنسو بھی اکارتھ جائیں گے۔

بلانوش: آج ہم نئی کروٹ لیں گے۔ ہمارے اُفق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوگا۔ وہ زندگی آرہی ہے۔ (وقفہ — سب ایک انہماک کے ساتھ اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔)

پروفیسر ٹھاکر: وہ ایک لجائی ہوئی سندری کی طرح پیچھے دیکھ رہی ہے۔

شنکر: (گھبرا کر) ارے! اس نے آگے نہ دیکھا تو وہ گر پڑے گی۔ اس کی راہ میں بیسیوں رُکاوٹیں ہیں۔ تختے، میوزک اسٹینڈ، خوبصورت مرد!......

صفدر: ہاں شنکر! وہ گر پڑے گی۔ اگر روشنی پیچھے کی طرف سے آئے، تو سایہ ہمارے آگے پڑتا ہے اور روشنی جتنی پیچھے ہو، سایہ اتنا ہی لمبا ہوتا ہے......

بلانوش: روشنی سر پر ہونی چاہیے۔

شنکر: اپنے پانو کا سانپ نہیں دکھائی دے گا۔ روشنی آگے ہونی چاہیے۔

پروفیسر ٹھاکر: میں سمجھتا ہوں تمھارا کیا مطلب ہے؟ لیکن میں کہتا ہوں روشنی آگے ہو تو پیچھے اپنا ہی سایہ بھوت بن کر ڈرانے لگتا ہے۔

صفدر: ''زندگی'' ہم تک آتے ہوئے گھبرا رہی ہے۔ اپنا بدن چُرا رہی ہے؟

پروفیسر ٹھاکر: جیسے اپنے ہونے کی چھما چاہتی ہے۔

بلانوش: لیکن اس کا زرق برق لباس!......

صفدر: وہ اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتی، اگر چہ اس میں اتنی تیزی اور طراری نہیں جو کبھرے ناچ کے وقت تھی۔ شاید اس لیے کہ اُس وقت وہ زندگی کی فنکارانہ شکل تھی اور اب...... (زندگی قریب آجاتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا لبادہ تھامے

ہوئے ہے)

زندگی: کیا میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟

بلانوش: (اُٹھ کر، جھکتے ہوئے) وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!

صفدر: ہم زندگی کے ہی منتظر تھے۔ ہمارے اعصاب بالکل مُردہ ہو چکے تھے (اپنی کرسی خالی کر دیتا ہے) آیئے، آپ میرے قریب بیٹھیے۔

امرت: آپ کچھ کھوئی کھوئی معلوم ہوتی ہیں......

زندگی: (گھبرا کر) نہیں۔ میں کھوئی ہوئی نہیں۔ لیکن یہ جگہ جہاں آپ بیٹھے ہیں، مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس سرد منجمد کرّے میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے خدا نے زبردستی مجھے اِدھر دھکیل دیا ہے، اُسے یہ کھیل بیحد مرغوب ہے!

صفدر: ہاں، یہ کُرّہ اسی قسم کا ہے۔ لیکن (وقفہ) وہ کھرے ناچ کس قدر خوبصورت تھا۔ زندگی کے آتے ہی تاریکی دُور ہوگئی تھی۔ سارا ہال جگمگا اُٹھا جیسے اس دُنیا میں ہُو کا عالم ہوگا، زندگی آئی اُس نے حرکت کی تو ساری دُنیا منور ہوگئی، نغمے گونج اُٹھے۔ نور و نغمے سے ہی دُنیا کی بنیاد ہے۔

بلانوش: زندگی کا بار بار پہلو بچانا اور موت کے چنگل میں نہ آنا، خوب تھا۔

پروفیسر ٹھاکر: اُس ستون کے پاس جب زندگی جھکی تو میں نے سمجھا، موت نے آ ہی لیا ہے، لیکن کس طرح ایک جست کے ساتھ زندگی موت کے بند ہوتے ہوئے بازوؤں سے نکل گئی......

زندگی: ہاں۔ لیکن اس ڈرامے کا انجام آپ لوگ بھول گئے ہیں۔ آپ آنکھیں جھپک رہے ہیں، جیسے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ آخر موت نے زندگی کو دبا لیا تھا۔ (زہر خند سے)— کتنا دلچسپ دھوکا ہے کہ آپ اسے محض ایک کھرے ناچ، محض ایک کھیل سمجھ رہے ہیں۔

شنکر: اگر اس کے بعد ''زندگی'' ہماری رفیق نہ ہوتی، تو شاید ہم اسے ایک کھیل سے زیادہ سمجھتے۔ لیکن ہر روز سینکڑوں انسان مرتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے پیدا ہوتے ہیں—

اور زندہ لوگوں کے رفیق ہو جاتے ہیں!

صفدر: اور پھر کوئی دھن، کوئی لگن ——

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

بلانوش: آپ کیا پییں گی؟

زندگی: نہیں۔ میں سب کچھ پی چکی ہوں...... میں اب کچھ نہیں پینا چاہتی اور پھر بار بند ہو چکا ہے۔

بلانوش: بار ہمارے لیے کھلا ہے۔ چوبیس گھنٹے کھلا ہے (آواز دیتے ہوئے) بیرا!

زندگی: نہیں، میں کہتی ہوں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بادہ خوری کی مشق اتنی بڑھ چکی ہے کہ پی کر نشہ اُتر جاتا ہے......

شنکر: آپ جانتی ہیں ہم ہندستانی بڑے مہمان نواز ہیں۔ اتنی مدّت سے ہم نے آپ کی میزبانی کا فخر حاصل کر رکھا ہے تو آج......

بلانوش: ایک ایک پیگ ہو جائے خاتون ''زندگی'' کی صحت کا جام! اے بیرا!

بیرا: حضور!

صفدر: کدھر مر گئے تھے اُلو؟

بلانوش: پانچ وسکی —— اور ایک پورٹ!

زندگی: ہندستانی بڑے مہمان نواز ہیں۔ لیکن اتنی لمبی میزبانی سے تو مہمان بھی اُکتا جاتا ہے۔ ایک بات اور، میں امریکن ہوں!

شنکر: خوب! آپ امریکن ہیں! —— اور خاتون موت؟

زندگی: اس کیفے کا منیجر اور خاتون ''موت'' دونوں برطانوی ہیں۔

صفدر: آج آپ پہلے کی طرح خوش نظر نہیں آ رہی ہیں۔ گویا ابھی آپ کی کسی کے ساتھ جھڑپ ہوئی ہے۔ منیجر سے تو آپ کے تعلقات خوشگوار ہیں نا؟

پروفیسر ٹھاکر: بات یہ ہے —— آج شاید لڑکوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

زندگی: بلکہ یوں کہیے کہ ضرورت سے زیادہ توجہ فرمائی ہے۔ زندگی کے لیے کون واویلا

کر رہا تھا؟

امرت: (کھسیانہ ہو کر) ہم ہی لوگ تھے۔ بات یہ ہے محترمہ! ہمارے ملک میں جنسی بھوک بہت زیادہ ہے!

زندگی: (روکھی سی ہنسی کے ساتھ) جنسی بھوک!...... جنسی بھوک! میں جہاں سنتی ہوں، جنسی بھوک کے ہی قصے سنتی ہوں۔ یہی داستان پڑھتی ہوں!! یہ بیسیوں صدی کے سب سے زیادہ دُہرائے گئے الفاظ ہیں......

شنکر: ان کے دُہرانے میں کیا حرج ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں عورتیں، مردوں کی نسبت کم ہیں اور پھر یہاں کے رسم و رواج، ان کے میل جول کے خلاف ہیں۔

زندگی: کیا ان الفاظ کا اس بہتات سے استعمال ہونا دلیل نہیں ہے کہ اسے اسی وقت ترک کر دیا جائے۔ اگر آپ اسے استعمال کیے بغیر نہیں رہ سکتے، تو خدارا اس کے لیے کوئی اور ہم معنی الفاظ تلاش کر لیجیے! اس کے استعمال سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی پتھر پر لوہار گڑ رہا ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں!

امرت: مجھے خاتون زندگی سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم کھانے کا لفظ دن میں بیس مرتبہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس لفظ کو چھوڑ دیا جائے۔

زندگی: غلط ہے۔ ہم اس وقت نہیں، تو اس کے کچھ دیر بعد کچھ نہ کچھ کھا لیتے ہیں اور اس کی رٹ نہیں لگاتے اور آپ کا کیا خیال ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے مرد، عورت کے معاملے میں کم بھوکے واقع ہوئے ہیں؟ وہ بھی ایسے ہی بھوکوں کی طرح عورت کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہاں بھی عورت کو آزادی نہیں۔ وہاں بھی اس پر ایسے ہی جبر کیا جاتا ہے......

شنکر: معاف کیجیے، ہم آپ کا مطلب نہیں پا سکے۔

زندگی: مطلب ظاہر ہے۔ دراصل آپ کی جنس کا مقام سر ہے اور وہ جگہ نہیں، جہاں اسے

ہونا چاہیے۔

(سب اُچھل پڑتے ہیں)

بلانوش: خاتون 'زندگی' کی بات قابلِ غور ہے۔

صفدر: آپ درست فرماتی ہیں۔ اللہ قسم! ایک افسانے کا موضوع ہے۔

شنکر: خاموش! بات سننے دو۔ ساری دُنیا سمٹ کر ایک افسانے تک محدود ہوگئی ہے۔ کتنا ذلیل رویّہ ہے۔ ہر ایک چیز سے افسانہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنا اور زندگی، ہزار رنگ زندگی سے لطف نہ اُٹھانا۔

صفدر: گویا خاتون کی چوٹ کا بدلہ مجھ سے لیا جارہا ہے۔ میں اس پر بحث کرسکتا ہوں۔

پروفیسر ٹھاکر: شنکر کے ساتھ بحث کرسکتے ہو؟

زندگی: تم سب کتابی باتیں کرتے ہو۔ سب بیکار ہو۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر شراب اور کافی پیتے ہو اور جنس کے متعلق باتیں کرتے ہو۔ تم بالکل بے عمل ہو۔ بالکل بے عمل۔ بیدار ملکوں میں ہوش سنبھالتے ہی ایک نوجوان کو آٹھ دس گھنٹے کے لیے ایک ورکشاپ میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ وہاں وہ تیس بتیس توڑے گولیوں کے بناتا ہے۔ مشینوں کے لیے درجنوں ایکسل تیار کرتا ہے اور بوائلر کی حرارت میں کھڑا پگھلتا رہتا ہے۔ جب وہ باہر آتا ہے تو اُسے صرف ایک ہی بھوک ہوتی ہے۔ پیٹ کی بھوک! دُنیا میں اور پھر ہندستان میں، ایک ہی بھوک مقدم ہے اور وہ ہے پیٹ کی بھوک۔ دوسری بھوک، پیٹ کی بھوک کے بعد بیکار آدمی کا مشغلہ ہے!

شنکر: ہمیں ''زندگی'' کی سب باتوں سے اتفاق نہیں ہے، لیکن......

صفدر: لیکن ہم ان کی باتوں سے عمل کا سبق ضرور حاصل کرسکتے ہیں۔

زندگی: تم ابھی بالکل نوعمر ہو! شراب نے جیسے میرے پھیپھڑوں کو چھلنی کردیا ہے، ایسے ہی تمھارے دل اور دماغ بھی ناکارہ بنادے گی! تمھاری کمزور اولادیں تمھارے سامنے آکر تمھاری ہی مصیبت کا باعث ہوں گی۔ جاؤ، کام کرو۔ کرنے کے لیے کوئی بھی کام حقیر نہیں ہے۔

Go To the Ants-sluggardds

بلانوش: (اُٹھ کر) میں قسم کھاتا ہوں، آج یہ شراب کا جام میرا آخری جام ہوگا۔ ''زندگی'' کی صحت کا جام!

شنکر: زندگی کی صحت کا جام!—— آخری جام!

امرت: اس شراب کے آخری گھونٹ کو حلق میں اُتار لو اور اس بیہودہ نقل کو ختم کر دو۔

صفدر: مجھ میں روحِ عمل حلول کر گئی ہے۔ اس آخری گھونٹ کے بعد میں ایک عملی زندگی بسر کروں گا۔

شنکر: اور یہ آخری لڑکی ہوگی، جس کے ساتھ میں ناچوں گا: ''زندگی''۔

امرت: یہ آخری ریستوران ہوگا اور آخری کیبرے۔ اس کے بعد ہم عوام میں کام کریں گے۔ ہمارا سایہ بھی کسی گندی پبلک جگہ میں دکھائی نہیں دے گا۔

پروفیسر ٹھاکر: یہ میرا آخری قہقہہ ہوگا!

صفدر: (غصے میں) پروفیسر! ہم مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ آج ہمارے لیے صور پھونکا گیا ہے۔ شاید تمھیں اس کی آواز نہیں آ رہی۔ آج ہم سب اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ آج یہ ہماری آخری نیند ہوگی!

(شور —— جس میں لفظ ''آخر'' علاحدہ سنائی دیتا ہے)

منیجر: آرڈر۔ آرڈر —— (قریب آتے ہوئے) جنٹلمین، میں کہتا ہوں آپ لوگ......

(باقی کی آواز شور میں گم ہو جاتی ہے)

منیجر: (غصے میں) خاتون زندگی، رنگ میں چلی آیئے۔ آرکسٹرا انتظار کر رہا ہے۔ (طالب علموں سے) اور آپ لوگ ہرگز شور نہیں مچا سکتے ہیں۔

بلانوش: ہم شور مچائیں گے، شور ہمارا پیدائشی حق ہے۔ شور زندگی کا ثبوت ہے۔

منیجر: میں کہتا ہوں، اگر اس سے زیادہ شور مچایا تو میں نقضِ امن کا اندیشہ گردان کر پولس کو اطلاع دے دوں گا۔

امرت: پولس کے لوگ ہمارے اپنے بھائی ہیں۔ وہ ہم پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے۔

منیجر: آپ اپنے بھائیوں کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ قانون اور امن چین کے محافظ ہیں۔ وہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کے وفادار ملازم ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: آپ ناراض نہ ہوجیے، منیجر صاحب! خاتون 'زندگی' شنکر کے ساتھ رنگ میں جارہی ہیں......

زندگی: میرے ساتھ آپ نے میری روح کو نہیں خرید لیا، منیجر! مجھے رنگ میں جانے سے انکار کی پوری آزادی ہے۔

منیجر: معاف کیجیے۔ آپ کو معاہدے کی رُو سے رنگ میں جانا ہوگا—JAAZ موسیقی کے بعد آپ ان لوگوں کے پاس نہیں ٹھہر سکتی ہیں۔

زندگی: اگر میں یہاں سے چلی جاؤں گی، تو اس کیفے سے بھی چلی جاؤں گی۔

شنکر: منیجر! کیا آپ نے خاتون 'زندگی' کو PERSONA NON-GRATA قرار دیا ہے؟

صفدر: ہاہاہا!!!

منیجر: (غصّے سے) میرے نزدیک یہ کیفے ایسی سو خواتین سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر آپ کو صرف خاتون کی ضرورت ہے، تو میں 'زندگی' کی رفیق کار کو بھیج سکتا ہوں۔

شنکر: خاتون 'زندگی'! چلیے چلیے! ہم آج یہ آخری ناچ آپ کے ساتھ ناچیں گے۔

زندگی: میں رنگ میں چلی جاتی ہوں۔ لیکن اس کیفے میں میرا یہ آخری دن ہوگا۔ میں ایسی بے حرمتی برداشت نہیں کرسکتی۔ چلیے!

(چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ناچ دُھن، چہ میگوئیاں، ہلکے ہلکے قہقہے اور گلاسوں کے ٹکرانے کی آوازیں آتی ہیں)

بلانوش: موت آرہی ہے۔

صفدر: خاتون 'زندگی' کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ کچھ بوڑھی دکھائی نہیں دیتی؟

امرت: معلوم ہوتا ہے اس نے اپنے چہرے کی لکیروں کو کریم کے مساج سے درست کر رکھا ہے۔

بلانوش: وہ عمر رسیدہ عورت ہے اور تجربہ کار۔ جب خون جلد کے کناروں تک نہ آئے تو غازہ بھی پھٹ جاتا ہے......اور منھ پر جھائیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: 'زندگی' نے دنیا دیکھی ہے۔

بلانوش: ہاں، اس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: لیکن وہ ایک ہمدرد عورت ہے۔ وہ ہمارے کلچر کو یوں تباہ ہوتے دیکھ کر دُکھی ہوتی ہے۔

بلانوش: کسی زمانے میں وہ خوبصورت رہی ہوگی۔ لیکن اب......

امرت: اب تو اس کی شکل سے گھن آتی ہے۔

صفدر: وہ بہت پکے ہوئے پھل کی طرح ہے۔ آپ جانتے ہیں کوئی چیز بہت میٹھی ہو جائے تو آپ اس کا ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتے۔

بلانوش: خاتون 'موت' ابھی کمسن دکھائی دیتی ہے۔

امرت: شگفتہ اور خوبصورت! لیکن وہ ''موت'' ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: اُس نے اپنا ہڈ اور اپنے ناخن اُتار دیے ہیں۔ کالے لباس میں اس کا سفید چہرہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

صفدر: ''موت'' بذاتِ خود کوئی خوف پیدا کرنے والی چیز نہیں۔ البتہ اس کا خیال گھناؤنا ہوتا ہے۔ فلسفیوں کا خیال ہے کہ موت کا خیال موت ہے۔ موت بذاتِ خود زندگی ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: شاستروں میں لکھا ہے، مرتیو ایسا دروازہ ہے جس سے گزر کر ہم نوجیون پاتے ہیں۔

(خاتون 'موت' اپنا ذکر سُن کر متوجہ ہوتی ہے اور منیجر کا اشارہ پانے کے بعد ان لوگوں کی طرف چلی آتی ہے)

موت: کیا میں اِدھر آ سکتی ہوں؟

امرت: (کچھ رُک کر)......آیئے......خاتون موت......!

بلانوش: (اُٹھ کر) تشریف رکھیے۔ (اپنی جگہ خالی کر دیتا ہے)

صفدر: ہاہا! موت نے کبھی آنے کی اجازت طلب کی ہے؟

موت: معلوم ہوتا ہے، آپ زمانے کے ساتھ نہیں دوڑ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے سائنسدانوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ موت کو اجازت لینا سیکھنا چاہیے کیونکہ اور چند سالوں تک وہ اُن لوگوں کی اجازت کے بغیر نہیں آسکے گی، جیسے...... جیسے اب زندگی اجازت لے کر آتی ہے!

بلانوش: ہوہوہو!!!

امرت: That's Brilliant

پروفیسر ٹھاکر: Clever Too

موت: آج زندگی ہستی کے دروازے پر کھڑی کانپتی ہے، محبت، جوش اور غصے کے ساتھ! لیکن ہستی چند جھلیاں اُس کے سامنے تان دیتی ہے اور اس کے وجود میں آنے کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتی اور موت......

بلانوش: خاتون ''موت'' ''زندگی'' سے زیادہ عقلمند ہیں...... ان کی باتوں میں سادگی کی نسبت عیاری اور پُرکاری زیادہ ہے! (موت، کا ہاتھ تھام لیتا ہے) آپ کے ہاتھ کس قدر نرم ہیں محترمہ!

صفدر: شیریں کا عشق فرہاد کا ہُنر ہے۔ شاید تم ان ہاتھوں کے گداز کا اندازہ نہیں لگا سکتے!

امرت: سانپ کس قدر سُندر ہوتا ہے، لیکن اُس کے سر میں زہر ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: سوندریہ شاستر کے ودیارتھی اس زہر کی پروا نہیں کرتے۔

بلانوش: شراب کا جام وہ ہے جو تمھیں اس دُنیا کے رنج اور غم سے آزاد کردے۔ ایک اور جام کے بغیر مجھے محسوس ہوتا ہے۔

بہار بے سپر جام و یار گزری ہے

(سب داد دیتے ہیں)

موت: میں آپ کے لیے وسکی اور اپنے لیے ایک پورٹ منگوا سکتی ہوں؟

امرت: لیکن............

(سب پر افسردگی چھا جاتی ہے)

پروفیسر ٹھاکر: ہم سوگند لے چکے ہیں۔

صفدر: (رُک کر)......خاتون......ہمیں افسوس ہے۔ ہم آج قسم کھا چکے ہیں کہ شراب کا یہ جام ہمارا آخری جام ہوگا۔ اسے ہم پی چکے ہیں

بلانوش: آپ اپنے لیے پورٹ منگوا سکتی ہیں۔

موت: ایک اور جام کے بغیر آپ لوگوں کی رگیں مردہ ہو رہی ہیں۔ ان ہاتھوں سے دیے ہوے جام سے کبھی کسی نے انکار نہیں کیا۔

بلانوش: لیکن......مادام!......(شنکر کی طرف دیکھتا ہے) شنکر، 'زندگی' کے ساتھ ناچ رہا ہے ......اور ہم......

صفدر: وہ اچھا ناچتا ہے — میرا خیال تھا، اُس کا پانو زندگی کے پانو پر پڑ جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا......اور ہمارا عہد تھا کہ 'زندگی' آخری لڑکی ہوگی!

امرت: یہ آخری کیفے ہوگا۔ اور آخری کبھر ے —

موت: شاید یہ تمھاری آخری بہک ہوگی!

بلانوش: میں کچھ کہنا چاہتا ہوں — (خلا میں گھورتے ہوئے) میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

صفدر: میں نہیں جانتا، میں کچھ نہیں جانتا......

بلانوش: (اُٹھ کر اور جوش سے) ہم اور شراب منگوا سکتے ہیں۔ ہم خاتون 'موت' کی رفاقت میں ناچ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی قسم توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

صفدر: (خوش ہو کر) وہ کیسے بلانوش؟

بلانوش: ہم نے کہا تھا، آج سے ہم ان سب چیزوں کو چھوڑ دیں گے۔ آج سے! جس وقت ہم نے یہ قسم لی تھی۔ اُس وقت گھڑی بارہ بجا چکی تھی۔ بارہ بجے کے بعد دوسرا دن شروع ہوتا ہے، اس لیے ہمارا آج کا دن ختم ہونے میں ابھی تیئس گھنٹے باقی ہیں۔ اے بیرا! پانچ وسکی اور ایک پورٹ لاؤ۔

صفدر: خوب، گویا ابھی پورا ایک دن باقی ہے۔

امرت: (مسرّت کے عالم میں) خاتون...... اِدھر بیٹھ جایئے۔

صفدر: شنکر کو بُلا لو، ''زندگی'' کو آواز دو!

بلانوش: ہمیں 'موت' چاہیے، 'زندگی' بہت بوڑھی ہے۔ اے بیرا! پانچ وسکی اور ایک پورٹ۔
کدھر مر گئے تھے، گدھے؟......

(سب مل کر ہنستے ہیں 'موت' کی خوفناک ہنسی سب سے زیادہ بلند ہے——)

(پردہ)

رخشندہ

(کردار، جس ترتیب سے وہ کھیل میں وارد ہوتے ہیں)

رخشندہ : بائیس تیئیس برس کی ایک پڑھی لکھی، اعصاب زدہ لڑکی
آپا : رخشندہ کی آپا
دولھا بھائی: رخشندہ کے دولھا بھائی
بھابی : رخشندہ کی بھابی
بھائی جان: رخشندہ کے بھائی جان
ننھے میاں : رخشندہ کا چھوٹا بھائی
امّاں جان: رخشندہ کی امّاں جان
آپ : رخشندہ کے جسم اور رُوح کے مالک

پہلا منظر

ایک پُرانی وضع کے ٹھاٹ دار مکان کا بیرونی حصّہ۔ ایک گیلری سی اس مکان کے اردگرد دوڑ گئی ہے جس کا ایک حصّہ سامنے نظر آرہا ہے۔ اس گیلری پر ٹین کی ایک چھت ہے جو چوڑائی میں گیلری جتنی ہے۔ چھت بارش کو روکنے کے لیے کافی ہے بشرطیکہ بارش ترچھی نہ ہو۔

اس وقت سخت بارش ہو رہی ہے اور بجلی کڑک رہی ہے۔ چونکہ ہوا زوروں پر ہے، اس لیے گیلری پر سے گزرنے والا بھیگ جاتا ہے۔ پردہ اُٹھنے کے تھوڑی دیر بعد رخشندہ، دیوار کے ساتھ لگی ہوئی سامنے نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے...... اگر وہ کھڑکی اور دروازے کے درمیان شمعدان نما بڑھاؤ کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے تو اس کی شلوار کے پائنچے چھوٹ جاتے ہیں اور اگر وہ پائنچے پکڑتی ہے تو شمعدان ہاتھ میں نہیں آتا اور وہ دیوار کے ساتھ ساتھ نہیں جا سکتی۔

رخشندہ — تھوڑے رکھ رکھاؤ کے بعد مزاحمت نہیں کرتی اور اپنے آپ کو بھیگنے دیتی ہے۔ ساٹن کی شلوار اور آرگنڈی کی قمیص اس کے دُبلے پتلے اور رُوح ایسے لطیف جسم کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ رخشندہ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے تو اس کے سفید چہرے پر سر کے بھورے بال یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے دیے کی لو سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں، — وہ رخشندہ ہے!

دروازے کے پاس پہنچ کر رخشندہ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ڈرتے ڈرتے وہ پھر دروازے پر ہاتھ مارتی ہے —

رخشندہ: آپا! آپا...... (التجا سے) آپی! کھول دو نا کواڑ۔ دیکھو واسطہ دیتی ہوں بڑوں کا۔

آپا جان: (اندر سے) کون؟ رخشندہ ہے باہر؟ (دروازہ کھولتے ہوئے) رخشی! سڑن کہیں کی۔ اِتنی رات گئے کدھر آدھمکیں تم —؟

رخشندہ: تم کہو گی وہی پُرانی عادت...... آپا! لیکن دیکھو، کس قدر اندھیری رات ہے، بجلی کڑک رہی ہے۔ حوصلے کے پَر جلے جاتے ہیں اور ''آپ'' ابھی تک نہیں آئے۔ اس وقت بارہ یا ایک بجا ہوگا۔ اللہ جانے کدھر بیٹھ رہے ہیں؟

(پھر رعد کی گرج اور بارش کی آواز سُنائی دیتی ہے)

آپا جان: ظاہر ہے، کلب سے واپسی پر بارش نے آلیا ہوگا۔ اُف کتنی بارش ہے۔ سامنے مکان کی سلیٹ والی چھت پر اولوں کی آواز...... کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے (سوچ کر) ...... لیکن کیا عجب ہے جو سلامت بھائی اسکول کے برآمدے میں چھینٹے سے بچنے کے

لیے ٹھہر گئے ہوں، کیا پہن رکھا تھا انھوں نے؟

رخشندہ: وہی ان کی دل پسند کالی پتلون تھی اور بُش شرٹ۔ جانے سے پہلے بہت دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے بال بناتے رہے۔ میں کہتی ہوں، آئینہ بھی تنگ آ گیا ہوگا ان سے!

آپا جان: ہاں تو سلامت کیا مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے یہ امید نہ رکھو کہ کپڑوں کی پروا نہ کرتے ہوئے گھر چلے آئیں گے۔

رخشندہ: (بجلی کی کڑک سُن کر) آپا، میں یہ سب باتیں تمھیں یہاں کھڑا رکھنے کی غرض سے کہہ رہی ہوں، اس بجلی کی خوفناک آواز سے میرا قلب اُلٹا جاتا ہے اور آپا! دولھا بھائی نے یہ کیا نحوست پھیلا رکھی ہے، جو چھ گھنٹے سے سو رہے ہیں؟

آپا جان: سو کب رہے ہیں؟ آپ سوتے ہیں نہ مجھے سونے دیتے ہیں، ان کی طبیعت تمھیں پتا ہے نا۔ دماغ میں خیال پیدا ہو گیا کہ شطرنج کھیلیں گے۔ اب اور اسی وقت میں ہی ذرا آنکھ جھپکنے لگی تھی کہ موئے شطرنج میں گھسیٹ لیا مجھے۔

رخشندہ: آپا! تم قیاس کر سکتی ہو، وہ کیوں نہیں آئے؟ یہ ہاتھ میرے کلیجے پر رکھ کر دیکھو، کس طرح کی دھمک پیدا ہو رہی ہے!

آپا جان: رخشی! تم ناحق گھبرا رہی ہو، ناحق۔ ابھی آئیں گے سلامت بھائی تو بڑی ہنسی ہوگی، پھر آنکھیں چار نہ کی جائیں گی تم سے۔

رخشندہ: آپا جان! واپس جانے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ کیا تمھیں اپنی خوف زدہ بہن کا ذرا بھی خیال نہیں۔ میری مصیبت کا ذرا بھی اندازہ نہیں؟ تمھیں اِدھر مشغول رکھنے کے لیے دولھا بھائی سے اجازت طلب کر لیتی ہوں، تم گھڑی دو گھڑی میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ جب میرا جی سنبھل جائے تو چلی جانا۔

آپا جان: ہائے ہائے، اتنا بھی کیا ہے تھی؟

رخشندہ: (محبت سے) آپی تم نہیں جانتیں، میں — کتنا سہمی جا رہی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے (سوچتے ہوئے) دُنیا میں، میں ہی ایک عورت ہوں جس کا خاوند ابھی تک واپس گھر نہیں آیا۔ میں ہی ایک روح سرگرداں ہوں جو صدیوں سے سایے ایسے

سُبک اور تیز گام قدموں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہی ہے۔ جو اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں ازل سے آوارہ ہے...... میں نے کتنی صحرا نوردی کی ہے، کتنے کوہ و دشت ناپے ہیں! چٹانوں اور کانٹوں کی نوکوں کے جلتے ہوئے بوسے میرے قدموں پر حاوی ہو گئے ہیں، آپا یہ دیکھو میرے پاؤں......

آپا جان: اُف! یہ گودنے سے کیا ہیں ننھی......؟

رخشندہ: وہ......وہ دیکھو......وہ......(خلا میں دیکھنے لگتی ہے)

آپا جان: وہ......(اوپر دیکھتے ہوئے) وہ کیا ہے رخشی!

رخشندہ: آپا، کئی موٹروں کے پہیئے اور دُھرے میرے ذہن میں گھوم رہے ہیں، کانوں میں گھر رگھرر کی ایک مسلسل آواز سُنائی دیتی ہے، جو آناً فاناً ایک دھماکے پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھو کیا تمھیں کچھ نہیں دکھائی دیتا؟

آپا جان: کیا ہے...... مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

رخشندہ: ہاں وہ دیکھو، ہسپتال کی آیوڈین میں بسی ہوئی پیلی پیلی پٹیاں عزرائیل کی زرد بے خون انگلیوں پر چکّر لگا رہی ہیں۔ تم جانتی ہو پار سال چچا فیاض کے چوٹ آئی تھی تو ان کی ٹانگ پر پلستر جما کر اسے لکڑی کی ایک تختی کے ساتھ باندھ دیا تھا اور وہ کس درد و کرب سے کراہتے تھے۔ ان کی آنکھوں کی دہشت ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی ہے اور مجھے اس سے کتنا ڈر معلوم ہوتا ہے......! (بادل کی گرج سنائی دیتی ہے) آپا، اچھی! مجھے اپنے دامن میں چھپا لو۔

آپا جان: (روکھی ہنسی ہنستے ہوئے) میرے دامن میں چھپو گی؟ میرا دامن اتنا مختصر ہے کہ......

رخشندہ: (تاسف سے) اوہ! تمھارا دامن تمھاری رخشندہ پر بھی تنگ ہو گیا ہے، آپا، یہ مجھے معلوم نہ تھا...... شادی کے بعد یتیم اور بے کس بہن بھائیوں کے ساتھ ایسا سلوک کس قدر افسوسناک ہے۔ کیا اس دامن میں ننھا اور تازی ہی سما سکتے ہیں؟ یا......(کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن شرم مانع ہے)

آپا جان: (برافروختہ ہو کر) آخر یہ کیا ہے آدمی رات کے وقت تم دیوانی ہو رہی ہو۔ سب سو

رہے ہیں، یہ کیا بدتمیزی ہے کہ ذری خلاف توقع مرد کے آنے میں دیر ہوئی، تو یوں
ٹھٹک گئیں۔

رخشندہ: (آواز میں رقت ہے) تمیز! (آواز میں لغزش ہے) اوہ تمیز! کبھی تم لوگ میری تمیز اور سلیقے کی داد دیا کرتے تھے۔ کبھی میری حیا کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ جب کسی کا بچانے والا ہاتھ ہٹ جائے تو عورت سے سب عیب منسوب کر دیے جاتے ہیں۔ آپا تم جانتی ہو، جب ابا، اللہ کو پیارے ہوئے تو رشتہ داروں نے کون سی تہمتیں تھیں جو لمّاں جان پہ نہ لگائیں؟ اگر وہ گھر سے نکلی ہیں تو ان پر انگلیاں اٹھی ہیں، اگر اندر رہی ہیں تو آوازے کسے گئے ہیں۔ اب جن حالات میں مَیں ہوں، ان میں تمیز سے واسطہ؟ آپا میری تمیز، میری حیا، میری عقل، میرے سہاگ کی باندی ہے۔

آپا جان: تم حیا کا دامن چھوڑ رہی ہو رخشی!

رخشندہ: آپا جان، آج اس مختصر سی بیوگی پر مجھے اپنی بیوہ ماں کے دُکھ کا احساس ہوتا ہے۔ تم کیوں نہیں سو جاتیں۔ لمّاں؟ ہم اپنی نادانی میں ہمیشہ کہا کرتی تھیں، لیکن وہ ایک ٹک چھت کی طرف، جہاں سے مالی نے شہد کا چھتّا اُتارا تھا، دیکھتی جاتیں اور......

آپا جان: تم بھی عجیب ہو جو بیوگی کا آزادانہ طور پر ذکر کر رہی ہو، حالانکہ عورتیں اس کے تذکرے تک کو بُرا سمجھتی ہیں اور لمّاں جان اپنی دائمی بیوگی پر اتنی واویلا نہیں کرتیں، جتنی تم......

رخشندہ: تم نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا کی ہے آپا کہ ان کی خاموشی کتنی پُرشور ہے! اُن کے کپڑوں کی ماتم آلود سادگی میں ہزاروں بیواؤں کا سوگ دکھائی دیتا ہے! اُن کی پتھرائی ہوئی نظروں میں اُن سینکڑوں عورتوں کی کاہش اور کسک ہے، جن کے خاوند گھر نہیں آئے ان سب باتوں کے باوجود ان کے دل کی حدیث میرے قصے سے علاحدہ ہے۔ اماں جان نے دنیا کی اونچ نیچ دیکھ لی ہے اور سنو، اس نے اپنے بہو، بیٹے، بیٹی اور داماد میں اپنا سہاگ پالیا ہے ــــــ اور پھر (وقفہ) ــــ پھر ــــ (بادل کی گرج سُنائی دیتی ہے۔)

آپاجان: اور پھر کیا؟

رخشندہ: (ڈرکر) میرے اور قریب ہو جاؤ، آپا۔ پھر اماں جان نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے کہ ابا جان جنت سے واپس نہیں آنے کے۔ لیکن میں ان کی طرح نہیں سوچ سکتی۔ میری ماں کا خاوند فانی تھا، لیکن میرا خاوند غیر فانی ہے۔

آپاجان: (گھبرا کر) رخشندہ یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟

رخشندہ: میں دیوانی تو نہیں آپا!

آپاجان: دیوانہ اپنے زعم میں......

رخشندہ: میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آپا۔ روح کا خاوند کبھی نہیں مرتا۔ (ایک مریض کی سی ہنسی) لیکن (یکلخت جیسے اس نے نبض کو پالیا ہو) لیکن ہمیشہ اس کے آگے آگے بھاگتا رہتا ہے، جس طرح ازل سے چاند سورج کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن ہمیشہ سے برابر کا فاصلہ قائم ہے۔ اس طرح روح ازل سے اپنے محبوب کو پکڑنے کے لیے عالم ہستی میں سرگرداں ہے، لیکن اسے پکڑ نہیں پاتی۔

(دور سے دولھا بھائی کی آواز آتی ہے۔ دولھا بھائی کا اصول ہے، خوش باش وے کہ زندگانی این است)

دولھا بھائی: بیوی! آپ آئیں گی یا پانسہ اُلٹ دوں؟

آپاجان: میں کہتی ہوں ذری اِدھر تو آیئے لپک کے.....

دولھا بھائی: اِدھر کیا ہے؟

آپاجان: سلامت بھائی نہیں آئے تو رخشی باؤلی ہوئی جا رہی ہے۔

دولھا بھائی: ہار رہی ہو نہ! اب جب کہ میرا خون خچر ہوا جاتا ہے تو آپ کیا چپکے سے بیٹھ رہی ہیں وہاں!

آپاجان: میں کہہ رہی ہوں سلامت بھائی نہیں آئے ابھی تک۔

دولھا بھائی: رخشی سے کہو سورۂ حمد پڑھے آکر۔ حکم ہی تو صادر کرے گا، وہ ہمیشہ کی طرح آئے گا وقت پر! (کچھ قریب آجاتے ہیں)

رخشندہ: وقت کب کا ہو چکا دولھا بھائی۔

دولھا بھائی: ایں؟ ایک بج چکا ہے! (ایک جمائی لے کر) تو کیا مضائقہ ہے باہر دیکھو۔ موسم بھی تو کتنا خراب ہے۔ کہیں بارش کے تھم جانے کا انتظار کر رہا ہوگا۔

آپا جان: ڈر یہی ہے کہ کہیں موٹر تانگا کی لپیٹ میں نہ آ گئے ہوں۔ ہاں بابا، آج کل موٹریں بھی تو کتنے بلیوں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔

دولھا بھائی: ارے جانے بھی دو۔ تم نے سلامت میاں کو بچہ سمجھ رکھا ہے؟ کان کاٹتا ہے وہ بڑے بڑوں کے!

رخشندہ: کان کاٹتے ہوں گے، لیکن حادثے کو عقل سے نہیں تقدیر سے واسطہ ہوتا ہے، دولھا بھائی!

دولھا بھائی: پھر جو آدمی تقدیر کو مانتے ہیں، انھیں تو تسلیم و رضا کی عادت ڈالنا اور خوش رہنا چاہیے (بات کا رُخ پلٹ کر) اور میں سوچتا ہوں سلامت کس قدر خوش قسمت ہے (مزا لے کر) رخشندہ ایسی لڑکی، اس کا انتظار کرتی ہے! یہ دیکھو رخشندہ، یہ بھی تمھاری ہی بہن ہے نا۔ کبھی دس بجے بھی آؤں تو آرام سے پڑی سو رہی ہوتی ہیں!

آپا جان: (خفا ہو کر) میں نے سمجھ لیا ہے نا کہ آپ کے وقت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ بقول 'حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے' اور رخشی سلامت بھائی کے متعلق جانتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کلب میں جاتے ہیں اور اس کے بعد شراب خانے، قہوہ خانے میں جھک نہیں مارتے پھرتے، سیدھے ہی گھر کا رُخ کرتے ہیں۔

دولھا بھائی: سنتی ہو رخشندہ؟ سورج غروب ہونے کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں رہا۔ لیکن آپ اس وقت بھی نیند میں مدہوش ہوتی ہیں، اور پھر پہلے پہر کی نیند جگانا تو سوئے ہوئے شیر کو ہاتھ لگانا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر کہیں حادثہ ہو جائے تو تین دن کے بعد میری نعش ہسپتال کے مردہ خانے سے ملے۔

آپا جان: (چمک کر) چپ رہیے، آپ کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ہسپتال کے مُردہ خانے کا ذکر کرتے ہوئے کیا آپ رخشندہ کے زخم پر پھاہا رکھ رہے ہیں؟

دولھا بھائی: رخشندہ! لڑکی تم مطلق فکر نہ کرو، وہ آتا ہی ہوگا۔ ذرا بارش تو تھم جانے دو اور جو انتظار کرنا ہی ٹھہرا تو آؤ! ایک بازی شطرنج کی لگالیں۔ (جاتے ہیں)

آپا جان: چلو گی؟

رخشندہ: ہوں! شطرنج!

آپا جان: آخر دل جو بہلانا ہوا۔

رخشندہ: کیا ایسے میں مجھے شطرنج کی چالیں سُوجھیں گی۔

آپا جان: (خفا ہو کر) تم ایسی نادان چھوکریاں ہی مردوں کو خراب کرتی ہیں ...... اور خود بھی خراب ہوتی ہیں۔

رخشندہ: اور اپنی خرابی میں کتنا خوش ہوتی ہیں آپا! خدا دولھا بھائی کو خواجہ خضر کی عمر عطا کرے اور تمھاری گود ہمیشہ ہری رہے۔ جس کی گود میں بچّے اور جس کے پہلو میں اس کا چاہنا والا ہو، اسے کیا پڑی ہے کہ جو دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھے۔

جس کے پیر پھٹے نہ بوائی   وہ کیا جانے پیر پرائی

آپا جان: تمھاری نگاہ میں میرے بچّے اور میرا شوہر ہو رخشندہ! کیا تمھیں شرم نہیں آتی، جو اپنے حسد و بغض کا کھلے بندوں اظہار کرنے لگو؟ یہ تمھاری وجہ سے ہے کہ وہ میری طرف سے بے اعتنا رہتے ہیں۔

رخشندہ: میری وجہ سے؟

آپا جان: ارے توبہ توبہ! خدائی بھر میں کوئی تم ایسی باتیں سن کر صبر اور سکون کا دامن تھامے رکھے گا؟ میں تو تمھیں اپنی بہن ہی سمجھتی تھی، مگر تم تو خاصی سوت ہو!

رخشندہ: (چیخ مار کر) آپا —!

آپا جان: چل، اپنے کمرے کے اندر جا کے سُو رہ، تیرے پاگل پنے کا ایک ہی جواب ہے۔

(زور سے دروازہ بند کر دیتی ہے)

رخشندہ: (جیسے یقین نہیں آتا) دروازہ بند کر دیا! مجھ پر میری اپنی بہن نے دروازہ بند کر دیا!

(پردہ)

دوسرا منظر

رخشندہ کے بھائی جان اور ان کی بھابی کا کمرہ۔ کمرے میں مدھم سی روشنی ہے جس میں کمرے کے عین درمیان دو پلنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پلنگ پر بھائی جان بیٹھے گھٹنوں تک دوشالہ اوڑھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ پاس ہی ایک ڈائمنڈ کٹ کے ایک خوبصورت گلاس میں ایک رنگین سی چیز پڑی ہے...... بیگم (درخشندہ کی بھابھی) سے باتیں کرتے ہوئے وہ گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ پی لیتے ہیں۔

باہر بارش کی آواز اور بادل کی گرج برابر سُنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد رخشندہ کی بھابی اپنے میاں کی بغل سے اُٹھ کر دروازے کے قریب پہنچتی نظر آتی ہے۔ پہلے وہ روشندان کی رسّی کو کھینچتی ہے تاکہ پانی کی بوچھار کمرے میں گر کر قالینوں کو خراب نہ کردے، پھر وہ دروازے کے پاس کھڑکی کی نچلی چٹخنی کو بھی بند کردیتی ہے اور درزوں میں کاغذ ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ پلنگ کے دوسری طرف بیٹھ جاتی ہے اور دوشالہ اپنے گھٹنوں تک کھینچ لیتی ہے۔

اِن دونوں میاں بیوی کی زندگی کا یہ نہایت پُر کیف لمحہ ہے۔ باہر بارش ہے، سردی ہے اور ان دونوں کو عشق ومحبت کی گرمی میسر ہے۔ انھیں کچھ اس قسم کا حظ حاصل ہو رہا ہے، جیسے سردیوں کی صبح چائے کے عادی شخص کو چائے کا ایک گرم گرم پیالہ پی لینے سے حاصل ہوتا ہے اور پھر اگر ایک سگریٹ بھی مل جائے تو......

بھابی: کتنی خوفناک رات ہے، طوفان بڑھتا ہی جا رہا ہے!

بھائی جان: درختوں کے دیو وحشتناک سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ جیسے خوفناک گھنے جنگل میں رہزن کسی مسافر کو دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔

بھابی: کالے بادلوں میں بجلی کی کوند کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ جانور بیچارے اپنے گھونسلوں میں کیا کرتے ہوں گے؟ ہماری چھت کی کارنس پر جو کٹھ پھوڑا رہتا ہے......

بھائی جان: دابے رہے پروں سے نشیمن کو رات بھر...... کر کیا سکتے ہیں بیچارے؟

بھابی: ہمارا بھی ننھا سا گھونسلا......

بھائی جان: کتنا اچھا ہے!......جس میں ہم اور تم زندگی کے حسین لمحے کاٹ رہے ہیں، زندگی کے حسین لمحے وہی ہوتے ہیں جب باہر طوفان ہو، حالات ناموافق ہوں، لیکن محبت کرنے والے دل، ان سب باتوں سے بے خبر اپنی ننھی سی دنیا میں مگن ہوں......

بھابی: اور اس لمحے چاہیے نشیمن پر بجلی گر جائے......آہ......کس قدر موزوں ترین خاتمہ ہے۔

(دروازہ پر دستک سنائی دیتی ہے)

بھابی: کون ہے؟

بھائی جان: بجلی——

بھابی: لیکن ایسی بجلی جو ہمارا خاتمہ نہ کر سکے گی۔

رخشندہ: (رخشندہ کی آواز) بھائی جان؟...... بھائی جان!

بھائی جان: کون ہے اس وقت (رُک کر) رخشی معلوم ہوتی ہے! لیکن یہ کیا بوالعجبی ہے کہ رات کے تیسرے پہر......؟......

بھابی: بے وقت کی شہنائی!

بھائی جان: (ایک طویل سرد آہ بھرتے ہوئے) اس کی زندگی بھی سوتے جاگتے کا ایک نا تمام افسانہ ہے۔

بھابی: (اظہارِ ناپسندیدگی میں) چاہے بہن ہی ہے آپ کی، لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گی کہ اسے وقت کی تمیز نہیں۔ اس بھرے گھر میں جہاں بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی، ہمیں اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ میں نے آزما کر دیکھا ہے، جب ہم دونوں اکیلے ہوتے ہیں تو ضرور آدھمکتی ہے۔

بھائی جان: بُری عادت ہے۔ لیکن......

بھابی: ہاں......لیکن......آپ تو اس کا جواز تلاش کر ہی لیں گے۔ دنیا میں کوئی ایسی بات ہے بھی جس کا جواز نہ پیش کیا جا سکے۔ میرے بھی بھائی ہیں، لیکن کیا مجال جو میری پاسداری کریں۔ ان کے نزدیک ہمیشہ وہی سچ ہوتا ہے جو بھابی جان کہتی ہیں۔ اس لحاظ سے رخشندہ واقعی رخشندہ اختر ہے——!

بھائی جان: میں محض جواز نہیں پیدا کر رہا!

رخشندہ کی آواز: (زیادہ مضطرب)— بھائی جان! بھابی! خدا کے لیے دروازہ کھول دیجیے۔

بھائی جان: رخشندہ کی آواز میں غیر معمولی گھبراہٹ نہیں سُنائی دیتی کیا؟

بھابی: اس کی آواز گھبراہٹ سے خالی کب ہوتی ہے؟ وہ ہمیشہ بات یوں شروع کرتی ہے جیسے کوئی حادثہ رونما ہو گیا ہے۔ اس کی کھوئی کھوئی نگاہوں سے ہمیشہ یہ پتا چلتا ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان سلطنت کھو دی ہے۔ ایسی سلطنت جو کبھی اس کی ملکیت نہ تھی......

بھائی جان: فصاحت کے دفتر پھر کھول دینا۔ دیکھو تو سہی ماجرا کیا ہے؟ دروازہ کھولو۔

(دروازے تک پہنچتے ہوئے، بھابی اس انداز سے پوچھتی ہیں، گویا انھوں نے دستک کو پہلی بار سُن پایا ہے۔ رخشندہ کی آواز آپا جان کے سلوک کی وجہ سے زیادہ ہی معذرت سے پُر اور صدمہ زدہ ہو گئی ہے)

بھابی: کون ہے......؟ (دروازہ کھولتی ہے)

رخشندہ: میں ہوں ایک بھک منگی۔

بھابی: بھک منگی؟

رخشندہ: ہاں میں تم لوگوں سے بھیک مانگنے آئی ہوں بھابی! تم فقط میری بھابی ہی نہیں ہو۔ پھوپھی زاد ہونے کی وجہ سے تم میری چھوٹی بہن بھی ہو۔ بہت سی باتیں جو میں اماں جان سے نہیں کر سکتی، وہ میں نے تمھارے ساتھ کی ہیں، میرے کئی راز تمھارے کانوں کے گوشوارے ہیں۔

بھابی: کیا بات ہے آپا؟ خدا کے لیے مجھے پہیلیاں نہ بُجھواؤ۔ میں بھی تمھاری طرح گھبرا رہی ہوں۔

رخشندہ: تم......تم میری مصیبت کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ بھائی جان کو دیر سے گھر آنے کی عادت ہے۔ بھابی جب بھائی جان نہیں آتے، تو کیا تمھاری نگاہیں دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے پتھرانے نہیں لگتیں......؟ کیا تمھیں ہر حرکت میں صدیوں سے ایک مانوس

آہٹ نہیں سُنائی دیتی؟

بھابی: سنائی دیتی ہے آپا، لیکن......

رخشندہ: کیا تم باتیں کرتی ہوئی بہک نہیں جاتیں؟ کیا تمھارے کردار اور گفتار میں فرق نہیں پڑتا؟ کیا تمھیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ دنیا بھر میں تم ہی ایک ایسی عورت ہو جس کا خاوند واپس نہیں آیا؟ کیا تمھارا فکر تمھاری چربی کا چراغ جلا کر راہ گذاروں، شاہراہوں، اسپتالوں میں نہیں ڈھونڈا کرتا؟ کیا تمھیں یوں نہیں دکھائی دیتا، جیسے تم صدیوں سے آوارہ ہو رہی ہو اور تمھارے عزیز اپنے نرم و گرم گھونسلے میں پڑے تمھاری مصیبت کا خیال نہیں کرتے۔

آہ! روح اس تجسّس تا ابد میں کتنا وقار کھو دیتی ہے! وہ کتنی کم ظرف ہو جاتی ہے۔

بھابی: مشکل ہی سے کوئی عورت ہوگی جو اپنے خاوند کی اس بے اعتنائی کو دیکھ کر چُپ رہے۔ عورتیں ہمیشہ اس بات سے خفا ہوتی ہیں۔ لیکن سوچو تو سہی، یہی ایک لطیف بنیاد ہے جس پر حبیب و محبوب کی محبت کا محل کھڑا ہے۔ ہاتھ پسارو اور تمھیں محبوب مل جائے......تو روح کی مقدس آگ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔

رخشندہ: بھابی! میں تمھارے ہاتھ چومتی ہوں۔ آؤ۔ مجھ سے لپٹ جاؤ۔ تمھارے اس فقرے میں کتنی پیغمبرانہ شان ہے۔ لیکن وہ کدھر ہیں؟ اب انتظار کی وحشت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھ سے مذاق نہ کرو۔ مجھے میرا شوہر دے دو، مجھے میرا شوہر دے دو۔

بھائی جان: (جو جامد و ساکت سب باتیں سن رہے ہیں) رخشندہ اختر!

رخشندہ: آپ لوگوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ وہ دیکھو بستر اُبھرا ہوا ہے (دوڑ کر بستر تک پہنچتی ہے) کیوں یہاں کچھ بھی نہیں؟

بھائی جان: رُخشی، رُخشی۔ بیوی، رُخشی کے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔

بھابی: ہاں ساری شلوار گیلی ہوئی جاتی ہے۔ برآمدے میں کھڑے رہنے کی وجہ سے چھینٹا پڑ گیا ہے۔

بھائی جان: یہ سب اس لیے ہے کہ تم نے اپنی بحث طرازی میں دروازہ جلدی سے نہیں کھولا۔

رخشندہ: وہ پردے ہی میں رہے ہیں۔ وہ پردے کی تہوں میں چھپ گئے ہوں گے (بھاگتی ہے) لیکن اِن بازوؤں میں ہوا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ یہیں تھے، لیکن دروازہ کھلتے ہی کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ میں مر کر ان پردوں کو ہمیشہ ہلاتی رہوں گی۔ ان دروازوں کے اندر باہر ہمیشہ کے لیے گھومتی رہ جاؤں گی۔

بھائی جان: (ڈر کر) رخشی۔ رخشی۔

بھابی: میں کہتی ہوں، انھیں جھنجھوڑیے......اور......

رخشندہ: راستہ کدھر ہے؟ تم لوگ کیوں بحرِ ظلمات میں غوطہ کھا رہے ہو۔ بتی جلاؤ۔

بھابی: بتی جل رہی ہے۔

بھائی جان: بتی جل رہی ہے (گھبرا کر) بتی جل رہی ہے۔

رخشندہ: راستہ کدھر ہے؟ میں انھیں مدتوں سے ڈھونڈھ رہی ہوں۔ میں ان کے طور طریقے سے واقف ہوں۔ ایک نظر دکھائی دے کر پھر گم ہو جانا، ان کا شیوہ ہے۔

بھائی جان: سلامت بھائی ابھی تک نہیں آئے۔ ان کو تو دیر لگانے کی عادت نہیں۔

بھابی: آئیں ہائیں۔ اب مردوں پر حکم تھوڑے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے آپ کو کسی ضابطے کا پابند کیا جا سکتا ہے۔

بھائی جان: مجھے پتا ہو کہ کسی کی یہ غیر حالت ہو سکتی ہے، تو میں کبھی دیر نہ لگایا کروں گا۔

بھابی: اس طرح ہوتا ہے۔ کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ تعجب ہے! سلامت بھائی ہو کہاں سکتے ہیں اس وقت؟

بھائی جان: شہاب گنج میں ایک سیّد زادہ ہے۔ اس سے گاڑھی چھنتی ہے ان کی۔ کیا معلوم جو موسم کی خرابی کی وجہ سے وہیں ٹھہر گئے ہوں۔

بھابی: جب اپنے گھر کے آدمیوں کا پتا ہو تو پھر کسی صورت نہیں رُکنا چاہیے۔

بھائی جان: یا انھیں لائبریری میں چمڑے کی جلدوں کی بُو اچھی لگتی ہے۔

بھابی: لیکن لائبریری تو نو بجے بند ہو جاتی ہے۔

بھائی جان: اور بارش آٹھ بجے سے ہو رہی ہے، لیکن سلامت اپنے کپڑوں کو کسی طرح بھی خراب

کرنے والے نہیں۔

بھابی: اشرفیاں لٹیں، کوئلوں پر مُہر! رخشندہ ایک طرف اور کپڑے دوسری طرف، چھی!

بھائی جان: البتہ سینما کے دوسرے شو میں نہ چلے گئے ہوں۔

بھابی: لیکن کتنا غیر ذمہ دارانہ رویّہ ہے۔ اچھی طرح سے جانتے ہیں لاڈلی کو۔ اسے تو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا ہوتا۔

رخشندہ: (آواز میں رقّت ہے) بھائی جان۔ اللہ نے مجھے اور آپ کو ایک ہی خون سے بنایا ہے۔ لیکن ان کے نہ آنے سے آپ کا خون کیوں بے حس رہتا ہے؟ اس میں بے تار برقی کا عمل کیوں نہیں؟ کیوں ہر بار میری ہی گردن غم واندوہ کی کُند چھری سے رِیتی جاتی ہے۔ آپ کیوں نہیں سامنے پڑا ہوا چھاتا لے کر نکل جاتے اور انھیں ڈھونڈ لاتے؟

بھابی: پتا بھی ہو سلامت ہیں کہاں اور پھر چھاتا بھی ٹھیک حالت میں نہیں ہے۔

رخشندہ: برساتی۔ بھائی جان! برساتی کیوں نہیں پہن لیتے؟

بھابی: ہونہہ! جدامجد کے وقت کی برساتی خرید رکھی ہے۔ وہ کیا چھینٹے کو روک سکتی ہے؟

بھائی جان: اور ایسے میں تو چھاتا بھی بے بضاعت ثابت ہوتا ہے۔

بھابی: اچھی حالت میں بھی ہو تو اُلٹ جاتا ہے اور برساتی میں گردن کے قریب ایک بڑا سوراخ بھی ہے۔

رخشندہ: راستہ! راستہ! جب روح اپنے مالک کا پیچھا کرتی ہے، تو رات کس قدر اندھیری ہو جاتی ہے۔ دنیا کے چاروں کونوں سے طوفان اُمنڈ آتے ہیں۔ خرمن سوز بجلیاں کوندنے لگتی ہے۔ بھائیوں کے چھاتے اُلٹ جاتے ہیں اور بدنصیب روح۔

بھابی: آپا معاف کیجیے۔ آپ کو دوسروں کے برتن میں گدلا پانی کھنگالنے کی بہت بُری عادت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو اپنے بھائی کی نسبت، اپنا شوہر زیادہ عزیز ہے۔ نہ جانے شادی کے بعد بہنوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ ماں باپ، بہن بھائی سب شوہر کے مقابلے میں ہیچ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

رخشندہ: مجھے میرے ہی خنجر سے حلال نہ کرو بھابی۔ تم یہ سب باتیں ایسے کر رہی ہو بھابی، جیسے تم کسی کی بہن نہیں ہو۔ لیکن (رونے لگتی ہے) زندگی کی شمع زندگی سے ہی جلتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچانے کے لیے ایک خطرے سے باہر انسان کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنا ہوتی ہے۔ اگر یہ پتا ہو کہ دوسرا آدمی ڈوب ہی چکا ہے، تو کوئی نامحرم کو بھی چھلانگ لگانے کے لیے نہ کہے۔ آہ بھابی! تم لوگ ایک بیقرار روح کو کتنا غلط سمجھتے ہو!

(ننھے میاں داخل ہوتے ہیں)

ننھے میاں: یہ کیا اودھم سا مچ رہا ہے ادھر؟

بھابی: وہی روزمرّہ ننھے میاں!

ننھے میاں: آپا کیوں پاگلوں کی طرح چیخ رہی ہے؟

رخشندہ: میں ہی مشیّت کی ماری ہوئی ہوں ننھے میاں! ہر روز مجھے تلنے کے لیے زمانے کی کڑاہی میں نیا تیل ڈالا جاتا ہے۔ ہر روز میرے لیے ایک المناک افسانہ کھڑا ہوتا ہے۔

ننھے میاں: آج کیا بات ہے؟

بھائی جان: بات کیا ہوگی۔ سلامت بھائی نہیں آئے۔

ننھے میاں: تو اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ پرسوں میرا امتحان ہے اور میں ایک لفظ بھی تو نہیں پڑھ سکتا۔ بھائی جان آجائیں گے، کوئی بچہ تو نہیں ہیں۔

رخشندہ: ننھے میاں! کیا تم بھی اس قبیح سازش میں شریک ہو؟ کیا تم بھی اس غلیظ اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کے ایک ویلین ہو؟

بھائی جان: (اونچی آواز میں) رخشندہ بہن، اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے۔

ننھے میاں: بھائی جان برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آپا کو اچھی طرح سے جانتے ہوئے بھی نہیں جان رہے ہیں (نہایت محبت سے) آپا جان۔ کیا چاہتیں ہیں آپ؟

رخشندہ: (ہمدردی کے الفاظ سن کر پھر سسکتی ہے) میں کیا چاہتی ہوں؟ لذّت خودی دے کر مجھ ہی سے پوچھتے ہیں کہ میں...... آہ! تم سب بہن بھائی گرگِ باراں دیدہ ہو۔

ننھے میاں: لیکن آپا!......

رخشندہ: میں کسی کو انھیں تلاش کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتی۔ میں خود چلی جاتی ہوں۔ لیکن تم لوگ مجھے یوں سڑکوں پر جاتے ہوئے دیکھ کر بھی تو برداشت نہیں کرتے۔ خود جاؤ یا مجھے جانے دو۔ ننھے میاں تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ کیا تم پر بھی میں کوئی حق نہیں رکھتی؟ تمھیں روکنے والی تو یہاں کوئی نہیں ہے۔

بھابی: دیکھو آپا!......

ننھے میاں: بھابی! آپ پھر بولنے لگیں۔ آپ معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ لائیے کدھر ہے چھاتا اور برساتی؟

بھائی جان: (ندامت سے) باہر جانے سے تو میں نہیں گھبراتا، البتہ مجھے......

بھابی: چھاتا اور برساتی، وہ دونوں سامنے کپڑوں والی الماری میں پڑے ہیں۔

(ننھے میاں جاتے ہیں)

رخشندہ: (پھر خلا میں دیکھتے ہوئے) کارواں! کارواں جا رہا ہے۔ مجھے اپنے کانوں میں گھنٹیوں کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔ کارواں چلا گیا اور میں ریگِ صحرا پھانک رہی ہوں۔

بھابی: (حیران ہو کر) آپا کو کشف ہو رہا ہے؟

بھائی جان: (حیران ہو کر) کشف ہو رہا ہے؟

بھابی: آپ دیکھتے نہیں، ان کی نگاہیں کس طرح ایک نقطے پر جمی ہوئی ہیں...... وہ اس دیوار کے پار اس طرح دیکھ رہی ہیں، جیسے وہ شیشے میں سے جھانک رہی ہوں (وحشت زدہ ہو کر) ان کی نظریں دل و جود کو چیر رہی ہیں۔

بھائی جان: بیوی...... رخشی کو کیا ہو گیا ہے؟ خدارا اس کے کپڑے بدل ڈالو! ورنہ یہ سردی میں مر جائے گی۔ دیکھو اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے ہیں۔

رخشندہ: کپڑے! (ہنس کر) میں نے پہلے ہی اپنے جسم کو نم زمینوں کے کپڑوں سے آلودہ کر رکھا ہے (نفرت سے) تم لوگوں نے پہلے ہی مجھے جو جسم دے رکھا ہے، وہ ایک چیتھڑے سے زیادہ نہیں، وہ سال میں بارہ مہینے نزلہ اور دردِ سر میں مبتلا رہتا ہے

(کشف) میں محض ایک جسم سے کچھ زیادہ ہوں! لیکن میں کون تھی؟ کہاں تھی؟ اور کدھر چلی آئی؟ (دیوانہ وار ناچتے ہوئے)

"جب سے ہوں میں نیستاں سے بے وطن"

(ناچنے لگتی ہے)

بھائی جان: بیوی! مجھ سے یہ نہیں سہا جاتا۔ تم زبردستی رخشندہ کے کپڑے بدل ڈالو۔ میں لقاں جان کو اطلاع دیتا ہوں۔

بھابی: میرے ہاتھ پاؤں بھی پھولنے لگے ہیں، آپ آپا کے چہرے کا جلال نہیں دیکھ رہے؟ اوہ!...... میری آنکھیں تو خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔

رخشندہ: یہ روح کا ناچ ہے! روح کا ناچ! روح جب اپنے ازلی خاوند، اپنے اصل سے جدا ہوتی ہے، تو پھر اس کے وصال کے لیے بھٹکتی پھرتی ہے!

(گاتی ہے)

جب[1] سے ہوں میں نیستاں سے بے وطن

ہیں مرے شیون سے نالاں مرد و زن

بھائی جان: (ڈرکر) رخشندہ مجسم رخشندہ ہوئی جارہی ہے۔

بھابی: (متانت سے) آپ سلامت بھائی کو ڈھونڈنے چلے جایئے۔ چلے جایئے!

بھائی جان: اب چھاتا بھی نہیں اور نہ برساتی۔

بھابی: پروا نہ کیجیے! مجھے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ بھی باہر سے واپس نہیں آئے۔ اگر سلامت بھائی آگئے تو میں سمجھوں گی آپ بھی آگئے۔

بھائی جان: میں چلتا ہوں، لیکن رخشندہ آناً فاناً چپ ہوگئی ہے، کیوں؟ آخر کیوں؟

بھابی: جیسے صدف نے گوہر کو لے کر اپنا منہ بند کرلیا ہے۔ میں کپڑے بدلتی ہوں، آپ لقاں جان کو خبر کردیجیے، جایئے!

رخشندہ: میں کپڑے نہیں بدلنے دوں گی (ننھے میاں داخل ہوتے ہیں۔ طوفان کی آواز

---

1. کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند   (مولانا روم مثنوی)

آتی ہے)

ننھے میاں: (ہانپتے ہوئے! غصے کے اظہار میں) میں سر سے پانو تک بھیگ آیا ہوں، میں کہتا ہوں یہ کیا بیہودگی ہے؟

بھائی جان: بیہودگی کیا؟

بھابی: سلامت بھائی نہیں ملے؟

ننھے میاں: میں چوک سے پرے نہیں گیا کہ چھاتا اُلٹ گیا۔ برساتی پر قناعت کی لیکن اس میں بھی کپڑے بھیگ گئے۔ آپ باہر طوفان نہیں دیکھتے؟ (غصے میں) یہ آپا رخشندہ کی سراسر زیادتی ہے۔ اب میں خواہ نمونیہ میں مبتلا ہو جاؤں۔

بھابی: ننھے میاں، تمھارا بال بیکا نہیں ہونے کا۔

ننھے میاں: لیکن یہ کتنی بدتمیزی ہے۔ ذاتی طور پر میں تو زندگی بھر ایسی لڑکی سے شادی نہ کروں جو اپنے شوہر کو اتنی بھی آزادی نہ دے سکے کہ وہ ایسے میں باہر ٹھہر جائے۔

بھائی جان: خطرہ حادثہ کا ہے، ننھے میاں۔

بھابی: ہاں، حادثے کا ہی ورنہ!

ننھے میاں: اگر سلامت بھائی کا بال بیکا ہو، تو آپ مجھ سے بھر لیں۔

رخشندہ: (آناً فاناً) ہیں، میرے شیون سے نالاں مردوزن
(ناچتے ہوئے) مردوزن! مردوزن! مردوزن!!

ننھے میاں: آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ لتاں کو بلاؤ — فوراً۔ لتاں جان کو۔

بھائی جان: بیگم تم کپڑے بدل دو۔ ہم دونوں جاتے ہیں (جاتے ہیں)

بھابی: آپا۔ آپا مجھے بخش دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تو مجسّم روح ہے، روح! ہم سب جسم ہیں، جسم۔ ہم اس جسم سے کبھی اوپر نہیں اُٹھتے۔

رخشندہ: بھابی...... وہ آ رہے ہیں...... وہ آ رہے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ولی راستے میں بیٹھے ہیں اور میں بھاگی جا رہی ہوں......

بھابی: آپا...... آپا...... اپنے مبارک قدموں پر مجھے اپنی گناہ آلود جبیں رگڑنے دو۔ میں نہیں

جانتی تھی کہ تو ـــــــ

(آپا جان، دولھا بھائی، بھائی جان اور امّاں جان اور گھر کے بہت سے
آدمی بھاگے آ رہے ہیں۔ سب کے سب سخت گھبرائے ہوئے ہیں)

امّاں جان: رخشی! رخشی بیٹا! (چیخ مار کر) ہائے!

آپا جان: رخشی! رخشی!!

دولھا بھائی: رخشندہ، ہیں، سچ مچ؟

آپا جان: رخشی کو مار ڈالنے کی میں ذمّہ دار ہوں۔ اس کا خون میری گردن پہ ہے۔ لیکن میں کیا
جانتی تھی، مشیخت کی ماری......

امّاں جان: رخشی بیٹی! ہائے بیٹی! ایک دفعہ تو آنکھیں کھول کر دیکھ لے (روتی ہے)۔

بھائی جان: (روتے ہوئے) رخشی!

ننھے میاں: (بلند آواز میں) آپا!

امّاں جان: بیٹی ـــ بیٹی!!

رخشندہ: (نہایت کمزور آواز میں) امّاں!

بھابی: امّاں جان! آپ کی بیٹی کوئی ولی اللہ ہے۔ اس کے چہرے کا جلال نہیں دیکھتیں آپ؟

دولھا بھائی: تم عورتیں کتنی ضعیف الاعتقاد ہو۔ اسے سردی لگ گئی ہے اور بس۔

آپا جان: کمبل اوپر کر دو۔ ہائے میں نصیبوں جلی۔

بھائی جان: (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) کرامت۔ ابے کرامت۔ وہ انگیٹھی سرکانا۔

امّاں جان: دودھ کا ایک گھونٹ ہے کہیں......

بھابی: ہاں امّاں جان۔ میں رات چولھے میں ایک گلاس رکھ آئی تھی۔ دودھ لا دو ننھے میاں!

(ننھے میاں جاتے ہیں)

امّاں جان: رخشی، کیوں کیا ہوا میرے بیٹے کو؟

رخشندہ: (ویسے ہی نحیف آواز میں) امّاں مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔

امّاں جان: (ڈر کی جگہ غصہ لے لیتا ہے) آج آلے سلامت۔ میں اس کی وہ خبر لوں گی کہ یاد

کرے گا۔ میں نے آج تک اپنے کسی داماد کو کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن آج میں نے اس کے بال نہ نوچ ڈالے تو......

بھائی جان: واقعی یہ کیا بدتمیزی ہے کہ......؟

دولھا بھائی: ارے رہنے دو یار! اس بیچارے کو کیا معلوم کہ رخشندہ اتنی پاگل ہے؟

آپا جان: لیکن ایسا بھی کیا؟ آپ اپنے رات کے سیر سپاٹوں کا جواز پیدا کر رہے ہیں، تو علاحدہ بات ہے۔

بھائی جان: مانا باہر ٹھہر گئے۔ لیکن اطلاع تو ہو۔

بھابی: باہر ٹھہر ہی کیوں گئے بھلا؟

ننھے میاں: امّاں جان! یہ لیجیے گرم گرم دودھ حلق میں ٹپکا دیجیے۔ اس چمچے سے۔

اماں جان: رخشی بیٹا!

رخشندہ: امّاں جان! اس تھوڑے سے عرصے میں، میں سب حقیقتوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ سب حجاب اُٹھ چکے ہیں۔

بھابی: روح کو جسم کو بیماری سہنا ہی پڑتی ہے۔

رخشندہ: میں کسی پر الزام نہیں دھرتی بھابی۔ یہ اپنے ہی لینے دینے کے سمبندھ ہوتے ہیں۔ پھر بیمار روح بھی تو جسم کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ امّاں! وہ آئیں ہیں یا نہیں؟

امّاں جان: اللہ جانے کہاں عاقبت کے بوریے بٹور رہا ہے۔

رخشندہ: تو مجھے طفل تسلیوں پہ جینے دو اماں۔ تم میری شادی کا ذکر کرو۔ میری شادی کا۔

امّاں جان: شادی کا؟

رخشندہ: تم لوگ میرے اِردگرد مت کھڑے ہو جاؤ—— ہاں امّاں جان! شادی کا!

آپا جان: رخشی......

بھائی جان: رخشی!

ننھے میاں: آپا! (سسکیاں لیتا ہے)

امّاں جان: ابھی کل کی ہی تو بات ہے تمھاری شادی۔ تمھارے ابا نے شادی ٹھہرائی (ایک معنی خیز

وقفہ، جس میں امّاں جان کے ضبط کا احساس ہوتا ہے) منگنی کردی، سامان درست کیا اور اپنی بیٹی کو مانجھے بٹھایا۔

رخشندہ: پھر کیا ہوا۔ امّاں؟ مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں؟ اور جی میں ایک حظ سا محسوس ہو رہا ہے، کیوں امّاں ——

امّاں جان: کچھ دن کے بعد ساچق آئی۔ چڑھاوا چڑھا۔ پھر تمھارے گورے گورے خوبصورت ہاتھ مہندی میں رنگے گئے، دیکھو، میری دُلھن کے ناخنوں میں اب تک مہندی کا رنگ ہے!

رخشندہ: کہاں......؟ (جیسے اپنے ناخن دیکھ رہی ہے) میری انگلیوں کی پوریں تو زرد ہیں، بالکل زرد!

امّاں جان: چل ہٹ —— پگلی ہوئی جاتی ہے کیا؟

آپا جان: (سسکیاں لیتے ہوے) رخشی۔ ہائے!

امّاں جان: اری تو کیوں رونے لگی؟ یہ بڑا دلاسا دینے آئی تھی۔

آپا جان: میں آپ کی مجرم ہوں —— امّاں!

امّاں جان: بڑی کو پرے لے جاؤ بیٹا (رخشی سے) رخشی بیٹا!

رخشندہ: پھر کیا ہوا؟

امّاں جان: پھر برات آئی۔ دروازے پر دھما چوکڑی مچی۔ سمدھنیں نئے جوڑے پہنے ہوے اُتریں۔ اُدھر گالیوں کی بارش ہوئی اِدھر ڈومنیوں نے گا گا کرناچا اور ناچ ناچ کر گایا۔

بھابی: (روتے ہوے) امّاں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا!

ننھے میاں: (روتے ہوے) کیا ہو گیا ہے آپا کو امّاں؟

امّاں جان: خاموش! (آواز میں رقّت ہے) پھر تمھارا نکاح پڑھا گیا۔ گوری گوری ناک میں سبک سی ہیرے کی کیل۔ ہاتھ میں کڑے۔ پانو میں چھڑے۔ چھم چھم کرتی ہوئی چلیں تم۔

رخشندہ: امّاں، کتنا اچھا دن تھا!

بھائی جان: اوہ امّاں جان، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے!

رخشندہ: لتاں، تمہارا بھی بیاہ ہوا تھا اسی طرح؟

لتاں جان: (معنی خیز خاموشی) ـــ (ہچکی)

رخشندہ: لتاں جان بولتیں نہیں؟ منہ سے دوپٹا اُٹھا دو تا کہ میں تمہارا منہ اچھی طرح سے دیکھ سکوں۔

لتاں جان: (روکر) ہاں بیٹی۔ اسی طرح ہوا تھا۔ اسی طرح۔

رخشندہ: لیکن اب؟

لتاں جان: اب کیا؟ (اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے) اب کچھ بھی نہیں (گھبرا کر اور اپنے فقرے کے معنی سمجھتے ہوئے) اب سب کچھ ہے (محبت سے) بیٹا یہ دیکھو، اب میرے ہاتھوں کا حنائی رنگ تمہارے ہاتھوں پر نظر آ رہا ہے!

رخشندہ: لتاں تم کتنی فراخ دل ہو۔ میں تو کبھی اپنا رنگ کسی کو نہ دوں۔

لتاں جان: (روکر) دراصل کوئی عورت اتنی فراخ دل نہیں ہوتی۔ لیکن، اچھا اب تم سو جاؤ۔ آرام تمہارے حق میں مفید ثابت ہوگا۔

رخشندہ: لتاں جان، میں سمجھتی ہوں۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں، مجھے میرے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ میں آرام سے سو جاؤں گی ...... میں ناحق تم لوگوں کی پریشانی کا باعث ہو رہی ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔

(سب چلے جاتے ہیں)......

(وقفہ)

لتاں جان: (یہیں بستر پر لیٹ جاؤ۔ (سامنے بستر پر لٹا دیتی ہیں۔ ایک طرف سے "آپ" داخل ہوتے ہیں ـــ آپ نیم غنودگی کی حالت میں ہیں)

آپ: کوئی ہے؟ پیاس لگ رہی ہے۔

لتاں جان: ارے سلامت!

دولھا بھائی: سلامت۔

آپا: سلامت بھائی۔

بھائی جان: بھائی جان آپ یہیں تھے؟

(سب بھونچکا رہ جاتے ہیں)

رخشندہ: (اُٹھتے ہوئے) آپ؟......آپ؟......آپ کہاں تھے؟

(پھوٹ پڑتی ہے) کہاں تھے آپ؟

آپ: میں یہیں تھا— کیوں کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تم سب لوگ پریشان کیوں نظر آتے ہو؟ رخشندہ کیوں موت کی طرح زرد نظر آرہی ہے؟

رخشندہ: آپ یہاں نہیں تھے۔ آپ یہاں نہیں تھے۔

آپ: میں اور کہاں تھا، رخشندہ؟ اتنے طوفان میں میں باہر کیسے جا سکتا ہوں؟

رخشندہ: آپ کدھر چلے گئے تھے؟

آپ: میں تم سے ایک ہاتھ کی دوری پر تھا۔ اے مضطرب روح! میں ہمیشہ ایک ہاتھ کی دوری پر رہتا ہوں۔ لیکن تم مجھے پانے کی لیے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتیں۔

رخشندہ: یہ کیسے ممکن ہے۔ (حیران ہو کر) ایک ہاتھ کی دوری پر، فقط ایک ہاتھ—!

آپ: میں ہمیشہ تم سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہوتا ہوں رخشی!

رخشندہ: آپ ....آپ نہیں ہیں۔ نہیں ہیں۔ مجھے چھوڑ دو میں انھیں ڈھونڈنے جاؤں گی......اُنھیں ڈھونڈنے جاؤں گی۔

(گھبرا کر چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور بھگدڑ سی مچ جاتی ہے، گھر کے سب مرد رخشندہ کے پیچھے دوڑتے ہیں)

امّاں جان: میری بیٹی!

دولھا بھائی: (بھاگتے ہوئے) رخشندہ! رخشندہ!!

(پردہ)

بیدی

کے

مضامین

بیدی کے مضامین

تعارف

راجندر سنگھ بیدی نے مضامین، انشائیے اور خاکے زیادہ نہیں لکھے۔ لیکن جو کچھ لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم انشائیے لکھنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان کے دو انشائیے ''مہمان'' اور ''بیوی یا بیماری'' ان کی بہترین تحریروں میں جگہ بناتے ہیں۔ ان دونوں انشائیوں کی زبان صاف ستھری، اسلوب بے تکلف اور ظرافت بے مثال ہے۔ کاش وہ اس نوع کے چند اور انشائیے قلم بند کر گئے ہوتے۔ لیکن انشائیہ کے لیے ذہنی فراغت بہت ضروری ہے جو بمبئی کی فلمی دنیا میں انھیں مشکل ہی سے میسّر آئی۔

اس کا احساس ہمیں بیدی کے ان مضامین سے بھی ہوتا ہے جو سوانحی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان میں سب سے اچھا مضمون ''آئینہ کے سامنے'' ہے۔ ایسا لگتا ہے اس مضمون میں بیدی نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ بعض جملے تو اقوالِ زرّیں کی چمک رکھتے ہیں۔ فکر کی بلند پروازی نے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک خلّاق ذہن اور غیر معمولی حسنِ ظرافت کے باوجود بیدی اندر سے دُکھی آدمی تھے۔ اس کی تائید ان کے خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ وجہ کوئی اور نہیں تھی بلکہ بمبئی کا موسم، بمبئی کی زندگی اور فلمی پروڈکشن کے کام کا بوجھ تھا۔ بیدی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کی اس ذہنی کیفیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اشک کے نام اپنے ایک

خط میں وہ لکھتے ہیں ''اوپیندر، یہاں کے نامساعد حالات کے پیش نظر بعض اوقات مجھے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں نے بمبئی آکر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ لکھنا پڑھنا سرے سے چھوٹ گیا ہے۔ صحت ہے تو یہاں کے غارت گر آب وہوا کی نذر ہو چکی ہے۔ اس پر یہ نہیں کہ کوئی بنک بیلنس بن گیا ہو۔ جو آتا ہے خرچ ہو جاتا ہے۔ کوئی مکان نہیں، موٹر نہیں۔ لیکن بیدی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ''میں اس کے سوا کیا کرتا۔ مجھ سے ناخواندہ آدمی کی اور کھپت بھی کہاں تھی''۔ بیدی کو ہمیشہ اس بات کا غم رہا کہ زندگی بھر وہ کسی پُر فضا مقام پر تفریح اور استراحت کے لیے نہ جاسکے۔ بیدی کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لکھیں اور خوب لکھیں۔ انھوں نے ہر چیز سے بیزاری کا اظہار کیا ہے لیکن لکھنے پڑھنے سے نہیں۔ دراصل بنیادی طور پر وہ ایک مصنف تھے اور انھیں وہی زندگی ملنی چاہیے تھی جس کی تمنا ہر مصنف کرتا ہے اور جس کی ترجمانی ڈبلیو ایچ آڈن نے ان الفاظ میں کی ہے ''میں ایک چھوٹے سے شہر میں رہنا پسند کروں گا جہاں صرف گرجا ہو، ایک لائبریری، ایک سینما گھر۔ بہت دولت بھی نہ ہو اور تنگ دستی بھی نہ ہو۔ بس اتنے پیسے ہوں کہ آرام سے زندگی گذر جائے''۔ لیکن بمبئی تو اردو والوں کا مقدر تھا اور ابھی بھی ہے۔ ''آئینہ کے سامنے'' کے ان آخری جملوں میں کیسی حسرت جھلکتی ہے۔

> ''میں ایک سادے سے انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں — چاہنے کے مفہوم کو نکال کر ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں، تمنا سے عاری ہو کر جسے عرف عام میں سہج اوستھا کہتے ہیں، اور جو صرف جاننے کے بعد ہی آتی ہے اور میں نہیں جانتا۔''

بیدی کا مضمون ''چلتے پھرتے چہرے'' بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ دورِ جدید میں انسانی رشتوں میں جو بحران اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے اس کا بیدی کو اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ شعور تھا۔ اس کا اظہار ان کے افسانے ''صرف ایک سگریٹ'' میں ہوا ہے۔ ان کے مضمون ''چلتے پھرتے چہرے'' بھی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بنتے بگڑتے تناؤ بھرے رشتوں، نوجوانوں کی نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی اور تہذیبی مسائل کا عکس نظر آتا ہے۔

فلموں پر بیدی نے جو مضامین لکھے ہیں، وہ آج بھی سچ ہیں۔ ورنہ اس نوع کے مضامین

بہت جلد فرسودہ ہو جاتے ہیں۔

بیدی کے شخصی خاکوں میں تین خاکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ''ترکِ غمزہ زن'' جو اپیندر ناتھ اشک کا خاکہ ہے اور سب سے اچھا ہے۔ اشک اور بیدی کے درمیان تعلق خاطر بھی بہت تھا، لیکن شخصیتوں میں تضاد بھی اتنا ہی تھا۔

بیدی کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اس تعلق خاطر میں مقامات من وتو بھی نکل آئے، شکوک وشبہات بھی پیدا ہوئے اور گہرے جذباتی تعلقات بھی قائم رہے۔ ظاہر ہے ایسی متنوع کیفیات کا حامل اسکیچ دلچسپی کے کیسے مقامات رکھتا ہوگا۔ اشک کی پہلی بیوی شیلا سے بیدی زندگی میں نہیں مل سکے، لیکن اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ شیلا بہت ہنستی تھی اور وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر مرگئی۔ گمان گذرتا ہے کہ بیدی کا افسانہ ''ماسوا'' شیلا ہی کے کردار پر مبنی ہے، جس کی ہنسی کی آواز کمروں میں گونجا کرتی ہے اور جس کے متعلق جیوتشی کہتا ہے کہ وہ بہت جیے گی نہیں۔ اشک کے اسکیچ میں بیدی کی زبان کی روانی ندی کے بہتے پانی جیسی ہے، جس کی سبک سار موجوں پر قاری بہتا چلا جاتا ہے۔ اشک کے والد اور بھائی اور ان کے جھگڑے، ان کے گھر اور ان کا محلہ، سب کی نقش گری میں افسانہ کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔

دوسرا دلچسپ خاکہ خواجہ احمد عباس کا ہے۔ بیدی اور خواجہ صاحب کی شخصیتوں اور مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ اس لیے اسکیچ میں طنز ملیح کو اچھی جولانگاہ ملی ہے۔ (جو بھی ان کے پاس آیا، انھوں نے آنے دیا، یہی نہیں جو اُن کے پاس سے گیا، اُسے جانے بھی دیا) کرشن چندر پر صرف دو صفحے کا اور وجینتی مالا پر صرف ڈیڑھ صفحہ کا اسکیچ ہے۔ اتنے مختصر اسکیچ صرف صحافت پر دلالت کرتے ہیں۔ کرشن چندر پر اسکیچ ان کی موت کے بعد ایک تعزیتی خراج عقیدت ہے۔ کرشن چندر اور بیدی میں اختلافات بھی تھے، شخصیتوں کا ٹکراؤ بھی تھا، پسند اور ناپسند کے مقامات بھی تھے، لیکن کبھی ابھر کر سامنے نہیں آئے۔ دبے دبے رہے اور دبی زبان ہی میں بیان ہوئے۔ اس مختصر سے اسکیچ میں بھی مزاجوں کے اختلاف کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اسکیچ بہت دردمندی سے لکھا گیا ہے۔ کرشن چندر کو ایک ہم پیشہ اور ہم مشرب کی طرح بڑے خلوص اور محبت سے یاد کیا گیا ہے۔ اتنے مختصر اسکیچ میں زبان ایسی گھٹی ہوئی ہے کہ قطرے میں سمندر سما گیا ہے اور کرشن چندر کی رعایت

سے زبان کبھی کبھی تو نغمگی کے پر لگا کر اڑتی ہے۔ وجینتی مالا کے اسکیچ میں بھی انھوں نے چاول پر قُل ھو اللہ لکھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔ بیدی سخنِ مختصر میں گہری باتیں کہہ دیتے ہیں اور ان کے یہاں ایجاز بیان اور حسنِ بیان کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو اسکیچ کو منی ایچر پینٹنگ بنا دیتا ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے گیتا بالی کو فلموں میں دیکھا ہے اور بطور ایکٹرس کے جانتے ہیں، ان کے لیے وہ اتنی غیر معمولی عورت نہیں تھی جتنی کہ بیدی کے اسکیچ میں ابھر کر آتی ہے۔ بیدی گیتا بالی کو پسند کرتے تھے، اس سے شاید یک طرفہ محبت بھی کرتے تھے لیکن انھوں نے اس بُت کو ایسا پوجا کہ خدا کر چلے۔ کرشن چندر پر وہ اپنے اسکیچ میں لکھتے ہیں ''میں انسان کی اندرونی زندگی کا سائنسی طریقہ سے قائل ہوں۔ Extra sensory perception کی باتیں محض ڈھونگ نہیں، کیونکہ مجھے خود ان کا تجربہ ہے۔ سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ دماغ کی ان پرتوں تک پہنچ سکے جن کے بیچ دودھ اور ندیاں بہتی ہیں۔'' گیتا بالی کے اسکیچ میں بیدی نے اسی نظر سے کام لیا ہے۔ گیتا بالی، شمی کپور کی بیوی تھی اور عین جوانی میں وہ چیچک کی بیماری سے مر گئی۔ چیچک سے بچنے کے لیے اسے کئی بار ٹیکہ لگوانے کے لیے کہا گیا لیکن اس نے ہمیشہ انکار کر دیا، کیونکہ اس کے پتا جی کو ٹیکہ لگوانے کے باوجود چیچک ہو گئی تھی اور ان کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔ گیتا کی موت پر بیدی لکھتے ہیں ''آپ ایک مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے اپنے سے، انسان سے بڑا درجہ دیتے ہیں اور مقامی طور پر اسے اپنے لیے آخری حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ مورتی اپنے ٹھکانہ پر سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے میں آپ کس سے شکایت کریں گے۔''

گیتا پر بیدی کا پورا اسکیچ ماورائی فضاؤں سے اپنے رنگ مستعار لیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مجھے اندازہ نہ تھا کہ فلم اور فلمی اداکاری کے بارے میں گیتا کی نظرِ انتقاد اتنی بلند تھی۔ کہتے ہیں عنقا کا آشیانہ بلند ہوتا ہے لیکن گیتا کا ٹھکانہ عنقا کے آشیانے سے بھی کہیں اوپر تھا۔ یعنی وہاں جہاں کبیر کے ایک بھجن کے مطابق بغیر بادلوں کے بجلی چمکتی ہے۔ بعد میں سورج اجیارا ہوتا ہے، جہاں آنکھوں کے بغیر موتی پروئے جاتے ہیں اور بنا شبد کے شبد کا اُچارن ہوتا ہے۔''

گیتا بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کو فلمانا چاہتی تھی۔ وہ اس میں اس قدر ڈوب گئی

کہ ناول کی ہیروئن رانو بن گئی۔ رانو اور گیتا میں کیا مماثلت تھی۔ غالبًا یہی کہ دونوں نے دُکھ دیکھا تھا۔ رانو دیوی تھی کیونکہ اس نے مار کھائی۔ مار اپنے پیٹ، اپنی بیٹی، اپنی محبت کے لیے۔ یہی نہیں وہ خود دیوی ہوگئی۔ دیا اور کرونا کے پرساد بانٹنے لگی۔ رانو کے کردار نے گیتا کے دل میں ایک عجیب سی گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ زندگی کے بھلے بُرے کے آخر میں موکش ہے۔ چنانچہ میرے ناول کی نائیکہ اور یہ نائیکہ دونوں آخر موکش کو پہنچ گئیں اور میں بیچ میں رہ گیا۔

ارضیت اور ماورائیت کے استعاروں میں گیتا کا کردار ڈھل کر پورے خاکے کو مادی سطح سے بلند کر دیتا ہے۔ ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ واقعی دماغ کی کچھ پرتیں ایسی بھی ہیں جن کے بیچ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں۔ روح اندر کے مان سروَر میں نہاتی، چھینٹے اڑاتی ہے اور اپنے آپ کو سب آلودگیوں سے پاک کر لیتی ہے۔

بیدی کے وہ مضامین جو ادبی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں، دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق کسی تقریب سے تھا، یا ادبی جلسہ میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے، اور دوسرے وہ دیباچے یا پیش لفظ ہیں جو انھوں نے اپنی یا دوسروں کی کتابوں پر لکھے۔ اکثر و بیشتر تو پیش لفظ صفحہ ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ نہیں اور ان میں کوئی فکر تازہ یا ندرت بیان کی جھلکیاں بھی نہیں، لیکن کبھی کبھی کوئی روشن ادبی نکتہ بیان کرتے ہیں تو لطف آ جاتا ہے۔ مثلاً ''قلم اور کاغذ کا رشتہ'' میں فلابیر اور موپاساں کا واقعہ یا مثلاً ''دانہ و دام'' کے پیش لفظ میں یہ جملہ کہ ''کوئی قلم برداشتہ لکھتا ہے تو کوئی چیخوف کے قول کے مطابق اس طرح آہستہ آہستہ لکھتا ہے کہ حریص بُھنا ہوا تیتر کھاتا ہے''۔ اسی طرح ''گرہن'' کے پیش لفظ میں بہت سی باتیں اب از کار رفتہ ہوگئیں لیکن ایک اہم ادبی نکتہ ضبطِ قلم کر گئے۔ ''مجھے تخیلی فن میں یقین ہے۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من وعن بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔''

اسی طرح ''سات کھیل'' کے دیباچے میں انھوں نے ڈرامائی سچوئیشن اور عام زندگی کے واقعہ کے بیچ جو فرق ہے، اسے نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس کی مثال انھوں نے ٹرام میں باتیں کرتے ہوئے دو آدمیوں سے اور ان کی باتوں کو گھر جا کر بیان کرنے والے تیسرے آدمی

سے دی ہے۔''تو گویا ان ڈراموں کی فصاحت، بلاغت، سادگی، حقیقت سے اتنی ہی دور ہے جتنا کہ عین ڈرامائی لمحہ میں گرفتار انسان، کردار اور گفتار میں ایک عام انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ایک خاص موقع (Situation) میں مبتلا آدمی ایک خاص ہی انداز کی حرکت کرتا ہے، عام انداز کی نہیں۔'' دلچسپ نکتہ ہے۔

وہ دیباچے، جو بیدی نے احباب کی کتابوں پر لکھے ہیں، ان میں سب سے اچھا دیویندر ستیارتھی کی'' گائے جا ہندوستان'' کا افتتاحیہ ہے۔اپنے ملک اور لوگوں سے بیدی کو جو گہرا لگاؤ تھا وہ بھی گویا ایک گیت بن کر افتتاحیہ میں گونج رہا ہے۔

ادب کے مسائل پر ان کا سب اچھا مضمون ''اظہار خیال'' ہے، جو بقول شمس الحق عثمانی 23رفروری 1975 کو بمبئی کے ایک ادبی جلسہ میں بطور خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ یہ مضمون طنز و مزاح، اقوالِ زریں، قولِ محال اور سنجیدہ فکر کا خوبصورت امتزاج ہے۔مضمون میں اس بات پر اصرار ہے کہ ادبی مسائل میں کسی قسم کے گروہی دباؤ کو دخل نہ ہونا چاہیے۔انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اپنے ملک کی معاشرتی اور تہذیبی روایتوں اور ضرورتوں کے مطابق نئے میلانات کو ادب میں راہ دی جائے۔بیدی اپنی تصنیفی زندگی میں کبھی بھی قنوطیت، تنہائی، دہریت، انارکزم اور ذات کے زنداں کے اسیر نہیں بنے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی تک مکمل زندگی سے ہمارا واسطہ نہیں پڑا۔وہ سوال کرتے ہیں کہ لامعنویت، ترسیلی مشکلات اور بیگانگی، تنہائی اور وجودیت کی تلاش میں ہم مغرب کی طرف کیوں جائیں، جب کہ اس ملک کے رشی منی صدیوں پہلے ان کی تھاہ پا چکے ہیں۔ہم ہمیشہ کسی کتاب ہی کا سہارا کیوں لیں، جب کہ زندگی ورق ورق ہمارے سامنے کھلی ہے۔نا صاحب— ہم اپنے قلم سے اپنی بات لکھیں گے۔ہم ہندوستانی— جب تک ہم اپنے گرم خانوں میں یہاں کی خس نہیں لگاتے، نہ ٹھنڈک آئے گی، نہ خوشبو!—

ستم ظریفی دیکھیے کہ متذکرہ بالا چھوٹے چھوٹے مضامین میں تو بیدی نے بہت سی کام کی باتیں بتائیں، لیکن ان کے تین بظاہر طول طویل بھاری بھرکم مضامین میں ہمیں سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔میری مراد ہے افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل ''مختصر افسانہ'' اور ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے''۔تینوں مضامین میں ٹھوس مسائل، واضح تصورات اور شفاف خیالات کی

بہت کی ہے۔ انشائیہ کا رنگ غالب ہے۔ آزاد تلازمِ خیال، ظرافت اور طنز، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی سے اِدھر اُدھر مضامین دلچسپ اور چمکدار تو بنے ہیں، لیکن مسائل پر سوچ بچار میں دانشورانہ نظم و ضبط اور تعمیری حسن عنقا ہے۔ اس طویل مضمون کے آخری دو تین صفحات میں بیدی اپنے چند افسانوں سے مثالیں قائم کرتے ہیں اور اپنے اس تجسس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کا سچ تو بہت کڑوا ہوتا ہے۔ اسے کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا افسانہ نگار کو اس میں جھوٹ کی آمیزش کرنی پڑتی ہے۔ خدا بھی مایا کی زبان بولتا ہے اور کبھی ٹھیٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیلیو، سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اس لیے مارے گئے کہ انھوں نے خالص سچ بولا اور جھوٹ سچ کی عظمت کو نظرانداز کر گئے۔ انسان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن سامنے کا سچ نہیں۔ بیدی اپنے افسانے ''ببل''، ''ٹرمینس سے پرے'' اور ''اپنے دُکھ مجھے دیدو'' سے مثالیں دیتے ہیں۔ ''ببل'' میں درباری جب ہوٹل کے کمرے میں سیتا کی طرف دست درازی کرتا ہے، تو ببل جو ایک بھکارن مصری کا مانگا ہوا لڑکا ہے، تاکہ ہوٹل والوں کو شک نہ گذرے، رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لیے آگے بڑھتا ہے، لیکن نیم عریاں سیتا دوڑ کر بچے کو پکڑ لیتی ہے اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہے جس نے اس کام کے لیے ایک معصوم بچے کا استعمال کیا۔ درباری پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا۔ لیکن یہ کہانی جھوٹی ہے۔ جس سچے واقعہ سے بیدی نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، اس میں لڑکے نے وِسکی پی اور پانچ روپے والا پان کھا کر سیتا کی اس حد تک آبروریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال لے جائی گئی اور جلاب سے بچے کے پیٹ میں سے افیون اور اس کا اثر دور کیا گیا۔

''ٹرمینس سے پرے'' میں موہن جام اور راچلا اتفاق سے اسٹیشن پر ملتے ہیں۔ دونوں جنس کا کھیل کھیلتے ہیں، لیکن پھر رُک جاتے ہیں اور راکھی باندھ کر بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر دونوں کی رگوں میں لہو تمتما رہتا ہے اور دونوں کو عیاری سے کام لینے پر مجبور کرتا ہے۔

اصل واقعہ جس سے یہ کہانی لی گئی ہے، اس میں تو دونوں سازش کرکے اپنے شوہر اور بیوی کو باہر پہاڑوں پر بھیجتے ہیں اور راچلا کا شوہر رام گدکڑی اپنے بچے سے کھیلتا ہے، جو دراصل

موہن جام کا نطفہ ہے۔

اور ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' کی اِندو، جو بیدی کے تمام قارئین کے دلوں پر ایک بے مثال عورت کی طرح راج کرتی ہے، ان کا آدرش ہے۔ وہ کبھی سچ تھی، جھوٹ نہیں تھی، کیونکہ اس کردار کی تعمیر بیدی نے اپنی بیوی ستونت کور کے ماڈل پر کی تھی۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس خوبصورت سچ سے ایک دوسرا کڑوا سچ پیدا ہوتا ہے، جسے افسانہ میں بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن جس پر بیدی نے دوسرے دو افسانے لکھے۔ ''باری کا بخار'' اور ''ایک باپ بکاؤ ہے''۔ دونوں میں اس عورت کی جھلک ملتی ہے جس کے متعلق لکھتے ہیں۔ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' کی اندو اپنی حقیقی زندگی میں ''اتنی بلند کردار'' بن چکی ہے کہ اسے اپنے سوا کوئی آدمی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے پٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ وہ اکیلی بیٹھی پوجا پاٹھ کیا کرتی ہے اور کبھی کبھی آنے جانے والوں کو اس کی وحشت ناک ہنسی سنائی دیتی ہے۔

بیدی اپنے ان بیانات میں بہت سے ادبی اور فنی مسامحات کے شکار ہوئے ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے، ورنہ افسانوی آرٹ کے متعلق قاری کا نظریہ ہمیشہ کے لیے معکوس ہو جائے گا۔

بیدی نے افسانوی آرٹ کا ایک اور نکتہ فراموش کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ ہر افسانہ کی سچائی صرف اسی افسانہ کی ہوتی ہے۔ کوئی دوسرے افسانہ کی سچائی اس کا بطلان نہیں کرتی۔ اس طرح زندگی کے جس حقیقی واقعہ یا کردار پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے، قاری کو اس میں نہیں، بلکہ صرف افسانہ کی حقیقت میں دلچسپی رہتی ہے۔ قاری تصویروں اور ماڈل کی سوانح نہیں پڑھتا۔ ممکن ہے منٹو کی کوئی طوائف کسی کروڑ پتی کے ساتھ شادی کر کے سُکھی ہو گئی ہو، یا اس کا قتل ہو گیا ہو۔ ہمیں تو صرف اس طوائف میں دلچسپی ہے جو افسانہ میں ہے۔ اس کے متعلق ہم افسانہ کی فریم ورک میں رہ کر ہی بات کریں گے۔ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' کی اِندو صفائی پسند ہو گئی یا نہیں اور بعد میں اس نے اپنی زندگی پوجا پاٹھ میں گذار دی یا وہ پاگل ہو گئی، یہ وہ باتیں ہیں جو ہم جاننا نہیں چاہتے، کیونکہ اِندو کوئی تاریخی شخصیت نہیں، جس کا علم ہمیں دوسرے ماخذوں سے ہوتا رہے، بلکہ افسانوی کردار ہے اور جس کے متعلق ہم وہی باتیں جان سکتے ہیں اور جاننا پسند کریں گے جو صرف

افسانہ میں بیان ہوتی ہیں۔

آخر میں میں ایک اور مضمون کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ''دانہ و دام'' کی اشاعت اول میں دیباچہ کے طور پر خود راجندر سنگھ بیدی نے لکھا تھا، لیکن ہنس راج کے نام سے شائع کیا تھا۔

یہ دیباچہ بیدی نے کافی دھانسو قسم کی مفرس زبان میں لکھا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُنیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے اخیر میں جب کہ یہ دیباچہ ضبط قلم ہوا، نہ تو افسانوی تنقید کا زیادہ رواج تھا نہ تنقید کی زبان اور اسلوب نے اپنا کوئی امتیازی آہنگ اور لہجہ قائم کیا تھا۔ اس میں جگہ جگہ زبان اکھڑی ہوئی اور نئی اصطلاحوں کے سبب اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پورے مضمون کا مزاج ناقدانہ تحسین کا ہے، کیونکہ بہر حال کسی ہنس راج کے نام سے بیدی کو خود اپنے فن اور ''دانہ و دام'' کے افسانوں کی تعریف کرنا تھی اور انھوں نے پیٹ بھر کر کی۔ لیکن اتنے منصفانہ طریقہ سے اور ایسی بصیرت کے ساتھ کہ ان افسانوں پر آئندہ جو کچھ لکھا گیا، وہ کچھ بہت زیادہ اضافہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس مضمون میں بھی بیدی نے اپنے دوسرے ادبی مضامین کی طرح بہت سارے مغربی مصنفوں کے حوالے دیے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کتابیں پڑھنے کا انھیں شوق تھا اور اپنے طور پر وہ انگریزی، امریکی اور یورپ کے فکشن سے بھی آگاہ رہا کرتے تھے۔ اس دیباچہ میں بیدی نے ''بھولا، گرم کوٹ، پان شاپ، تلا دان، دس منٹ بارش میں، حیاتین 'ب'، ہم دوش، من کی من میں، چھوکری کی لوٹ پر جس طرح تبصرہ کیا ہے اور ان افسانوں کی جزئیات نگاری، علامت نگاری، تہذیبی آب و رنگ اور نفسیاتی گہرائیوں کے متعلق جو اشارے کیے ہیں، وہ اگر بیدی کے بعد آنے والے نقادوں کے سامنے ہوتے تو ان کی تنقیدوں میں زیادہ گہرائی پیدا ہوتی۔ لیکن دانہ و دام کا پہلا ایڈیشن اور اس کا دیباچہ شاید بیدی کے چاہنے والوں کی نظروں سے اس وقت تک اوجھل رہا جب تک شمس الحق عثمانی نے اسے اپنی کتاب ''باقیات بیدی'' (سن 2001) میں شائع نہ کیا۔ ایک دو مثالوں سے اس دیباچہ میں بیدی کے اُسلوب نقد کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ (یعنی دیباچہ کے فرضی مصنف، ہنس راج ایڈیٹر اتالیق، لاہور) بیدی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس کے افسانے میں عورت کے رخسار کبھی بھی کسی متقابل جنس کا شانہ نہیں چھوتے۔ بلکہ دوشیزہ قسم کی عورت ماسوائے ''چھوکری کی لوٹ'' کے، اس کے سب افسانوں سے حیرت انگیز

طور پر مفقود ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ''گرم کوٹ'' کے سے افسانہ میں بیوی کی جگہ دوشیزہ کی قسم کی عورت ہوتی تو تصویر کتنی پوری ہو جاتی۔''

''بھولا'' میں عورت کے کردار کے متعلق لکھتے ہیں:

''بھولا'' میں ایک عورت بہ یک وقت ماں بہن اور بہو کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور وہ عالم پیدا ہوتا ہے جو اچھے سے اچھے رومان میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ عورت ایک ہی وقت میں بچے کو ہری ہر استوتر سناتی، اپنے سسر کی جوتی کو سرسوں کا تیل لگاتی اور اپنے بھائی کے لیے پیار کے جذبے میں معمور ہر روز آدھ پاؤ مکھن جمع کرتی ہے۔ ''بھولا'' اور ''گرم کوٹ'' میں گھریلو فضا کی تصویر اس حد تک کامیاب ہے کہ میں نے شاید ہی اردو کے کسی افسانے میں دیکھی ہو۔''

وارث علوی

خودنوشت

میں، راجندر سنگھ بیدی، یکم ستمبر 1915 کو لاہور چھاؤنی میں پیدا ہوا۔ تنخواہ ملنے کا دن تھا۔ ظاہر ہے گھر میں سب لوگ خوش ہوں گے۔ بچپن کا پہلا حصہ دیہات میں اور بقیہ لاہور میں گزرا۔ کچھ دیر ایک ریاست میں بھی رہا۔ شمال میں درّہ خیبر اور جنوب مشرق میں علی گڑھ سے پرے سفر نہیں کیا۔ ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ ریاضی میں ہمیشہ اُتنا ہی کمزور رہا، جتنا ادبیات میں اچھا۔

والد کھشتری تھے۔ والدہ برہمن۔ ذات پاک کی پابندیوں کے دنوں میں اُن کی شادی کیوں کر ہوئی، یہ آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ یہ اتصال قطعاً رسمی تھا۔ والد صاحب خوبصورت انسان تھے اور والدہ بدصورت تھیں۔ قدرت کی ستم ظریفی کہیے کہ دونوں میں جو چیز بُری تھی وہ ہم بہن بھائیوں کے حصے میں آئی۔

شکلوں کے اِس تضاد کے باوجود میرے والدین میں بہت ہم آہنگی تھی۔ ہمارا وجود اُس کا نتیجہ محض نہیں، بلکہ اُس اتصال سے جو کچھ ظاہر ہوا، وہ میرے افسانے ہیں۔ والد صاحب رات کو دیر تک والدہ کو دو پیسے روزانہ کرایے کے ناول، شرلک ہومز کے کارنامے اور ٹاڈ کا راجستھان سنایا کرتے تھے، اور ہم بچے بستروں پر دُبکے ہوئے سنا کرتے۔

والد صاحب کی ایک دو عادتیں مجھے بیک وقت اچھی اور بری لگتی تھیں۔ بات بات پر فارسی کے اشعار پڑھنا اور پڑھتے پڑھتے رونے لگنا اور والدہ کی اُن کی سہیلیوں میں ہر دلعزیزی۔ ہمارے گھر میں بہت شور بپا ہوتا تھا۔ شور، شور، شور—اور اُس کے بعد یک لخت رات کا سنّاٹا اور بھی

بڑا شور سجھائی دیتا تھا۔

شروع میں انگریزی اور پنجابی میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنے کی غرض سے اُردو میں لکھنے لگا۔ پہلے مقبولِ عام افسانے ''بھولا'' ''گرم کوٹ'' ''پان شاپ'' دس منٹ بارش میں'' اور ''ہمدوش'' وغیرہ تھے۔ پھر وہ کتابی صورت میں ''دانہ ودام'' کے نام سے شائع ہوئے۔ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ اُردو کی متعدد کتابوں کی طرح تین سال میں اس کا پہلا ایڈیشن نہیں بِک سکا۔ (میرے پبلیشر بالکل ایماندار ہیں!)

طبیعت میں تلون زیادہ ہے۔ انقلاب کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتا ہوں۔ ایک جگہ اور ایک صورت میں دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔ اپنے کمرے میں بھی میز کو کبھی ایک کونے میں اور کبھی دوسرے کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ چنانچہ پہلے پوسٹ آفس میں ملازم تھا۔ آٹھ سال کی ملازمت کے بعد پوسٹ آفس چھوڑ دیا۔ کچھ مہینے آوارہ گردی کی اور پھر ریڈیو میں ملازم ہو گیا۔ اور اب

میں محض افسانے نہیں لکھتا۔ میرے تین بچے ہیں۔ ایک مر چکا ہے۔ ایک بیوی ہے۔ گو ادب میری پہلی محبت ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی امیر بیوہ مجھ سے شادی پر رضامند ہو جائے یا کوئی متموّل آدمی مجھے (بہ ایں ہمہ بیوی بچے) متبنّی بنالے تو میں آرام سے بیٹھا لکھا کروں۔

[زمانۂ تحریر واشاعت: قبل از 1940]

آئینے کے سامنے

مجھے آج تک پتا نہ چلا، میں کون ہوں؟

شاید اس سے کوئی یہ مطلب اخذ کرے کہ میں عجز و انکسار کا اظہار کر رہا ہوں، تو یہ نادرست ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوسرے کے آگے نہیں جھکتا، یا کسی خاص مدرسۂ فکر و خیال یا مذہب یا ''ازم'' کی پیروی نہیں کرتا، عجز کا حامل ہو اور وہ شخص جو بہت ہاتھ جوڑتا ہے، جھک جھک کر بات کرتا ہے، انا کا بدترین نمونہ —

بلکہ بہت انکسار کا اظہار کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہوتا ہے۔

اَپراہدی دونڈنو یں، جیوں ہنستاں مرگانہہ

گُرنتھ صاحب

...... اَپراہدی دُگنا جھکتا ہے، جیسے ہرن کو مارنے کے لیے شکاری!

میں جانتا ہوں، میں عام طور پر ایک سادہ اور منکسر المزاج آدمی ہوں، لیکن مجھ پر ایسے لمحے آتے ہیں، بادی النظر سے دیکھنے والا جسے میری انا سے تعبیر کر سکتا ہے۔ وہ لمحے اُس وقت آتے ہیں جب میں کوئی ادبی چیز لکھنے کے لیے بیٹھوں۔ مضمون میرے ذہن میں ہو۔ بات نئی اور مختلف اور مجھے اسے کہنے کے انداز پر ایک اندرونی طاقت اور صحت کا احساس ہو۔ جب معلوم ہوتا ہے، میں اپنے آپ کو ایک غیر شخصی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں — ہٹ جاؤ، میں آ رہا ہوں، باادب باملاحظہ ہوشیار یا...... سادودھان، راج راجیشور، چکرورتی سمراٹ ...... رنگ بھومی میں

پدھارتے ہیں۔

چونکہ ایسے احساس کے بغیر لکھنا سہل نہیں، اس لیے میری یہ لحاتی انا انکسار سے دور کی بات نہیں۔ اس وقت کاغذ اور میرے درمیان کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اپنے گھر بیٹھ کر کوئی اپنے آپ کو کالی داس یا شیکسپیر سمجھ لے، اس سے کسی کا کیا جاتا ہے؟ البتہ لکھ لینے اور پبلشر کے پاس پہنچنے تک بھی وہ اپنے آپ کو عظیم سمجھتا رہے تو بڑا احمق آدمی ہے۔ اول تو کاغذ پر نزول ہوتے ہی اپنی اوقات کا پتا چل جاتا ہے، اور جو نہ چلے تو دوست بتا دیتے ہیں اور جو زیادہ بے عزتی کرنا چاہیں تو بتاتے بھی نہیں۔

ہاں، تو میں کون ہوں؟

عام طور پر یہی پوچھا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ یہ دو سوال میرے سلسلے میں غیر ضروری ہیں کیونکہ چند لوگ مجھے جانتے ہیں۔ کیا کام کرتا ہوں؟ اس سے بھی واقف ہیں۔ بھلا ہو فلموں کا، جنھوں نے مجھے رسوا کر دیا۔ یہ دنیا اشتہاروں کی دنیا ہے۔ مشتہر انسان کی طرف لوگ آنکھیں پھیلا کے دیکھتے ہیں لیکن مشتہر آدمی کو اپنے جانے پہچانے ہونے کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس سے عام آدمی واقف نہیں اور اس لیے شہرت کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ہماری فلموں کے ہیرو لوگوں سے پوچھیے۔ کیا وہ اپنی زندگی کا ایک بھی لمحہ فطری طریقے سے گذار سکتے ہیں؟ وہ گھر میں ہوں تو بیوی کے لیے بھی ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں، جو کہ ان کی رگ رگ پہچانتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے

بہر رنگِ کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتا یاد آتا ہے (میں پھر انکسار کا اظہار نہیں کر رہا) جسے ایک ڈائریکٹر نے اپنی ایک فلم میں لیا۔ کتا فلم کے تسلسل میں آ گیا۔ یعنی سین نمبر بارہ میں آیا تو سین نمبر اکیاون میں بھی اس کی ضرورت تھی۔ اور وہ سین چھ مہینے کے بعد لینا تھی۔ بے چارہ اچھا بھلا کتا تھا۔ بازار میں گھومتا، کوڑے کے ڈھیر یا اِدھر اُدھر ہر جگہ کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں سر دھنتا تھا، لیکن فلم میں آ جانے کے بعد وہ ایک معیّن تجارتی چیز، ایک جنس بن گیا جو بک سکتی تھی، جس کا بھاؤ

تاؤ ہو سکتا تھا۔اس لیے ڈائریکٹر صاحب نے اسے باندھ کر رکھ لیا۔اب بیچارے کو دن میں تین چار وقت کھانا پڑتا تھا۔سونے کے لیے گدے استعمال کرنے پڑتے۔زکام لگنے پہ سلوتری کو بلوایا جاتا تھا۔اور ہر آدمی کے آنے پر کتا زور زور سے دُم ہلاتا۔وہ انسان کو فرشتہ سمجھنے لگا۔یعنی جتنا کہ کتا شیطان اور فرشتے کے درمیان تمیز کر سکتا ہے۔ چنانچہ فلم بنتی رہی اور کتا صاحب موج اُڑاتے رہے۔ اُدھر فلم ختم ہوئی اُدھر انھیں 'آزاد' کر دیا گیا۔لیکن اب اور سے ۔رکٹ کے ڈھیر سے روزی کریدنے کی اسے عادت نہ رہی تھی۔وہ بار بار گھوم پھر کے وہیں پہنچ جاتا اور پہلے سے زیادہ زور سے دُم ہلاتا، جس کے جواب میں اُسے ٹھوکر ملتی۔اور چوں چوں کرتا ہوا وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ لیکن پھر گھوم کر وہیں وہی حیرانی ، وہی کشت ،وہی گالی - یہ ڈائریکٹر کتا نہیں - کوئی انسان ہے!

یہ اس آدمی کی حالت ہے، جو شہرت میں بہک جاتا ہو۔یا زندگی میں کسی مرتبے، مقام کا بھوکا ہو۔ پیسے چاہتا ہو جس سے وہ ہر چیز کو خریدنے کی طاقت حاصل کر سکے۔قانون ، مذہب ، سیاست سب کو جیب میں ڈال لے۔لولتا کے ہیرو کی طرح کسی نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہو جائے ، مزے اُڑائے۔اور لوگ داد دیں "بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں!" شہرت ،مرتبہ، مقام، پیسا ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ انھیں حاصل کرنے کے بعد ہر شریف آدمی ان کا تیاگ کرنا چاہتا ہے لیکن 'میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں' کمبل مجھے نہیں چھوڑتا' کی طرح یہ چیزیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ بھی محل نظر ہے کہ وہ شخص خالی خولی باتیں کرتا ہے یا واقعی ان چیزوں کو چھوڑنا بھی چاہتا ہے؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے، میرے ایک چاہنے والے، میرے مداح مجھے مل گئے۔انھوں نے میری کچھ کہانیاں پڑھی تھیں۔وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو زندگی کا راز جانتے ہیں۔تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سیدھے مطلب پر آ گئے

"بیدی صاحب آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"جی؟" میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا "میں جی (پنجابی انداز)" "جی، میں تو کچھ بھی نہیں۔"

—اور جب انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا تو مجھے بڑا غصہ آیا!

میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کے سوال تو ختم ہوئے۔ دراصل یہ سوال مجھ پہ لاگو ہی نہیں ہوتے۔ میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں، جن سے پوچھنا چاہیے— ''آپ، کیوں ہیں؟—یعنی کہ آخر— کیوں؟''

یہ بھی میں نہیں جانتا!

واقعی دنیا میں کروڑوں انسان روز پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب میں سے ایک میں بھی ایک دن ایکا ایکی پیدا ہو گیا۔ ماں کو خوشی ہوئی ہوگی، باپ کو ہوئی ہوگی۔ لیکن دائیں ہاتھ کے پڑوسی کو پتا بھی نہ تھا اور پڑوسی کو پتا ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ وہ ضرور مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوگا لیکن رسمی طور پر۔ میرے پیدا ہو جانے سے اسے کیا خوشی ہو سکتی تھی؟ اُلٹا اس تجارتی دنیا میں اس کے لڑکے پنا لال کا مدِ مقابل پیدا ہو گیا۔ اس کا حریف۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لیے خواہ مخواہ کا خطرہ.....تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہو تو مبارک باد دو۔ چوہڑ سنگھ ہو تو بدھائی دو۔ ڈھلو رام یا چمنے خاں آجائیں تو خوشی مناؤ، ڈھول بجاؤ۔

ٹیگور کہتے ہیں، دنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہو جاتے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ابھی انسان بنانے سے نہیں تھکا۔ خدا کی کتنی ستم ظریفی ہے۔ چونکہ وہ تھک نہیں سکتا، اس لیے انسان بناتا جا رہا ہے!

بیکار مباش کچھ کیا کر

پاجامہ اُدھیڑ کر سیا کر

چنانچہ خدا کے پاجامے کا آخری ٹانکا یعنی یکم ستمبر 1915 کی سویر کو لاہور میں 3 بج کر 47 منٹ پر، صرف مہا کوی ٹیگور کو ثبوت مہیا کرنے کے لیے پیدا ہو گیا۔ . رام اور رحیم انسان کی طرح بھول گئے کہ یہ دنیا دُکھ کا گھر ہے۔ ورنہ اس دنیا میں مجھے بھیجنا رحمت کی بات تھی؟ بلکہ شاستروں کے مطابق کوئی بدلا لینے کی۔ کوئی کرم پچھلے جنم میں کیے ہوں گے جنھیں خدا کی رحمت بھی معاف کرنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔

جیسے ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو، تو کلکٹر بنے، ایسے ہی میرے ماں

باپ کی خواہش تھی۔ان بیچاروں کا کیا قصور؟ان کی سوچ ہی کلکٹر تک محدود تھی۔انھیں کیا معلوم کوئی ایسا بھی ہوسکتا ہے جس کے سامنے کلکٹر پانی بھریں۔جیسے سیدھا سادا ایک جاٹ مالگذاری کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا تو تحصیلدار صاحب نے جاٹ کے حق میں فیصلہ کردیا۔ جاٹ نے بہت خوش ہوکر دعا دی ——— ''خدا کرے تحصیلدار صاحب،آپ ایک دن پٹواری بنیں..........''

کمپٹیشن کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے حوالے دیتے ہیں۔ایک ایسی سازش ہوتی ہے،عام آدمی فوراً جس کا شکار ہو جاتا ہے۔مثلاً لوگ کہتے ہیں—لنکن لاگ کیبن میں پیدا ہوا اور اسٹیٹس کا پریذیڈنٹ بنا۔لاگ کیبن سے پریذیڈنٹ کی روایت کا ذکر کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو جھونپڑی سے راج بھون تک پہنچے۔اس دھوکے،اس سازش کے شکار ہوکر لاکھوں،کروڑوں سر پٹختے مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر

اس کے بعد بھی آپ خدائی اور خلقت سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔

میں ایک بیمار بچہ تھا۔ایک بیمار ماں کا بیٹا۔میں نے تپ محرقہ میں وہ غیر مشتکل ہچکولے دیکھے ہیں جن کا مرکز مریض خود ہوتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کے گوپھیے میں ڈال کر اسے بار بار دور،کسی موت کے اُفق سے پار پھینکا جارہا ہے۔میں نے سرہانے میں آنکھیں دبا کر،ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں،جو کسی عکس کی زد میں نہیں آتے اور طبیب جن کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہے،قوسِ قزح جن کی حد باندھنے سے عاری۔ وہ آنسو روئے ہیں جو نمکین تھے اور نہ میٹھے۔جو کسی ذائقے کی قید میں نہیں آتے۔اور جسے پیار کرنے والے ماں باپ،بھائی اور بہن یا محبوبہ نہیں پونچھ سکتی۔سیکڑوں بار میں کسی لق ودق ویرانے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور ایکا ایکی ڈر کی پوری شدت کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں یوجنوں تک میرے پاس کوئی نہیں،میں بھی نہیں......

بیسیوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار دیکھا ہے،یا بنارس کا وہ گھاٹ جہاں پچھلے جنموں میں میں پیدا ہوا تھا......گنگا طغیانی کے بعد ہٹ گئی ہے اور کناروں کے قریب سرخی اور زردی سے

ملی جلی مٹی کے بیچ ہزاروں لاکھوں چھوٹی چھوٹی ندیاں چھوڑ گئی ہے۔ جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک ندی اور بہہ نکلتی ہے......اور وہاں آٹھ نو برس کا ایک سیاہ فام بچہ، ننگا، کمر میں سیاہ تاگا باندھے، سر پر چوٹی رکھے کھڑا ہے اور وہ — میں ہوں......

اس سے پہلے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری حادثات میں تباہ کر لیتا، میرے اعصاب ختم ہو چکے تھے۔ ذرا اسی بات پر ناراض، ذرا اسی بات پر ریں ریں روں روں...... ماں جھلا کر مجھے دور پھینک دیتی تھی کیونکہ میں اس کی بیمار چھاتی تک چچوڑ ڈالتا تھا۔ .. ماں، تم ہو نہ ہو، مجھے میرا دودھ دے دو۔ میں آج تک پکار رہا ہوں — ماں! مجھے میرا دودھ دے دو۔ اور ماں کہیں نہیں ہے......اس کا مطلب جانتے ہیں؟ — ماں کہیں نہیں ہے۔ ہاں تو، ایک بار پھینک دینے کے بعد اتھاہ مادریت کے عالم میں، ماں مجھے پھر اٹھا لیتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مجھے رکھے یا پھینک دے......

میں کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر سانحے کے بعد پریشان۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ پریشانی کی کوئی انتہا نہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، جیوتش لگوائے گئے۔ جیوتش نے کہا۔ لگن میں کیتو ہے اور برہسپت اپنے گھر سے بدھ پر درشٹی ڈالتا ہے۔ یہ بالک کوئی بہت بڑا کلاکار بنے گا۔ لیکن چونکہ شنی کی درشٹی بھی ہے، اس لیے اسے نام مرنے کے بعد ملے گا...... سوریہ سوگریہ ہے، دھن اور لابھ استھان میں پڑا ہے۔ اور اسی گھر میں شکر ہے، جسے سوریہ نے اپنے تیج سے اِستھر کر دیا ہے۔ چونکہ شنی شکر کو دیکھتا ہے اس لیے اس کے جیون میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھے پر بھی لے جائے، لیکن برہسپتی گھر کا ہونے کے کارن کبھی بدنامی نہیں ہوگی — لیجیے!

......پھر منگل بھی سنیچر کے ساتھ پڑا ہے۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن پھر بھی منگل منگل ہے، اثر تو کرے گا ہی۔ کام چلتے چلتے ایک دم رک جائیں گے۔ خاص طور پر اُن دنوں جب کہ برہسپتی وکریہ ہوگا۔ دسویں گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھتا ہے، اس لیے پتنی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا میرے باپ کی بیوی بیمار، دائم المرض اور میری بیوی بھی ...... پورے خاندان کو شراپ لگا تھا!

چنانچہ آج تک میں نے ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے علاوہ کوئی اُپجاؤ کام کیا ہے تو یہی صفحے کالے کرنا، کچھ کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی اُن کو خریدنے کے لیے چل دینا۔

میری ماں براہمن تھیں اور میرے پتا کھشتری۔ اس زمانے میں اس قسم کی شادی گریٹنا گرین میں بھی نہ ہو سکتی تھی، لیکن ہوگئی۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اس لیے گھر میں ایک طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پاٹھ ہوتا تھا۔ پہلی کہانیاں جو بچپن میں سنیں، جن اور پری کی داستانیں نہ تھیں، بلکہ مہاتم تھے جو گیتا کے ہر ادھیائے کے بعد ہوتے ہیں اور جو بڑی شردھا کے ساتھ ہم ماں کے پاس بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چند باتیں جو سمجھ میں آجاتی تھیں جیسے راجا... برہمن... پشاچ...... لیکن، ایک بات—

''ماں! یہ گنکا کیا ہوتی ہے؟''

''ہوتی ہے، آرام سے بیٹھو۔''

''اُدہوں، بتاؤ نا— گنکا......''

''چپ''

—اور پھر وہ دَیا جو ماں ہی کو آسکتی ہے، جب وہ اپنے بچّے کے چہرے کو ایکا ایکی کملاتے ہوئے دیکھتی ہے—

''گنکا بُری عورت کو کہتے ہیں۔''

''تم تو اچھی ہو نا، ماں؟''

''ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے... کسی کی بھی ہو؟''

''تو پھر بُری کون ہوتی ہے؟''

''تو تو سر کھا گیا ہے، راجے...... بُری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔''

میں سمجھ گیا لیکن دوسرے دن مجھے بے شمار جوتے پڑے۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں سومتری کی ماں کو گنکا کہہ دیا کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے انٹ سنٹ قسم کے کئی مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری باقی کی زندگی سب ایسی ہی ہے۔ اِدھر میں نے سوال کیا، اُدھر زندگی نے کہا— "چُپ۔"

اور جو کبھی جواب بھی دیا تو ایسا کہ میں اسے سمجھ ہی نہ سکوں۔ اور سمجھ جاؤں تو جوتے پڑیں۔

میری جسمانی کمزوری، نسوں کا اُلجھے ہونا، میرے سوالوں کا جواب مناسب طور پر نہ دیے جانا، یا جواب کی ماہیت کا نہ سمجھنا، ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی بچے میں احساسِ ذات پیدا کر سکتی ہیں اور وہ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے، حسّاس ہونے لگتا ہے۔ پھر زندگی میں سیدھے سادے اندھیرے کے علاوہ مہاشونیہ بھی ہے— مقامِ ہُو...... اور بیسیوں ڈر ہیں، خطرے ہیں، مایوسیاں جو دل میں ہر وقت لرزہ پیدا کیے رہتی ہیں۔ جیسے بجلی کا موہوم اشارہ بھی ڈایا فرام میں جُھرجُھری پیدا کر دیتا ہے...... باقی کی چیزیں واقعات اور تجربات ہیں، جو ہر مصنّف کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ اُن سے سیکھتا، اُن کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر اسے کاغذ پر اتارنے کی کوشش۔

یوں جانیے کو پانچ برس کی عمر میں میں رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور اُن کے کردار سے واقف ہو چکا تھا۔ اب رامائن کتنی بڑی کتاب ہے۔ اس میں کتنے خوبصورت اور ایثار والے کردار آتے ہیں، لیکن اس کی کیا وجہ کہ اب رامائن کے کرداروں میں مجھے سب سے زیادہ ہمدردی سگریو کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا بھائی بالی، اس کی بیوی تک کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور وہ بیچارہ منھ اٹھا کر دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر بھگوان رام ادھر نہ آنکلتے تو سگریو بیچارہ لنڈورہ ہی رہ گیا تھا۔ اسی طرح میری دلچسپی کا مرکز، ایک کردار مہابھارت میں بھی آتا ہے— شکھنڈی، مخنث...... جسے بیچ میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے، ورنہ وہ نہ مرتے؟...... آج تک زندہ نہ ہوتے۔

ماں کی بیماری کی وجہ سے میرے پتا بازار سے ایک پیسے روز کے کرایے پر کوئی نہ کوئی کتاب لے آیا کرتے تھے اور میری ماں کے پاس بیٹھ کر اسے سنایا کرتے۔ میں پائینتی میں دبکا سنا کرتا۔ گویا اسکول کی عمر کے ساتھ ٹاڈ کے راجستھان اور شرلک ہومز کے کارناموں سے واقف ہو

چکا تھا۔ جو چیز اپنی سمجھ میں نہ آئی وہ تھی — مسٹریز آف دی کورٹ آف پیرس...... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ اسے بڑے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اور میں حیران ہوتا تھا کہ فلاں آدمی کیوں ہر بار نئی عورت سے گڑبڑ کرتا ہے۔ جب تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے پڑنا کوئی شرافت کی بات نہیں اور یہ کہ عورت بہت گندی چیز ہے...... چنانچہ میں بے کیف ہو کر سو جاتا۔

اس کے بعد میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید لیا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا۔ پرائمری سے مڈل تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ سب چٹ کر لیں۔ میں وہ سلور فش تھا جو ہر پرانی کتاب کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ یا بک مارک، جسے ہر معقول پبلشر نئی کتاب میں ڈال دیتا ہے۔ علمی طور پر میں قریب قریب ہر چیز سے واقف ہو چکا تھا لیکن عملی طور پر نہیں۔ علم اور عمل میں فاصلہ ہونے سے جو بھی تباہی ہو سکتی ہے، وہ ہوئی۔ میں ہر تجربے کی سولی پر مصلوب ہوا اور شاید میرے لیے ضروری بھی تھا......

زندگی کی ایسی بنیاد کو وضاحت سے بتا دینے کے بعد باقی کے حوادث کا ذکر فروعی ہے۔ یہی ناکہ میٹرک پاس کیا، کالج میں داخل ہوئے۔ انگریزی اور پنجابی میں شعر کہے۔ اردو میں افسانے لکھے۔ ماں چل بسیں۔ ڈاک خانے میں نوکر ہو گئے — شادی ہوئی، بچہ ہوا۔ پتا چل بسے۔ بچہ چل بسا۔ نو سال ڈاک خانے میں ملازمت کی۔ ریڈیو میں چلے گئے ...... بٹوارہ ہوا...... قتل و غارت ...... لہو سے لتھڑے ہوئے بدن ...... ننگے ریل کی چھت پر دلّی پہنچنا ...... اسٹیشن ڈائریکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن ...... ریاست کے جمہوری نظام، سے لڑائی ...... پھر بمبئی...... اچھی فلمیں، بڑی فلمیں ...... کہیں کہیں بیچ میں افسانوں کی کوئی کتاب ...... پھر ہاتھ قلم کرتے رہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کوئی معاشقہ ...... ایسے لمحے جو بُدھ پر بھی نہ آئے، ایسے پل جنھیں راجا ل بھی نہ جی سکا...... بیوی میں دلچسپی کا فقدان، بیوی کی اپنے ساتھ محبت کا خاتمہ...... وجہ؟ — ادھیڑ عمر کا سڑی پن۔ بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بیوقوف سمجھنا اور میرا اسے پیسے کا پجاری اور غیر ذمہ دار...... بھلا کوئی بات ہوئی؟

میرے اعتقادات کیا ہیں ؟— کوئی نہیں ۔ میری امیدیں کیا ہیں ، اور مایوسیاں کیا— ؟ کوئی نہیں ۔ میں عقلمندی کی وجہ سے کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اور وہ بیوقوفی کی وجہ سے مجھ سے نہیں کرتی ۔ اس لیے کہ میں حرص اور محبت کا فرق سمجھتا ہوں ۔ بغیر خواہش کے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں ۔ پیسے کے لیے نہیں، کسی پبلشر کے لیے نہیں ۔ میں بس لکھنا چاہتا ہوں ۔ مجھے کسی دھرم گرنتھ کی ضرورت نہیں کیونکہ اُن متروک کتابوں سے اچھی میں خود لکھ سکتا ہوں ۔ مجھے کسی گرو ، استاد ، کسی دیکشا کی تلاش نہیں ، کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا گرو ہو سکتا ہے ، اور آپ ہی چیلا ۔ باقی دکانیں ہیں ۔ میں نے ہرے ہرے پتوں اور چنبیلی کے پھولوں سے باتیں کی ہیں اور ان سے جواب لیا ہے ۔ میں کاگ بھاشا جانتا ہوں ۔ میرا کتا مجھے سمجھتا ہے اور میں اسے ۔ مجھے کسی حقیقت ، کسی موکش کی ضرورت نہیں ۔ اگر بھگوان انسان کو بنانے کی حماقت کرتا ہے ، تو میں انسان ہو کر بھگوان بناتے رہنے کی بیوقوفی کیوں کروں ؟ اگر حقیقت کو میری ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں ، وہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ، مکمل سکوت کے کسی لمحے میں مجھے اپنے آپ ڈھونڈ لے گی ۔ میں ایک سادے سے انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں ، چاہنے کا مفہوم نکال کر ۔ ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں ، تمنا سے عاری ہو کر ، جسے ہم عرفِ عام میں 'سچ اوستھا' کہتے ہیں اور جو صرف جاننے کے بعد ہی آتی ہے ، اور ——

میں — کتابوں سے فلموں تک

کبھی میں نے اس لیے لکھنا شروع کیا تھا کہ مجھے کچھ کہنا تھا معاشرے کے بارے میں، زمانے کے بارے میں، حالات کے بارے میں، خود اپنے بارے میں۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی تصانیف کے ذریعے معاشرے کے زخموں کو دکھاؤں، تاکہ جو لوگ ان پر مرہم لگا سکتے ہیں، وہ لگائیں، یا اُن چھوٹی چھوٹی باتوں کا بیان کروں، جو زندگی کی بڑی بڑی مصیبتیں بن جاتی ہیں۔

پھر، میں کتابی زندگی سے نکل کر فلمی زندگی میں آیا اور میں نے محسوس کیا کہ ہر فلم ساز میری طرف ایسے دیکھ رہا ہے جیسے شیش محل میں کوئی کتا گھس آیا ہو۔ ہر شخص مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ فلمی کہانی اصل میں کیا ہوتی ہے اور کیسے لکھی جاتی ہے۔ کامیاب فلم سازوں کی تقریریں سننا میں گوارا کر بھی لیتا، لیکن ان کے چیلے چانٹے، جنھیں فلمی زبان میں ''چمچے'' کہا جاتا ہے، وہ بھی مجھے سمجھاتے کہ فلمی کہانی اصل میں ایسی ہونی چاہیے، اس میں فلاں فلاں باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، اور کہنے کا انداز ایسا ہونا چاہیے...... میں ان باتوں میں ایسا جکڑ گیا کہ کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ ادبی کہانی اور فلمی کہانی اصل میں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور پھر جب میں نے فلمی کہانیاں لکھیں تو ان پر بھی ویسی ہی نکتہ چینی ہوئی، جو ادبی کہانیوں پر ہوتی تھی۔ ان میں بھی وہی جھول نظر آئے جو ادبی کہانیوں میں دکھائی دیتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فلم ساز مجھے زبان اور لکھنے کا انداز اور جملے بنانا تک سکھانے لگے۔ میں ان کی غلط باتوں پر جھنجھلاتا، آخر ایک بار اُس زمانے کے ایک بہت بڑے فلم ساز سے میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''آپ نے کون سی کتاب لکھی ہے؟'' اور اُس

کے بتانے پر کہ اس نے کوئی کتاب نہیں لکھی، میں نے کہا ''میری تین کتابیں چھپ چکی ہیں! اور اُن میں میں نے کسی ہندوستانی یا غیر ملکی فلم سے کچھ نہیں چرایا ہے۔' پھر جو سین وہ مجھ سے سات بار لکھوا چکا تھا، اُسے آٹھویں بار لکھنے کی بجائے، کاغذوں کے پُرزے پُرزے کر کے اس کی میز پر پھینک کر چلا آیا۔

ہمارے اسٹوڈیو بہت بڑے اصطبل ہیں۔ ان میں کیمرے اور ساؤنڈ ریکارڈنگ کا سامان پچھلی صدی کا ہے، مگر مہنگائی کی وجہ سے ان کا کرایا دوگنا ہے۔ پھر، انگڑائی لے کر جاگے مزدور اور ان کی یونین ہے۔ صبح کی شفٹ میں کام کرنے والوں کو بھی پروڈیوسر کو دوپہر کا کھانا دینا پڑتا ہے اور شام کی شفٹ میں کام کرنے والوں کو بھی۔ لنچ تو لنچ ہوا ہی، مگر ڈنر بھی لنچ، اور بریک فاسٹ بھی لنچ اور پھر نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کے پھول کو آک کہہ دیجیے تو کیا وہ گلاب نہیں رہتا؟ خاص کر جب لنچ کا مطلب دال روٹی نہ ہو کر صرف پیسا ہو اور پیسا بھی چھ یا آٹھ گنا۔

فلم کی پوری دنیا ایک اُلٹا استرا ہے جس سے پروڈیوسر کے سر کی حجامت کی جاتی ہے۔ لاکھوں روپے لینے کے باوجود آپ کا ہیرو، کار کے پیٹرول کے پیسے نہ مانگے تو وہ بہت اچھا اور مقبول ہیرو مانا جاتا ہے، مگر ڈرائیور کے دس روپے کے بھتّے کے لیے وہ بھی بگڑ جاتا ہے۔ پھر اس کی شرطیں کہ میک اپ مین اس کا اپنا ہوگا، مگر اس کی تنخواہ پروڈیوسر کو دینی پڑے گی۔ اسی طرح ہیروئن کو بھی انار، انگور، موسمی کے رس اور بھنے ہوئے مرغ مسلّم کے علاوہ بڑھیا شراب بھی چاہیے۔ اگر کوئی شرط نہیں ہے تو پروڈیوسر کی نہیں۔

جلا بھنا میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اور پروڈیوسر آ گیا۔ وہ جیسے بھول ہی گیا کہ میں اب ادیب نہیں رہا۔ اور کہنے لگا ''بیدی صاحب، میں ''چھینا جھپٹی'' نام کی ایک فلم بنا رہا ہوں۔ آپ میرے لیے ڈائلاگ لکھ دیں گے؟''

''ضرور لکھ دوں گا، مگر میری ایک شرط ہے۔''

''بتایے''

''ہیئر ڈریسر میرا اپنا ہوگا۔''

میں ایک نئی کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کئی موقعوں پر میں نے دیکھا کہ ہدایت کار اور فلم ساز کی پسند الگ الگ ہے اور وہ ایک دوسرے کے برعکس رائے دیتے ہیں۔ دونوں کو مطمئن کرنے کا جو ایک طریقہ مجھے سوجھا، وہ تھا کہ ایک ہی سین کو دو الگ الگ طریقوں سے لکھوں اور پھر یہ فیصلہ ان دونوں پر چھوڑ دوں کہ انھیں کون سا سین پسند آیا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک شکایت اندر ہی اندر مجھے پریشان کرنے لگی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے کسی ناشر کے کہنے پر اس کی مرضی کے مطابق لکھا ہو۔ بلکہ میں نے جو کچھ اپنی مرضی سے لکھا، وہی ناشر نے قبول کیا۔ لیکن اب میں مجبور تھا کہ یا تو فلم ساز کی مرضی کے مطابق لکھوں یا فلم کے ہدایت کار کی پسند کو ذہن میں رکھوں۔ مجھے ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اور فلم ساز اور ہدایت کار دونوں ہی کی شکایتیں سنی پڑتیں۔ ان شکایتوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں خود ہی ہدایت کار بن جاؤں، لیکن ایسا کوئی فلم ساز نہ ملا جو ایک مکالمہ نگار کو بطور ہدایت کار فلم دینے کو تیار ہو جائے۔ آخر مجبور ہو کر مجھے خود ہی فلم ساز اور ہدایت کار بننا پڑا۔

تب، سب سے پہلا سوال آیا پیسے کا۔ فلم کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟ آخر کون پیسا دے گا مجھے؟ جب کوئی بھی پیسا دینے والا نہ ملا تو ''فلم فائنانس کارپوریشن'' کی طرف نظر گئی، جس سے نپی تلی رقم ہی مل سکتی تھی۔ اس رقم کو دھیان میں رکھ کر میں نے اپنی کہانیوں اور ساتھ ہی اُن ڈراموں پر نظر گئی، جو میں نے کبھی آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھے تھے اور ''سات کھیل'' کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ اُن ڈراموں میں سے میں نے ''نقل مکانی'' نامی ڈرامے کو منتخب کر لیا کیونکہ اُس کے لیے ایک ہی سیٹ کافی ہو سکتا تھا۔ تب میں نے ڈرامے کو فلم کے نقطۂ نظر سے لکھا اور اس پر ''دستک'' نامی فلم بنائی۔ اس فلم نے اس سال کی بہترین فلم کا قومی انعام حاصل کیا اور ''باکس آفس'' پر بھی کامیاب رہی۔ اس طرح اُس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ایک ادبی کہانی، فلمی کہانی بھی ہو سکتی ہے اور ایک ادبی ادیب، فلم ہدایت کار بھی بن سکتا ہے۔

(پیش کردہ: سکھ بیر)

[زمانہ اشاعت۔ مارچ 1985]

چلتے پھرتے چہرے

اس وقت میں صرف ایک ہی چہرے کی بات کر رہا ہوں جو بہت ''چلتا پھرتا ہے'' اور وہ چہرہ آج کل کے عام نوجوانوں کا ہے، چنانچہ میرے بیٹے کا بھی۔

اپنے بیٹے کا چہرہ دکھانے کی کوشش میں، اگر کہیں بیچ میں آپ کو میرا چہرہ بھی دکھائی دینے لگے تو برا مت مانیے گا۔ کیونکہ میں آخر اسی کا باپ ہوں، اپنے بیٹے پر ہی گیا ہوں۔ چنانچہ جو کچھ بھی آپ کو میرے بیٹے کے خلاف لکھا ہوا معلوم ہوگا، وہ دراصل میرے اپنے ہی خلاف ہوگا۔ کیونکہ اسے اس دنیا میں لانے کے علاوہ، اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا ذمہ دار میں ہوں۔ البتہ جو کچھ اس کے حق میں کہوں گا، وہ میرے بیٹے کی اپنی لیاقت ہوگی، جس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں۔

میرے بیٹے کا قد لمبا ہے اور رنگ کسی قدر کھلتا ہوا۔ حالانکہ میرا قد چھوٹا ہے، اور رنگ بھی پکا۔ اس کی وجہ غالباً میری بیوی ہے، جس کے میکے میں سب لوگ لمبے قد کے ہیں اور رنگ کے گورے۔ میاں بیوی کے ملاپ سے جو نتیجہ نکلتا ہے، اس سے کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔ نہ معلوم کیا چیز نکل آئے؟ مثلاً! ایکٹرس ہیلن ٹیری نے جارج برنارڈ شا کو لکھا تھا۔ ''ہم دونوں کا ملاپ ہو جائے تو اولاد کتنی اچھی ہو؟'' جس پر برنارڈ شا نے جواب دیا تھا ''مادام بدقسمتی سے اگر بچہ کو میری شکل مل گئی اور عقل آپ کی تو......؟'' شا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو ان کا لطیفہ پٹا ہوا معلوم ہو تو اندازہ کیجیے، اگر بچے کو شکل ہیلن کی اور عقل شا کی مل جاتی تو؟

میرا بیٹا بہت دبلا ہے۔ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی جیٹ ہوائی جہاز کے بہت ہی

قریب نہ چلا جائے، یا کوئی میرے بیٹے کے بہت ہی قریب منھ کر کے پھونک نہ مار دے۔ اس کے مہین سے چہرے پر موٹی سی ناک رکھی ہے۔ جو اس بات کے انتظار میں رہتی ہے کہ چہرے کے باقی خدوخال بھی بھر جائیں تا کہ وہ خود معقول معلوم ہو اور بات بات پر اسے لال نہ ہونا پڑے۔ اس وقت میرے بیٹے کے ناک کے نتھنے یونان سے ہندوستان تک بھاگ کر آئے ہوئے سکندر کے گھوڑے بوس فیلس کے نتھنوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہیں۔ یا اس وقت کام میں آتے ہیں جب انھیں اپنے مالک کی انا، یا وہم کو جتانا ہو، ورنہ وہ تو مہینے میں تین چار بار صرف زکام کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

اس زکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوانی میں مجھے بھی اکثر زکام ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ورزش کر کے، وقت پر سو کر اور وقت پر جاگ کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اس زکام کو بالکل انقلابی طریقے سے ٹھیک کرتا ہے۔ وہ رات ایک ڈیڑھ بجے تک میکس، یا نیو یارک کا ہفتہ وار انگریزی رسالہ ''ٹائم'' پڑھتا رہتا ہے، جس پر اس کا دنیا بھر کے علم کا مدار ہے اور پھر صبح سب سے آخر میں اٹھتا ہے، جب کہ اس کے بہن بھائی وغیرہ اسکول جا چکے ہوتے ہیں۔ ماں گھر کا سب کام کر چکی ہوتی ہے اور میرا ایک پیر گھر کے اندر ہوتا ہے اور ایک باہر۔ تب وہ نیند کا ماتا میرے پاس آتا ہے اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اسے دیکھتے ہی پہلے میں سلام کرتا ہوں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بار میں نے اس کو سلام کے سلسلے میں آنا کانی کر دی تو وہ مجھے کبھی سلام نہیں کریگا۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا میرا سارا دن کڑھتے رہنے کی وجہ سے برباد ہو جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ دنوں کے تسلسل ہی کو زندگی کہتے ہیں۔

میرے بیٹے کے ہونٹ پتلے ہیں اور ٹھوڑی مضبوط، جو ایک پکے ارادے کا ثبوت ہے اور جسے وہ اکثر اپنے ماں باپ،، بہن بھائیوں پر استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی ہیں، جن سے پاس کا تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور دور کا اتنا بھی نہیں، جتنا کوئی صحت مند آدمی، مٹی کا ڈھیلا پھینک سکے۔ اس لیے میرا بیٹا آج کل کے نئے علم کا چشمہ پہنتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر کی بھویں گھنی ہیں جو خلوص کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میرے بیٹے میں خلوص نہیں۔ اس میں خلوص ہے، بہت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھاتا اور یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا

کہ آدمی کا دل صاف ہو اور اس میں خلوص ہو، پھر بھی وہ دھوکا نہ کھائے؟

میرے بیٹے کا ماتھا چھوٹا ہے۔ کہتے ہیں ایسی تنگ پیشانی کے لوگ زیادہ بھاگیہ وان نہیں ہوتے، جس کا ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راک فیلر کے گھر میں پیدا ہونے کی بجائے ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کی ماں کام کر کے مری جارہی ہے، میں مر مر کے کام کرتا جارہا ہوں اور وہ مزے سے لیٹا ہوا ہے، تو مجھے بزرگوں کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ وہ فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ اگر وہ کسی کی بات بیچ میں نہ کاٹے تو اپنے چہرے پر کے رگ وریشوں کی خفیف سی جنبش سے دوسرے کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ آپ کی بات تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس پر بھی آپ کہتے ہی رہنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے اور یہ اس کی اسی ناطق خاموشی کی وجہ ہے کہ اسے اپنے باپ کو کبھی بیوقوف کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غالباً یہ اس کی بے صبری نہیں۔ آج کل کی دنیا تیز رفتار ہے، جس سے میرا بیٹا مطابقت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا۔ وہ کار بھی چلائے گا تو چالیس پچاس میل کی اسپیڈ پر اور میں بیس پچیس پر ٹرک ٹوں رہوں گا۔ اس نے کئی ایکسیڈنٹ بھی کیے، جن میں سے دو تو بہت قیمتی تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ سو روپے کا تھا اور دوسرا کوئی بارہ ساڑھے بارہ سو کا۔ اور اس پر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے اس بات پر شرمندہ نہ کرے کہ میں اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

لیک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔ میں حسبِ معمول سلو اسپیڈ میں تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی بچہ بھاگ کر آیا۔ اسے کار کا دھکا لگا تو فٹ پاتھ پر جا گرا۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کی جان بچ گئی اور ساتھ ہی ہماری بھی۔ ہسپتال سے اسے مرہم پٹی کرانے کے بعد ہم گھر کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا "دیکھا میں تمھاری اسپیڈ پر ہوتا تو بچہ مر گیا ہوتا۔"

"آپ میری اسپیڈ پر ہوتے" میرے بیٹے نے کہا "تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے۔"

یہ شاید خلیل جبران نے کہا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اپنا جسم اور ذہن دے سکتے ہیں، اپنے خیالات نہیں دے سکتے۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والوں نے بڑی گڑ بڑ کی ہے۔ وہ الفاظ میں حقیقت کا

ایک ایک لمحہ جکڑ لیتے ہیں۔اس وقت آدمی یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کی ہر چیز ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی حقیقت مطلق نہیں۔حقیقت ایک مقامی حیثیت رکھتی ہے، اور کاہلی پسند کند ذہن اس وقت پڑھنا اور سوچنا بند کر دیتا ہے اور اس محدود حقیقت کو دنیا بھر پر پھیلاتا رہتا ہے۔

کوئی خلیل جبران سے پوچھے ''کیوں بھئی۔ہم انھیں اپنے خیالات کیوں نہیں دے سکتے؟''

پھر کیوں ہمیں کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کو بچوں کے سامنے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیے۔حالانکہ یہی فطری جھگڑا ہے جسے دیکھ کر بچے کو سمجھنا چاہیے کہ زندگی صرف قلاقند ہی نہیں، کونین کی گولی بھی ہے۔اور اس آدمی کا آپ کیا کریں گے، جس نے کبھی کبھی بچے کو ماں باپ کا ننگا بدن دکھانے کی کوشش کی ہے۔یہ خارجی زندگی ہے جو بچے کے خیالات کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر اس کی ''پریرنا'' کا حصہ ہو جاتی ہے۔آج کل کے بچے کانوں اور آنکھوں کے ذریعے ہزاروں آوازوں اور تصوّرات کو اپنے دل میں اتار لیتے ہیں، اور کچھ اس انداز سے کہ نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ میں جان سکتا ہوں۔آج کا بچہ اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اسے کوئی جنم دے گیا تھا یا وہ برسات کے پہلے قطرے کے ساتھ اس دھرتی پر ٹپکا تھا۔وہ اپنے بڑوں سے اپنی اور ان کی پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے اور رسمی جواب حاصل کر کے چپکے سے قلم اٹھاتا ہے اور اپنے جوابی مضمون میں لکھتا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پورے خاندان میں چار پشت سے کوئی بھی قدرتی طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔

دراصل کرشن دیاس سے لے کر دشنو پر بھاکر تک، سب لکھنے والوں نے گڑبڑ کی ہے۔وہ اس زمانے سے اتنا ہی پیچھے ہیں، جتنا زمانہ ان سے آگے ہے۔چلیے وقت کے اعتبار سے ہی سہی، مانیے ہم نے سب کچھ پایا ہی نہیں، کھویا بھی بہت کچھ ہے۔لیکن اس کھونے میں جو کچھ ہم نے پایا ہے، اسے کالی داس، بھوبھوتی اور شیکسپیئر آج نہ پا سکیں گے۔میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اتنا تاؤ نہ دیجیے کہ میں ان بڑے لوگوں کو آج کے نقطۂ نظر سے دیکھوں۔میں کس قدر بے بضاعت ہوں، ان مہان ہستیوں کے مقابلے میں۔لیکن آج کے نوجوان کو میرا یہی مشورہ ہے کہ مجھے پڑھیں اور پھینک دیں اور واقعی کسی نامحسوس دلیل کی بنا پر مکمل طور پر ردّ کر دیں اور میں یہ محسوس کروں، میرا بیٹا بھی ٹھیک ہے اور میں بھی غلط ہوں!

میرا بیٹا میری اتھارٹی کو نہیں مانتا۔ کسی اتھارٹی کو بھی نہیں مانتا۔ میں روتا ہوں۔ میرے بڑوں اور پیشروؤں کی روحیں کسی آسمان میں کلبلاتی ہیں اور وہ میرے ساتھ مل کر اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے زمانے میں انقلابی تھے اور انھوں نے اتھارٹی کے خلاف جہاد کیا تھا، اور اس کی وجہ سے کڑی مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ کیونکہ ان کے زمانے میں بھی ہماری ہی طرح کے ماں باپ تھے، حاکم تھے، مذہبی پیشوا تھے۔ انھوں نے بھی وقت کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور نئے اخلاق کو دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا! آپ اندازہ تو کیجیے کہ میرے بیٹے کو کن چیزوں سے نبٹنا پڑتا ہے ، زندگی کی رفتار سے، قدم قدم پر ایک کڑے مقابلے سے، مادی اور روحانی قدروں کی کشاکش سے ، پرانے اور نئے جھگڑوں سے — میں نے اگر بہت پڑھا بھی ہے تو میرا ذہن جاگیردارانہ ہے لیکن میرے بیٹے کا نہیں۔ میں ایک خاص قسم کا ادب اور متابعت اس سے مانگتا ہوں، جو وہ مجھے نہیں دے سکتا اور دینا بھی نہیں چاہتا۔ میں جب اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھلا کر کہتا ہوں، تم آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے، تو میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہی فقرہ مجھے بھی میرے ماں باپ نے کہا تھا۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں سرطان (کینسر) صرف ایک پھوڑا تھا، جس پر کوئی مرہم لگایا جاتا تھا اور مصفّی خون کی بوتل پینی پڑتی تھی۔ ان کے زمانے میں دباؤ اتنے نہ تھے کہ انسانی شخصیت ایک ٹوٹے ہوئے آئینہ کی طرح نظر آئے — جب ''سکزوفیرنا'' کا لفظ ایجاد نہ ہوا تھا۔ خواب آور گولیاں استعمال نہ ہوتی تھیں اور نہ لوگوں کو ایل۔ ایس۔ ڈی چوبیس یا اُس کھمب کا پتا تھا، جس کا رس پی کر...... انسان کو اپنا ہی لطیف جسم، گہرائیوں میں اترتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن بے حد حسین سبزہ زاروں میں وہ جاتا ہے، وہ انسان کے اپنے دماغ اور اس کے شعور کی تہیں ہیں، جن میں سیلا کانٹ مچھلی سے لے کے آئنسٹائن تک کے سب تجربات چھپے پڑے ہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمارے رشی منیوں نے ہزاروں سال تپسیا کی۔

یہ کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا، ایک حقیقت ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ یونہی میں نے اپنے آپ کو صفر کرنے کی کوشش کی ہے، تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ اگر میں جانتا بھی ہوں کہ سوئز کی نہر فرانسیسی انجینئر ڈی لیلیپس نے بنائی تھی، تو بھی میں اپنے بیٹے کے سوالوں کا

جواب کچھ اس انداز سے دوں گا جس سے اس کی تسلی نہ ہوگی اور میں اس بات کو چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں بھی سب باپوں کی طرح جاہل ہوں۔ اور میرا زمانہ گذر چکا ہے۔ میری حیثیت اس وقت اس ''ڈیڈی'' کی طرح ہوگی جس سے بیٹے نے پوچھا۔ ''ڈیڈی! یہ مصر کے مینار کیوں بنائے گئے ہیں؟''

''خدا معلوم۔ بس بنا دیے، اگلے وقتوں میں بہت زیادہ وقت تھا لوگوں کے پاس!''

''زرّاف کی گردن اتنی لمبی کیوں ہے ڈیڈی؟''

''بھائی کسی جانور کی لمبی ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی۔''

''ڈیڈی! بچہ صرف عورت ہی کو کیوں پیدا ہوتا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر مرد کو بچہ پیدا ہونے لگے تو پھر وہ عورت نہ ہو جائے!''

''ڈیڈی! اگر آپ میرے سوالوں سے خفا ہوتے ہیں تو میں نہ پوچھوں۔''

''نہیں نہیں پوچھو بیٹا، سوال نہیں پوچھو گے تو علم کیسے ہوگا؟''

میرا بیٹا رات کو کیا سوچتا رہتا ہے؟ کیوں رات دیر تک اسے نیند نہیں آتی؟ کیا صرف روغن بادام یا خواب آور گولیاں ہی اس کا علاج ہیں؟ کیا اسے سیکس ستاتا ہے؟ کیونکہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہو چکی ہے اور اس کے چند مطالبے جائز ہیں۔ پھر اس نے شادی سے انکار کیوں کر دیا۔ کیا صرف اس لیے کہ جب تک وہ اس دنیا کی تگ و دو میں اپنا مقام نہ بنائے گا، کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہ کریگا؟ کیوں ہمارے زمانے میں لوگ اس عقیدے پر شادی کر لیا کرتے تھے کہ عورت لکشمی ہوتی ہے؟ اس کے آنے سے قسمت کے دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں۔ اکثر وہ نہیں کھلتے تھے، صرف چند تاریک مستقبل والے بچے اس دنیا میں چلے آتے۔

میرے بیٹے کے خیالات کیا ہیں؟ میں ان تک پہنچنے کی کوشش تو کروں۔ اس کی روح میں اتر کر دیکھوں کہ وہ کیوں اتنا خود غرض ہو گیا ہے؟ کیوں وہ دوسرے کسی کے باپ کے پیر بھی چھوتا ہے لیکن صبح اُٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ دوسرے کا باپ امیر کبیر ہے اور اس نے اپنے بیٹوں کو دولت اور شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بیٹے کے باپ نے چند کالے صفحوں کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا۔ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ

آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بیٹا بھی راتوں رات لکھ پتی ہو جانا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پیسا کمانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک روّے پر دوسرا رڈا رکھنا پڑتا ہے؟ جیسے وہ مذہب اور دوسری رسوم و روایات کا قائل نہیں۔ وہ گرد و پیش کی دنیا کو دیکھ کر اس قسم کی محنت کا بھی قائل نہیں۔ ایسے نظام کا بھی قائل نہیں جس میں کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور کچھ عیش کرتے ہیں اور کھلے بندوں کہتے ہیں، بزنس میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں، میرا بیٹا میرا نام استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی شرم نہیں سمجھتا۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجبور اور شرم سار ہے۔ میری وجہ سے وہ کسی سے دس روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔

میں نے ہنسی کی آڑ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہا۔ ''بیٹا تو پھر تم سَو مانگا کرو۔''

اور مجھے پتا چلا کہ وہ میری زندگی میں سے جذباتیت اور مثالیت کو یکسر نکال دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے باپ کی اتنی حیثیت تو ہو جائے کہ وہ کسی سے لاکھ دو لاکھ مانگ سکے، جس سے وہ ایک فلم بنائے اور اس سے کئی لاکھ کمائے۔

اس قسم کی مادّہ پرستی، خود غرضی، سگریٹ، شراب، عورت کی وجہ سے باپ اپنے بیٹوں کو اپنی زمین جایداد سے برطرف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مادّی معنوں میں میرے پاس ہے ہی کیا، جس سے بیٹے کو برطرف کر دوں؟ اگر وہ کسی بات سے ناراض ہو کر چلا جائے تو میں ہی اسے ڈھونڈتا پھروں گا اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو وہ مجھے نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لیے میں سخت وحشت کے لمحوں میں بھی چپکے سے گھر چلا آتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کہیں چلا نہ جائے۔ میں اسے برطرف کرنے کی نہیں سوچتا۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے انسانی اصول کے کلبلاتے ہوئے درخشاں مستقبل سے برطرف نہ کر دے۔

مہمان

میں شروع ہی میں مانے لیتا ہوں کہ مجھے مہمانوں سے نفرت ہے، سخت نفرت!

اگر چہ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں لیکن یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ ہماری سبھیتا میں مہمان کا بہت بڑا درجہ ہے ۔ یہ مہمان کی اپنی بدکرداریوں اور اس کے نام میں لگی ہوئی فالتو سی 'م' نے گڑ بڑ کر دی، ورنہ وہ تھا ہی مہان...... آپ ذرا اسے لکھ کر تو دیکھیے ۔

اَتھی ستکار کا ہماری پستکوں میں بڑا مہتو ہے ۔ جگہ جگہ اس بات کی پریرنا کی گئی ہے کہ مہمان کیسا بھی ہو، اسے بھگوان کر کے مانا جائے ۔ اس زمانے میں شاید خیالات کی زیادتی یا سوچ بچار کی کمی کہ ان درشن شاستروں کے لکھنے والے گھوم گھام کر پھر شبد مہمان پہ چلے آتے تھے ۔ غالباً وہ سب اس لیے کرتے تھے کہ خود ان کے پاس پہننے کو لنگوٹی تھی اور نہ کھانے کو روٹی، اور وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کو کسی کا مہمان ہونا ہی پڑے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ مہمان کا درجہ بھگوان کا ہے، تو میں بڑی نمرتا سے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ مجھے بھگوان سے بھی نفرت ہے!

جس زمانے میں ہمارے شاستر لکھے گئے تھے، اس زمانے میں جگہ کی کیا کمی تھی؟ سوائے وشالتا کے اور تھا ہی کیا؟ نیچے زمین، اوپر آسمان اور بیچ میں مہمان، چاہے درجنوں لٹک جائیں ۔ آج کس کے پاس 10×10 فٹ سے بڑا کمرہ ہے؟

شامت اعمال، اگر مہمان چھ فٹ کا آجائے تو آپ کو ٹانگیں سکیڑ کر انھیں چھاتی سے لگا کر

باقی کے چار فٹ میں گزارا کرنا پڑے گا۔ حالانکہ مرنے کے لیے بھی آدمی کو کم سے کم چھ فٹ جگہ چاہیے۔ جس میں کہ مہمان پڑا ہوتا ہے...... صبح اٹھیں گے تو آپ کی ٹانگیں چھاتی کے ساتھ ہی لگی رہ جائیں گی اور جب انھیں پھیلانے کی کوشش کریں گے تو یوں لگے گا جیسے آپ پھر سے پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں ہمارا پورا فلسفہ مہمان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جب لوگ جنگل میں جا کر کند مول وغیرہ کھا لیتے تھے اور اسی میں سنتشٹ ہو جاتے تھے، لیکن آج کا ذشٹ مہمان چکن روسٹ سے کم بات ہی نہیں کرتا۔ کچھ اس انداز سے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو کوالٹی ریستوران میں بیٹھے ہوئے پاتے ہیں۔ آخر دم تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ بل وہ دینے والے ہیں۔۔۔ یہ مسئلہ آپ کا ہے، مہمان کا نہیں کہ دیش بھر میں کھانے کو نہیں۔ راشننگ کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے۔ بیوی کی شکل دُکان پہ کھڑے کھڑے کیوسی ہو گئی ہے۔ پھر پُرانے زمانے میں انسان زیادہ تھے اور مہمان کہیں اِکا دُکا ملتا تھا۔ لیکن آج مال تھوسی کے عقیدے کے مطابق، اس بھوکی ننگی دنیا میں مہمان ہی مہمان رہ گئے، انسان کہاں نظر آتا ہے؟ اس زمانے کے مہمانوں میں پھر کوئی آنکھ کی شرم تھی، حیا تھی، دوسرے کی تکلیف کا احساس تھا۔ لیکن آج کل کے مہمان؟ ارے توبہ۔ آپ تو انھیں مجھ سے بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ہندوستان میں کوئی ایسا آدمی نہیں، جسے اس موزی سے پالا نہ پڑا ہو۔ وہ موت کی طرح سے ہر ایک پہ آتا ہے۔ جینا جھوٹ ہے اور مرنا بھی جھوٹ۔ صرف مہمان سچ ہے۔ آج کل کے مہمان کو تو بس گولی ماریے۔ ذرا سوچیے تو ہم جو خود اس دنیا میں کل دو ہی دن کے مہمان ہیں، اپنے اوپر ایک اور مہمان کو لے آئیں جو مہینے بھر سے پہلے جانے کا نام ہی نہ لے؟

نا صاحب۔ گھر میں مہمان لانے سے تو اپنی بیوی پر سوت لے آنا اچھا۔

اس دنیا میں تکلّف کی بھی ایک جگہ ہے۔ مثلاً آپ کسی کے گھر کھانا کھائیں تو شوربے میں ڈوبے ہوئے دو آلوؤں کے بارے میں ضرور کہنا پڑے گا۔ واہ صاحب مزا آ گیا۔ برسوں کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے، یا رُخصت ہوتے ہوئے اپنے میزبان کی بیوی کے بارے میں کہنا پڑے گا، آپ کی بیوی بڑی Charming ہے۔ سمجھ دار میاں تو اس بات کو سمجھتا ہے۔ وہ صرف

ایک بار مُڑ کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اور پھر گھبرا کر بوٹ کے تسمے بند کرنے لگتا ہے۔ لیکن مہمان ؟ آپ کہیں غلطی سے بھی اسے کہہ دیں، آپ غریب خانے پر تشریف لے چلیے، وہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے، تو پھر دیکھیے، کیسے وہ آپ کے ہاں انتقال فرما جاتے ہیں اور وہیں اپنی قبر بنا کر رہتے ہیں۔ آپ کو، آپ کی بیوی کو، آپ کے بچوں کو مجاور بنا کر چھوڑتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے ہی گھر میں مہمان ہو گئے۔ میزبان تو وہ ہیں، بذاتِ خود!

اپنے دل میں پھر سے گھر کا احساس جگانے کا کے لیے آپ کے پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگلے پھیرے میں آپ اس کے گھر میں مہمان ہو جائیں اور ہر بات میں ان کی جھونپڑی کو بار بار دولت خانہ کہیں۔ ''تشریف رکھیے'' ...... ''پہلے آپ'' اور اس قسم کے جملوں کا آزادانہ استعمال کریں۔ پھر ایک اور بات جو اُن سے سہواً چھوٹ گئی۔ اس کی بیوی سے عشق بھی کریں، اس لیے نہیں کہ آپ کا جی چاہے گا، بلکہ اس لیے کہ اس کمینے کو پتا تو چلے کہ کسی دوسرے کے گھر میں مہمان کیسے ہوا جاتا ہے؟

بمبئی کے فلیٹوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سالے بہت ہی فلیٹ ہیں۔ ان میں اگر آپ ایک چار پائی رکھ دیں، تو دو پائے والے کے لیے کہیں کوئی گنجائش نہیں۔ آخر چار پائی تک پہنچنے کے لیے تھوڑی جگہ تو چاہیے ہی۔ بہر حال وہ کھاٹ جسے آپ کی بیوی جہیز میں لائی تھی اور جسے آپ پلنگ نہ کہیں تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ مہمان کو دینا پڑتی ہے اور خود نیچے سونا پڑتا ہے، بدقسمتی سے اگر آپ کے مہمان ساتھ اپنی بیوی کو بھی لائے ہوں تو پھر آپ اوپر سو سکتے ہیں، نہ نیچے۔ ہاں، تو جب آپ مہمان صاحب کو چار پائی پر سونے کے لیے کہیں گے تو پہلے وہ ضرور کہے گا۔ نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ پلنگ پر سوئیے، میں نیچے سو جاتا ہوں۔ لیکن اس کی نیت ایسی ہرگز نہ ہوگی۔ وہ جانتا ہے نا کہ اس کی خاطر کر کے میزبان اپنے کرتویہ ہی کا تو پالن کر رہا ہے۔ اس کی اس پیش کش سے انکار کیا تو بے چارے میزبان کے دل پر کیا بیتے گی؟ چنانچہ وہ پلنگ پر ٹانگیں پھیلا کر مزے سے سو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو یوں لگے گا، جیسے دشمن کا ریڈیو براڈ کاسٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کوڈ نہ جاننے کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کو اچانک خیال آئے گا۔ نہیں بھائی، اس Wave length پر تو پہلے ہی بیسیوں نشریات سن

چکے ہیں۔ یہ تو مہمان کے خراٹے کے ہیں۔

چنانچہ مہمان صاحب سو رہے ہیں۔ ہمیشہ کی نیند نہیں۔ صبح وہ پھر جگ جائیں گے۔ ایک نہیں نیند آتی تو آپ کو اور آپ کی بیوی کو، جو سوچ رہے ہیں کہ کل ان کو کیا کھلائیں گے؟ آپ سوچتے تو نیلا تھوتھا ہیں اور لاتے سیب ہیں، جن کا منہ بھی مہنگائی کے اس زمانے میں آپ نے مہینوں سے نہیں دیکھا۔ پھل بیچنے والا پیشہ ور آدمی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہے اور آتتھی ستکار کی بھاونا ان کے من میں ویاکل ہو اُٹھی ہے۔ چنانچہ وہ سیب تو ایک دیتا ہے اور روپے دو مانگتا ہے۔ جیسے اکیلا وہی ایک سیب ہے جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کشمیر سے آیا ہے۔ پھر آپ آم خریدنے کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ مقابلہ میں سستا پڑتا ہے۔ گھر پہنچ کر آپ اس آم کی بہت سی قاشیں کاٹ کر مہمان کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ انھیں ایک کے دو معلوم ہوں۔ مہمان ایک بار پھر آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ چنانچہ لپڑ چپڑ وہ سارے کا سارا چٹ کر جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں، شاید وہ سمجھ رہا ہے کہ اندر اور بھی بہت سے آم ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اندر صرف بیوی ہے جو غصہ سے کانپ رہی ہے اور اس کی شکل اناس کی سی ہو گئی ہے۔

مہمان کے گھر میں آنے سے سب سے بڑی بیہودگی جو ہوتی ہے، وہ آپ کے سب راز، سب پول کھل جانا۔ آپ گھر میں آدھی کھائیں یا ساری، یا بھوکے ہی سو رہیں، لیکن مہمان کے آتے ہی آپ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ آپ کتنا ہی اس سے چھپانے کی کوشش کریں، مگر وہ سب ایسے ہی بیکار ہے جیسے کارک کو پانی میں ڈبونے کی کوشش۔ مہمان اس وقت اندر سے خوش لیکن باہر سے اُداس دکھائی دیتا ہے اور اکثر یہ جملہ کہتا ہے — ''کیا ہوا بھائی، گھروں میں ایسا ہوتا ہی ہے......''

وہ ہمدردی کر رہا ہے جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ جب تک آپ پڑوس سے سو روپے کا نوٹ پکڑ سکتے ہیں، اپنی گھڑی بیچ سکتے ہیں، بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ سکتے ہیں، کسی کو ہمدردی جتانے کا کیا حق ہے؟ اگر آپ کسی نہ کسی طرح حقیقت حال چھپانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو پھر مہمان بڑے شاطرانہ انداز میں کریدنے کی کوشش کرتا ہے۔

''کیوں بھائی! کاروبار کا کیا حال ہے؟''

''آپ جواب دیتے ہیں— ''اچھا ہے۔''

''کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی؟''

''ہوئی کیوں نہیں؟ . ہر سال ہوتی ہے، جیسے ہر معقول ہندوستانی عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہے—ہی۔''

چنانچہ ہنسی میں بہہ جانے کی وجہ سے آپ کو بالکل اندازہ نہیں رہتا کہ آپ کیسے دھیرے دھیرے مہمان کی سازش میں آ رہے ہیں۔ وہ آپ کے بھونڈے مذاق پر آپ سے کہیں زیادہ ہنستا ہے اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیں اور پھر ایکا ایکی آپ کو پورے طور پر نہ دیکھتے ہوئے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چھوڑتا ہے— اب تو تنخواہ تین سو روپے مہینہ ہو گئی ہوگی؟''

آپ کی رگِ حمیت ایک دم بھڑک اٹھتی ہے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ آپ اپنے آپ کو کہتے ہوئے پاتے ہیں— ''تین سو؟ پانچ سو تو میری پچھلے برس تھی— ''جبھی آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ نے کیا حماقت کی۔ خود کو کنویں میں گرا کر اب آپ بچنے کے لیے بے کار ہی ہاتھ پیر مارتے ہیں اور کہتے ہیں' پانچ سو میں آج بنتا ہی کیا ہے؟ کچھ انکم ٹیکس کٹ جاتا ہے، کچھ انشورنس، پراویڈنٹ فنڈ میں چلا جاتا ہے۔ کچھ بیوی کمیٹی کے لیے رکھ لیتی ہے، تاکہ اس بیٹی کی شادی کر سکے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی.....'' لیکن صاحب آپ کچھ بھی کیجیے۔ مہمان اندازہ لگا چکا ہے کہ آپ کے گھر میں اور کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔

ہر معقول آدمی کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے کیونکہ مرد عورت کا رشتہ ہی جھگڑے کا ہے۔ لیکن جب مہمان گھر میں آتا ہے تو وہی جھگڑا مہابھارت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بیوی آپ سے کتنی نفرت کرتی ہے اس کا اس وقت تک پتا نہیں چلتا، جب تک مہمان گھر میں نہ آئے۔ جیسے آپ کو بھولنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا، ایسے ہی بیوی یاد رکھنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتی۔ جانے کب کا بغض آپ کے خلاف سینے میں لیے بیٹھی ہے جو مہمان کے آتے ہی پنڈورا باکس کی طرح آپ کے سر پر اُلٹ دیتی ہے۔ مہمان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ ''دیکھیے بھائی

صاحب۔ دن میں چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں اور اس پہ دودھ کا ایک گلاس نہیں پیتے ۔ آپ بتایئے ان کو خشکی ہوگی کہ نہیں ہوگی؟ نہ ناشتے کا کوئی وقت ہے نہ کھانے کا...... اب پینے کی نئی لت پڑگئی ہے ۔ اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان آئے اور ان کے پینے کا بہانا ہوجائے...... آج تو میں انھیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔''

''کسے؟'' مہمان شرارت سے کہتا ہے۔

بیوی کچھ مُسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہتی ہے۔''بوتل کو، اور کسے؟ آپ بھی بالکل نہ پیجیے گا، بھائی صاحب۔''

مہمان تھوڑا گھبرانے لگتا ہے اور لہجے میں وہ پیار لے آتا ہے جو وہ اپنی سگی بیوی کے لیے بھی کبھی نہیں لایا۔ ''کبھی کبھی پی لینے میں کوئی حرج نہیں، بھابی! مرد لوگ......''

بیوی ایکا ایکی میز پر ہاتھ مار کر کہتی ہے۔''نہیں''

''ہاں ۔'' میں جواباً کہتا ہوں اور بوتل ڈھونڈنے چل نکلتا ہوں، جو بیوی نے گودریج کی الماری میں چھپا کر رکھی ہے اور تالا لگا دیا ہے۔ میں کنجی مانگتا ہوں اور وہ ٹھنٹ دکھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں، چابی کہاں ٹھنسی ہے، لیکن مہمان کے سامنے وہاں سے نکال نہیں سکتا۔ چونکہ میرے شوہری وقار کو ٹھیس لگتی ہے، اس لیے میں آگ بگولا ہوجاتا ہوں اور بیوی کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہوں۔''یہ عورتیں!...... آپ دو روپے کمائیں اور دیانت دار آدمی کی طرح آتے ہی ایک روپیا ان کو تھما دیں۔ باقی کے روپے میں آپ بس کا کرایا رکھیں اور صرف اٹھنی اپنے موج میلے کے لیے۔ جب بھی ان کی نگاہ آپ کی اٹھنی پر رہے گی ۔ مرد سے یہ آخری سانس تک نچوڑ لیں گی اور جب مرجائے تو اونچی اونچی آواز میں روئیں گی ۔ اس لیے نہیں کہ وہ مر گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اب نچوڑیں گی کسے؟''

''بکومت'' بیوی کی بلند آواز آتی ہے اور اب دیکھتے ہیں کہ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ہے۔ ابھی اسے فکر پڑگئی کہ یہ گیا تو روپیا کہاں سے آئے گا؟ لیکن آپ اپنا ٹیمپو کم نہیں ہونا دینا چاہتے۔ آپ مہمان سے کہتے ہیں—'' آپ ہی بتایئے بھائی صاحب...... ہر بیوی شادی کے دس سال میں یہ ہوجاتی ہے۔ اس دلہن کو دیکھیے جسے آپ برسوں پہلے گھر لائے تھے اور جس

سے والہانہ پیار کیا تھا، دو گھونٹ پینا ضروری ہیں یا نہیں؟ یہ ذلیل سا گھر ہمارا...... جب میں پی لیتا ہوں تو مجھے یہ کچھ ایسے معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ گندا سا محلہ 'ہینگنگ گارڈن!'' پھر میں آنکھوں میں شعلے اور انگارے برساتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں ''دیکھو شانتی! مجھے آکاش وانی ہو رہی ہے۔''

بیوی آکاش وانی کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس لیے ڈر کے مارے چابی میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے لیکن اس کے بعد جو ہتھیار میرے خلاف استعمال کرتی ہے، اس کے سامنے آکاش وانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ رونے لگتی ہے اور مہمان سے مخاطب ہوتی ہے — ''آپ کو کیا بتاؤں بھائی صاحب! جب یہ چابی لیتے ہیں تو آدمی نہیں رہتے۔''

''کیا ہو جاتے ہیں؟'' وہ پوچھتا ہے۔

بیوی ہچکچاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''باہر جاتے ہیں۔''

''باہر جانے میں کیا حرج ہے؟'' مہمان عارفانہ تجاہل کے ساتھ کہتا ہے ''باہر کی کھلی ہوا......''

''او ہو۔ آپ نہیں سمجھتے۔''

''او۔'' مہمان کہتا ہے، جیسے وہ سمجھ رہا ہے۔

''آپ ایسے نہیں، تو سمجھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی مرد ایسا نہیں؟'' اور پھر گھگھیا کر رونے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ ذلیل اور گھٹیا مہمان، ہم میاں بیوی پہ جج بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ بیوی مجھے نقطوں سے بھری ہوئی گالیاں دیتی ہے اور میں اسے بے نقط سناتا ہوں۔ مہمان بیچ بچاؤ کرتا ہے۔ باہر سے دکھی مگر اندر سے سکھی نظر آتا ہے۔ آخر وہ مجھے بے تحاشہ صلواتیں سنانے لگتا ہے...... ''شرم آنی چاہیے آپ کو۔ ہم نے ہزاروں عورتیں دیکھیں ہیں، لیکن شانتی جیسی دیوی نہیں دیکھی۔ آپ اگلے سات جنم تک بھی لگے رہیں تو ایسی ستی ساوتری آپ کو نہیں ملے گی۔''

''پچھلے سات جنم سے ستی ساوتری کی تلاش میں ہوں، اور اب جا کر یہ مجھے ملی ہے شانتی۔ اب تو مجھے موکش ملنے والا ہے۔''

بیوی عقیدت کے ایک جذبے سے مہمان کی طرف دیکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہو رہا

ہے۔اس گھر میں مہمان کی نوکری پکی۔ یہ تو موٹی عقل کا مہمان بھی جانتا ہے کہ کسی کے گھر میں رہنا ہے تو بیوی کے ساتھ بنا کر رکھو۔ اب اور بھی وہ مجھے بُرا بھلا کہنے لگتا ہے۔ بیوی چونکہ مرد کا Ego ہوتی ہے۔اس لیے میاں اوپر سے بے حد خفا ہوتا ہے اور بھیتر سے خوش۔ بیوی کے سلسلے میں اسے کھانا کھا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنے جوتے کھا کر ہوتی ہے۔ ہر بیوی کسی انتقامی جذبے سے چاہتی ہے کہ مرد کو بے بھاؤ کی پڑیں کہ نانی یاد آ جائے اور پھر وہ بے دست و پا ہو کر اس کی شرن میں چلا آئے۔ جب وہ اسے ایسا پیار دے جو ماں ہی اپنے بچے کو دے سکتی ہے، جب وہ پڑوس کے کلوا سے پٹ پٹا کر گھر آتا ہے۔

لیکن آپ کا مہمان تھوڑی ہی دیر میں آپ کا سب مزا کرکرا کر دیتا ہے۔ وہ آپ کو آنکھ مار کر ایک طرف لے جاتا ہے اور بالکونی پر لے جا کر بڑی رازداری سے کہتا ہے۔'' آپ بھی ایک پنٹک ہیں۔ ہوتی میری بیوی،تو ایک چھانپڑ دے کر گھر سے نکال دیتا۔''

مہمان کو گھر سے بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔اس کے کپڑوں میں سیاہی انڈیلنے، روٹی میں ریت ڈالنے، گھر کا مین سوئچ آف کر دینے کے سب طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ خود ایک دم گھبرا جاؤ، جس سے آپ کا مہمان بھی گھبرا جائے گا۔اس کی اتنی خاطر کرو کہ وہ توبہ توبہ بول اٹھے۔ اس کا پاؤں ہی زمین پر نہ پڑنے دو۔اس کے منھ سے 'پ' نام کا حرف نکلے تو دوڑ کر پانی کا گلاس لے آؤ۔ پلنگ پر بیٹھا وہ زمین کی طرف دیکھے تو سلیپروں کی جوڑی اٹھا کر سامنے رکھ دو۔ وہ آپ سے بار بار معافی مانگے گا۔لیکن اس بات کا آپ پر ذرا بھی اثر نہ ہو۔ باتھ روم کا بٹن آپ دباؤ۔ نل بھاگ کر کھولو اور ایسے میں دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لو۔ غلطی سے وہ خود ہاتھ دھونے لگے تو ایک تولیہ لے کر کھڑے رہو۔ ٹٹی کا لوٹا خود ہاتھ میں لے کر سامنے بیٹھ جاؤ اور اس کی منت کرنے پر بھی نہ ٹلو۔لیکن یاد رہے۔ یہ سب نسخے باریک عقل کے مہمانوں پر چلتے ہیں، موٹی عقل کے مہمانوں پر نہیں۔ پچھلے مہمان کو میں نے باریک عقل کا سمجھا تھا۔لیکن وہ موٹی عقل کا نکل آیا۔ میرے یہ سب کرنے کے بعد اس نے منڈی ہلائی اور کہا— '' آپ بڑے دیوتا آدمی ہیں۔''

جب میری سمجھ میں آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟

پھر مہمان کے ساتھ جو اس کی بیوی آتی ہے، وہ عجیب ہی چیز ہوتی ہے۔ نہ جانے آپ کیسے اُسی وقت اندر کے کمرے میں جاتے ہیں، جب وہ کپڑے بدل رہی ہوتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی ہڑ بڑا کر ایک طرف بھاگتی ہے۔ آپ کھڑ کھڑا کر دوسری طرف۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی رہی سہی ساڑی بھی کھل جاتی ہے اور جب آپ دونوں سخت وحشت کے عالم میں الٹی سمتوں میں بھاگتے ہیں تو نہ جانے کیسے پھر برآمدے میں ٹکرا جاتے ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے آپ اپنے ہونٹ پونچھتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں.....

مہمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ایوالانش بھی آتی ہے، جس کا نام بچے ہیں اور جو شکل ہی سے مہمان کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے پیار کرنا چاہیے کیونکہ وہ پرماتما کے راج بھوت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ چھوٹے للی چوچو کی ناک بہہ رہی ہے، جسے وہ ہمیشہ اپنی قمیص کے کف سے پونچھتا ہے۔ بڑا باہر سے کھیلتا ہوا آتا ہے اور اپنے کیچ سے لت پت پانو دِوان پر رکھ دیتا ہے۔ ان کی ماں رسمی طور پر انھیں ڈانٹتی ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں— ''بچے ہیں، بھابی۔ یہ تو ایسے ہی کریں گے، جیسے بچے کرتے ہیں۔ انھیں روکنا بڑی غلطی ہے۔'' یہی نہیں، آپ اپنے علم کے زور پر اسے بتاتے ہیں کہ بچے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ نہ کریں تو ان میں تخریبی جذبے دب جاتے ہیں اور اس وقت نکلتے ہیں، جب وہ بڑے ہو جائیں۔ لیکن یہ بات تو آپ بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے بچے، آپ کی سب باتیں سمجھ رہے ہیں ابھی آپ نے کھانے کے لیے لقمہ منھ میں رکھا کہ اڑ ڑ ڑ ڑ دھڑام کی آواز آتی ہے۔ آپ سب بھاگتے ہوئے بغلی کمرے میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لینن کا بت، جو آپ لینن گراڈ ہی سے لائے تھے، زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور للی چوچو پاس کھڑا کچھ فاتحانہ، کچھ مجرمانہ انداز سے ہنس رہا ہے۔ ہے ہے ہے ہے۔ اب ماں دکھاوے کے لیے تھپڑ مارتی ہے، لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ وہ کس پھولوں کی چھڑی سے اس کی تواضع کر رہی ہے۔ اب آپ ہیں اور آپ کی بیوی جو اسے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا انتا کرن تو کہتا ہے، سالے کو ننگا کر کے، ٹکٹکی لگا کر وہ بید مارو کہ چمڑی ادھڑ جائے۔ لیکن اوپر سے آپ یہی کہتے ہیں۔ ''کیا ہوا بھابی؟ بچے تو توڑیں گے ہی۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا؟...... چھوڑو اب مار ہی ڈالوگی معصوم کو؟'' پھر چھڑانے کی بجائے اسے دھکیلتے

ہوئے آپ کہتے ہیں" روس والے اب مجھے Reactionary سمجھنے لگے ہیں، ورنہ میں ایک بت اور ماسکو سے لے آتا۔"

بجلی مجھ پر اس وقت گرتی ہے جب میرا مہمان اور اس کی بیوی دونوں مل کر بچے سے کہتے ہیں" نمستے کرو، نمستے کرو انکل کو......ارے رِنکُ۔"

اب رِنکُ ماں کی دھوتی پکڑ کر اس کے پیچھے چھپنے لگتا ہے اور مشکوک انداز سے آپ کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی ادا سے کہتا ہے۔" نا ئیں......"

بچے کا باپ اسے پکڑتے، سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے" ارے، نمستے کر سالے، انکل چاکلیٹ دیں گے۔"

جبھی ماں اتراتی ہے" میرا رِنکُ چاکلیٹ بہت پسند کرتا ہے۔"

آپ فوراً کہتے ہیں" چاکلیٹ لے دوں گا بیٹے اور ٹانی بھی۔" حالانکہ انتا کرن کہتا ہے۔ تھوڑا سا پوٹاشیم سائنائیڈ بھی۔ میں پھر شروع ہوتا ہوں۔

" تمھارے لیے غبارہ لاؤں گا، رِنکُ! بہت بڑا غبارہ۔ نمستے...."

" ہی ہی ہی۔ نمشتے!" آخر رنکُ کہتا ہے۔

پھر اس کا باپ شروع ہوتا ہے......" یار رنکُ، انکل کو اے بی سی ڈی سناؤ۔"

رِنکُ انکار میں سر ہلا دیتا ہے، اور پھر ماں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے۔

" ارے سناؤ نا، شرما کیوں رہے ہو؟" ماں اسے پھر سامنے لاتے ہوئے کہتی ہے۔" انکل سائیکل لے کر دیں گے۔"

" ہاں" میں کہتا ہوں" کار لے دوں گا۔"

جب رِنکُ فارم میں آتا ہے اور کہتا ہے" چابی والی کار نا ئیں، انکل! وہ والی" ، اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ وھیل کی شکل بناتا ہے۔

آخر میرے وعدہ کرنے پر وہ شروع ہوتا ہے۔

" اے......بی......شی......ڈی......ای......ہی ہی، مجھے سُو سُو آیا ہے ممی۔"

" ارے!" ممی یوں اظہار کرتی ہے، جیسے کوئی اَن ہونی بات ہوگئی۔

''چل اندر''۔

اور وہ وہیں سے اس کا ازار بند کھولتی ہوئی رِنکو کو باتھ روم کی طرف لے جاتی ہے۔لیکن جاتے میں یہ بھی کہہ جاتی ہے۔''بالکل باپ پر گیا ہے،کام کے وقت سوُسوُ.....''

باپ ہنستا ہے۔میں بھی ہنستا ہوں۔میری بیوی ہنستی ہے۔ساری دنیا ہنستی ہے۔

ہمارا مہمان پھر شروع ہوتا ہے۔''بڑا ذہین ہے اپنا رِنکو!''

''کیوں نہ ہو۔'' میں اتفاق کرتا ہوں۔''ذہین ماں باپ کی اولاد......'' حالانکہ میرا انتا کرن کہتا ہے۔گدھے کا بچہ گدھا ہی ہوگا،گھوڑا کیسے ہو جائے گا؟

جبھی ایک طرف سے کوئن چلی آتی ہے۔انگریزی GENDER کے سب قانون جھٹلاتی ہوتی۔، کیونکہ وہ کوئن ہونے پر بھی رِنکو کی بہن ہے۔وہ اپنے بھائی کی ہر دل عزیزی دیکھتی اور جلتی رہی ہے۔شاید اس لیے کہ وہ کسی پتری پاٹھشالہ میں پڑھتی ہے،سامنے آتے ہی وہ، بنا کسی فرمائش کے،ایک پُرانا، بےسُرا سا گانا شروع کر دیتی ہے۔

''ہیئے دیا مئے،ہم سبھوں کو شدھتائی دیجیے......''

میں بھجن سنتا ہوں،لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنی تائی یاد آ جاتی ہے،جو بہت ہی مُشدھ ہے......میں اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے کوئن کو بیچ ہی میں ٹوک دیتا ہوں اور کہتا ہوں—''واہ،کیا گلا پایا ہے......بڑی ہوگی تو لتا منگیشکر سے کم کیا ہوگی؟''اور میرے انتا کرن سے آواز آتی ہے۔ مینڈک کی اولاد!

لیکن کوئن بدستور گا رہی ہے۔انترہ پہلے اور استھائی بعد میں۔اس سے بھجن اور بھی موثر ہو جاتا ہے۔

''ایسی کرپا اور انوگرہ ہم پہ ہو پرتما۔''

چونکہ وہ بچّی ہے،اس لیے بھلائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتی اور بڑی نمرتا سے پرارتھنا کرتی ہے،جس سے وہ پُرانا اور فرسودہ گانا نیا اور ماڈرن ہو جاتا ہے۔

''دور کر کے ہر بھلائی کو بُرائی دیجیے!''

اتنے میں رِنکو فارغ ہو کر چلا آتا ہے اور کوئن کو گاتے دیکھ کر شروع ہو جاتا ہے''میں بھی

سناؤں گا اردو کا سبق۔''

''ارے سناؤ، سناؤ رِنکنگ ..... یار رِنکنگ تم تو.....'' ہم سب کہنے لگتے ہیں۔

اب رِنکنگ ایک ہی سانس میں سبق سناجاتا ہے۔

''بچھو سے کسی نے پوچھا۔ تو جاڑے میں باہر کیوں نہیں آتا؟

بچھو نے کہا۔ گرمیوں میں میری کون سی خاطر ہوتی ہے جو جاڑے میں بھی باہر آؤں؟''

اور پھر رِنکنگ یکبارگی اُلٹا سانس لیتا ہے۔ ہا!

....

آخر ایک دن ہمیں آنا فانا پتا چلتا ہے کہ ہمارے مہمان جانے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ہمیں اپنے سُبکباش ہونے کی خبر دے دیتے ہیں بلکہ کچھ یوں کہ اس سہانی صبح کو ہمارا مہمان ہمارے پاس آتا ہے، محبت بھرا ہاتھ ہمارے کاندھے پہ رکھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ خود سرکتا ہمیں سرکاتا ہوا، بالکونی کی طرف لے جاتا ہے اور کھسر پھسر کے انداز میں بات شروع کرتا ہے۔ ''بات یہ ہے، میں نے بینک میں ایک چیک ڈالا تھا......''

میں ایکا ایکی سب سمجھ جاتا ہوں اور اسی وقت پوچھتا ہوں۔ ''کے روپے چاہئیں آپ کو؟''

وہ کہنے لگتے ہیں۔ ''میں دلّی پہنچتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔''

اب میں اپنے مہمان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ جو آدمی مجھے پیسا لوٹانے کی بات کرتا ہے، میرا اس کے منھ پہ تمانچا مارنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر وہ تو میرا اندا کرن ہے۔ میں اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں۔ ''ارے یار، تم نے آتے ہی کیوں نہ مانگے ...... کتنے چاہئیں؟''

''زیادہ نہیں۔'' وہ کہتے ہیں۔ ''یہی تین اِک سو روپے۔'' میں فوراً بھاگا ہوا اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی کے پانو پر سر رکھ دیتا ہوں اور اس سے تین سو روپے لاکر مہمان کو دے دیتا ہوں۔ وہ کچھ کھسیائے ہوئے انداز میں مجھے تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اندر سے کتنا خوش ہوں۔ بھلا مہمان، اس کے لاؤ لشکر۔ رِنکنگ، کوئن، پرنس رائل اور اس کے پورے شاہی خاندان سے چھٹکارا پانے کی تین سو روپے بھی کوئی قیمت ہے؟

بیوی یا بیماری

جب سے دنیا بنی ہے، بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصہ میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ ہے!

بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنے شوہر کو بتاتی ہیں، ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی امید اور خوشی میں ڈھول ڈھاکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سسرال کی چوکھٹ پر پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نو آموز (شوہر) دولھا، دلھن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے، جو اس کے پھوہڑ پنے پہ خوب ہنستی ہیں۔ چونکہ اسے کسی دوسرے کا منھ تو ملتا نہیں، اس لیے اپنا سا منھ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو پکا کرنے کے لیے بیوی تندرستی کے دن، یعنی کنوار پنے اور میکے کو یاد کر کے رونے لگتی ہے، جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ کبھی دولھا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبّی نقطۂ نظر سے—clinically بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے، جو بیوی سے کچھ سوال کرتے

ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری، ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لا کر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہے۔ بُرے بُرے منہ بناتی ہے، میاں پیار کا دھوکا دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں۔ وہ فو فو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے، آدھی باہر گرتی ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد جنابہ بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے "اے! تمھارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں۔" اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا، یا ہرے رنگ کا جھوٹ سمجھیں، ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں، یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں کسی دوسرے کی نہ سنیں، تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں۔ وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہوتا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل، بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام ہے۔ اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں، تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں "مرد ہے!" اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے، تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی، لیکن اندر سے کہیں گی "زنخا ہے موا۔"

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے، ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو اُکسانے کے لیے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہوگی تو روز سویرے اٹھ کر شکایت کرے گی۔ "آج میرا سر کچھ بھاری بھاری ہے۔" پھر وہ ناک سکیڑے گی۔ ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لے گی اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں۔ آپ بہت بڑی محبت، جو لفظ اردو میں لکھتے وقت مُحبت معلوم ہونے لگتا ہے، کے ساتھ کہیں گے۔ "او ہو، ایسپرین ہے گھر میں؟" چنانچہ ایسپرین ہوگی۔ کوڈاپائرین بھی ہوگی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔ آپ سوچنے لگیں

گے۔ ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصّہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مصر ہوتی ہے۔ یاد رہے، یہ عورت کے بدن کا وہ حصّہ ہے، جس پر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور تعلّی کے مضمون میں، اسے نازک پتلا ہونا تو کیا، نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کمرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے، مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصور کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصّے سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے۔ مگر کمر سے نہیں، کیونکہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہر حال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوانٹی فلاجسٹین اثر نہیں کرتا اور نہ درد شقیقہ وعصابہ (Nervolgia) دُور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں ـــ ''بنّو! آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو۔'' پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر درد کے لیے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی۔

میں جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پر ہنسنا اچھی بات نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جیوتشی ہے۔ رمال ہے یا کوئی ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی بیماری کے ایام میں میاں جنت اور دوزخ کے بیچ عالمِ برزخ میں کہیں اُلٹا لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہیں۔ دل کو کریدو تو ایک ہنسی ہے جو اس کان سے اس کان تک پھیلتی جا رہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ، نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ ہے کہ مسکت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے ''ہائے میں مرگئی۔'' لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے، اگر اس نے کہا ''میں مر گیا۔'' تو وہ سچ مچ مر جائے گا! جلدی یا آسانی سے مر جانے کی سزا قدرت

نے مرد کو شاید اسی لیے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پُر پیچ جنسی سلسلے کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لیے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہو جاتی ہیں، کیونکہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر۔ وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یونہی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں چاہتیں۔ اسی لیے وہ مرد کے رنڈوا ہو جانے کو، اپنے بیوہ ہو جانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی، بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے حد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا ''اب کے مہینے رہ گئے؟'' تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیے۔ گویا عورتوں کی زبان میں ابجد کا کوئی دخل نہیں، جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی، تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خطِ تصویر (Hieroglyphics) سے ملتی جلتی ہے، جسے مصر کے لوگ کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔ جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور نا قابل علاج ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامتِ اعمال عیادت کے لیے چلے بھی جائیں، تو آپ صاحبِ خانہ سے پوچھتے ہیں — ''کیسی طبیعت ہے۔ گھر میں؟''

''اب تو اچھی ہے، بھگوان کی دیا سے۔''

''کیا تکلیف تھی؟''

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی، آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں، جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کے چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے۔ البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے ــ ''زنانہ تکلیف   '' مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجیے۔ آپ کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری، شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اُٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے، مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے، مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو ''بکواس بند کر'' کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں، جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہوگی جو مہینے میں چند روز بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں۔ دنیا جہان کی، جملہ بیوی جات کا قصہ ہے۔ ان ایام میں وہ کچھ یوں لیتی ہوں گی، جیسے انھیں ہیضہ ہو گیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آرہی ہیں۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں۔ گری گدھے پر سے ہیں اور غصہ کمھار پر اتار رہی ہیں، جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے۔ اگر کسی مہینے میں چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹی کھٹی ڈکاریں آئیں گی۔ سر چکرائے گا۔ اُبکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف اس بیماری پر غصہ آئے گا، دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا، مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہوگا اور تلافیٔ مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں، قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا، جنھیں

لے کر بیوی خوش تو ہو گی مگر بیاری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لیے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی، جو لکڑی کا نہیں، نسیان کا بنا ہوتا ہے۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمایش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ، گول گپّے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹی کھائے گی۔ مرد کو جب بری بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے۔ لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی۔ اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیاری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیاری میں پھر میاں کے لیے تھوڑی سی تسکین کی گنجایش ہے لیکن دوسری میں یکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پر اُلٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا، یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے، دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ منہگائی کا زمانہ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے۔ نہ اُٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے، اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں — میاں کے لیے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں؟ بیوی جو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے۔ "IT'S A BOY" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے۔ "Congratulations"۔ اس سے پہلے کہ میاں، بیوی کی حالت پوچھ سکے، نرس جا چکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا سارا اندر، ابل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے؟ ہنسے یا

روئے؟ وہ ہنس اس لیے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لیے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہو گیا، جو بڑا ہو کر ضرور محبت میں مبتلا ہوگا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ چنانچہ اس وقت میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پر کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو۔ ''اس دکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے؟'' لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے، اس لیے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے، جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساڑی نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبیہ جس میں کلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبت اور تاسف کے آنسو لیے ایک اُلٹی رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پر باندھ دیتا ہے اور ساڑی اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

''بنو یہ رشوت ہے، مول نہیں۔''

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے، جو ارگٹ اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے سے، جسے بیوی کہتے ہیں، محبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے، جس میں ایک بیوی اپنے نکمے، نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات اُلٹ جاتی ہے۔ بجنسہ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرِ شام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں کے ساتھ ہوا تھا:

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

مُحرکِ غمزہ زن

1936 کی بات ہے، منشی پریم چند کی وفات کے سلسلے میں لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں تعزیتی جلسہ ہوا۔

میری ادبی زندگی کی شروعات تھی۔ مشکل سے دس بارہ افسانے لکھے ہوں گے جو کہ معمول کی دِقتوں کے بعد آہستہ آہستہ ادبی رسالوں میں جگہ پانے لگے۔ ہم نئے لکھنے والوں کی کھیپ منشی جی سے اثر پذیر تھی، اس لیے ہم سب کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا مجازی باپ چلا گیا۔ چنانچہ اپنا غم دوسروں کو دکھانے، دوسروں کے غم کو اپنا بنانے کے لیے بھی جلسے میں پہنچ گیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ جائز اور حقیقی وارثوں سے ملیں گے جن سے غائبانہ تعارف تو تھا لیکن سامنے کی ملاقات نہ تھی۔

جلسہ شروع ہوا۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اچھا لکھنے والے اچھی تقریر کر پائیں۔ کچھ لوگوں نے بہت ہی اچھی تقریریں کیں اور میں سمجھ گیا۔ اس جلسے میں ایسے بھی تھے جنھوں نے چھاتی پیٹ پیٹ کے محرّم کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ یہ سب ''پرچے بیچنے'' والے تھے، جنھیں یوں الفاظ کے خاک و خون میں غلطاں دیکھ کر مجھے شر بنا چٹر جی کے کردار دیوداس کی یاد آ گئی، جو اپنے باپ کی موت پر گھر کے ایک کونے سے لگا رسمی آہ و بکا کرنے والوں کو اپنے دنیادار بھائی کی طرف یہ کہہ کر بھیج دیتا ہے— ''اُدھر!''

جلسے میں کچھ لوگ اِدھر والے بھی تھے۔ ان میں سے ایک اُٹھا۔ سانولے رنگ کا دیوار کے ساتھ گڈی لگی، سلیٹ کا سا ماتھا، نشار کانتی گھوش کے سے بال، آنکھوں پر ہیرلڈ لائیڈ کا سا چشمہ،

دھوتی کرتے میں اوپر مسجد، نیچے ٹھاکردوار۔ تھکا تھکا۔ مضمحل۔ مرنے سے برسوں پہلے مرا ہوا۔

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں!'' اُس نے اپنی ڈُڈّی انگلیوں کو انگوٹھے کے ساتھ لگاتے ہوئے، ہاتھ صاحبِ صدر کی طرف بڑھاتے ہوئے، کہا۔

صاحبِ صدر نے اجازت دی بھی نہ تھی کہ اُس نے میز پر پہنچ کر ایک کرخت آواز، ایک بھونڈے لہجے میں [بولنا] شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پنجابی ہتھوڑے سے ہندی اور اردو کے کوبڑ نکال رہا ہے۔ ابھی لندن کے لیے روانہ ہوا، کلکتہ پہنچ گیا۔ پھر لوگوں نے دیکھا، یہ تو کوئمبتور میں گھوم رہا ہے، پھر دلّی میں ہے، جبھی کسی خیالی جیٹ میں بیٹھ کر منزل پر پہنچ گیا۔ تقریر کیا تھی، ایک ایسے آدمی کی چال تھی جو غم کے مارے زیادہ پی گیا ہو۔ لیکن اُسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ ''نالہ پابندِ نے نہیں ہے'' کے سے انداز میں بولا چلا جا رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ میز کے ایک طرف کھڑا وہ کل عالم کا باپ ہے اور اردگرد کے سب لوگ اس کے بچے بالے ہیں، جو کھیل رہے ہیں اور انھیں کھیلنے دینا چاہیے

ان سب باتوں کے باوجود اس کی تقریر میں ایک اثر تھا، کیوں کہ وہ اُس دل سے آئی تھی جو صرف ونحو کے قواعد سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس میں ایک درد تھا اور ایک کلبلاہٹ تھی جو صرف طبّاعوں کے حصّے میں آتی ہے، اور جس کا غیر منطقی منطق ''پرچہ بیچنے'' والوں کو حیران کیا کرتا ہے۔ وہ اُن خطوط کا حوالہ دے رہا تھا جو منشی جی نے اپنی حیات میں لکھے تھے اور جس میں رہنمائی اور عقدہ کشائی کی بہ نسبت اپنے ہم مشرب سے جذباتی یگانت [یگانت] کا اظہار زیادہ تھا اور جو خط، اس ماتمی لمحے میں محض خط سے بڑھ کر اب ایک خزانہ ہو چکے تھے۔

یہ اشک تھا۔ اس سے پہلے میری اشک سے ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ میں نے اس کو سدرشن کے رسالے ''چندن'' میں پڑھا ضرور تھا، لیکن دیکھا نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کی کوئی تصویر بھی میری نظر سے نہ گذری تھی۔ جو لوگ اشک کو جانتے ہیں، کہیں گے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اشک تو تصنیف وتالیف کے ساتھ تشہیر کا بھی قائل ہے اور اس لکھنے والے کو بیوقوف اور جاہل سمجھتا ہے جو صرف لکھنا ہی جانتا ہے۔ بعد میں میں نے بھی دیکھا کہ اشک نہایت بے تکلّفی سے اپنی کوئی اُلٹی سیدھی تصویر ایڈیٹر یا کسی ناشر کے گلے منڈھ دیتا ہے جو اس غریب کو چھاپنی ہی پڑتی ہے، اور کیا

تصویر ہوتی ہے!— سامنا ایک چوتھائی، تین چوتھائی پروفائل جس میں زلفیں کاندھوں پر بکھری ہوئی ہیں، یا اگر شیو بنی ہے تو سر کے بالوں کو بڑی صفائی سے کنڈلوں میں ڈال رکھا ہے۔ کچھ دیر دیکھنے پر یقین ہو جاتا ہے— مرد ہے— ابھی ننگا ہے۔ ابھی ڈھانپے ہوئے۔ ....ایک منٹ ایک پرچہ، ایک کتاب! پہلے سر پر گاندھی ٹوپی تھی تو اب فلٹ ہیٹ ہے جو سر پر عمداً ٹیڑھی رکھی ہے اور بانکا لگ رہا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ خود بھی مسکرا رہا ہے...... یا سر پر قرہ قلی ہے اور آنکھیں ادھ کھلی۔ ترک غمزہ زن معلوم ہو رہا ہے، جو اس کے ہزاروں پڑھنے دیکھنے والوں کو کھل رہا ہے۔ اس پر بھی جو دل میں گھر کیے ہوئے ہے۔ حافظ کے الفاظ میں دل کے نہاں خانے میں آرام کر رہا ہے اور خلقت کو گمان ہے کہ وہ محفل میں بیٹھا ہے...... میں جو ڈاڑھی کو کسی دشمن کے چہرے پر دیکھنا چاہتا ہوں اور اس ڈر کے مارے آئینہ نہیں دیکھتا، اشک کے چہرے پر فرانسیسی طرز کی بکروٹی دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد اشک کی شکل کسی تصویر میں کیا ہوگی، یہ کسی کو نہیں معلوم، خود اشک کو بھی نہیں معلوم، کیونکہ تلوار کی دھار کے سے من، چانکیہ کی سی بدھی اور دور پہنچنے والی نگاہوں کے باوجود، اشک اس لمحے کا پورا احترام کرتا ہے جس میں وہ اس وقت جی رہا ہو۔ وہ صرف حواس سے ہی زندگی کا لطف نہیں لے رہا، اس میں شعور بھی پورے طریقے سے شامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے حال اور قیل وقال کے سلسلے میں اگر کرشنا مورتی کو کسی نے غلط پڑھا ہے تو اشک نے۔ ہوسکتا ہے اگلی تصویر میں وہ جوگیا بانا پہنے ہوئے ہو۔ اور ایک ہاتھ سے دیکھنے والے کی طرف ''چھو'' بھی کر رہا ہو۔ یہیں پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ تصویر ایسے ناول کا بھی حصہ ہو سکتی ہے، جو سرتاسر پھول کی پتی ہو اور جس سے ہیرے کا جگر بھی کٹ سکے۔

شاید کوئی ازلی دوستی تھی یا ابدی رشتہ قائم ہونے والا تھا کہ اشک سے متعارف ہوئے بغیر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اشک کے بغیر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُس دور کے سب لکھنے والوں میں سے جو آدمی منشی جی کے قریب تھا اور اُن سے ہم رنگ تھا، وہ اشک تھا۔ منشی جی نے اپنی زندگی میں دوسروں کو بھی خطوط لکھے ہوں گے، لیکن جن خطوط کا اشک حوالہ دے رہا تھا، اُن کا مضمون ہم مشربی کی طرف اشارہ کرتا تھا...... جلسہ برخواست ہوا۔ میں ان دنوں پوسٹ آفس میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا، اس لیے پبلک کی شکایتوں سے بہت ڈرتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے

میں اشک کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک ایڈیٹر صاحب کے ساتھ بحث میں الجھا ہوا تھا۔ بحث کے خاطر بحث کرنا اشک کا آج تک شیوہ ہے۔ یہ بات نہیں کہ جو وہ کہنا چاہتا ہے اس میں وزن یا دلیل نہیں ہوتی۔ سب کچھ ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ لیکن اشک تو اس میں سے ایک خاص قسم کا مچھندری مزا لیتا ہے اور اس سلسلے میں بحث وتمحیص کے سب حربے استعمال کرتا ہے۔ ایک آدمی ابھی ابھی مدلل گفتگو کر رہا ہے لیکن اشک اس سے یہ کہہ کر کہ ہم شاید دو مختلف چیزوں کی بات کر رہے ہیں، اسے ایسی سوچ، ایسی گھبراہٹ میں ڈال دیتا ہے کہ گفتگو کرنے والے کی ریل صاف پٹری سے اتر جاتی ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ ایک بار ریل پٹری سے اتر جائے تو کیا ہوتا ہے۔ مخالف تلملاتا ہوا رہ جاتا ہے۔ اگر وہ ہوشیار رہا اور خلطِ مبحث ہونے دے تو [اشک] آپ کو ٹھہا کا مار کر ہنستا ہوا اور کہتا ہوا ملے گا "تم تو یار سنجیدہ ہو گئے!" ابھی وہ پورے طریقے سے سمجھ بھی نہ سکا کہ اشک اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہہ رہا ہے "دراصل جو بات تم کہہ رہے ہو، وہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے...." اس کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ دوسرا آنکھیں جھپکتا رہ جائے اور اپنے آپ کو بیوقوف سمجھنے لگے یا پھر خفا ہو جائے کہ مجھ سے خواہ مخواہ زبان کی ورزش کرائی گئی۔ نتیجہ ہر دو صورت میں وہی ہوتا ہے۔ کوئی خفا ہو تو میدان اشک کے ہاتھ میں اور خوش ہو تو اشک کے ہاتھ میں۔ چت بھی اشک کی اور پٹ بھی اشک کی..... جب میں دھیرے دھیرے سرکتا ہوا اشک کے پاس پہنچا تو بحث کرنے والے ایڈیٹر کا بگل بج چکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"اشک صاحب!"

ایک دم گھوم کر اشک نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑ دیں اور میرے آر پار دیکھنے لگا۔ آپ اندازہ کیجیے، اگر میرے کمرے میں عام روشنی کی بجائے رونجن شعاعیں (X.RAYS) ہوں تو بڑے سے بڑا رومانی منظر بھی کیا ہوگا۔ یہی نا کہ کھوپڑی سے کھوپڑی ٹکرا رہی ہے۔ ایک ڈھانچے کا بازو اٹھا اور دوسرے ڈھانچے کے گلے میں پیوست ہو گیا اور معلوم ہوا کہ صنفِ مخالف کو ہم آغوشی کے لیے نہیں، گلا گھونٹنے کے لیے اپنی طرف کھینچا جا رہا ہے اور پھر گلا بھی کہاں؟...... میں نے کہا۔ "بڑی مدت سے میری تمنا تھی کہ اشک صاحب......"

''آپ — ؟'' اور پھر اگلے ہی لمحے وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم کہیں راجندر سنگھ بیدی تو نہیں؟''

ایکا ایکی جیسے میں اپنا نام بھول گیا یا کم سے کم یہ ضرور محسوس ہوا کہ راجندر سنگھ بیدی کوئی دوسری شخصیت ہے، جسے میں نہیں جانتا ہوں۔ جبھی اپنے آپ میں آتے ہوئے میں نے کہا'' ہاں اشک صاحب، میرا ہی نام راجندر سنگھ بیدی ہے۔''

انسان کی انا کہاں تک پہنچتی ہے۔ دراصل یہ دنیا کتنا بڑا جنگل ہے۔ کتنا بڑا صحرا، جس میں وہ کھویا کھویا پھرتا ہے اور ہر دم یہی چاہتا ہے کہ کوئی بھی اسے پہچانے، کوئی بھی اس کا نام پکارے اور جب ایسا ہو جائے تو اسے کتنی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ایک بچہ تو دھیرے دھیرے اپنا نام سیکھتا ہے، اپنی ذات کو دوسروں سے الگ کر کے دیکھنے لگتا ہے، لیکن بڑا ہو کر اپنے مجازی نام کو پا لینے کے بعد اپنے حقیقی نام کے لیے کتنی دوڑ دھوپ کرتا ہے اور پہچانے جانے کے بعد وہ اپنے نام کو اسمِ اعظم سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس میں جذب ہو جانے کی تمنا کے باوجود اپنی ایک انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ اگر میں نے اشک کو ملے بغیر اسے پہچان لیا، تو اس نے بھی ایک ہی نظر میں مجھے جان لیا...... میں پھر ایک چھوٹا سا ادیب، اور ایک اتنا بڑا ادیب مجھے میرے نام سے جانتا ہے۔
یہی نہیں اس نے میری ایک دو کہانیوں کا ذکر بھی کر دیا، جو ان دنوں تھوڑے تھوڑے وقتی فرق کے ساتھ لاہور کے رسالوں میں چھپی تھیں...... وہ ان کی تعریف بھی کرتا تھا... کیا یہ سچ ہے؟ اس لق ودق ویرانے میں مجھ بے بضاعت ڈاک خانے کے ایک بابو کے لیے بھی جگہ ہے؟...

جگہ تھی یا نہیں۔ اِس وقت بھی ہے یا نہیں۔ اس سے بحث نہیں۔ اشک جسے پسند کرتا ہے اُسے تسلیم بھی کرتا ہے اور نام ونمود کی اس دنیا میں اس کے لیے جگہ بنانے کی شعوری کوشش بھی۔ یہ بات ہے جو میں نے اشک میں بدرجۂ اتم پائی ہے۔ آج جب میں اپنے پیچھے ادبی زندگی کے تیس سال دیکھتا ہوں تو ندامت سے اپنی گردن جھکا لیتا ہوں۔ میں نے تو کسی نئے لکھنے والے کی مدد نہیں کی۔ میں بھی اشک کی طرح ان کی تعریف کر سکتا تھا، تنقید کر سکتا تھا اور ان کے لیے راستہ آسان کر سکتا تھا۔ لیکن میں میں ہوں اور اشک اشک۔ آج بھی، جب میں اشک سے ملتا ہوں تو اسے کسی نئے لکھنے والے کا نام لیتا ہوا پاتا ہوں۔ مجھے اچنبھا ہوتا ہے۔ وہ محبت جو انسان چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ کرتا رہتا ہے، نفرت سے بدل جاتی ہے اور چونکہ آدمی ہر حالت میں اپنے آپ

سے پیار کرنا چاہتا ہے، اس لیے اشک سے آدمی چڑ جاتا ہے۔ میری اس کمزوری کی وجہ کیا ہے؟ شاید میرے لیے اسے سمجھانا مشکل ہے اور کسی کے لیے سمجھنا مشکل۔ آسانی کے لیے صرف اتنا کہوں گا..... مجھے شروع ہی سے ایک احساسِ کمتری ہے۔ باوجود کوشش کے، دوسروں کی تحسین و تسلیم کے، میں اسے نہیں جھٹک سکا..... جیسے مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں؟ کیوں یقین نہیں؟ اسے جاننے کے لیے کسی کو میری زندگی جینا پڑے گی اور اشک کو کیوں یقین ہے، اس کے لیے اشک کی زندگی جینا پڑے گی۔

اگلے ہی لمحے ہم دو دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے، جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں.....شاید گرمیوں کا موسم تھا اور ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ نیچے کی دھول اور گرد تھی، جو کچے علاقوں سے بے شمار گھوڑوں کی ٹاپ سے یا بے لگام ہوا کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی اور ریزہ ریزہ نیچے آ رہی تھی۔ ہم پیدل چل رہے تھے۔ اشک باتیں کر رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ وہ بہت باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسا کیوں؟ اس کی وجہ مجھے بعد میں پتا چلی۔ اس وقت ہماری باتیں ایک نئے شادی شدہ جوڑے کی سی باتیں تھی، جو رات بھر ایک دوسرے کو کچھ کہتے سنتے رہتے ہیں اور دوسرے روز اپنی ہی باتوں کا ''تات پریہ'' (مطلب) نہ پا کر حیران ہوتے ہیں۔ پیدل چلتے باتیں کرتے ہوئے ہم انارکلی کے قریب پہنچ گئے، جہاں اشک نے مجھے اپنا گھر دکھایا۔

اشک کا گھر انارکلی بازار سے ہٹ کر پیچھے ایک گنجان آباد گلی میں تھا، جس میں اکثر عورتیں اپنے مکان سے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتی سنائی دیتی تھیں۔ ''بھابو، آج تیرے یہاں کیا پکا ہے؟'' اور وہ جواب میں کہتی'' آج کچھ نہیں پکا۔ یہ باہر کھانا کھا رہے ہیں نا۔ تو دال ایک کٹورے میں بھیج دینا.....'' اور کہیں آپ بے خبر جا رہے ہوں تو اوپر سے کوڑا گرتا ہے اور آپ کی طبیعت تک صاف کر دیتا ہے۔ گلی میں اتنی جگہ نہیں کہ کوئی اچھل کر ایک طرف ہو جائے۔ کوئی لڑکا کوٹھے میں کھڑا سامنے کی کھڑکی میں جھکی ہوئی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلیاں کھجلا دیتا ہے، جو لاہور کا عام منظر ہے اور جس سے پتا چلتا ہے کہ عشق کے لیے لاہور شہر سے بہتر دنیا میں کوئی جگہ نہیں......اور اسی گلی میں اشک رہتا ہے۔ اگرچہ اشک اور عشق کی ہجوں میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ بات گھوم پھر کر دہیں پہنچتی ہے۔ کیا خبر کب عشق، اشک میں بدل جائے یا اس کا

الٹا ہو جائے ...... اشک کا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کی اوپر کی منزل پر اشک کے دندان ساز بھائی ڈاکٹر شرما بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے اشک اور اس کا کتب خانہ۔ کام کرنے کی جگہ ...... جہاں پہنچنے کے لیے دُبلے کی جنت اور موٹے کی دوزخ قسم کی سیڑھیوں پر سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ ایک رسہ تھا جو لوگوں کے ہاتھ لگ لگ کر میلا ہو چکا تھا اور جسے پکڑ کر نہ چلنے پر لڑھک جانے کا ڈر تھا۔ اس تنگ و تاریک مکان میں اشک رہتا تھا۔ یہیں وہ آرٹسٹ کے وِشی واشی (Wishy Washy) انداز میں لکھتا۔ کاٹتا۔ پھر لکھتا۔ پہلے نقش کو مٹا کر دوسرے نقش کو بنانے لگتا ۔لکھنا اس کے لیے عادت تھی اور عبادت بھی، جو زندگی کے پرے تھی، تو موت کے بھی پرے۔

اشک چھوٹی عمر میں اپنی روزی کمانے لگا۔ اس کے والد اسٹیشن ماسٹر تھے جنھیں شراب پینے اور گھر سے بے پروا ہونے کی عادت تھی۔ وہ گھر کی طرف رجوع بھی کرتے تو کسی تادیبی کارروائی کے لیے۔ بیوی سے لڑ رہے ہیں، اس پر گرج رہے ہیں یا کسی بچے کو الٹا لٹکا کر اسے بید سے مارا جا رہا ہے۔ ان کی شکل جابر تھی اور عقل بھی جابر، جو فیصلہ ہو گیا اٹل ہے۔ اس زبردست شخصیت والے مرد کے ساتھ ایک گائے صفت عورت کی شادی ہوئی، جو اشک کی ماں تھی۔ اپنے مرد کے ظلم نے، جس کے چہرے پر ایک مظلومیت دوام کر دی تھی۔ اشک کی تحریروں میں گھریلو نزع کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ کے متضاد کردار بھی آتے ہیں۔ یہ اس زبردست شخصیت والے باپ ہی کی وجہ سے تھا کہ اشک نے زندگی میں اپنی جگہ پانے کے لیے باپ کی عاطفت کا سایہ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے چیلنج دیا۔ باپ نے قبول کیا اور دونوں جیت گئے۔ کیونکہ زندگی کی منقلب ہواؤں اور جھکّڑوں سے ٹکّر لینے والا، خود دق کے عارضے میں مبتلا ہو کر موت کا منہ چڑاتا ہوا بچ کر نکل آنے والا، ناداری اور ترس پہ دوستوں اور عزیزوں کی بے رخی کے باوجود، معاصرانہ تعصب سے بچے ہوئے شہر الٰہ آباد میں نشر و اشاعت کا کاروبار مستحکم کرنے والا، ایسے ہی باپ کا بیٹا ہو سکتا تھا۔

اشک کے ماں باپ، چھے بیٹے اس دنیا میں لائے اور سب کے سب نر۔ جالندھر [کے] مردم خیز خطّے میں جنھوں نے پرورش پائی۔ جہاں کا ہر آدمی شاعر ہے یعنی مغنّی۔ جہاں سال کے سال ہر بلّب کا میلا ہوتا ہے اور پورے ہندوستان سے پکّا راگ گانے والے چلے آتے ہیں اور گاتے ہوئے ڈرتے ہیں، کیونکہ اس شہر کا بچہ بچہ "پدپابان" ہے جو سیدھا کلیجے میں لگتا ہے۔ جانتا

ہے کہاں کوئی سُر غلط لگ گیا۔ پھر وہ لحاظ تھوڑا ہی کرے گا۔ جہاں کہیں بھی کونے میں بیٹھا ہے، وہیں سے پکار اٹھے گا اور برسوں اپنے یا اپنے استاد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے اور سنگیت سیکھنے کی دعوت دے گا۔ سردیوں کی رات کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ بیت بازی کرے گا، جو صبح تک چلے گی..... اس شہر کا ہر بشر اپنے آپ کو طبّاع سمجھتا ہے اور اس کی طبّاعی کو تسلیم نہ کیا جائے تو ایک ہاتھ ہے، جو سیدھا نہ ماننے والے کی پگڑی کی طرف آتا ہے، پھر گالیوں اور مار پیٹ تک نوبت آسکتی ہے۔
یہ چھتّوں بھائی اس شہر کی پیداوار تھے اور یہ حیرت کی بات نہیں کہ ان میں سے ہر ایک، ایک مسلّمہ فرد تھا۔ ایسے شخص کے حال جس سے وہی انکار کرے، جس کی شامت آئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے گھونسا بھی دلیل کا ایک حصّہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ گھونسا نہ تان سکے تو یوں ہی شور مچا رہا ہے۔ مکان سے ''مر گیا'' اور ''مار دیا'' کی آوازیں آرہی ہیں اور لوگ اس کان سے سن کر اس کان سے نکال دیتے ہیں۔ ایک دن کی بات ہو تو کوئی کچھ کرے بھی، ہر روز اس مکان سے کوئی نہ کوئی گرج سنائی دیتی ہے۔ چھتّوں کے چھتّوں شیر۔ کوئی بڑا اپنے وزن سے دوسروں کو دبا لے، پیٹ ڈالے، لیکن چھوٹا بھی گرجنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کچھ نہیں تو زخمی ہو کر چلّا رہا ہے، شور مچا رہا ہے۔ شور کے بنا کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ چاروں طرف ایک ہڑ بونگ سی مچی ہے۔ دو اِدھر آرہے ہیں۔ تین اُدھر جا رہے ہیں۔ کچھار سے نکل رہے ہیں کچھار میں داخل ہو رہے ہیں۔ خون بہہ رہا ہے، مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ اس لیے مارا جا رہا ہے کہ مار کیوں کھائی ہے اور سب کی گرج اور ایک پاٹ دار آواز ایک اور بڑی گرج میں دب جاتی ہے ''چپ!'' — یہ پتاجی کی آواز ہے۔ ایک شیر ببر کی گرج، جسے سُن کر پورے جنگل میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس گیر کے بیلے (Gir Forest) میں کوئی لومڑی نہیں ہے۔ گائے ماں کانپتی رہ جاتی ہے، جب کہ پتاجی بوتل کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، برائی کرتے ہیں لیکن براہمن ہونے کے ناطے بھول بخشوانا بھی جانتے ہیں۔ گا رہے ہیں— ''شاماجی اوگن چت نہ دھرو۔''

اشک کے پتا کو اپنے براہمن ہونے پر ناز تھا۔ وہ اُس پرش رام کی اولاد تھے جس نے ہاتھ میں کلہاڑے لے کر اکیس بار کشتریوں کا ناش کیا تھا۔ کشتری، لڑنا اور مارنا جن کا پیشہ تھا اور جو کسی کے سامنے نہ دب سکے، آج بھی پرش رام کی اس اولاد سے دبتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اشک کے پتا کا

شراب پینے کا عمل، ایک دو بچوں کے بعد اور تیز ہو گیا۔ اچھے بھلے سریندر ناتھ، رویندر ناتھ کے نام رکھتے ہوئے سیدھے پرشورام تک پہنچ گئے۔ جو اِن چھے بھائیوں میں تیسرا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جالندھر کے اُس محلّے میں رہتے تھے جہاں کشتریوں کی برہمنوں کے ساتھ ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ برسوں پہلے کھشتریوں نے مل کر سرِ بازار اشک کے پاگل بابا کو پیٹا تھا۔ جب کے ان ہاں کی عورتیں، جن میں اشک کی ماں بھی تھی، سانس روکے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ جبھی سے ایک عزم تھا جو اشک کی بظاہر مرنجاں مرنج ماں کے دل میں بیدار ہو گیا تھا اور یہ اس عزم کی وجہ ہی تھی جس کارن نئے پیدا ہونے والے بچے کا نام پرشورام رکھا گیا۔ بچپن ہی سے اس بچے سے کہا گیا ارے! تو پرشورام ہو کر روتا ہے۔ جس نے کشتریوں کے کُل کا ناش کر دیا اور آنکھ تک نہ جھپکی، اور وہ بچہ روتے روتے خاموش ہو جاتا اور سوچنے لگتا، وہ بڑا ہو کر کھشتریوں کی بیخ کنی کرے گا۔ اگلے بیٹے کا نام اشک کے ماں باپ نے اندرجیت رکھا۔ براہمن راون کا سپوت، دیوتاؤں پہ حکم چلانے، ان کو جیتنے والا، کھشتری لکشمن کو برچھا مار کر اسے مورچھاگت کرنے والا اشک کے ماں باپ کا بس چلتا تو پوری رامائن نئے سرے سے لکھتے، جس میں ثابت ہوتا کہ راون ہیرو تھا اور رام چندر ایک ویلین!

اشک کے والدین کے یہاں آٹھ اولادیں ہوئیں، ان میں سات لڑکے تھے اور ایک بیٹی، جو پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اشک کی ماں کے بارے میں جوتشیوں نے کہا تھا کہ وہ ''سات پوتی'' ہے۔ اوّل تو اس کے بیٹی ہو ہی نہیں سکتی، اگر ہو گئی بھی تو زندہ نہ رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لڑکے ہی لڑکے چلے آئے اور ایسی تعلیم کے سہارے ایک سے ایک دبنگ۔ ایک سے ایک لڑاکا۔ دنیا کی تاریخ میں پٹھانوں کی بدلہ کشی مشہور ہے کیونکہ وہ اپنی مخاصمتوں کو اولادوں تک منتقل کر دیتے ہیں۔ لیکن اشک کے والدین ان سے کم نہ تھے۔ آخر ایک روز آیا جب کہ ان بھائیوں نے مل کر پورے محلّے کو پیٹ پیٹ کر اسپتال میں بھجوا دیا۔ اکیلے پرشورام نے مار مار کر سب کے پرانچے اڑا دیے۔ اگرچہ وہ خود بھی زخمی ہوا اور قانونی شکنجے میں پھنس گیا، لیکن سب کو خوشی اس بات کی تھی کہ پاگل بابا کی روح کہیں آسمانوں میں دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی!

سو یہ سب تھے اشک کے ڈرامے ''چھٹا بیٹا'' کے کردار۔ اشک ان بھائیوں میں سے دوسرا

تھا۔ پھر تو گھر میں بھابیاں آنا شروع ہوئیں۔ شیروں کے پاس بکریاں بندھنے لگیں۔ اب آپ ہی بتائیے وہ کیا کھاتیں کیا پیتیں؟ اس آپسی مار دھاڑ، گھر کے ہنگامے میں وہ کھا پی بھی لیتیں تو کیا بدن کو لگتا؟ انار کلی والے مکان سے پہلے اشک اور ان کے بڑے بھائی چنگڑ محلے کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتے تھے، جس میں تازی ہوا کے بجائے، وہ ایک دوسروں کی سانسوں میں جیتے۔ اس حیرت آباد میں عورتیں نے بہت کیا تو رو لیا، نہیں تو۔۔۔

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اشک کی بیوی شیلا جب بیاہی آئی تو گندمی رنگ کی ایک گول مٹول لڑکی تھی، جو بات بات پر ہنستی رہتی تھی۔ اس گھر کے ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا، لیکن وہ اپنی پہلی فرصت میں کھلکھلا اٹھتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات بھی اس کی ہنسی کو نہ (نہیں) دبا سکتی۔ میں شیلا سے ملا تو نہیں، البتہ اشک کے لاہور والے کمرے اور بعد میں الٰہ آباد میں اشک کے گھر، اس کے بڑے بیٹے اُمیش کی خواب گاہ میں شیلا کی تصویر ضرور دیکھی ہے، جس میں وہ ہنس رہی ہے۔ موت بھی اس ہنسی کو نہ دبا سکی جس زمانے میں یہ لوگ چنگڑ محلے کے کمرے میں رہتے تھے تو شیلا بیمار ہو گئی اور ڈاکٹروں نے تپ دِق کی تشخیص کر دی۔

اشک ان دنوں بہت مشغول تھا۔ وہ اپنی تحریروں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا تھا۔ انھیں بازار لے جا رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ بکتی ہیں کہ نہیں۔ کچھ بک سکیں اور کچھ نہیں۔ کچھ پیسے وصول ہوئے، بیشتر مارے گئے، لیکن اپنی تحریروں کے بل بوتے اُسے روزانہ اخبار ویر بھارت اور پھر بندے ماترم کی سب ایڈیٹری مل گئی۔ فرصت کے لمحوں میں وہ Ghost Writing کیا کرتا۔ اس کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں بکے، لیکن چند ٹکلیوں کے سوا اشک کے ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر گھر میں ایک اور واقعہ ہو گیا۔ شیلا کی ماں کو اپنی بیوگی نبھانے کے سلسلے میں لاہور کے کسی امیر کے ہاں گھر کے چوکا برتن کے لیے ملازم ہونا پڑا، جس سے شیلا کے جذبات بسمل ہو گئے اور اس کے کارن اشک کو جو ٹھیس پہنچی، اس نے فیصلہ کر لیا کہ سماجی طور پر شیلا کو ایسا مرتبہ اور مقام دے گا جس سے باقی لوگ رشک کریں گے۔ اس نے سِشن جج بننے کی ٹھان لی۔

اب وہ وکالت پڑھتا تھا۔ دن کو ادبی مشاغل، لا کالج کی تعلیم اور رات کو قانون پڑھنا۔

کوٹھے کوٹھے جتنی بڑی کتابوں سے نبرد آزمائی، لیکن جس مٹی سے اشک کا خمیر اٹھایا گیا تھا، جس ہڈی سے اس کی پشت بنی، کسی بھی محنت کے قابل تھی۔ اسی دوران میں شیلا نے اُمیش، اشک کے سب سے بڑے لڑکے کو جنم دیا۔ گھر کے ماحول، خوراک کی کمی سے اس کی بیماری بڑھ گئی۔ اب اشک ایک طرف ادب تخلیق کرتا، دوسری طرف قانون کی کتابیں پڑھتا اور تیسری طرف ہفتے میں دو تین بار سائیکل پر آٹھ میل کی منزل مار کر گلاب دیوی ٹی۔بی۔ اسپتال میں شیلا سے ملنے جاتا۔ اسے دراصل یقین نہیں تھا کہ قدرت استہزا کو اس کمینہ حد تک لے جائے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شیلا اچھی ہو جائے گی۔ اتنی محنت، اتنی ریاضت سے، اِدھر اشک ایک امتیازی شان سے قانون کے امتحان میں پاس ہو گیا، اُدھر شیلا چل بسی۔ قضاوقدر نے ایک ہاتھ سے دیا اور دوسرے ہاتھ سے سبھی کچھ چھین لیا۔ اب زندگی میں کوئی قاعدہ کوئی قانون نہ رہا۔ اشک نے سیشن ججی کے خیال کو بالائے طاق رکھ دیا۔ جس کے لیے وہ جج بننا چاہتا تھا، وہ تو جا چکی تھی...... اس نے رنج، بے حد تکان، بے حد اضمحلال کے عالم میں اپنا قلم اٹھایا اور ادب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ادب ہی تھا جس میں اپنے آپ کو غرق کر دینے سے وہ اپنی زندگی کے عظیم سانحے کو بھول سکتا تھا...... گھر بھر کے نزاع، حالات کی ابتری ہی تھی جسے اشک نے اپنی تحریروں کا مضمون بنایا۔ اس زمانے میں وہ اپنا نیم سوانحی ناول ''گرتی دیواریں'' شروع کر چکا تھا، جو اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں — کونپل، 324، گوکھرو، ڈاچی وغیرہ لکھیں، جن پر اشک کی عظیم اداسی کی چھاپ ہے۔

شاید اشک میری اس بات کی شہادت دے کہ اس نے محبت صرف ایک عورت سے کی ہے اور وہ شیلا ہے، کیونکہ اس زمانے میں شعور رکھنے کے باوجود وہ نہ جانتا تھا [کہ] محبت کیا ہوتی ہے اور نہ شیلا جانتی تھی۔ وہ دونوں جی رہے تھے لیکن اپنے لیے نہیں، ایک دوسرے کے لیے۔ اور یہ محبت تھی جس کی ہر ادا والہانہ تھی، جو نہ کسی صفت کی محتاج تھی اور نہ موصوف کی۔ اس کے بعد بھی اشک نے محبت کی۔ لیکن جنون اس میں سے غائب ہو چکا تھا۔ اس میں ایک پختگی آ چکی تھی جس کے کارن وہ دوسری شادی کے کچھ ہی دنوں کے اندر مایا، اپنی دوسری بیوی، کو چھوڑ سکا اور کوشلیا، اپنی موجودہ بیوی، سے کہہ سکا...... جانِ من! میں زندگی کا سفر کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ مجھ میں

جوانی کی وہ لپک نہیں رہی ہے۔ اگر تم مجھ سے اس کی امید رکھتی ہو تو بیکار ہے۔ میں اس محبت کے قابل نہیں، جو شعلۂ جوالہ ہو، ہاں وہ محبت میں تمھیں دے سکتا ہوں جو دھیمی آنچ ہو سکتی ہے اور اس لیے خوش ذائقہ بھی ہوتی ہے۔

تو یوں مجھے اپنے گھر لا کر اشک نے میرے ساتھ سیکڑوں باتیں کر ڈالیں۔ اپنا کھایا پیا سب میرے سامنے اگل دیا۔ آزمودہ کار آدمی عام طور پر اپنا سب کچھ نہیں کہہ ڈالتے اور یوں، پھر اس آدمی سے، جو ان سے پہلی بار ملا ہو۔ مگر اشک مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا میں مل گیا، نہیں تو وہ دیواروں سے باتیں کرتا۔ سڑک پر گڑے کسی بجلی کے کھمبے کے سامنے اپنی داستان دہرا دیتا... جب تک رات آدمی سے زیادہ جا چکی تھی۔ غبار دب چکا تھا، البتہ آسمان کچھ صاف نہ تھا۔ کہیں کہیں کوئی ستارہ خود نمائی کے عالم میں دھند اور دھوئیں اور دھول کی قبائیں چیرتا پھاڑتا اپنا ٹمٹماتا ہوا حسن دکھانے لگتا۔ اشک کی باتوں میں میں کئی بار ہنسا، کئی بار میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اب میری طبیعت اوبنے لگی تھی۔ کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اس وقت میری بیوی گھر میں انتظار کر رہی ہوگی۔ جب تک مرد کے سیلانی ہونے کا یقین نہ ہو جائے، ہر عورت اپنے میاں کے پیچھے کچھ گھوڑے دوڑا دیتی ہے۔ ان میں کچھ گدھے نکل آتے ہیں، جن میں میرا ایک عزیز تھا جو مجھے ڈھونڈنے کے لیے بھیجا گیا۔ اشک مجھے کچھ دور چھوڑنے کے لیے مکان سے نیچے اترا۔ وہ دور نہ جا سکتا تھا، کیونکہ جب تک اس نے دھوتی کُرتے کو تہبند اور بنیائن سے بدل لیا تھا۔ لیکن پھر باتوں کے نئے شوشے چھوڑتے ہوئے ہم انارکلی کے بازار سے نکل کر بائبل سوسائٹی کے سامنے چلے آئے اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے مال روڈ پر...... میرے گھر کی طرف...... گول باغ، جہاں میرا وہ عزیز، جیسا کہ بعد میں پتا چلا ''چھپلے درد فراق دالیئے'' گاتا ہوا پاس سے گذر گیا اور ہم بے فکری کے عالم میں گول باغ کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے..... آہستہ آہستہ مجھ میں اپنی بیوی کی وجہ سے ایک گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، مگر اشک اپنی کوتا سناتا رہا۔

چل دو گی کُٹیا سونی کر، اِسی گھڑی اِس یام
ٹِک ٹِک تک چلتے رہنے کا مجھے سونپ کر کام

اور میں اس کی داد دے رہا تھا۔ مجھے کِوتا اچھی ضرور لگی لیکن گھر کا خیال بھی ستا رہا تھا۔ اب

میں کمبل کو چھوڑ نا چاہتا تھا لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ آخر میں نے جی کڑا کیا، لیکن جو الفاظ میرے منھ سے نکلے، معافی نامے کی حیثیت سے زیادہ نہ تھے۔ میں اٹھا تو اشک بھی میرے ساتھ اٹھ گیا...... باتیں کرتا ہوا وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

بچے نے دروازہ کھولا اور میں جلدی جلدی اندر گیا۔ بیٹھک کھول کر بتی جلائی اور اشک کو اندر بٹھایا، اتنی گرمی کے باوجود ستونت، میری بیوی، نیچے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ عام کلرک کی بیوی تھی جو دفتر سے چھٹی کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر شوہر کو اپنے گھٹنے کے پاس بیٹھا دیکھنا چاہتی ہے اور اب تو رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور ''بُرے بُرے خیال من میں آ رہے تھے۔''

''کہاں رہے اتنی رات تک؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جہنم میں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ذرا میرے ساتھ بیٹھک میں آؤ۔ ایک بہت بڑا ادیب مجھ سے ملنے آیا ہے......''

''ہاں مگر۔ اس وقت؟''

ہاں۔ تم آؤ تو!''

اور میں ستونت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیٹھک کی طرف لے چلا۔ جب تک ستونت ادیبوں کو عزت کے قابل کوئی چیز سمجھتی تھی۔ جلدی جلدی ستونت نے اپنا غصہ پی لیا اور اپنے چہرے کو، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، بک نک سُک سے سنوارتے ہوئے میرے پیچھے بیٹھک میں چلی آئی اور ایک کالے کلوٹے آدمی کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر ڈر گئی۔ اشک اس وقت بھاٹی دروازے کا کوئی غنڈہ معلوم ہو رہا تھا، جس سے لاہور کی سب عورتیں ڈرتی تھیں اور اسے سامنے آتے دیکھ کر سڑک چھوڑتے ہوئے ایک طرف ہو جاتی تھیں۔ ستونت نے جلدی سے 'نمستے' کی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں نے پہلے اشک کی طرف ہاتھ بڑھایا...... ''اوپندر ناتھ اشک''۔ اور پھر بیوی کی طرف—— ''ستونت، میری بیوی۔''

چھوٹتے ہی اشک نے میری بیوی کا نام پکارا۔ ''ستونت! برا مت ماننا۔ میں ایسے ہی چلا آیا ہوں۔'' اس نے اپنی بنیائن اور تہبند کی طرف اشارہ کیا۔ ''بات یہ ہے کہ میں ملنگ آدمی ہوں......''

اور پھر زور سے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنسا — ایسی ہنسی میں، جس سے
پھیپھڑے پھٹ جائیں۔ ایک چڑیا، جس نے اوپر کارنس کے قریب گھونسلا بنا رکھا تھا، پھڑ پھڑا
اٹھی۔ سامنے گھر کی بتی جلی اور کسی نے بالکونی پر سے جھانکا...... اس سے پہلے میری بیوی کچھ کہتی،
اشک اس سے کہہ رہا تھا۔ ''کچھ کھانے کو ہے ستونت!..... بہت بھوک لگی ہے۔۔''

باقر مہدی کے تعلّق سے

یقیناً یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج کی شام میں باقر اور آپ کے درمیان نہیں گزار سکا ہوں۔ کیا یہ استہزا نہیں کہ ہم دو دوست بوتل کے گرد تو اکھٹے ہوں، لیکن کتاب کے لیے نہیں؟

باقر مہدی بہت بڑے شاعر نہیں ہیں۔ یہ میں وضع احتیاط سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ بڑے شاعر کی تعریف کسی کو نہیں معلوم...... ابھی تو ہم یہی جانتے ہیں کہ باقر شخصی کردار کے اعتبار سے نہ صرف ضدّی بلکہ معکوس و متضاد آدمی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عالمی ادب، فی الخصوص شعری ادب، ان کا پسِ منظر ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ تجربے اور تجربے کے [تجزیے؟] کے معاملے میں ہمارے شعرا حفظِ ماتقدم کا شکار ہیں۔ نیا محاورہ (Idiom) یا ان کی سمجھ میں نہیں آتا اور یا ان کا نظریہ باقر کا نہیں، کسی باکرہ کا ہے، جو انحراف کو قبولِ عام پر ترجیح دیتی ہے۔

''شہرِ آرزو'' سے لے کر ''ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' تک باقر صاحب میں قبولیت، انحراف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں وہ غزل کی صورت میں بظاہر روایتی ہیں، وہاں وہ غزل کی زبان میں، نفسِ مضمون کے پیشِ نظر، خاصی ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ روایتی کے بجائے وہ انقلابی زیادہ نظر آتے ہیں۔ اور جب نظم سے رجوع کرتے ہیں، تو الفاظ کی نشست و برخاست کو، پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے ہیں کہ نشست ٹھیک بیٹھی ہے اور برخاست ٹھیک سے اٹھی ہے یا نہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر وہ پٹے ہوئے مضامین اور فرسودہ بندشوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ سوائے ''شہرِ آرزو'' کے، ان کے دواوین کے نام'' کالے کاغذ کی نظمیں'' اور'' ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' اس بات کا

ثبوت ہیں۔ یہ آخری نظمیں انھوں نے کیوں کہیں، یہ بات مجھ میں جھرجھری پیدا کرتی ہے۔

ایک بات جو انحراف شخصی سے آگے ہے، وہ باقر کا احساس علاحدگی ہے۔ زندگی کی کسی قدر پر تکیہ نہیں۔ الفاظ و معنی میں کبھی الفاظ، کبھی معنی کو ایک شدید شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی بھی کتاب کا کوئی بھی ورق اُلٹیے۔

میں جو بولوں تو ہر ایک شخص خفا
اور خاموشی کو رُسوا دیکھوں

یہ شعر باقر کے پورے کردار و گفتار کی کلید ہے۔۔۔ باقر کا مصرع ''اور خاموشی کو رُسوا دیکھوں'' کسی بھی حساس آدمی پر تشنجی کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔ باقر بولنے سے نہیں رہ سکتے۔ خاموشی کو رُسوا نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ ان کی تنہائی اور اکیلا پن، وہ تنہائی اور اکیلا پن نہیں ہے جسے دنیا بھر کے لکھنے والوں نے فیشن کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چوں کہ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ فکر میں فرق ہے، اس لیے باقر ان کا اسلوب اپناتے ہوئے بھی نگارش کے اعتبار سے مشرقی رہتے ہیں۔ زبان کو جان بوجھ کر انھوں نے کہیں اینڈی بینڈی بنایا ہے تاکہ زمانے کے، زبان و مضمون کے تقاضے کو پورا کرسکیں۔

میں نے جب بھی باقر کو پڑھا تو خیال کے اعتبار سے مجھ میں ایک ہول اٹھا، ان سے نہیں، اپنے آپ سے۔ انسان سب کچھ برداشت کرلیتا ہے لیکن اپنے روح کے اندھیرے کو نہیں۔ مقام ہُو کا تذکرہ سنیں تو ایک بات ہے لیکن اس میں خود گھر جائیں تو دوسری بات۔ باقر انسان کے اندر کے مقامِ ہُو کو محصور کردیتے ہیں۔ یہاں تک محسوس ہونے لگتا ہے کہ انسان اپنی تنہائی میں بھی تنہا ہے، وہ کہاں جائے، کیا کرے؟...... جو چیز دکھائی دیتی ہے، ویسی نہیں۔ ہر بات ایک الیوژن (Illusion) ہے۔ زندگی کی دوشیزہ کا ازالۂ بکارت ممکن ہی نہیں۔

باقر اپنے شعروں سے اس قدر حساس نظر آتے ہیں کہ خوف آنے لگتا ہے۔ اگر انھوں نے خودکشی نہ کرلی، جس کی طرف راہ نمائی ان کے شعر، ان کا کردار اور گفتار کرتے ہیں، تو وہ یقیناً نظر و فکر کے اعتبار سے ہمارے شعری ادب کے لیے نئے راستے نکالیں گے، جب ہمیں بھی ان کو بڑا شاعر ماننے میں کیا وہ ہے؟

میرا یار کرشن چندر

کسی جیتی شخصیت پہ لکھنا آسان کام نہیں۔ ایک تو اس لیے بھی کہ اس کے بیچ سے اٹھ جانے کے بعد ایک ٹھوس، مزاحمت کرنے والی، مادّی حقیقت پر ماورائی غلاف پڑ جاتا ہے اور جیتے جاگتے انسان کی بجائے وہ اس کا ہیولا نظر آنے لگتا ہے۔

کوئی انسان تمام تر اچھا نہیں ہوتا، نہ کلیتاً برا ہوتا ہے۔ بلکہ انسان ہونے کی دلیل ہی یہ ہے، وہ زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ٹکراؤ میں آئے، کہیں مارے کہیں مار کھائے۔ کبھی وہ ہمیں انقلابی دکھائی دے، کبھی سماجی طرز پر ایک مصلح اور کبھی صرف جسم میں جیتا جاگتا عام گوشت پوست کا انسان، سب خوبیوں اور خامیوں کو سموئے ہوئے۔ کبھی وہ بڑا سخی اور آدم دوست معلوم ہو اور کبھی نہایت خودغرض اور شاطر۔ اور جو لوگ زندگی کو سمجھتے ہیں، وہ جانب داری کے احساس سے اٹھ کر انسان کا غالب رنگ دیکھتے ہیں۔

کرشن ایک انسان تھے۔ دل کے ہاتھوں مجبور۔ آخری چند برسوں میں انھیں دل کے جو دورے پڑے، ان کا حساب تو ہمارے پاس ہے، لیکن دل کے وہ دورے جن کا حساب ان ہی کے ساتھ گیا؟ دل کی ہر کسمساہٹ تو تحریر میں نہیں آتی اور نہ لائی جا سکتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جذبے جو تتلیوں اور پریوں کی طرح ناچتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے خوف اور خدشے جو Gnowes بن کر راتوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں اور زندگی کافکائی (Kafka) ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت میں، جمع تفریق کے بعد، اثباتی باتیں زیادہ ابھر کر

سامنے آتی ہیں۔ یہ کہ وہ ایک اچھی روح تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسپتال میں پڑے [پڑے] وہ ایک بار کلینیکل طور پر چل دیے، لیکن ڈاکٹر کے ایک ٹیکے نے جواُن کے بدن میں دھڑکن پیدا کردی، صوفیوں کی زبان میں وہ [عالَم] بالا سے عالمِ سفلی میں لوٹ آئے۔اس عارضی موت میں انھوں نے کیا دیکھا، اس کے بارے میں سلمٰی، ان کی بیگم، بیان کرتی ہیں

''کرشن نے کہا کہ میں تو کسی شاندار مرغزار میں تھا، جہاں خوشی ہی خوشی تھی اور سکون ہی سکون۔اور روشنی کی صورت میں ایک جمال، جس کے نظارے سے روح دھلی جارہی تھی۔ پھر نہ معلوم مجھے وہاں سے کیوں بلالیا گیا؟ ڈاکٹر سے کہو کہ ایک بار پھر مجھے وہی ٹیکا لگادے جو پہلے لگایا گیا تھا ''

میں انسان کی اندرونی زندگی کا سائنسی طریقے سے قائل ہوں۔ یہ (Extra sensory perception) کی باتیں محض ڈھونگ نہیں، کیونکہ مجھے خود ان کا تجربہ ہے۔سائنس نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ دماغ کی ان پرتوں تک پہنچ سکے جن کے بیچ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں۔روح اندر کے مان سرودر میں نہاتی، چھینٹے اڑاتی ہے اور اپنے آپ کو سب آلودگیوں سے پاک کرلیتی ہے۔جہاں گلزار ہیں، مرغزار ہیں، حوریں ہیں اور اپسرائیں، جو آپ کا سواگت کرتی ہیں۔مذکورہ باتیں میں صرف اس لیے کررہا ہوں کہ کرشن چندر کی دنیا، زندگی میں بھی وہی تھی جس پہ اکثر حادثات کے سائے پڑتے تھے، ورنہ ہواؤں، خوش بوؤں، [ہوائیں خوش بوئیں] کشمیر کی وادیاں اور ان میں گھومتی ہوئی چرواہیاں تکرار کے ساتھ ان کی تحریروں میں کیوں آتی ہیں؟ کرشن ایک اچھی روح تھے کیونکہ اختلافات کے باوجود ہر ادیب سے پیار کرتے تھے۔ بلکہ اُن ہی کی وجہ سے تھا کہ ہم مل بیٹھتے تھے، انجمن بناتے تھے، بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ کرشن چندر خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

رہی ان کی تحریروں کی بات، تو وہ ایک بہت بڑے اسٹائلسٹ تھے۔جو بات اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔قلم کی اس قدر روانی دو وجہ سے ہوتی ہے۔ایک تو یہ کہ کسی کو اندرونی طور پر یہ احساس ہوجاتا ہے کہ اسے تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ کہنا ہے۔دوسرے اس لیے کہ اچھے اور برے تجربات کی وجہ سے فن کار کے دل میں ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے، جسے وہ اپنے فن کی مدد سے جلد سے جلد جھٹک دینا چاہتا ہے۔کرشن چندر میں جذبات کی شدت تھی اور

آپ جانتے ہیں کہ جب روح میں خیالات اس درجہ متلاطم ہوں تو گفتار کے اُسلوب پر قابو رہے تو کیسے؟ اسلوب کے ایک حصے پر تو انھیں قابو تھا، مثلاً منظر کشی، تشبیہات، استعارے، احساسِ جمال۔ لیکن یہ غایت کا احساس ادیب کی تحریر کو بیانیہ بنا دیتا ہے۔ وہ دل چسپ تو رہتی ہے لیکن گریز کے نہ ہونے کی وجہ سے فن کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کاش! وہ تھوڑا سا توڑ کے ہوتے۔ میرے نزدیک، مڑ کر اپنے آپ کا ہی ہالہ دیکھنا اعلیٰ درجے کے ادب کے لیے ضروری ہے۔

میں اس سے زیادہ خراج اپنے یار کو اور کیا دے سکتا ہوں کہ ان کی تحریرات کے شروع میں میں نے کتنا چاہا کہ کرشن کا قلم مجھے مل جائے اور میری لکنت دور ہو۔ ہم ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ جاننا اب میرا نہیں، آپ کا کام ہے کہ منٹو میری تحریر میں کہاں چلے آئے، کرشن چندر کہاں اور عصمت کہاں؟ اور مجھے یقین ہے کہ میں بھی ان کی تحریروں میں کہیں ضرور ہوں گا جس کی حد چاہے ایک ہی کی فقرہ ہو۔ بہ ہر حال، یہ کتنا خوبصورت حادثہ ہے کہ اُپندر ناتھ اشک، منٹو، کرشن چندر، عصمت، عبّاس، حیات اللہ انصاری اور ہمارے بہت سے شاعر ساتھیوں کا قافلہ ایک ساتھ چلا — اور وہ قافلہ اب بھی اپنی کج کلاہی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ منٹو نہیں رہے، کرشن بھی گئے۔ لیکن یہ دونوں تُرکِ غمزہ زن، اپنے بے شمار کارناموں کے ساتھ اب بھی ہمارے سامنے بیٹھے ہیں ع

اے تُرکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای
دردیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ ای

[زمانۂ اشاعت: مئی 1977]

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں، ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسے ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بزرگ اور پیشرو مانا اور یوں احترام کرتے ہوئے ٹال دیا۔ کچھ اسی قسم کا سلوک انھوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ ادبی سلسلے میں بارہا میری پیٹھ ٹھونکی، تحریری طور پر مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد ٹکسال باہر کر دیا۔ حال ہی کی بات ہے، جب کہ میں نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو بلا تکلف انھوں نے مجھ سے پوچھا ''تم رہتے کہاں ہو؟''

عباس صاحب کی ہمدمی کا شرف بھی مجھے حاصل نہیں ہوا، جس میں میرا قصور ہے تو ان کا بھی۔ میرے خیال میں انھوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب امتیازی نظریہ سے نہیں کیا۔ ایک واضح ارادے سے کسی صحیح آدمی کو تو قریب لانے کی کوشش نہیں کی۔ جی ہاں آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ خود اپنی طرف ہے، تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی، جو نقد ونظر سے عباس صاحب کی بہتری کا سامان کر سکتے تھے، اور خود بھی ان سے سیکھ سکتے تھے۔ جو بھی ان کے پاس آیا، انھوں نے آنے دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی پیر مغاں تھے، اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے حسن سلوک نے ہمیشہ کے لیے انھیں بنا دیا اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟

اس موذب فاصلے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کی ہم مشربی کا فخر حاصل ہے جس سے ہمدمی اور دوستی کہیں دور کی بات نہیں۔ پھر تھوڑا جاننے والے میں اتنا انکسار تو ہوتا ہے

کہ وہ کسی کو جاننے کا حتمی دعوا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے، جن سے پتا چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی دور بھی۔

زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر آخر دم تک ایک ہی سی رہی ہو، جس کی وجہ سے وہ بہت سے جرائم نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا، لیکن اپنے فرنیالوجی کے محدود علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری اڈیشن کا پیپر بیک ہوں گے۔ اور کچھ نہیں تو پچھلے پچیس برس سے تو میں ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ذہنی طور پر ان کا قد بڑھا ہے، جسمانی طور پر آپ وہی کے وہی رہے ہیں۔ چہرے پر جس فہم و فراست کے نشان پہلے تھے، وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پہ پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی تحریر جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ، جو خفگی یا کھسیانے لمحوں میں کچھ اس طرح سے ملتے ہیں کہ انھیں پھڑ پھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی بے ساختہ ہے مگر ریشمی، جسے استعمال کرتے ہوئے وہ ایکا ایکی رک جاتے ہیں۔ معتبر آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے!...... سر پر کے بال پہلے ڈھائی تھے اب دو رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں، بلکہ کئی دفعہ میں نے انھیں کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ لباس میں سادگی ہے اور استغنا کا فن بھی۔ ان کی عام نشست و برخاست کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ زندگی میں تاکید تکلفات پر نہیں، کچھ اور ضروری باتوں پر ہے، جس میں ادب، صحافت، فلم، سیاست اور دوسری بیسیوں قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انھیں اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان چننے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً عرب جمہوریہ کو چنیں گے۔ صدر عبدالناصر کی پیروی کریں گے، لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے بین گورین سے ملے گی۔

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا، جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کا حصہ تھے، جس کے ایک جلسے میں، میں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ایئر تھیٹر قائم ہوا تھا جہاں خوب ہی ہنگامہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کبھی نہیں تو اردو کبھی

ضرور ہے۔ چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکّے پڑے۔ خیر، دھکّوں کی بات چھوڑیے۔ وہ تو زندگی کا حصّہ ہیں۔ ہم سب دھکّے کھاتے ہیں۔ کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ۔ ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں مہاکوی ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا، تو اس بھی برا سلوک ہوا۔ بھگدڑ میں سیکڑوں پیروں کے نیچے دَلا گیا۔ جب بھی میں نے یہی سوچا تھا کہ کیا بڑے آدمی کو دیکھنے کے لیے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ باقی کے فضول اور بے کار قسم کے مرد تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے اور سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے، جسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے: ''۔ اور وہ آزادانہ مہمانوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جلتے رہے۔''

ایسا معلوم ہوتا تھا، عباس صاحب کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ ایسا کریں گے تو ان کا اپنا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس عمل میں انھیں کتنا ہی بولنا، کتنا ہی وقت ضائع کرنا پڑا، وہ اس بات کو بھول ہی گئے اور آج تک بالعموم بھولے ہوئے ہیں کہ جب تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے، بات کیسے بنے گی؟ (دل ''بدست آور'' کہ حج اکبر است!)

جب عباس صاحب کے چہرے پر ایسی ہی طمانیت برستی تھی، جس سے پتا چلتا تھا کہ بعد میں وہ '' آزادقلم'' ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو '' آزادفلم''۔ ایک نقطہ اور بھی کم۔ ان کے چہرے پر سب سے اوپر عقیل اور آزادروی کے نقوش تھے۔ اس سے نیچے پی۔ سی۔ جوشی کی پارٹی لائن اور سب سے نیچے مہاتما گاندھی کی 'تلاش حق' پوری کی پوری، جو چھپتا کر سب سے اوپر چلی آتی تھی۔

اسی دن مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لیے اس سے ذاتی طور پر مل لینا ضروری ہے۔ اسے چھو کر دیکھنا لابدی ہے، چاہے وہ ہاتھ ملانے کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔ صرف اس نے زندگی کے خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت اور ریاضت کی ہے اور ہم نے نہیں کی۔ کریں تو ذہنی طور پر بھی ہم ان سے ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے ذہن میں ایسے آدمی کو کچھ

ایسے مافوق الفطرت انتسابات دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں وہ بامن اوتار سوگز امعلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے انسان کی تربیت میں دیکھ کر، عام انسانوں کی سی حرکتیں کرتے پا کر ہمارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، جس میں اس بچارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں، ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ عباس صاحب سے مصافحے کے بعد کم از کم ایک بات کی تسلی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور پر ان کا قد مجھ سے بڑا نہیں۔ البتہ رنگ گورا ہے۔ لیکن کبھی تو افریقی قومیں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھیں گی اور گوروں کا جوا اتار پھینکیں گی (چنانچہ آج میری پیشن گوئی کتنی پیغمبرانہ ثابت ہو رہی ہے!)......رہی ذہنی قد کی بات تو ورزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی، جس کا مجھ پر بہت رعب پڑا تھا۔ لائم اوفلا ہرٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ خوبصورت افسانے لکھے تھے، لیکن عباس صاحب کا افسانہ ''ابابیل'' ان پر بیس تھا۔ جب میں ڈاک خانے میں بابو (بیک نقطہ بیش، یابو شود!) تھا اور میرے نزدیک کاؤنٹر پر منی آرڈر بک کروانے والے سے لے کر عباس صاحب تک سب انگریز وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے لکنت سے پٹی زبان میں افسانے کی تعریف شروع کی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر انکسار میں ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے اور میں بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی ''ایک پاؤلی چاول'' کی بھی تعریف کرنا ہے۔ میں خود بھی اپنے افسانوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں کس قدر گرا پڑا ہوں گا، کہ انکسار ان دنوں میرے لیے بہت بڑی عشرت کی بات تھی، جیسے عباس کی تعریف میرے نزدیک بہانہ محض تھی۔ اپنی باتیں کرنے کے لیے جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے پتا چلا کہ میرے اس وقت جانے بوجھے بغیر انھوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصہ مجھے بھی دے دیا ہے۔ میں گورا نہیں ہوا تو لمبا ضرور ہو گیا ہوں۔

اور یہ عباس صاحب میں امتیازی بات ہے۔ ادیبوں میں (میرے سمیت) کم آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں گے اور دوسروں کی زیادہ۔ ایک دوسرا شخص جو لوگوں کو بظاہر ''انا'' سے معمور معلوم ہوتا ہے، وہ ــــ اوپندر ناتھ اشک ــ میں جب بھی ان دوستوں سے ملا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ ادب کے آسمان پر کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ یہ اسی کا تذکرہ کرتے ہیں، اس کی

چیزیں پڑھ کر سناتے ہیں یا پڑھواتے ہیں ۔ تھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے ہیں کہ وہ ستارہ ابھی طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے ۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں ڈر محض ڈر کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ چونکہ ڈر کوئی اثباتی جذبہ نہیں، اس لیے یا تو وہ ادیب مجھے تالستائی اور چیخف سے بھی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے اور یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا ۔ میری طرح کے جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے اور بھی بہت سے ادیب ہیں ۔ لیکن ایک فرق ہے ۔ میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں اور اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں، لیکن ان میں سے اکثر جانتے ہیں، نہ کوشش کرتے ہیں ۔ خیر، وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے اور میں اپنے آپ سے مایوس نہیں ۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور اشک میں انا نہیں ۔ ارے صاحب، ہے اور بہت ہے ۔ لیکن اسی قدر جس قدر اسے تخلیقی عمل کے لیے ہونا چاہیے اور وہیں اسے جہاں ہونا چاہیے جیسے اکثر لوگوں کا سیکس تمام تر سر میں ہوتا ہے اور ایک معزز خاتون کے مطابق ـــ ، وہاں نہیں جہاں اسے ہونا چاہیے ۔ عباس صاحب میں انا اتنی ہی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں، دوسروں سے الگ، اور دوسروں کے بیچ ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ساتھی لکھاڑ ہی بہت ہیں ۔

میں نے عباس صاحب کے بہت سے افسانے پڑھے ہیں جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گیا ۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رائے ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں ۔ اس سے بہت بلند ہے جس کی تفصیل یا بحث مضمون کا حصہ نہیں ...... عباس صاحب کا افسانہ 'بارہ بجے' تو میں بھول ہی نہیں سکتا ۔ ایک تو اس لیے کہ اس سے میرا براہ راست تعلق ہے (اگرچہ میں ڈاڑھی کاٹنے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لیے کہ یہ افسانہ پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھا جن میں سے میں بھی گزرا ہوں اور ریل کی چھت پر ننگے بدن بیٹھ کر تقسیم کے وقت ہندوستان پہنچا ہوں ۔ اس افسانے میں عباس صاحب نے اپنے ہی طرز کی حسابی مساوات میں برابر کے سکھ اور مسلمان مارے تھے ۔ لیکن اس پر بھی سکھوں کی تسلی نہ ہوئی اور مجھے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں بیان دینا پڑا ۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی ۔ اب،

آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے، ان کی فلمیں دیکھی ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ میں نے اچھا کیا یا برا؟

جب تک عباس صاحب انڈین پیپلز تھیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کا کلاسیک ''دھرتی کے لال'' بنا چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ''دھرتی کے لال'' پہلی ہندوستانی Realistic فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور بیرون ملک کے باشندوں کی توجہ اس المیے کی طرف دلائی جس کا نام اس زمانے کا ہندوستان تھا۔ ''آجکل'' بھی تکمیل پا چکی تھی۔ اس میں بھی عباس صاحب کے ان افسانوں اور ناولوں کی قسم کا ایک پیغام تھا جو تائید کی کثرت سے پیغام نہیں رہ جاتا، آدمی کو چڑا دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بدصورت نہیں چاہتا۔ ''انہونی'' پہلی غیر جانبدار فلم تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی۔ عباس صاحب اس کے رہبر تھے اور راہی بھی۔ کبھی انھیں اس تحریک کی زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر کمی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جبکہ غریبوں اور ناداروں کے حق میں ایک مبلغ کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی مینڈیٹ کے مطابق تحریک سے عاق کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ تب میں نے پہلی مرتبہ عباس صاحب کو اس قدر غصے میں دیکھا، جب ان کے ہونٹ بھنچ بھی رہے تھے اور پھڑ پھڑا بھی رہے تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ تیز تیز باتیں کیے جا رہے تھے۔ آواز جو پہلے ہی کھسیائی ہوئی تھی اور کھسیا گئی، لیکن پانی پت کا ہونے اور اور اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے کے باوجود عباس صاحب کے منھ سے ایک بھی گالی نہ نکلی۔ کیونکہ وہ تہذیب کا تقاضا نہ تھا۔ ان دنوں ہم ''چور'' کا رول ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف پلڑا بھاری ہو، جھک جائیں۔ کچھ ہمت اور شخصیت کی کمی اور کچھ دماغی ابطال۔ بس جو اِسٹالن نے کہہ دیا، وہ آسمانی صحیفہ ہے۔ کبھی کبھی محسوس بھی کرتے تھے کہ یہ سیل (CELL) کیا بلا ہے؟ جس میں بیٹھے ہوئے لوگ عالمِ کل ہیں، ہمیں سنے بغیر ہی ہماری قسمت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، ورنہ آپ تحریک سے خارج، حالانکہ آپ کی تحریک کا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں کم از کم براہ راست نہیں۔ اس پہ طرفہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں بیچ

بھی نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں، کئی پنچوں کا ہوتا ہے، اور آپ تو جانتے ہیں پنچ پرمیشر ہوتا ہے۔ پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان پنچوں میں ایک ادیب قسم کا آدمی بھی ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جو ادب اور فن اور اس کے عوام کے لیے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب حدیں جانتا ہے اور پھر اس قدر لوچ بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر بھی معافی مانگ سکے.... میں تو اپنی ناسمجھی اور کمزوری کی وجہ سے خائف تھا لیکن دوسرے بھی خاموش تھے جو مجھ سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ عباس صاحب کے منھ پر کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کا تذکرہ کرکر کے خوش ہوتے تھے۔ اپنی ہمت پہ خود حیران۔ لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی تحقیق کی بہ نسبت اپنے جذبے پر یقین تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسٹالن سے لے کر کیفی اعظمی تک (سے) اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ حقیقت پر پہنچنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔ محبت...... جسے صحیح آدمی کبھی کبھی خود بھی شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سرکس کے روپ وا کر کی طرح زندگی کے رستے پر اپنے فکر اور جذبات کے درمیان متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال اپنے آخری تجزیے میں وہی کسوٹی نسبتاً ٹھیک اُترتی ہے، کیونکہ اس کے پیش نظر ادب اور سیاست ریاضی کے گنجلک سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان کے سیدھے سادے مسئلوں کی توضیح و تفہیم اسٹالن کے پرجز کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نہ چاؤ ماؤ کی طرح ہندوستان پر حملے کی، تاکہ روس کے کان ہوں...... چنانچہ ان سب باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے رستے سے نہیں ڈگمگائے۔ لیکن، جب تک، بقول شخصے، بہت سا پانی ہمارے دریاؤں میں بہہ گیا تھا۔

ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ کو ہم آہنگ کر کے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا، ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا، بلکہ شور، ......عباس صاحب کے کئی افسانے اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو موثر نہیں ہوتیں اور اگر ہوتیں ہیں تو کردار کے اعتبار سے سخت خارجی، ہنگامی پہلو لیے ہوئے، جس کے باعث ان کی گونج جلد ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے مقصد اور دوسروں کے مقصد میں بھی فرق ہے۔ انھوں نے لڑکی کے سہارے، تو ایک طرف لکڑی کے سہارے بھی انقلاب تک پہنچنے کی

کوشش نہیں کی اور نہ اس عمل میں بہت سوں کی طرح منقلب ہوئے ہیں، نہ انھوں نے زبان اور جمالیات کو اپنے معنی پہنائے ہیں، بلکہ اپنے مقصد کی جستجو میں کچھ یوں سیدھے گئے ہیں کہ ادھر اُدھر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ نظروں سے راستے کی تزئین کرتے جانا عین فن ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے عباس صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ انھیں ایک کام تھوڑا ہی ہے؟ سیکڑوں ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں اور زمانہ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنسی عمل ہے۔ میں اس بات کو فلسفیانہ سطح پر لاتے ہوئے عرض کروں گا کہ وقت کو تھامنا ہی پڑے گا، ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسے ہمارے بڑوں نے مشنون کے ذریعے گویائی تھام لی تھی اور یکسوئی اختیار کر کے کالی بھگوان کی مار سے بھی پرے چلے گئے تھے، اسی طرح کا عمل ہمیں بھی روا رکھنا ہوگا۔ ہم ادیبوں کا کاواشاک اور ہمارا راکٹ یہی ہے کہ جس پر سوار ہو کر مہر و ماہ سے بھی اوپر جا سکتے ہیں...... ایک دن آئے گا جبکہ جدلی مادیات کے دعویداروں کو بھی مقصد کی تحلیل اور اس کے اندرونی تضادات کو خاطر میں لانا پڑے گا۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی بیگم — مرحومہ بھی ایک نہایت ہی پیار کرنے والی عورت تھیں۔ ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ جوہُو میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا۔ عباس صاحب کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی ان کے ہاں رُکتا تو وہ بڑی شکایت کرتیں کہ قریب سے گزر جاتے ہو، آتے تک نہیں۔ ان کی وفات سے ہمیں قلق ہے، تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جنسی زندگی کے بارے میں عباس صاحب کا نظریہ ایک عام، نارمل مہذب آدمی کا نظریہ ہے۔ وہ زندگی کے اس حصے کو بالکل منفرد سمجھتے ہیں۔ انگریزی قول کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے پبلک میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں۔ مطلب، اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو......! (ضرور ہوں گے)

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے، وہ ہے ان کے کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت و قوت۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ قومی یا بین

الاقوامی سطح پر قلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ بلٹز کا آخری صفحہ تو بہر حال لکھنا ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی خروشچوف کی سوانح بھی ہو گئی۔ پنڈت نہرو سے بھی مل آئے، جن سے عباس صاحب کے ذاتی مراسم ہیں۔ پھر پینتیس لاکھ کمیٹیوں کا ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات ممبر شپ تک ہی محدود نہیں۔ ہر جگہ پہنچیں گے بھی، تقریر بھی کریں گے۔ پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے تین آدمی دکھائی دیتے ہیں — ایک پنڈت جوہر لال نہرو، دوسرے بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس، جن کی یہ قوت اور استعداد ایک عام آدمی کی بات نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک بار عباس صاحب کے سامنے اس حیرت کے جذبے کا اظہار کیا تو انھوں نے معمول کے رسمی انکسار سے ٹال دیا اور بولے ''جبھی تو ہر بات میں پتلا پن ہے'' اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ''آج کل کیا لکھ رہے ہو؟''

بیچ میں کسی نے ٹوک دیا۔ اس لیے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہ دیکھیں جو نمناک ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس برس کا وقفہ آ چکا تھا اور میں اپنے بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔

وِجینتی مالا

—اس کی اداکاری روح کی غذا تھی—

وِجینتی مالا کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے قدرت نے نہیں، یامنی رائے نے بنایا ہو۔ وہ کسی حد تک کانوں کی طرف کھنچی ہوئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ وہ سامنے دیکھتی ہوئی پیچھے بھی دیکھ رہی ہوں گی۔ ایسی آنکھیں پورے جلال میں آجانے پر کیا ہوتا ہوگا؟ ان میں سے برستا نور میں نے ڈرامائی مناظر میں دیکھا ہے، جہاں ان آنکھوں کی وجہ سے مکالمے لکھنے اور بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

مجھے وجینتی مالا کے ساتھ چار فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے: دیوداس، مدھومتی، آس کا پنچھی اور رنگولی میں۔

''دیوداس'' میں وجینتی مالا نے ایک طوائف کا رول کیا تھا، جو کسی طرح بھی ہیروئن کا رول نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن جنھوں نے شرت چندر کا ناول ''دیوداس'' پڑھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ چندرمکھی کا رول چھوٹا ہونے کے باوجود اپنے آپ میں اتنا ہی تیکھا ہے کہ اس کی بات ہیروئن 'پارو' کو میسّر نہیں آتی۔

اُن دنوں وجینتی مالا مدراس کی ایک دو ہندی فلموں میں کام کر چکی تھی۔ جب وہ ہمارے سامنے آئی، تو ہم اسے ایسی گڑیا سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے، جو چابی دینے سے ہاتھ پانو چلانے لگتی ہے۔ اس کے سامنے ہیروئن کے رول میں مشہور بنگالی اداکارہ سچترا سین تھی، جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ اعلا درجے کی فن کار بھی تھی۔ ان ہی دنوں اسے ایک بین الاقوامی ایواڈ بھی ملا تھا۔

اس کے سامنے وجینتی مالا کا ٹکنا بہت مشکل تھا۔ اور پھر اس کے رول میں اتنی گہرائی تھی کہ اس کی تہوں کو پانا کسی ایرے غیرے کے بس کی بات نہ تھی۔

طوائف چندر مکھی، دیوداس سے اس باعث محبت کرتی ہے کہ وہ پہلا مرد تھا، جس نے اس سے نفرت کی۔ اس نفرت نے چندر مکھی کی 'بری' عورت کو سدا کے لیے فنا کر دیا اور وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر جسم کی بجائے صرف روح بن گئی۔ وجینتی مالا نے کچھ اداس سی اداؤں اور بہکی بہکی نظروں سے اُس بے حد مشکل رول کو بہت عمدہ ڈھنگ سے نبھایا۔ اس کا رقص تفریح کا ذریعہ تھا، تو اس کی اداکاری روح کی غذا تھی۔

شاید اسی لیے بمل رائے نے وجینتی مالا کو اپنی اگلی فلم ''مدھومتی'' میں ہندی فلموں کے سب سے بڑے اداکار، دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کے لیے منتخب کیا۔ ''مدھومتی'' میں کئی ایسے منظر آتے ہیں جن میں دلیپ کمار سراسر حسن بن جاتا ہے اور وجینتی مالا خالصتاً محبت۔ وجینتی مالا نے دیکھنے والوں کے سامنے محبت کی وہ تصویر پیش کی کہ وہ اسے پانے کے لیے آئندہ جنموں کی مصیبتیں سہنے کو بھی تیار تھے۔ اگر وہ دوسرے جنموں کا سلسلہ نہ ہوتا، تو میں اس فلم کو کیسے لکھتا؟

''آس کا پنچھی'' میں وجینتی مالا کا ایک عام سا رول تھا اور اس کا کینواس بھی، ہیرو کے مقابلے، بہت چھوٹا تھا۔ لیکن رول چھوٹا ہونے کے باوجود وجینتی مالا نے اعلا فن کا ثبوت دیا۔ ''رنگولی'' میں نے خود لکھی اور بنائی تھی۔ تب وجینتی مالا سے میرا براہ راست واسطہ پڑا، جس میں تلخ تجربے بھی ہوئے اور میٹھے بھی۔ لیکن ایک بات جو وجینتی مالا کے حق میں جا سکتی ہے، وہ یہ کہ ایک بار ''کال شیٹ'' منظور کر لینے کے بعد، دیگر اداکاروں کے مقابلے، وہ اس میں کم ہی ادل بدل کرتی ہے اور سیٹ پر اس کا سلوک بہت اچھا ہوتا ہے۔ ''رنگولی'' کے آغاز میں، پہلے ہی دن اسے طویل مکالموں پر مبنی ایک ڈرامائی سین دیا گیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مادری زبان تامل ہونے کی وجہ سے وہ ہندی لب ولہجہ آسانی سے نہ اپنا سکے گی۔ سین ایک روز پہلے، شام کے وقت، اس کے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اگلی صبح جب وہ سیٹ پر آئی تو اسے نہ صرف سین کا ایک ایک لفظ یاد تھا، بلکہ اس کا لہجہ اور ادائیگی بھی دیکھنے لائق تھی۔

[زمانۂ اشاعت۔ مارچ 1985]

گیتا

میں خفا ہوں، بے حد خفا! — انسان سے، دیوی سے، خدا سے اور اس تجاہل سے جسے انسانیت کا ایک بہت بڑا حصہ، خدا کے نام سے یاد کرتا ہے۔

خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ ایک مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے اپنے سے، انسان سے بڑا درجہ دیتے ہیں اور مقامی طور پر اسے اپنے لیے آخری حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ مورتی اپنے ٹھکانے پر سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے میں آپ کس سے شکایت کریں گے؟ کسے کوسنے دیں گے؟ کیا آپ ساکن چیزوں میں حرکت کی پیچیدہ حسابی مساوات اور اس کی اقلیدسی شکلوں میں الجھیں گے، یا اس سائنسی حقیقت پر سر دُھنیں گے کہ پتھر نہ صرف زندگی رکھتا ہے بلکہ بہت دور کا ایک نامحسوس اور استھول سا ارادہ بھی؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ پتھر نے کسی اندرونی تحریک سے خود کو گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہو؟

دانائے راز ان باتوں کا کیا جواب دے سکتا ہے، سوائے اس بات کے کہ وہ چُپ رہے اور دنیا کی سب بے وقت اور 'مہمل' موتوں کے دکھ کو کہیں دور 'دل کے اندر' اپنے آفاقی غم کا حصہ بنا لے۔ پھر ہکسلے کے ٹھٹھو لیے پائلٹ کی طرح سے آگے گزر جائے اور اس منزل پر پہنچ کر انتظار کرے جہاں وقت کی حدیں بس ہو جاتی ہیں اور انسانی خفگی، عقلِ کل سے سوال کرتی اور اس کا جواب پاتی ہے۔

گیتا کو اس وقت موت نے آلیا، جب وہ زندگی کے اوج پر تھی۔ چیچک سے بچنے کے لیے

اسے کئی بار ٹیکہ لگوانے کے لیے کہا گیا، لیکن اس نے ہمیشہ انکار کر دیا، کیونکہ اس کے والد کو انسان کی اس چارہ جوئی کے باوجود چیچک ہوئی تھی، جس میں اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے جاتی رہیں۔ گیتا جو ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی، ماں اور دوست تھی، سب کا کہا مانتی تھی، لیکن اس نے کیوں ضد پکڑ لی؟ یہ کیسا انکار تھا جو اس کے منھ سے نکلا تھا؟ کون سا ہاتھ تھا جو اسے موت کی طرف کھینچ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے گیتا سے یہ بھول نہ ہوتی تو وہ آج اپنے بچوں کلی اور کاجل، اپنے میاں شمی، اپنے بہن بھائیوں اور ان گنت عزیزوں اور دوستوں کے درمیان ہوتی۔ لیکن کہیں اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا یا آنکھیں چلی جاتیں تو کیا ہوتا؟ گیتا جو زندگی میں اپنی ہی شرط پر جینے کی عادی تھی، کیسے مشروط زندگی سے مصالحت کر لیتی؟ اسے دیکھ کر اُس کے لاکھوں چاہنے والوں کا کیا حال ہوتا؟ اپنے چاہنے والوں کو نہ دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی؟ اس قسم کے سوال پھر La-mystique کی حدیں چھونے لگتے ہیں اور آخر بتلائے عقل آدمی اس حقیقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے جو ایک ہی جست لے کر زندگی کی باقی سب حقیقتوں سے آگے آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ ہے موت۔ یہ سچ ہے کہ گیتا آج نہیں ہے۔ اس پار آ کر اُس کے بڑے سے پتے پر لڑھکنے والے شبنم کے قطرے کو چتا کی آگ نے دھواں بنا دیا ہے۔ وہ بمبئی میں بان گنگا کے شمشان میں جلائی جا چکی ہے اور اس کی روح ایک ایسی شانتی پا چکی ہے جس کی تمنا گیتا نے ہرگز نہ کی تھی، کیونکہ اس نے اضطراب کا راز پالیا تھا۔

بان گنگا کے شمشان کے ساتھ وہ مندر تھا جہاں دس برس پہلے گیتا نے اپنا ہاتھ شمی کے ہاتھ میں دیا تھا اور پیار نبھانے کی سوگند لی تھی۔ اس نے تو اپنی سوگند نبھا دی، لیکن شمی کی سوگند کا کیا ہوا؟ وہ شمی سے محبت کرتی تھی، ایسی محبت جو ہمارے شاستروں اور مریادا نے ایک پتنی کو تفویض کی ہے۔ وہ بیک وقت پتنی، دوست اور ماں تھی اور ایک فاصلے سے اپنے پتی کے کھلنڈرے پن کو دیکھا کرتی تھی۔ شمی کے پیار میں بھی وہی والہانہ پن تھا جسے میں نے گیتا کی باتوں کے بین السطور جانا ہے۔ چنانچہ جتنے دن گیتا بیمار رہی، شمی اپنا سب کام چھوڑ کر گیتا کی نگہداشت کرتے رہے۔ اس کی جانکاہی میں محبت کے کئی چھوٹے اور بڑے وعدے کیے اور نیازیں گزاریں، جو ایک طرح کے واسطے تھے قضا و قدر کو، جو قسمت نے تسلیم نہ کیے۔ جب ان کی شادی، ہوئی تھی تو مندر کے بت،

ساحل کے سنگریزے، سمندر کی لہریں اور اس وقت کا آسمان جانتے تھے، لیکن ان سب نے مل کر اس حسین جوڑے کو چند برس کے لیے عشرت کی چھوٹ دے دی تھی۔

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

میں نے اس مضطرب روح کو اس کے بچپن ہی سے دیکھا ہے۔ گیتا، لاہور میں ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ جب بھی وہ نظر کی پہیلی کی طرح، یہ تھی وہ گئی، قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے دبلے پتلے بدن اور گورے چٹے چہرے میں ایک ہی چیز، باقی کے تمام خدوخال سے نمایاں تھی اور وہ تھیں اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جن میں حیرت تھی، جستجو تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو۔ وہ ہر بات کی ماہیت جاننا چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔ اس کی آنکھیں پپوٹوں میں ایک تیز گراری کی طرح سے چلتی تھیں اور یہ تھا بھی ٹھیک، کیونکہ انھیں سو سال کا سفر چونتیس برس ہی میں طے کرنا تھا۔ گیتا کی آنکھیں درسی کتاب پر اتنا نہ رکیں جتنا کتاب زندگی پر۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون کے آر پار نکل سکتی تھی۔ ورنہ عام کتاب میں تو الفاظ اور پھر کاغذ نظر کی پرواز کو جکڑ لیتے ہیں۔ اس کی حیرت انگیز سمجھ بوجھ ایک عام تعلیم یافتہ آدمی سے کہیں زیادہ تھی، کیونکہ اس علم کا مدار وجدان پر تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں کہیں ایک لمحہ ساکت تھا، جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا۔ نظروں کی قوس میں ایک مقام خالی تھا، جہاں تک کوئی نہ پہنچا۔

چند لوگوں نے فروعی طور پر ان آنکھوں کے سحر کو جانا اور غالباً اسی لیے انھیں صرف شوخی اور چلبلے پن اور کہیں ایک آدھ جذباتی سین میں استعمال کر سکے۔ پہلی فلم، جس میں گیتا نے منفرد اداکاری کی، سہاگ رات تھی، جس کی شوٹنگ ہی کے دوران میں ہدایت کار نے اس نظر کے اٹھنے اور جھکنے کے بیچ نغمہ و سحر بھی دیکھ لیا اور آہِ صبح گاہی بھی اور اپنی اگلی تصویر کا نام ''باؤرے نین'' رکھ لیا۔ لیکن گیتا کے نام لینے کے باوجود وہ ان شاہین بچوں کے پرِ پرواز کی قوت اور ان کی اڑان کا اندازہ نہ کر پائے۔ ان کا اندازہ گیتا کو تھا لیکن غیر شعوری طور پر۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب گیتا نے اپنی تصویر 'رانو' بنانے کا فیصلہ کیا، تو اپنے ادارے کا علامتی نشان دو آنکھیں رکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، جو ایک طرف تو بدری ناتھ کے مندر پر بنی ہوئی بھگوان وشنو ناتھ کی آنکھیں تھیں، جو

منزلوں دور سے آنے والے یاتریوں کو دیکھتی اور ان کی رکھشا کرتی ہیں، اور دوسری طرف دیوی کی آنکھیں، جو انسانی زندگی کو اس کے پاپ اور پُن میں دیکھتی ہیں۔ من اور اس کی ورتیوں کے آر پار چلی جاتی ہیں اور ہر جذبے کے ساتھ رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ ابھی ان میں دَیا ہے، ابھی کرونا اور ابھی چنڈی کا کوپ۔ ابھی جزا ہے، ابھی سزا اور پھر چھما۔ آنکھیں نہ صرف دل کا آئینہ ہیں، بلکہ باہر کی دنیا کو بھی دیکھتی ہیں اور اس کا عکس دل میں اتار لیتی ہیں۔ ان کا اوّل اور آخر مقصد ہے دیکھنا اور اپنا آپ دکھانا لیکن ہر گاہ خاموش رہنا۔ ایسی خاموشی کہ نطق بھی جس کے سامنے پانی بھرے اور یہ گیتا کی خاص بات تھی۔ وہ بات کرنے والے کی طرف ٹک ٹک یوں دیکھتی تھی کہ وہ بعض اوقات گھبرا اٹھتا تھا۔ لیکن اسے گیتا اور اپنے رشتے کے بارے میں فوراً پتا چل جاتا۔ ابھی وہ آپ کی دوست ہیں، ابھی دشمن، پھر دوست نہ دشمن، ایک ہی لمحے پہلے ہستی سے معمور وہ آنکھیں اچٹ کر نیستی کی منزلوں میں گم ہو گئی ہیں...

مجھے اس سے دل چسپی نہیں کہ گیتا نے فلمی دنیا میں کامیابی کا سنگلاخ راستہ کیسے طے کیا، یا وہ کون کون سی تصویروں میں آئی۔ مجھے کتاب سے دلچسپی ہے، اس کے ابواب کی فہرست سے نہیں۔ اگر کسی فلم میں اسے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تو اس لیے کہ کہانی یا منظر اس کی وجدانی سمجھ میں آ گیا، یا کوئی ذہین ہدایت کار جزوی طریقے سے پھر اسے گیتا کے ذہن میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اکثر اور بیشتر ہمارے ہدایت کار اپنی مجبوریوں کے باعث گیتا سے وہ کام نہ لے سکے جس کی صلاحیت گیتا میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی اچھی کہانی، کسی اچھے خیال اور جذبے کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی۔ کبھی ماحول کی مناسبت اور کردار کے اچھے ہونے سے اسے کام کرنے میں مزا آتا اور کبھی خانہ پُری کر دیتی اور اپنے تنہائی کے لمحوں میں بیٹھ کر رو دیتی۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ فلم اور فلمی اداکاری کے بارے میں گیتا کی نظرِ انتقاد اتنی بلند تھی۔ کہتے ہیں کہ عنقا کا آشیانہ بلند ہوتا ہے لیکن گیتا کا ٹھکانہ عنقا کے آشیانے سے کہیں اوپر تھا۔ یعنی وہاں جہاں کبیر کے ایک بھجن کے مطابق، بغیر بادلوں کے بجلی چمکتی ہے اور سورج اجیارا ہوتا ہے۔ جہاں آنکھوں کے بغیر موتی پروئے جاتے ہیں اور بنا شبد کے شبد کا اچارن ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار باتوں باتوں میں میں نے کچھ ایسے فلم بنانے والوں کے نام لے دیے جنھیں نہ صرف ہمارا ملک

بلکہ باہر ملکوں کے لوگ بھی مانتے ہیں۔ مڑ کر دیکھا تو گیتا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی وجہ پوچھتا، گیتا میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی اور پھڑ کتے ہوئے ہونٹوں سے التجا کر رہی تھی کہ میں آئندہ اس کے سامنے کبھی ان لوگوں کے نام نہ لوں۔ وفورِ جذبات میں وہ چند ایسے نام بھی لے گئی، جو اس کے اپنے قریب کے تھے۔ وہ فلم 'رانو' کو کسی ایسے ہی دیکھے نہ سنے انداز میں بنانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے لیے وہ مقام متعین کر رکھا تھا جس تک آج تک کوئی نہ پہنچا۔ شاید مرے بغیر وہ خود بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ گیتا کس دیس کی باسی ہے......

میں نہیں جانتا اسے میں اپنی اس وقت کی خوش قسمتی کہوں یا اس وقت کی بدقسمتی کہ خود میرے اور اپنے عزیز دوستوں کے منع کرنے کے باوجود گیتا نے میرے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کو فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔ گیتا کے پاس یہ ناول میرے دوست وید صاحب لے گئے تھے، جنھیں آخر اس فلم کا ہدایت کار ہونا تھا۔ ہماری، گیتا کو منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ''ایک چادر میلی سی'' کی کہانی ہماری مروجہ فلمی کہانیوں سے یکسر الگ تھی۔ چھوٹتے ہی اس کی نائیکہ رانو چار بچوں کی ماں دکھائی دیتی تھی۔ پھر اپنی بدکرداریوں کے کارن اس کا پتی قتل ہو جاتا ہے اور رانو کو اپنے دیور پر چادر ڈالنا، اس کے ساتھ شادی کرنا پڑتی تھی، جو عمر میں اس سے گیارہ سال چھوٹا تھا اور جسے اس نے ایک بچے کی طرح پالا تھا۔ گیتا کو رانو کے کردار میں ایک بہت بڑی رینج دکھائی دی اور وہ اس پر مر مٹی۔ رانو اور گیتا میں کیا مماثلت تھی؟ غالباً یہی کہ دونوں نے دکھ دیکھا تھا۔ اپنی فلسفیانہ تحلیل میں رانو دیوی تھی کیونکہ اس نے زندگی کو ایک بھرپور طریقے سے جیا۔ اس نے مار کھائی، مار۔ اپنے پیٹ، اپنی بیٹی، اپنی محبت کے لیے اس نے میٹھے مالٹے، شراب کی بوتل توڑی اور پھر اپنے دیور کو رام کرنے کے لیے اسے پلائی بھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دیور نے اس کے سارے پاپ چھما کر دیے۔ یہی نہیں وہ خود دیوی ہوگئی...... دیا اور کرونا کے پرساد بانٹنے لگی...... رانو کے کردار نے گیتا کے دل میں ایک عجیب سی گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ زندگی کے بھلے برے کے آخر میں موکش ہے۔ چنانچہ میرے ناول کی نائیکہ اور یہ نائیکہ، دونوں آخر موکش کو پہنچ گئیں اور میں بیچ ہی میں رہ گیا۔

اس بات سے گیتا کے بہت سے قریبی لوگ بھی واقف نہیں کہ گیتا کو Father fixation تھا۔ اس کی سب حرکتیں ایک 'اناتھ' لڑکی کی طرح تھیں۔ وہ کھلتی تو بے تحاشا کھلتی اور جب سمٹتی تو ایک پھول کی طرح اپنی پنکھڑیاں کچھ اس انداز سے بند کر لیتی کہ سب کیڑے مکوڑے اس میں گھٹ کر مر جاتے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ورسوا میں اس کے پتا کا انتقال ہوا۔ میں مُردے سے بہت ڈرتا ہوں، لیکن نہ معلوم یہ کیسا رشتہ تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے گیتا کے باپ کو نہلایا۔ جب سے گیتا نے میری طرف اس انداز سے دیکھنا شروع کر دیا جیسے کوئی بیٹی باپ کی طرف دیکھتی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے اپنی تصویر 'رانو کا باپ' کہا کرتی تھی۔

گیتا کے دل میں تخلیق اور اس کے خالق کے لیے بے پناہ جذبہ تھا اور عقیدت تھی۔ چاہے وہ زندگی اور فن کا کوئی شعبہ ہو، وہ پائے کے مصوروں، موسیقاروں، شاعروں اور مصنفوں کے سامنے یوں ہتھیار ڈال دیتی، جیسے اس کی اپنی کوئی شرط ہوتی ہو۔ وہ انھیں اپنے دل میں وہی درجہ دینے لگتی، جو عام آدمی کسی اوتار یا ولی اللہ کو دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کوئی اس کے ایثار، اس کے بلند معیار پر پورا نہ اترتا، تو اسے برابر ہی کی مایوسی ہوتی اور پھر ایکا ایکی اسے جھٹک بھی دیتی۔ وہ مثالیت کی گرویدہ تھی اور اس سلسلے میں اسے کئی بار اپنے اردگرد کے ماحول سے ٹکر لینا پڑتی۔ لیکن چونکہ گیتا کا پل تو درن تھا، اس لیے وہ مچھلی کی طرح ہمیشہ دھارے کے خلاف، زندگی کے آبشار کے اوپر ہی اوپر پہنچنے کی کوشش کرتی۔ بیچ میں ایسے لمحے بھی آئے جب وہ عملی زندگی کے ساتھ مصالحت کے سلسلے میں ہار بھی جاتی۔ جب وہ خاموش ہو جاتی اور صرف کسی نگاہ والے ہی کو اس کی اندرونی کیفیت کا پتا چلتا۔ اس کی شکل سمندر کی سی ہوتی جو اوپر، سطح پر سے تو شانت نظر آتا ہے لیکن اندر، اپنے سینے میں بڑوانل لیے ہے، جب اس کا راز اگلوانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا۔ ...البتہ پتا اس وقت چلتا جب کچھ کشتیاں ڈوبی ہوئی ملتیں، کچھ بادبان اور مستول ٹوٹی پھوٹی حالت میں کنارے پر آ لگتے۔

اس سے پہلے مجھے ایک فلمی رسالے میں گیتا کے بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیتا نے مجھ سے کہا— آپ لیکھک ہیں۔ آپ جو جی چاہے، میرے بارے میں لکھیے، اور اس سلسلے میں کسی کی پروانہ کیجیے— میں نے کہا— یہ نہیں ہو سکتا گیتا! پھر میں نے اپنے مبہم طریقے سے اس سے پوچھا:

کیا میں اس بڑو انل کے بارے میں لکھ سکتا ہوں؟ جس کا بھید تم نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں کیا۔ لیکن تمھارا چہرہ، تمھاری آنکھیں اس کی غمازی کرتے ہیں؟......کیا میں وہ سب لکھ دوں؟

گیتا کے ساتھ وید بھی بیٹھے تھے۔ گیتا نے مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا اور بول اٹھی—

''نہیں''

اس کے بعد گیتا 'رانو' کی شوٹنگ کے لیے اپنا پورا یونٹ لے کر بنگلہ، پنجاب چلی گئی، جہاں اس نے عام دیہاتی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، انھیں کی طرح کے کپڑے پہنے۔ ویسے ہی جاگتی، ویسے ہی سوتی۔ اور ان سے زندہ رہنے کا وہ فن سیکھا جس کے بعد زندہ رہنے کی حسرت ہی نہیں رہ جاتی۔ ایک تالاب کے کنارے رانو کا گھر تھا، جس میں گیتا رہتی تھی۔ گانو کے سب لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس کے گھر کے دروازے آج بھی یوں کھلے ہیں جیسے چونک جانے کے بعد کسی کا منھ کھل جاتا ہے۔

گیتا دو برس رانو کے ساتھ سوئی اور اسی کے ساتھ جاگی۔ وہ اسے اس کے مصنّف سے کہیں زیادہ جاننے لگی تھی۔ وہ خود رانو ہو گئی تھی۔ وہ مجھے خط بھی لکھتی تو اس پر رانو ہی کے دستخط ہوتے۔ پھر وہ بمبئی لوٹ آئی اور 12 جنوری کی صبح کو گیارہ بج کر دس منٹ پر چل پڑی۔ یہ سب کتنا تیز تیز ہوا...... پونے گیارہ تک تو میں عیادت کے سلسلے میں اس کے ہاں تھا۔ گیتا کے سسر پرتھوی راج کپور، اس کے پتی شمی، ڈاکٹر سب نے یقین دلایا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔ ان کے چہرے پر رونق چلی آئی تھی اور رَت جگوں کے نقوش مٹنے لگے تھے۔ باہر آ کر میں نے بیوی کی تسلی کے لیے اسے فون کر دیا۔

گھر لوٹا تو میری بیوی رو رہی تھی۔ ایک اور فون آ گیا تھا۔

میں گھر سے اپنی وہ کتاب جو پنجابی میں چھپی ہوئی تھی اور جس پر گیتا کی تصویر تھی، اسے ساتھ لیتا گیا۔ میں چاہتا تھا گیتا کے ساتھ اسے بھی شعلوں کے نذر کر دوں، کیونکہ گیتا نے اسے مجھ سے زیادہ جانا تھا۔ پھر میں نے سوچا— شاید یہ جذباتیت ہوگی۔ فلم کے لوگ اسے دکھاوا سمجھیں گے۔

چتا کے شعلے بلند ہوئے، میری ہمت پست ہو گئی۔

میں چپکے سے ساحل کی طرف سَنک گیا اور کتاب سمندر میں پھینک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لہروں کے ساتھ واپس آنے لگی۔ گیتا مجھے کتاب لوٹانے لگی۔ میں نے کہا — نہیں گیتا! یہ تمھاری ہے۔ اسے تم ہی فلماؤ گی۔ دوسرا کوئی نہیں۔

— ہو سکتا ہے آج سے پینتیس چالیس برس بعد کسی بڑی بڑی آنکھوں والی اداکارہ کی نظر اس کتاب پر پڑے اور وہ اپنا آپ اس میں دیکھ لے۔ اسے فلمانے کا تہیّہ کر لے۔ صرف اسے یہ پتا نہ ہو گا کہ پچھلے جنم میں وہ گیتا تھی۔

سوانحی اور تاریخی فلمیں

سوانحی اور تاریخی فلمیں کیا ہیں ؟ اگر ایک سادہ سے لفظ یا جملے کے لیے لغت تک ہاتھ بڑھانا ضروری ہو، تو سوانحی فلمیں وہ ہیں جو کسی بڑے آدمی، کسی عظیم شخصیت کی زندگی کو فلم کی صورت میں ہمارے سامنے لے آئیں اور تاریخی وہ جو کسی ملک اور قوم کی گذشتہ زندگی کو مصوّر شکل میں پیش کردیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے — کیا کسی بڑے آدمی یا بڑی شخصیت کی زندگی میں، پیدائش سے لے کر موت تک کے واقعات کی فہرست گنوا دینا ایک سوانحی فلم کہلائے گا؟ یا کسی ملک اور قوم پر گزرے ہوئے حالات کو سیلولائڈ پر لے آنے سے تاریخی فلم بن جائے گی؟

افسانے کے بہت سے معمولوں کی طرح سوانح اور تاریخ بھی بند معنوں میں اینٹ اور پتھر ہیں۔ جب تک یہ اینٹ اور پتھر کسی کاریگر، معمار کے ہاتھوں میں نہیں آتے، کوئی خوبصورت عمارت نہیں بن سکتی۔ آخر ایک انسان اور بہت سے انسانوں کی زندگی کی — سوانح اور تاریخ کا ایک تصوّر وہ ہے جو بچپن میں اسکول ماسٹر نے ہمارے ذہن میں پیدا کیا اور ایک وہ جو پنڈت جواہر لال نہرو ''دریافتِ ہند'' (تلاشِ ہند) کی شکل میں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ایک معمولی اسکول ماسٹر کا تصور، سوانح اور تاریخ کے بارے میں ساکت ہے، کیونکہ اُس میں ہم ہر انسان اور ہر واقعے کو ایک جگہ ٹھہرا ہوا دیکھتے ہیں۔ گویا انسان اور واقعات کا، نہ گزرے ہوئے زمانے کے انسان اور واقعات سے کوئی تعلق تھا اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں سے۔ انسان یا واقعہ جس سلسلے

کی کڑی ہے، اسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ یا اس کی رعایا پر خارجی حالات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اچھا آدمی، اچھا حاکم تھا تو اس لیے کہ اس کا باپ چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یا بہادر تھا تو اس لیے کہ اس کی ماں راجپوت کی بیٹی تھی یا اس سے بھی ایک قدم پیچھے جا کر ـــ وہ پیدائشی طور پر بھی [ہی ؟] اچھا یا برا تھا۔ اگر اکبر کو عقل سلیم حاصل تھی تو وہ خدا کی دین تھی۔ ایک بات جو اس قسم کا اسکول ماسٹر، تاریخ داں، یا سوانح نگار نہیں دیکھتا، وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کیا ہوا؟ اکبر کے باپ ہمایوں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور کیونکر؟ اکبر نے اور کہیں نہیں تو مصیبت اور تجربے کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اس لیے وہ ایسا حکمراں بنا، اکبر اعظم کہلایا

برخلاف اس کے ''دریافتِ ہند'' کے فاضل مصنف، خارجی حالات اور داخلی کیفیات، دونوں کا برابر تجزیہ کر کے ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور یہی بتاتے ہیں کہ اس زمانے کے سماج نے فرد پر کیا اثر ڈالا اور فرد نے سماج کو جوابی طور پر کیا دیا؟ آدمی اور ذرائع پیداوار کے آپسی رشتے کیا تھے؟ ہم پتھر کے زمانے سے لے کر چندر گپت موریا کے سنہرے عہد تک پہنچتے ہیں تو کیسے؟ اور پھر کلائیو سے کرپس مشن تک

ان کا تاریخ کا تصور ایک ٹھہرے پانی کا تالاب نہیں۔ ایک ایسا سمندر ہے جس میں دن رات لہریں آتی ہیں جاتی ہیں۔ ہر بار جو پانی آتا ہے وہ پہلے ہی کا پانی نہیں ہوتا، کیونکہ سمندر میں اگر نربدا اور تاپتی آ کر مل جاتے ہیں تو دجلہ اور فرات بھی اس میں حل ہوتے ہیں اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بحیرۂ عرب کا پانی کہاں ختم ہوتا ہے اور بحیرۂ ہند کا پانی کہاں سے شروع؟ گویا ان کے تصور کی تاریخ ساکن نہیں، متحرک ہے، جس میں ہمیں نہ صرف سماجی اور طبقاتی کش مکش دکھائی دیتی ہے بلکہ ہر وقت بدلتے ہوئے فرد کی شکل بھی نظر آتی ہے۔ یہ چیز کتنی فکر انگیز ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان ہی کی پیداوار ہوتے ہوئے جب ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھتے ہیں تو نئی ترتیب کو ''دریافتِ ہند'' کا نام دیتے ہیں۔ کیا ہندوستان پہلے کہیں کھویا ہوا تھا؟ یہ بات نہیں، ہندوستان یہیں موجود تھا اور موجود رہے گا مگر اس ملک کی تاریخ کو جس نظر سے مفاد پرستوں اور سامراجیوں نے دیکھا، پنڈت جی اس نظر سے دیکھنے کو تیار نہیں تھے۔ ہند کی تاریخ کے بارے میں ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا جسے انھوں نے بڑی کھوج اور عملی جدّ و جہد کے بعد حاصل کیا۔

یہ کھوج اور آخر کار دریافت، تاریخ اور سوانح حیات کے لیے بے حد ضروری ہیں، کیونکہ انھیں [ان ہی] سے آپ کا نقطۂ نظر وضع ہوتا ہے۔ سوانحی اور تاریخی حالات اور واقعات یوں اپنی جگہ ساکن ہیں، وہ موم کی ناک ہیں جسے آپ جس طرف چاہے موڑ کے رکھ دیں، لیکن اگر آپ نے کسی شخص کی زندگی یا کسی ملک کی زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر وضع کر لیا ہے تو پھر آپ اسی [اُس] زندگی کے واقعات میں ایسے رنگ بھر سکتے ہیں کہ کتاب کی صورت میں پڑھنے اور فلم کی صورت میں دیکھنے والوں کو وہ نئے اور دلچسپ معلوم ہوں اور وہ سوچیں کہ واقعی لکھنے والے یا فلم پیش کرنے والے نے ہمیں پتے کی بات بتائی ہے۔ کسی خاص شخص کی زندگی یا کسی خاص عہد کی تاریخ کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہم واقف نہیں تھے یا اگر واقف تھے تو یہ سب باتیں ہمارے عقلی اور جذباتی جسم کا حصہ نہیں بن پائی تھیں۔

یہ نقطۂ نظر کچھ بھی ہو، ہمیں اس سے مطلب ہے تو صرف اتنا کہ اس کا مدار کسی دلیل پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے علم میں اضافہ ہو اور بہتری کے لیے انسان کی جدّ و جہد آگے بڑھے۔ یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم ایک ایسی تفریح کا سامان ہو جو ہمارے بچوں، ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق کو نقصان نہ پہنچائے۔ انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے، کسی ایک آدمی کی دین نہیں۔ انسانی زندگی کا کل اس وقت بنا جب بہت سے جز وِل گئے۔ بقول مرزا یگانہ:

اپنے اپنے رنگ میں، اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں، کوئی پریشانِ بہار

دنیا کی کم ہی چیزیں ہیں جو اُپج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کچھ ہم نے عربوں سے سیکھا، یونانیوں سے سیکھا، کچھ انھوں نے ہم سے۔ ہندوستان نے تصوریت کا فلسفہ دنیا کے سامنے رکھا جس سے برکلے، کانٹ، ہیگل سے فلسفی متاثر ہوئے۔ مارکس نے انھیں [ان ہی] فلسفیوں سے سیکھ کر ایک نیا اندازِ فکر پیدا کیا جسے ہم کائنات کا مادّی تصور بھی کہتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں انھوں نے خود سے پہلے آنے والوں کی عملی شرکت کو نہیں جھٹلایا۔ گویا آپ چاہے روحانی نقطۂ نظر کے قائل ہوں، چاہے مادّی کے اور چاہے آپ کا کوئی اپنا ہی نقطۂ نظر ہو، مگر اس کے بغیر کسی بھی

اچھی سوانح یا تاریخ کا لکھا جانا یا فلمانا ممکن نہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر کو وضع کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ ماضی کی چیزوں کو مصوّر کرنے کے لیے آپ کو آج کے زمانے کا علم بروئے کار لانا پڑے گا۔ گویا شراب پرانی ہوگی، بوتل نئی۔

اس کو میں ایک مثال کے ذریعے سے واضح کروں گا۔ خاندانِ غلامان کی سلطانہ رضیہ کے بارے میں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس کی محبت امیر آخور ــــ یاقوت سے ہوئی جو ایک حبشی غلام تھا۔ رسمی تاریخ جب اس محبت کا ذکر کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی ہے۔ آج بھی سینکڑوں ہزاروں لوگ ہیں جو ایک بادشاہ یا ایک شہزادی کی ایک عام آدمی سے محبت کو بغیر آہ یا واہ کیے نہیں دیکھ سکتے۔ اور ایک خاص تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے کہ گورے اور کالے کی محبت کو دیکھ کر جن کا خون کھول اٹھتا ہے اور وہ کالے آدمی کو کھڑے کھڑے کچل دینا چاہتے ہیں۔

ایسے لوگ اس زمانے میں بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ اس لیے اس قسم کے ظلم کو ہوتے دیکھ کر بغاوت یا قتل وخون کر دینا ایک ایسی بات ہوتی ہے، جسے آپ سینکڑوں بار سن چکے ہیں۔ پڑھ چکے ہیں اور سنیما کے پردے پر دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اگر اس زمانے میں آپ رضیہ سلطانہ اور یاقوت کا قصہ بیان کریں گے تو آپ کو یہ نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑے گا کہ سلطانہ نے حبشی غلام سے اس لیے محبت کی کہ وہ بہت صحت مند تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ گورے اور کالے میں فرق نہیں سمجھتی تھی۔ ایک سے لے کر خود اس کے باپ التمش تک کی تاریخ نے اس پر یہ چیز ظاہر کر دی تھی کہ ہر انسان میں صلاحیتیں موجود ہیں، بشرطیکہ انھیں مناسب طریقے پر پنپنے کا موقع دیا جائے یا اگر آپ کو سلطانہ رضیہ اور یاقوت کی محبت کے واقعے کی صحت پر ہی شک ہو، تو آپ یہ دکھائیں گے کہ نسلی امتیاز کے خلاف جدّ وجہد آج سے صدیوں پہلے ہمارے ملک میں شروع ہو چکی تھی۔ جب یہ کہانی ایک نئے نقطۂ نظر کی دلیل ہوگی، تو نہ صرف لوگوں کے لیے دلچسپ ہوگی بلکہ تاریخ کی تجدید (REORIENTATION) کی صورت میں دیکھنے والوں کے علم میں اضافہ کرے گی۔ آپ رضیہ کے قصے کو کسی نظر سے دیکھیں، ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں کی ٹکر آپ کے سامنے نظر آئے گی۔ رضیہ کی ماں ملکہ شہہ ترکن اور اس کا بوڑھا وزیر جنیدی اور دوسرے ترک اُمرا نہیں چاہتے تھے

کہ ایک نچلے طبقے کا اور پھر کالا آدمی کسی قسم کی طاقت حاصل کرے۔ اس لیے انھوں نے رضیہ کی جگہ اس کے بھائی رکن الدین کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی، حالانکہ وہ ایک عیاش آدمی تھا اور زیادہ شراب پینے کے عمل نے اسے بزدل اور حکومت کے ناقابل بنا دیا تھا۔ چنانچہ رضیہ ان سب باتوں کے خلاف عملی طور پر جنگ کرتی ہے، مگر آخر کار دیکھتی ہے کہ چہ جائیکہ ترک امیر اور وزیر، اس کی اور یاقوت کی محبت کو اچھی نظر سے دیکھیں، وہ ایک عورت کے مردوں پر حکومت کرنے ہی کو اپنے لیے باعث شرم سمجھتے ہیں۔ مگر وہ ڈٹی رہتی ہے۔ خود اس کی ماں ملکہ شہہ ترکن اسے قتل کرنے کے لیے بونٹ پلاؤ میں زہر ملا کر بھیجتی ہے اور اس کام کے لیے یاقوت ہی کو گانٹھا جاتا ہے۔ مگر یاقوت جب ملکہ کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے تو اس ارادے کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ جمالیات کا احساس ایک کالے آدمی کو بھی ہو سکتا ہے اور یاقوت نہیں چاہتا کہ اتنی خوبصورت چیز کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا جائے۔ رضیہ کی زندگی کا آخری دور ہمارے اس افسانے میں مدد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ آخر میں وہ الطونیہ سے شادی کر لیتی ہے۔ اس لیے اس کہانی کو یا تو ہم وہیں ختم کر دیں گے جہاں الطونیہ دوبارہ اسٹیج پر آتا ہے اور یا تھوڑے سے تصرف سے کام لیتے ہوئے ہمیں یہ دکھانا پڑے گا کہ جب الطونیہ کے ساتھ شادی کی قربان گاہ پر اپنا سر قربان کر رہی تھی، تب بھی وہ پہلے ہی کی طرح باغی اور بیدار عورت تھی۔ البتہ کسی مصلحت کے پیش نظر اس نے ایسا کیا۔ یہاں پہنچ کر ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سوانح اور تاریخی باتوں میں آنے والے واقعات صرف افسانوی صلاحیتیں لیے ہوتے ہیں۔ بنے بنائے افسانے نہیں ہوتے۔ جس طرح عام ادب میں ہمیں زندگی میں ہونے والے واقعات میں رنگ بھرنا یا تصرّف کرنا پڑتا ہے، اسی طرح سوانحی اور تاریخی کہانیوں میں بھی، لیکن واقعات کو جھٹلائے بغیر۔ مثلاً اوپر کے قصے میں وہ واقعہ بھی لا سکتے ہیں جو مصر کی ایک ملکہ اور حبشی کے درمیان ہوا۔ ملکہ ہمیشہ حبشی غلام کے کالے رنگ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ ایک دن غلام نے کہا۔ ''ملکہ! میرے اس کالے رنگ کا چھینٹا تمھارے چہرے پر پڑ جائے تو تمھارے حسن کو چار چاند لگ جائیں۔ لیکن اگر تمھارے رنگ کا ایک چھینٹا بھی مجھ پر آ پڑے تو لوگ مجھے کہیں گے کوڑھی ہے!'' اور اسی چھوٹے سے واقعے سے ملکہ اور غلام کے رومان کی ابتدا ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ زمانہ تھا جب حاضر جوابی اور برجستگی کی بہت قدر ہوا

کرتی تھی۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر ہمارے لیے وہ نقطۂ نگاہ، وہ پراپیگنڈا مقدم ہے جسے ہم عوام کے سامنے رکھنے جا رہے ہیں۔

ایک انسان یا بہت سے انسانوں کے سوانح، جسے تاریخ کہہ لیجیے، نتیجہ ہے ٹکر کھاتے ہوئے نظریات کا۔ اور جتنی زیادہ سے زیادہ بار آپ اس ٹکر کو لائیں گے، اتنا ہی آپ کے لیے اچھا ہے۔ کیونکہ بغیر نزاع (CONFLICT) کے آپ کا کوئی ڈراما نہیں بنتا۔ سوانح اور تاریخی واقعے میں مرکزی اعتبار سے فلم کی صورت میں جو آپ دکھانا چاہتے ہیں وہ تو طے ہے ہی، مگر اس کے بعد جزئیات میں کرداروں کو مختلف نظریوں کا حامل دکھانا پڑے گا۔ گویا یہ طے ہے کہ جہاں ملک اور قوم کی ترقی میں اور بہت سی باتیں ضروری ہیں، وہاں سوانح اور تاریخ کا گہرا مطالعہ لازمی ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں میں نے جب بھرتری ہری اور گوتم بدھ کی زندگیاں پڑھیں، تو مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے سے دماغ نے، کسی مبہم طریقے سے، زندگی کی چند قدروں کی طرف توجہ دلائی تھی اور طبیعت میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اپنے ملک اور بیرونِ ملک کی بڑی شخصیتوں کے حالات پڑھے، تو میں نے راتوں رات اپنے آپ کو ان کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی حیرانی سے دیکھا کہ سب بڑے لوگوں کی زندگی میں پیار زیادہ تھا اور نفرت کم۔ نفرت تھی بھی تو اسے کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا، کیونکہ محبت کی نفرت بھی ایک اساسی جذبہ ہے جس کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ آخر کیا بات تھی جس نے طالسطائی کو YASNAYAPOLYANA کی اسٹیٹ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا اور آنِ واحد میں کاؤنٹ طالسطائی، بچوں کے استاد اور ہل چلانے والے کسان بن گئے؟ کون سی بات تھی جس نے مغربی رنگ میں رنگے ہوئے بیرسٹر گاندھی کو لنگوٹی پہنا دی؟ حقیقت وہی نہیں جسے ہم اپنے تجربے سے حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت وہ بھی ہے جو ہم دوسروں کے تجربوں میں دیکھتے ہیں۔ آج ہم گیہوں کھانے کے لیے خود گیہوں نہیں اگاتے۔ اگر گیہوں اگانے اور کپڑا بننے لگیں گے تو کتاب لکھ سکیں گے، نہ فلم بنا پائیں گے۔ آج کل کے بچے اور وہ لوگ جو صرف عمر کے لحاظ سے اُکتا چکے ہیں مگر جذباتی طور پر بچے ہیں، ان کے دماغ پر جس طریقے سے فلم کا میڈیم اثر انداز ہوتا ہے، ہم

فلم بنانے والوں پر ایک بڑی ذمّے داری عائد کرتا ہے۔ چونکہ سوانح اور تاریخ مصدقہ حیثیتوں کی حامل ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اثر ڈالنے والی ہوتی ہیں، اس لیے ہم عوام کے دماغ کی ان گنت فوٹو پلیٹوں کو لے سکتے ہیں اور ان پر تعلیم و تربیت کے نقش چھوڑ سکتے ہیں۔

سوانحی اور تاریخی فلموں کے سلسلے میں ہماری فلم انڈسٹری نے بحیثیت مجموعی لوگوں کو اچھی چیزیں دی ہیں اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ان تصویروں نے گہرا اور واضح اثر چھوڑا ہے۔ پربھات فلم کمپنی کی تصویریں ''رام شاستری''، ''سنت گیا نیشور''، ''تکارام'' آج بھی شاہ کار گنی جاتی ہیں۔ منروا مووی ٹون کی ''سکندرِ اعظم''، ''پکار''، ''پرتھوی ولبھ''، ''جھانسی کی رانی'' اور ''مرزا غالب'' ایسی تصویریں ہیں جو مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ نیو تھیٹرز نے ''راج رانی میرا''۔ ''یونٹی پکچرز'' نے ''چیتنیا مہا پربھو''۔ ''پرکاش [پکچرز؟]'' نے ''رام راجیہ'' اور ''بیجو باورا''۔ رنجیت [پکچرز؟] نے ''تان سین'' ایسی فلمیں پیش کرکے ہمارا سر فخر سے اونچا کیا ہے۔ یہ تصویریں نہ صرف ہر دل عزیز اور مقبولِ عام ثابت ہوئی ہیں، بلکہ انھوں نے لوگوں کے ذہن میں تہلکہ مچادیا ہے۔ جہاں ان فلموں میں پیش کش کا انداز بے حد خوبصورت اور پیارا تھا، وہاں کچھ ایسی بھی تھیں جن محبت کا عنصر اتنا ابھر گیا کہ اس نے سوانحی یا تاریخی شخصیت کی جامعیت کم کردی یا تاریخ کے کسی دَور کو ناچ رنگ کا دَور ثابت کردیا۔ میں خود کئی حیثیت میں فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے پروڈیوسروں کی مشکلات، سنسر کا نقطۂ نظر، عوام کی مقبولیت کا قائل ہوں۔ لیکن اس پر بھی عرض کروں گا کہ جہاں تصویر کی عوام کے نزدیک مقبولیت، فلم بنانے والوں کی زندگی کے لیے ضروری ہے، وہاں ملک اور قوم کے تئیں بھی ان کا فرض نکلتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سوانحی اور تاریخی فلمیں بنانے والا جہاں مضمون کے ساتھ انصاف کرے، اپنے ساتھ انصاف کرے، وہاں ملک اور قوم کا بھی خیال اپنے دل میں رکھے؟

آج ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔ ہماری قوم بن رہی ہے۔ دوسرا پنج سالہ منصوبہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب ہمارے راہ نماؤں کی بدولت ہے کہ انھوں نے ہمارے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک [.....] اکائی کی حیثیت سے ہم بھی قوم اور ملک کی ترقی اور بہبودی کی جدّ و جہد میں شعوری طور پر شرکت کر رہے ہیں؟ میں نہیں چاہتا کہ آج سے سو

سال بعد جب آج کے ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے تو کوئی کہے ''ملک کے دانشوروں نے اپنے راہ نماؤں سے غدّاری کی۔'' فلم انڈسٹری کے دانشوروں کے ہاتھ میں اتنا بڑا آلۂ کار ہے جس سے وہ ملک کی تعلیم و تربیت میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ سوانحی اور تاریخی فلمیں چونکہ بنیادی طور پر زیادہ پُر شکوہ، زیادہ موثّر ہوتی ہیں، اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں بے شمار عظیم المرتبت آدمی پیدا ہوئے ہیں جن کے سامنے دنیا سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ ان کی زندگیاں فلم کے پردے پر لا کر ہمیں اپنے لوگوں کے وقار کا سر اونچا کرنا ہے۔ ہماری تاریخ اتنی قدیم، اتنی حسین اور اتنی رنگین ہے کہ کہیں سے بھی اس کے دو ورق اٹھا لیجیے، آپ کو انھیں سے فلمی کہانی کا مواد مل سکتا ہے۔ ایک نقطۂ نظر اختیار کر کے، جسے ہم لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ فلم چاہے تصوّریت کی چھاپ لیے ہوئے ہو اور چاہے مادّیت کی، ہمیں روحانی مسرّت دے سکتی ہے اور پھر اس دنیا کے ٹکراتے ہوئے نظریات کا [کے؟] مابین بھی ایک جگہ ہے جسے ہم ''جیو اور جینے دو'' کے ملگجے اور فاختئی رنگ سے بھر رہے ہیں۔ اس [کے؟] تاریخی رول کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے میں اپنے فلمی دوستوں سے یہی کہوں گا

کعبہ و دیر کے مابین جگہ خالی ہے
کیوں یہ ویرانہ رہے، کیوں نہ یہ میخانہ بنے؟

[زمانۂ اشاعت دسمبر 1956]

فلم بنانا کھیل نہیں

فلم یوں تو کھیل ہے، لیکن اس کا بنانا کھیل نہیں۔ ارادے اور روپ ریکھا سے لے کر فلم بنانے تک بیچ میں بیسیوں، سیکڑوں ایسی رکاوٹیں آتی ہیں کہ بڑے دل گردے والا آدمی بھی دم توڑ سکتا ہے۔

سوشل فلم، باقی دوسری فلموں سے الگ نہیں، لیکن زیادہ مشکل اس لیے ہے کہ اس کے ساتھ آپ پر زیادہ ذمے داری آ پڑتی ہے۔ ہمارا سماج مختلف قسم کا ہے۔ کئی مذہب، نسل، صوبے، بولیاں ٹھولیاں ہیں۔ جمہوری نظام نے انفرادی طور سے سب کو بنیادی حقوق دے رکھے ہیں، اور مجموعی طور پر برابری کے حقوق۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان حقوق کے خلاف ہوں، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور سے ابھی میرے بھائیوں کو ان حقوق کا استعمال کرنا نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے جب میں نے فلم 'مرزا غالب' لکھی تو اول اور آخر ہمارے سامنے مقصد یہ تھا کہ دیش کے کونے کونے میں مرزا غالب کا کلام گونجے۔ لوگ، ان کے خیالات اور ان کی شاعری کی عظمت سے روشناس ہوں۔ کہانی تو ایک بہانہ ہوتی ہے، جس کی مدد سے آپ اس عہد کے سماج کی پرچھائیاں فلم بند کرتے ہیں۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں— '' آواز اٹھی اور نہ آنسو بہے۔ شہنشاہ ہند کی حکومت جمنا کے کنارے تک رہ گئی۔'' مغل عہد ختم ہو رہا تھا اور برٹش سامراجیت دھیرے دھیرے اپنے پنجے پھیلا رہی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مرزا صاحب جب جیل سے

رہا ہو کر اپنی محبوبہ کے یہاں آتے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ اس وقت وہ ایک سادہ مگر دکھ بھرے جملے میں اس عہد کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں ''ارے کہاں ہو دلّی والو؟..... دن دہاڑے ہی سو گئے؟'' اس پر بھی کچھ لوگوں کو سوجھی کہ مرزا صاحب کی عشقیہ زندگی کیوں پیش کی گئی؟ جیسے وہ انسان نہیں تھے۔ ان کے دل نہیں تھا۔ وہ کتنے دل والے تھے، ان کے خطوط پڑھ کر پتا چلتا ہے۔

تاریخی فلموں کا ذکر محض تذکرہ ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ کسی نہ کسی طرح سماجک پہلو لیے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا کیا جائے کہ اس کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کا اشارہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مہاراج رنجیت سنگھ کے بارے میں فلم بنانا آسان نہیں ہے۔ حقیقت سے متعلق دو مورخوں کی رائے آپس میں نہیں ملے گی۔ پھر وہ مقصد ان کی زندگی کے انفرادی پہلو کو فلم کے پردے پر نہیں لانے دے گا۔ آپ کو کئی اداروں سے کلیرنس حاصل کرنا ہوگا اور جب وہ حاصل ہوگا تو اسکرپٹ کی شکل بالکل بدل چکی ہوگی، جس میں آپ اپنا چہرہ پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ کچھ اس قسم کی باتیں ہو جائیں گی — آپ بہت اچھے ہیں، میں بھی بہت اچھا ہوں۔ تندرستی ہزار نعمت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر آپ ان کے شکوک کے خلاف جائیں گے تو مورچے لگیں گے، آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور آپ گھر کے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ آپ زیب النساء کے بارے میں فلم نہ ہی بنائیں تو اچھا ہے، کیونکہ وہ اورنگ زیب کی بیٹی تھی اور اس لیے سیزر کی بیوی کی طرح تمام شکوک اور شبہوں سے اوپر۔ عاقل خاں گورنر ملتان سے ان کی محبت کو نہ صرف مشکوک سمجھا جائے گا، بلکہ اس کی صحت، میرا مطلب ہے قصے کی صحت کو بیہودہ قرار دیا جائے گا۔ آپ دور کیوں جاتے ہیں۔ حال ہی میں ستیہ جیت رائے نے، جنھیں دنیا ایک بڑے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مانتی ہے، ایک فلم بنائی جس میں ایک نرس دکھائی گئی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر رات کو دھندا کرتی ہے۔ اب وہ ایک انفرادی بات تھی، جس کا اجتماعی طور پر نرس پیشہ عورتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پر اس پر بھی ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نرسوں نے آندولن چلایا اور شری رائے کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف لوگ 'مرزا غالب' اور 'سنسکار' جیسی فلموں کے خلاف مظاہرے کرتے ہیں اور دوسری طرف بھارت سرکار انھیں سال کی بہترین فلم قرار دیتی

ہے۔اس کے بنانے والے کوراشٹر پتی اپنے ہاتھوں سے سورن پدک اور مان پتر پیش کرتے ہیں۔

ساماجک فلم اپنے یہاں بنانے میں، اپنے یہاں دیش کے حالات بہت آڑے آتے ہیں۔مختلف گروہ، قومیں اور مقصد تو ایک طرف، خود سرکار بھی اس گناہ سے بری نہیں۔ مثال کے طور پر سرکار کی پالیسی اہنسا ہے۔لیکن اس کو کیا کیجیے گا کہ کئی ہنسا استعمال کرنے والوں کو ہم نے اپنا رہنما مانا ہے، ان کے سامنے سر جھکایا ہے اور اس کے سہرے گائے ہیں۔ میں شہید بھگت سنگھ کی مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔شہید بھگت سنگھ اول اور آخر کرانتی کاری تھے۔ وہ من سے سوشلسٹ تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ طاقت کے استعمال کے بنا برٹش سامراجیہ کا تختہ الٹنا ممکن نہیں ہے۔اب آپ ان کے بارے میں فلم بنائیں تو ایک طرف ان کو ان کے ساتھی بھگوتی چرن ورما کی بیوی کو بار بار بھابی کہہ کر پوشیدہ سیکس کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف ان کے اسمبلی میں بم پھینکنے کے واقعے کو یا تو چھوڑ دینا ہوگا اور یا پھر اس کا بیان یوں کرنا ہوگا کہ وہ صرف سامراجیہ کو چونکانا چاہتے تھے۔تبھی ایک اندرونی تضاد پیدا ہو جائے گا۔کیا لاہور میں سپرنٹنڈنٹ پولس سانڈرس کی ہتیا بھی انھوں نے انگریزوں کو چونکانے کے لیے کی تھی؟ اگر آپ ان واقعات کو ایسے ہی دکھائیں گے جیسے کہ وہ واقع ہوئے تو آپ حملوں کا نشانہ بنیں گے، کیونکہ ملک میں کئی ایسے گروہ ہیں جو گولی بندوق میں یقین رکھتے ہیں اور سرکار کی پالیسی ایسی ہے کہ وہ دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ ان کروڑوں نوجوانوں کا کیا حال ہوگا جو دن رات یونیورسٹی کیمپس میں اودھم مچاتے رہتے ہیں۔

یہ تاریخ کو چڑانے والی بات ہوگی کہ ہم کہیں کہ ہندوستان کو آزادی صرف اہنسا کی پالیسی کی وجہ سے ملی۔اس میں رائل نیوی کے ناوکوں کا بھی ہاتھ تھا، جنھوں نے گھٹیا قسم کے کھانے اور بدسلوکی کا بہانہ لے کر ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑائی لڑی، مخالفت کی اور بمبئی کی گلیوں میں انگریز کی گولیوں سے شہید ہوئے۔جلیان والا باغ کے بیسیوں سال کے بعد اودھم سنگھ نے لندن پہنچ کر مائیکل اوڈائر کو گولی ماردی اور ہماری قومی بے عزتی کا بدلہ لیا۔لیکن آپ اس سوشل اور تاریخی سچ کو مصیبت میں آئے بغیر نہیں دکھا سکتے۔اس لیے کہ برطانیہ کے ساتھ ہمارے کامن ویلتھ تعلقات ہیں، جو موجودہ بین الاقوامی حالات کو دیکھتے ہوئے، ہم کسی طرح نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حقیقت کی آنکھوں میں نہیں گھور سکتے۔

سوشل فلم بناتے وقت ہم ہر ہر قدم پر ایسے بیسیوں خطروں سے دو چار ہوتے ہیں۔ آپ قومی ایکتا پر فلم بنا رہے ہوں، تو آپ میں ہمت نہیں ہوگی کہ رانچی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے واقعات کو ان کی صحیح صورت میں پیش کر سکیں۔ کیونکہ ان میں ایک مذہب یا قوم کے لوگوں نے دوسرے پر وحشیانہ ظلم ڈھائے تھے۔ آپ ہندو مسلم فساد دکھاتے ہیں، تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ جہاں دو ہندو مرے ہوں وہاں دو مسلم مار کے دکھائیں۔ اس پر بھی نہ ہندوؤں کی تسلی ہوگی نہ مسلمانوں کی۔ دونوں آپ سے ناخوش، دونوں ناراض اور اس پر آپ کو سینسر سرٹیفکٹ لینے میں تکلیف ہوگی۔ تو آپ یہ طلبہ کے موجودہ ایجی ٹیشن کو بھی نہیں ٹٹول سکتے۔ ان کے دنگوں اور مخالفت تک پہنچے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹی کیمپس میں جو آج ہو رہا ہے، آخر ہے کیا؟ کیا صرف یہ بات ہے کہ آج کل نوجوانوں کا دماغ پھر گیا ہے؟ وہ اپنا اصل مقصد چھوڑ کر سنیاسی ہوتے جا رہے ہیں، یا وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہیں؟ آخر اس مار دھاڑ کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی تو گاندھی جی کو مانتے ہیں۔ پھر کیوں یہ لوگ ایکا ایکی اُمڑ کر مار کاٹ کرنے لگتے ہیں۔ ان باتوں کی تہہ میں جانا اور ان کے بارے میں فلم بنانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ ایسا کریں گے تو کئی ہزاروں کے پانو پر آپ کے پانو پڑیں گے اور وہ سب ہیں بڑی پہنچ والے۔ اس لیے آپ صرف گول گول دال والی بات کیجیے۔ پانچ چھ گانے ڈال دیجیے۔ دو چار ناچ۔ ماں باپ، بیٹے بیٹیوں کو بچپن ہی سے بچھڑوا دیجیے تا کہ بڑا بھائی جوان ہو کر پولس انسپکٹر ہو جائے۔ انجانے ہی میں اپنے چھوٹے بھائی کو ملزم کے طور پر عدالت میں پیش کرے اور یہ بعد میں پتا چلے کہ جج ان دونوں کا باپ تھا اور ماں جو بیٹے کے خلاف گواہی دے رہی ہے، اس کی بیوی تھی۔ پھر تو باپ کے لیے مشکل ہو جائے، ماں کے لیے مصیبت۔ نوجوانوں کے بارے میں فلم بنایئے تو صرف یہیں تک پہنچیے کہ بڑوں کا عشق، عشق تھا اور چھوٹوں کی محبت بدنامی اور بدکاری۔ اسے 'اُچت' مت لکھیے کہ شری مد بھاگوت سے لے کر ان تک استری اور پرشوں کے بیچ کیا کیا گردانیں ہوئیں۔ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ چند مصیبتوں میں پڑے، بڑوں کے پاس کوئی وقت نہیں۔ وہ انھیں سیاسی اور رہنما نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو اپنے ہی الٹے معنی پہناتے ہیں۔

اب آپ اس بدنام لفظ 'سیکس' پر آجایئے۔ ہمارا سماج یہ تو سہن کر سکتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی

ناچتے ہوئے پیڑ کے گرد یا موٹر میں بیسیوں چھچھوری اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کریں۔ لیکن باغ میں جو پیار کرنے والے کا اپنی محبوبہ کو پہلا اُپھار ہے، وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی فلموں میں دو، تین، چار ریلیں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لیتے ہیں کہ راجو کو رادھا سے محبت تھی۔ لیکن نفسیاتی بات جو چند سیکنڈ میں ثابت ہو سکتی ہے، پورا معاشرہ اس کے خلاف ہے، ہمارا سماج اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ کھجوراہو، کونارک کے وارث یہ بات کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں ــــ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس عمل کو ڈھکے چھپے ڈھنگ سے پیش کیا جائے اور فلم کسی حد تک آرٹ بھی ہے، کمرشیل اور پیشہ وروں کے ہاتھوں سے نکلتی جائے۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چند مناظر کو فلمانے کی اجازت اچھے اور بڑے فلم سازوں کو یکساں نہیں ہے۔ یوں سنسر نے اپنے لیے گنجائش رکھی ہے کہ ہر فلم اور اس میں ہونے والے واقعات کو بنانے والے کی نیت اور واقعے کی نوعیت میں دیکھا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے مان بھی لیا جائے کے سنسر کے چودھری بڑے دل والے ہیں، مگران کا کیا کیجیے گا جو پبلک کی سطح پر تصویر کو پاس کرنے کے سلسلے میں پہلے دیکھتے ہیں اور جن کا ادبی ذوق قابلِ غور ہے اور بار بار اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں ــــ ''میں فلم نہیں لکھتا، نہ دیکھتا ہوں۔''

مثال کے طور پر میں ایک فلم بناتا ہوں جس کا بنیادی خیال ہے کہ بالغ ہوتے ہوئے بچے کو جنسی تعلیم دینی چاہیے اور اسے ان تمام خطروں سے آگاہ کرنا چاہیے جو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب صاف بات ہے کہ اگر میں لڑکے اور لڑکی کے سلسلے میں کوئی لغزش نہیں دکھاؤں گا تو ڈراما پیدا نہیں ہوگا اور دکھاؤں گا تو اس کا حل مجھے وہی پیش کرنا ہوگا، جو مقبول ہے اور وہ نہیں جو نفسیاتی ہے۔

حال ہی کی بات ہے، میں ایک فلم بنا رہا تھا، جو نفسیاتی تھی۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر کسی اور لڑکی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس عورت کے ایک بچی پیدا ہوتی ہے۔ جوان ہو کر وہ شادی کرتی ہے، پر ماں بیٹی کے ساتھ یوں چپک جاتی ہے کہ داماد کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی اور داماد کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ لیتی ہے، اور ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو اپنی بیٹی کی جگہ پروجیکٹ کر دیتی ہے۔

انسان اپنے دماغ میں کئی بار ایسی ایسی باتیں سوچ لیتا ہے جو ساماجک اور اخلاقی نظریے سے قبول نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے، چاہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت بڑا پاپی اور گناہگار سمجھے۔ اس لیے ایسا ہی ہوتا ہے، ساس ایک لمحے کے لیے رک تو جاتی ہے، پر فوراً ہی چونک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے اور احساس گناہ سے اُوت پروت مندر میں جا کر بھجن گانے لگتی ہے —
'مورے تو گردھر گوپال دوجا نہیں کوئے'

اس سین کو فلمایا تھا کہ میری ہیروئن نے اس پر اعتراض کیا "یہ کیسا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا "ہوتا ہے میڈم۔ اور پھر جب یہ دکھلاتا ہوں کہ وہ ایک گنہگار ہونے کے جذبے سے شرمندہ ہو کر سیٹ سے چلی جاتی ہے، تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟" میڈم نے وہ سین کر تو دیا، پر سوچتی رہی کہ اس پر پبلک سے جوتے پڑیں گے۔ میں نے اس پر بھی کہا کہ جوتے جو پڑیں گے، آپ مجھے بھیج دیجیے، میرے اپنے جوتے پرانے ہو گئے، بلکہ پھٹ چکے ہیں۔

سوشیل فلم بنانے والے کی حیثیت اس عورت کی طرح ہے جو غرارہ پہنے ہوئے کسی پارٹی میں گئی اور جب لوٹی تو برسات ہو چکی تھی اور گھر کے سامنے پانی ہی پانی تھا۔ اس کے مرد نے سر والٹر ریلے کی طرح راستے میں اینٹیں اور سلیں رکھ دیں اور وہ غرارے کو سنبھالتی ہوئی چلی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ایک اینٹ ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دھپ سے پانی میں گری — غرارے سمیت! ساودھانی اُسے لے ڈوبی۔

نابابا۔ سماجک فلم بنانے میں بڑی جوکھم ہے۔ چاروں طرف سے آپ ننگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بدن پر کھال نہیں اور نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔

فلمیں ساماجک اور دوسری کن حالات میں بنتی ہیں، اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ نام کی ہمیں پوری آزادی ہے۔ مگر اس کے بعد جو مراحل پیش آتے ہیں، اس عالم میں مجاز کا شعر یاد آ جاتا ہے:

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

سچ، نہ کسی کے حلق سے اُترا ہے، نہ اُترے گا

ہم ہیں متاعِ کوچۂ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

طوائف کے موضوع پر جتنی فلمیں بنیں، وہ بنیادی مسئلے کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی نہیں ہیں۔ اس میں کوتاہی فلم بنانے والوں کے ساتھ ساتھ حکومت کی بھی ہے، معاشرہ اور حکومت دونوں چاہتے ہیں کہ یہ پیشہ جڑ سے ختم ہو جائے۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن دونوں دو غلے اصول اپنا رہے ہیں۔ اگر مسئلے پر پڑے پردے کو ایک انچ بھی ہٹا کر، اصلیت پردے پر دکھائی جائے، تو کیا سینسر بورڈ اسے پاس کر دے گا؟ میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

میں نے فلم ''دستک'' بنائی جس میں حقیقت کا ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا یوں پیش کیا کہ میری ہیروئن، جسم پر ہلکی سی چادر صرف گھٹنوں تک اوڑھے، گا رہی ہے: 'مائی ری میں کا سے کہوں، پیر اپنے جیا کی'۔

یہ فلم کا وہ کردار ہے جس کا تعلق اس خاص پیشے سے نہیں ہے، لیکن صرف اسی نیم عریاں منظر کی وجہ سے میری فلم کو 'اے' سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ میں نے اس بارے میں انھیں کافی سمجھایا، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ان حالات میں فلم ساز بھی کیا کر سکتا ہے؟ اس بارے میں انھوں نے جان بوجھ کر پیشہ ورانہ نقطۂ نظر اختیار کر رکھا ہے۔ اس معاشرے میں سچ نہ کسی کے حلق سے اُترا

ہے اور نہ اُترے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس پیشے نے لاتعداد عورتوں کو انسانی درندوں کے چنگل میں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ لیکن اس کا حل؟

میں نے اپنی بات مجروح کے ایک لاجواب شعر سے اس لیے شروع کی ہے کہ فلموں کی رنگینی اور اس کے مکالمے سب کچھ تو کوچۂ و بازار میں رکھے ہیں۔ اس بازار کے نقاب پوش چہروں کے پیچھے چھپی حقیقت پر ضرب لگانے کے لیے آخر کون فلمی دنیا کو آلۂ کار بنائے گا؟— یہ بھی تو اسی کا حصہ ہیں۔ وہ ہمت نہیں کر سکتے اور حکومت انھیں چھوٹ نہیں دے سکتی۔

اس موضوع پر جتنی فلمیں بنیں، ان میں سے کئی پُر اثر ثابت ہوئیں— کیوں؟ اس لیے کہ جو مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہوتا ہے، ناظر اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتا ہے۔ مثلاً ''امراؤ جان'' کچھ سال بعد پھر بنائیے، پھر چلے گی۔ ہم حقیقت سے روگردانی کب تک کر سکتے ہیں؟ وطن اور معاشرے سے ہی تو فلمیں بنتی ہیں۔ حالات کی تصویروں کو شکل بیانی، خریداروں کا زاویۂ نظر بدل سکتی ہے لیکن شرط ہے کہ حالات بھی تو سُدھریں۔ ورنہ طوائفوں پر فلمیں بنتی رہیں گی، ناظرین دیکھتے رہیں گے، حکومت اور معاشرہ فلاح و بہبود پر تقریریں کرتے رہیں گے اور وہ، چپ چاپ، کوٹھوں پر خریداروں سے اپنی آواز اور جسم کا مال بھاؤ کرتی رہیں گی اور فلم والے اسے کیمرے کی خوبصورتی میں قید کر کے بیچتے رہیں گے۔

(تاریخ اشاعت 26 دسمبر 1982)

اظہارِ خیال

کیا آپ ''کُن فیکُون'' پر یقین رکھتے ہیں؟ آپ مسلمان اور دیندار ہونے کے ناطے رکھتے ہوں گے، لیکن میں ''اظہار'' کے اجرا کے سلسلے میں رکھتا ہوں۔ اگر آپ کافر ہیں تو فضیل جعفری کا اداریہ پڑھنے کے بعد مسلمان ہو جائیں گے، لیکن بیعت باقر مہدی کے ہاتھوں پر کریں گے۔ آخر اللہ نے بھی تو ارادہ کیا، نیت ہی باندھی — اور عالم پیدا ہو گیا۔ اسی طرح باقر مہدی، فضیل جعفری، عزیز قیسی، عالی جعفری، محمود چھاپرا، اور دوسرے دوست۔ چاہے جامعہ کے شاہد علی خاں ہی کے یہاں اکٹھے ہوئے، باہر ہی فٹ پاتھ پر بیٹھے، مگر نیت باندھی اور اظہار کا اجرا ہو گیا۔ اگر جوگندر پال کے افسانے ''ٹوٹی پھوٹی کہانی'' کے اس فقرے پر غور کیا جائے — ''کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں، جو چلے جاتے ہیں، وہ مر جاتے ہیں؟'' — تو آپ کو اس بات کا بھی یقین ہو جائے گا کہ تصدیق سہادری بھی اس وقت ہمارے درمیان ہیں اور ''اظہار'' کا یہ پہلا شمارہ ہاتھ میں لیے خوش ہیں، اور شاید — میری ہی کہانی پڑھ رہے ہیں!

جب آپ مادّہ (Mass) پیدا کرتے ہیں تو روح اپنے آپ اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ ایسے میں صوفی اور مارکسسٹ کا جھگڑا فضول سی بحث ہو کر رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ 'ادب برائے ادب' 'ادب برائے زندگی' وغیرہ۔ اور ہم سوچتے ہیں کہ بیکار ہی ہم آسکر وائیلڈ کو گالی دیتے رہے، جس نے کہا تھا کہ — ''بڑا ادب زندگی اور قدرت کی طرف لوٹنے اور اسے نصب العینی مرتبہ دینے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب جب اپنے تخیلی حصے سے کٹ جاتا ہے تو اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا

ہے......'' اور اس بات پر ہمیں اور بھی صدمہ ہوا تھا، جب اِنھوں نے کہا تھا کہ ''فن کا مقصد ہے— جھوٹ بولنا...... اُن بے بنیاد مگر خوبصورت باتوں کا ذکر کرنا جو...... '' وغیرہ۔ حالانکہ آج ہم اِس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ پیداوار، اس کے ذرائع اور تقسیم ہی کے سلسلے انسانی رشتوں پر حاوی نہیں ہیں۔ جب ان کا حاوی ہونا اشتراکی ملکوں میں عادتاً دکھایا جاتا ہے، تو وہ ہمیں فن سے اتنا ہی گرا ہوا معلوم ہوتا ہے، جتنی اخلاق سے گری ہوئی کوئی حرکت— عجیب بات ہے نا کہ ایک لڑکی، لڑکے سے صرف اس لیے محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی نوع کا بیستوں کاٹ کر اُس میں سے فاسفیٹ لے آیا، اپنی کھیتی میں ڈالا، جس کے نتیجے کے طور پر اس میں معمول سے دس گنا اناج پیدا ہو گیا اور لڑکی کی عقل اس میں دفن ہو گئی۔ ہم اس قسم کی اُول جلول باتیں کریں تو پھر بھی کوئی قبول کر لے— لیکن اس اشتراکی نظام سے [کو؟] جو عقلِ محض اور سائنس کو خدا سے برتر سمجھتی ہے، لیکن سائنس کی ایک شاخ کیمسٹری کو بھول جاتی ہے، جو بدقسمتی سے ہر لڑکی کے بدن میں ہوتی ہے اور کسی قانون کو مانتی ہی نہیں۔ اگر اساطیری لہجے کی جگہ، مشین 557 کی کھڑ کھڑ نے لے لی، تو پھر فرق ہی کیا رہا؟ آسمان سے گر گرا کر کھجور ہی میں اٹکنا ہے، تو پھر اُڑیں ہی کیوں!

''اظہار'' اپنے معنوی اعتبار سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہم جو کہیں گے کھل کر کہیں گے، سامنے آ کر کہیں گے۔ حدِّ ادب کا وعدہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ کیونکہ کچھ کام ایسے ہیں جو صرف گالی ہی سے نکلتے ہیں۔'' آپ کی والدۂ ماجدہ کی شان میں گستاخانہ بات کہہ دوں گا۔'' اس ضمن میں ایسا کلمہ ہے جو تہذیب کو غیر مہذب بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اظہار'' کی سب سے مکمل کہانی ہے: ''ٹوٹی پھوٹی کہانی''۔ زندہ کہانی: ''کٹا ہوا سر'' اور خاموش کہانی: ''بولو''— قاضی سلیم ''فرار'' سے [''فرار......'' میں] میں نبرد آزما ہوتے ہیں زندگی سے، اور باقر مہدی کی ''بزدلی'' اُس کا مریڈ کو برہنہ کرتی ہے جو زندگی بھر خوف سے جہد کرتا ہوا آخرش تصوف کے پردے میں چھپ گیا ہے۔ جب کہ سر اس اب گلی گلی چھایا ہے!

''اظہار'' کا اجرا اس لیے بھی مبارک ہے کہ ابھی تک مکمل زندگی سے ہمارا واسطہ نہیں۔ اگر ہم اگاتھا کرسٹی، رابنز وغیرہ کو نہیں بھی پڑھتے تو مشی ما، کاواباٹا اور ہنریخ بوئیل کو پڑھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں سے دو موخر الذکر ہستیوں کو نوبل پرائز ملا تھا، بلکہ لامعنویت، ترسیلی

مشکلات اور بیگانگی، تنہائی اور وجودیت کی تلاش میں، جس کی تھاہ اس ملک کے رشی منی صدیوں پہلے پا چکے ہیں، ان کے حصّے بخرے کر کے، چیتھڑے اُڑا چکے ہیں ان کے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب بارہ کوس میں ایک دیا جلتا تھا، اب ایک کوس میں بارہ ہزار جلتے ہیں۔ ہم ہر وقت ہر گاہ اپنے کی بجائے کسی دوسرے کا تجربہ لکھنے پہ کیوں آمادہ رہیں؟ سارتر ہی کیوں ہمیں راستہ دکھائے، زندگی سمجھائے؟ میں انسان کے ان پڑھ ہونے کا جواز پیش نہیں کر رہا، لیکن اُس وشو ودیالیہ، اس یونیورسٹی کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس کا کوئی وائس چانسلر نہیں، کوئی گھراؤ نہیں۔ جہاں سے پڑھنے کے بعد کوئی ڈگری دار بیکار نہیں۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کسی کتاب ہی کا سہارا کیوں لیں، جب کہ زندگی ورق ورق ہمارے سامنے کھلی ہے؟ نہیں صاحب، ہمارا اور چند لوگوں کا کوئی میل نہیں — بالکل ہی نہیں کیونکہ وہ عقلی یا جذباتی طور پر نقال ہیں، سرقہ کرتے ہیں۔ تلسی داس کہتے ہیں:

تیرا میرا منوا کیسے اِک ہوئی رے؟
تو کہتا ہے کاگت کی لیکھی،
میں کہتا ہوں — آنکھن دیکھی
تیرا میرا منوا کیسے اِک ہوئی رے؟!

ناصاحب — ہم اپنے قلم سے اپنی بات لکھیں گے، ہم ہندوستانی — جب تک ہم اپنے گرم خانوں میں یہاں کی خس نہیں لگاتے، نہ ٹھنڈک آئے گی اور نہ خوشبو!

یہ سرقہ یا نقالی ایسے ہی ہے، جیسے میں نے اپنا ناول ''ایک چادر میلی سی'' اردو میں لکھا لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس کا پنجابی ترجمہ پہلے شائع ہو گیا اور لاہور کے ایک رسالے نے پنجابی سے اس کا اردو ترجمہ کر کے چھاپ ڈالا۔ میں نے پڑھا تو یوں لگا جیسے اس کے لکھنے والے کوئی بیدی حسن ہیں اور سُر میں بھی نہیں!......

''اظہار'' میں ایک بات چیخ کی صورت اختیار کر گئی ہے — چیخ اس لیے کہ جب کسی کو بات کرنے سے منع کیا جاتا ہے، اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں تو وہ آدمی نہ صرف جھٹکے سے ہاتھ ہٹا دیتا ہے، بلکہ جو آواز اس کے منھ سے نکلتی ہے وہ معمول سے سوگنا زیادہ اونچی ہوتی ہے۔

نہ صرف ہماری نظمیں، ہمارے افسانے، ہمارے ناول، بلکہ ہماری تنقید بھی چربا ہوتی

جارہی ہے۔ بالاستثنیٰ چند نقادوں کے۔ مثلاً وارث علوی، باقر مہدی، اور دوسروں کے۔ ہماری تنقید بھلمنسیت کا کفن اوڑھے ہوئے ہے ــــ اور اس بات کو بھول گئی ہے کہ جب تک آپ نوا کو تلخ تر نہیں کریں گے، بہتری کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اگر آپ زندگی سے واقف ہیں تو آپ کو پتا ہوگا کہ اکثر غنڈے، بدمعاش آدمی ہی کی اولاد شریف ہوتی ہے اور شریف ماں باپ کی اولاد چاروں عیب شرعی۔ یہ رازِ درونِ زندگی کون سمجھائے، کیسے سمجھائے؟ پرانی تنقید کا عالم مجھے یاد ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کی تحریریں پڑھنے کے بعد میں نے کہیں بھولے سے ''ادبی دنیا'' کے اڈیٹر صلاح الدین صاحب سے کہہ دیا: مولینا! آپ یلدرم صاحب اور پریم چند کا نام ایک ہی سانس میں کیوں لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک ترکی افسانوں کے چربے اتارتے ہیں اور دوسرے طبع زاد چیزیں پیش کرتے ہیں؟ بس صاحب کفر و الحاد ہوگیا، میری سانس کھینچی تنقید کے جواب میں مولینا ''ادبی دنیا'' کے اگلے شمارے میں لکھتے ہیں ــــ ''چند ایسے نوجوان پیدا ہوگئے ہیں جو اپنی ننھی منّی داڑھی ہلا کر سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں کہتے ہیں'' وغیرہ! اور یقین جانیے کہ میں آج تک اس تنقید کا تعلق اپنی داڑھی سے پیدا ہی نہیں کر سکا۔ ایسے ہی شریف النسل نقاد ''کلیانی'' پر تبصرہ کرنے سے گھبراتے ہیں، جب کہ انگلینڈ کا سب سے بڑا محقق ''اوہ کلکتہ'' کے سے فحش ڈرامے کو سماجی اہمیت کی سند دیتا ہے۔ ان نقادوں سے مجھے یہ شکایت نہیں ہے کہ وہ جیسی تیسی بھی تنقید کیوں کرتے ہیں، بلکہ یہ کہ بہتوں کو ان کی تحسین ناشناسی نے مارا ہے۔ وہ ادیب سمجھتے رہے کہ وہ انھیں اپنے گروہ، اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لیکن بعد میں انھیں پتا چلا کہ بے چارے خود استعمال ہوگئے اور اب چائے کی استعمال شدہ پتی کی طرح نالی میں پھینک دیے گئے ہیں۔

حال ہی میں لاہور کے ''نقوش'' کے اڈیٹر محمد طفیل نے میرے پاس اپنا تازہ پرچہ بھیجا۔ چونکہ پاکستان کے ساتھ خط و کتابت عرصے سے بند تھی، اس لیے وہ میرے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ میں ایک سِلور فش کی طرح اسے شروع سے آخر تک چٹ کر گیا۔ اس میں بنگلہ دیش بننے سے پہلے کے مسعود مفتی کے خط طفیل صاحب کے نام اور طفیل کے مسعود مفتی کے نام پڑھے۔ ظاہر ہے اس وقت پوری دنیا میں قوم پرستی (CHAUVINISM) کا دور دورہ ہے اس لیے ان سب میں پاکستانیوں پر کیے گئے مظالم کا ذکر تھا، لیکن ان دانشوروں کا نہیں جنھیں یونیورسٹیوں سے چن

چھن کر باہر نکالا اور گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ ساتھ مسعود مفتی کا افسانہ "تشنگی" بھی تھا اس میں، جو ایک نہایت معرکے کا افسانہ ہے۔ لیکن صاحب پورے پرچے میں عجیب سینہ کوبی کا عالم تھا۔ چنانچہ میں نے انھیں لکھا۔۔۔ میں نے آپ کے سب خطوط پڑھے ہیں، طفیل صاحب۔۔۔ اور وہ بھی پڑھ لیے جو آپ نے نہیں لکھے۔۔۔ مسعود مفتی کا "تشنگی"، عصمت چغتائی کا تجریدی افسانہ "گلدان" بہت عمدہ ہیں"۔

طفیل صاحب میری بات نہیں سمجھے۔ شاید آپ بھی نہ سمجھیں۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آنے کی بجائے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر سرحد کے پار ایک چین اسلامی کوشش ہے تو اِدھر ہندی کی یورش۔ حال ہی میں دھرم ویر بھارتی اڈیٹر "دھرم یگ" نے ویکلی میں ہندی ساہتیہ پر ایک مضمون لکھا جس میں اردو کو ہندی کی ایک شیلی (صنف) قرار دیا۔ اوّل تو میں اس بات کو نہیں مانتا کہ اردو ہندی کی شیلی ہے کیونکہ اس کی تاریخ موجود ہے۔ ہندی کی تاریخ سے کہیں پرانی برج بھاشا، اودھی، مگدھی تحریریں تھیں جو گوشوں کونوں میں پل رہی تھیں اور آج سے کہیں ڈیڑھ سو سال پہلے آریا سماج کی معرفت ہندی بھاشا کی موجودہ شکل لے کر سامنے آئیں۔ تاہم اگر اسے ہندی کی شیلی مان بھی لیں تو پھر یہ کیا بے ایمانی اور ریا کاری ہے کہ دھرم ویر بھارتی ہندی کی اس شیلی کے ایک بھی مظہر کا نام نہیں لیتے۔ ناگپور میں ہندی کانفرنس ہوتی ہے۔ جرمنی اور ملیشیا سے ہندی اسکالر منگوائے جاتے ہیں، لیکن اس ملک سے اس شیلی کا ایک بھی نہیں۔ دکھاوے کے لیے اردو کے ایک ادیب کو انعام سے نواز دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بے چارے کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے "دیوانِ غالب" ایک طرف فارسی رسم الخط اور دوسری طرف دیوناگری میں چھاپا! ع

بے خیالت مباد منظرِ چشم
زانکہ این گوشہ جایِ خلوتِ اوست

حال میں اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ وہ اردو کے ادیبوں کی تحریریں نہیں چھاپیں گے کیونکہ وہ انھیں گالی دیتے ہیں، حالانکہ اردو کی حالت اُس بھیڑ کی سی ہے جو کہ بھیڑیے کی طرف سے آنے والے پانی کو پی رہی ہے!

دوسرے ''اظہار'' ہی کے ذریعے سے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ 'دروغ گورا حافظہ نہ باشد' کے انداز میں باتیں مت کیجیے۔آپ کا ہر ادیب ایشیا کا سب سے بڑا ادیب ہوتا ہے۔فلاں شاعر — ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔فلاں افسانہ نگار ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار — ارے آپ نے اپنے گھر سے نکل کر ترچناپلی نہیں دیکھی۔ آپ کس ایشیا کی بات کر رہے ہیں۔اس سے مجھے عالمی مقابلۂ حُسن کی یاد آتی ہے، جس میں ہر دیس، ہر ملک سے لڑکیاں کیا کیا منزلیں پار کر کے آتی ہیں۔اپنے ضروری اعضا (معاف کیجیے VITAL STATISTICS کا مجھے ترجمہ نہیں ملا) برہنگی کے عالم میں منصفوں کو دکھاتی ہیں، انعام پاتی ہیں، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ دنیا کی حسین ترین عورت شاید بنکوک کے پاس ایک گانو سے نے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔

یہ پرائز اور نوبل پرائز — جینندر کمار کو مل سکتا ہے (اگر چہ کوشش کے باوجود نہیں ملا) دھرم ویر بھارتی کو مل سکتا ہے (بشرطیکہ آسمان کے آٹھویں گھوڑے پر سوار ہوں) آر۔کے۔نرائن کو مل سکتا ہے (اگر وہ مال گاڑی [مال گڈی؟] سے باہر نہ نکلیں تو) اس لیے نہیں کہ وہ اس کے حقدار ہیں بلکہ اس لیے کہ — ''کمال ہے، رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد اب تک کسی ہندوستانی کو نہیں ملا! حالانکہ روس اور امریکا کے بیچ کتنی خوبصورت TIGHT ROPE WALKING کر رہے ہیں!''

''اظہار'' کے نکالنے والے آزاد ہیں۔اس قدر آزاد کہ ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں۔ پورا پرچہ بک جانے پر گھاٹے میں رہیں گے۔پھر انھیں کس بات کی فکر؟ ایک ہاتھ آگے ایک پیچھے۔یہ دیو جانس کلبی ہیں۔جس نے سکندر سے کہا تھا — ''ذرا دھوپ چھوڑ دو — '' ان کے پاس کچھ نہیں ہے مگر ہمّت ہے۔پیسا ہمّت سے پیدا ہوتا ہے، پیسے سے بل بہت پیدا ہوتا ہے لیکن آخر ہمدرد دواخانے اور ڈاکٹر کے حمید کے پاس پہنچ جاتی ہے — صرف ہمّت کے بل بوتے پر یہ لوگ اتنا حسین اظہار کیسے کر گئے، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔اس بات کا اس لطیفے سے کوئی تعلق نہیں، جس میں کچھ روسی ہندوستان میں آکر خدا کو مان گئے — اس لیے کہ یہ ملک کیسے چل رہا ہے؟!

[زمانۂ تحریر فروری 1975]

علی گڑھ میں خطاب

[آلِ احمد] سرور صاحب کی استقبالیہ تقریر کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک سرور صاحب تقریر کرتے رہے، میں یہی سوچتا رہا کہ میں اپنی تقریر کس طرح شروع کروں گا۔ افسانہ لکھتے وقت بھی مجھے یہی دقت پیش آتی ہے۔ اس کا پہلا فقرہ میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتا ہے اور جب تک میں اسے پا نہیں لیتا، میرا افسانہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بیدی نے کہا، میں سرور صاحب کو پچھلے پچیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ہر فن کار کو ابتدا میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی صلاحیتوں کی پُر خلوص داد دیں۔ اس سے اس کے فن کو تقویت پہنچتی ہے اور اسے اپنا راستہ تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے سرور صاحب کی محبت و شفقت اور ان کی ناقدانہ بصیرت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے تبصروں میں میرے افسانے کی خصوصیات اجاگر کیں، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ان افسانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اِنھوں نے اپنے خطوط میں مجھے صحیح مشورے دیے۔ میں اِن کی اس محبت کی بے حد قدر کرتا ہوں۔

اپنے ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کے بارے میں بیدی صاحب نے کہا کہ اس میں میں نے وہ زندگی پیش کی ہے، جسے میں نے بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ یہ کہانی میرے اپنے

گاؤں کی ہے اور اس کے بہت سے کردار حقیقی ہیں۔ میرے دوست ملک راج آنند نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ''فن اسی وقت بلند پایہ ہو سکتا ہے، جب فن کار اپنی ذات اور اپنے ماحول کے اندرون میں جھانکتا ہے اور اس کے رشتوں کی گرہ کھولتا ہے۔'' میں نے ان کے اس مشورے پر اکثر عمل کیا ہے۔ میں نے دوسری زبانوں کے عظیم فن کاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہا کہ ان فن کاروں کی گرفت زندگی پر جتنی مضبوط ہے، وہ بات ہمارے یہاں نہیں ملتی۔ ہمارے ناول غیر ضروری تفصیلات اور بے معنی جزئیات کا ایک پشتارہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ ایک اکائی نہیں بن پاتے۔ ناول نگار اگر ناول کے اندر فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دے یا عملی مسائل پر تھیسس لکھنے بیٹھ جائے تو یہ فنی عیب ہے، خواہ یہ عیب ٹالسٹائی اور رومین رولاں کے یہاں کیوں نہ ہو۔ مغرب کے ناول نگاروں نے آہستہ آہستہ اس عنصر کو کم کیا ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں اب لمبی لمبی تقریریں نہیں کرتے، پند و نصائح کے دفتر نہیں کھولتے، نہ شاعرانہ اور انشا پردازانہ لفاظی کرتے ہیں۔ البتہ مصوری اور موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی نزاکتیں بہت سلیقے سے پیدا کرتے ہیں، جس سے ناول کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہیمنگ وے کے بعض ناولوں کی مثال دیتے ہوئے اس کی فن کاری، رمزیت اور مسائل حیات پر اس کی گرفت کو بیدی نے سراہا اور کہا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ اردو میں اس طرح کا ناول لکھوں جو ایک وحدت بن سکے اور زندگی سے اس کا رشتہ حقیقی اور گہرا ہو۔

''ایک چادر میلی سی'' میں میں نے یہ کوشش کی ہے۔ اب ایک اور ناول لکھ رہا ہوں جو مجھے امید ہے کہ ایک سال کے اندر مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام 'نمک' ہے۔

اپنے ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کے بعض اقتباسات بیدی صاحب نے پڑھ کر سنائے اور خاص خاص نکات کی نشان دہی کی۔

سرور صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ ''فلم نے ان کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچا ہے؟'' بیدی صاحب نے کہا کہ قطع نظر اس کے کہ فلم سے مجھے مالی فائدہ ہوا، سب سے بڑا فائدہ میری افسانہ نگاری کو پہنچا۔ فلم ایک ایسا وسیلہ ہے جس میں شاعرانہ یا انشا پردازانہ زبان یا اکتسابی طرز تحریر نہیں مقبول ہو سکتا۔ یہاں زبان کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور بول چال سے قریب رکھنا پڑتا

ہے۔ میں ابتدا میں ادبی زبان لکھا کرتا تھا اور اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی، اس لیے میں غلط زبان بھی لکھ جاتا تھا جس کی اکثر شکایت کی جاتی تھی۔ میرے مزاج کو فطری طور پر اس سے مناسبت نہیں تھی، لیکن ہماری ادبی روایات ہی ایسی تھیں اور ہر ادیب یہ سمجھتا تھا کہ اسے ادبی زبان لکھنی ہے۔ حامد علی خاں ایڈیٹر ہمایوں نے میرے بارے میں ایک بار کہا تھا کہ ''بیدی کا فقرہ اُٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ جاتا ہے۔'' آج میں نے اس طرز سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور اپنے آپ کو سادہ اور بول چال کی زبان کا پابند کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میرے فقرے حقیقی بھی ہوتے ہیں اور ان میں جان بھی ہوتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ''اب میرا فقرہ بیٹھنے سے پہلے ہی اٹھ جاتا ہے'' اور یہ فلم کی دین ہے۔

[سیّد مسعود علی] ذوقی صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ ''پچھلے پندرہ بیس سال میں فلم نے کیا ترقی کی ہے'' بیدی صاحب نے فلمی زندگی، فلم پروڈیوسروں کے طرزِ عمل اور ان کی تاجرانہ ذہنیت کا ذکر کیا اور کہا کہ مجموعی طور پر فلم کا فن زوال پذیر ہے۔ معیاری اور سنجیدہ فلم بہت کم چلتے ہیں، یہاں تک کہ اُن فلموں سے بھی مالی منفعت زیادہ نہیں ہوتی، جن پر ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ فلم ساز، سستی، سطحی اور سنسنی خیز فلموں کے بنانے پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

[زمانۂ اشاعت 8 مارچ 1966]

قلم اور کاغذ کا رشتہ

دوستو!

میں تقریباً دو سال سے بیماری کے مختلف مدارج طے کر رہا ہوں۔ اب پچھلی سی شدت میری بیماری میں باقی نہیں ہے، پھر بھی میرے لیے لکھنا خاصا دشوار مرحلہ ہے،

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ وعدۂ الفت
فقط 'خراب' لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

میں اپنی سعی تحریر کے بارے میں کیا لکھوں؟ یہ کوشش ناتمام 'دانہ و دام' سے شروع ہوتی ہے۔ ''گرہن'' 'کوکھ جلی' 'اپنے دکھ مجھے دے دو' 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ایک چھوٹا سا ناول 'ایک چادر میلی سی' ہے۔ دوسرا قدرے طویل ناول 'نمک' ہے جو میری بیماری کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا ہے۔ دو ڈراموں کے مجموعے ہیں 'سات کھیل' اور بے جان چیزیں۔ میں اصل میں کوئی ''زود گو'' ادیب نہیں ہوں۔ میں قلم اٹھا کر کاغذ کو سیاہ کرنا چاہوں بھی تو کبھی قلم رُک جاتا ہے اور کبھی کاغذ کی معصومیت آڑے آجاتی ہے۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے مجھے انعام کے قابل سمجھا۔

یہ بھی سچ ہے کہ زندگی کا بیشتر حصہ لکھنے میں صرف ہوا ہے۔ یعنی لکھنے کے بارے میں سوچنے سمجھنے اور پھر کبھی کبھی لکھنے میں۔ لکھنا میرے لیے عذاب نہیں رہا ہے۔ شروع شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر تجربے اور خیال کو کاغذ پر اتار دوں، مگر آہستہ آہستہ فنی شعور کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کبھی کبھی یہ گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ میں مہینوں کوئی افسانہ نہ لکھ پایا۔ گاہے گاہے ایسا بھی ہوا ہے کہ قلم روکے نہیں رکتا تھا۔ شعور اور لاشعور میں کوئی اتنی سیدھی جنگ نہیں ہوتی ہے کہ صفحۂ قرطاس

پہ خون خرابے کی نوبت آئے۔ مگر ایک کشمکش تو چلتی ہی رہتی ہے۔ وہی ہیملٹ کا تجزیاتی سوال، یعنی کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟

اور پھر افسانہ کیا ہے؟ یہ سوال میرے افسانوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ یوں کہ کبھی ایک بچے کو[کی؟] کہانی سنانے کا خیال آیا تو 'بھولا' لکھی۔ کبھی ایک اور بچے کے ذریعے آج کے روز[دَور؟] کی سیتا کی چتا لکھنی ہوئی تو 'بتل' لکھی۔ بچے اور کہانی کا بڑا ربط تھا، ہے اور رہے گا، اس لیے کہ کہانی سننے کی خواہش ہی افسانہ نگار کو کہانی لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ تکنیک بدلتی رہتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی دل چاہا ہے کہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہنگامہ زار پر بھی نظر ڈالی جائے، تو میں نے 'جنازہ کہاں ہے؟' لکھی۔ اور جب دہشت و جرم کی فضا کو مسلط ہوتے ہوئے دیکھا تو 'بولو' لکھی۔ غرض کہ کم لکھتے ہوئے بھی اسی کہانیاں پینتالیس سال میں لکھی ہیں اور اب بھی لکھنے کی خواہش ہے۔ اپنے ہاتھوں میں قلم اٹھا کر، کاغذ پر نظریں جما کر دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کسی نے کہا تھا:

کبھی پہلے سے کاغذ پر سیاہ لفظوں میں کچھ لکھنا
کبھی نظروں سے لکھ کر یوں ہی کاغذ کو جلا دینا

یعنی قلم اور کاغذ کا رشتہ قائم ہے اور میں ضرور لکھوں گا۔

نہ جانے کب فلابیر نے موپاساں سے کہا تھا کہ دیکھو وہ سامنے پیڑ ہے، اس کے بارے میں کہانی لکھ لاؤ اور جب موپاساں کہانی لکھ کر لے گیا، تو فلابیر نے کہا، تم تو جانے کیا لکھ لائے؟ شاخیں، پتیاں، پھل وغیرہ بھی ہیں، پر کہانی پیڑ کے بارے میں کہنی تھی۔ پیڑ کے جسم کی ANOTOMY کے بارے میں نہیں۔ اور نہ جانے کتنی بار موپاساں کو پیڑ پر نظریں جما کر اُس کے آر پار دیکھنا پڑا اور پھر وہ پیڑ کی کہانی لکھ پایا۔ پتا نہیں میں ایسے تجربات و خیالات سے پیڑ کی پوری ترجمانی کر رہا ہوں یا نہیں۔ مگر میری کوشش یہی رہی ہے کہ پورے پیڑ کی کہانی نہ سہی، کسی ایک شاخ، کسی پھل، ہرے یا زرد پتے کی کہانی لکھوں۔ کبھی کبھی پیڑ کے بارے میں کم، اس کی جڑوں کے بارے میں زیادہ لکھ گیا ہوں کہ اصلی پیڑ تو زمین کے اندر ہی ہے۔ پتا نہیں کیا لکھنا چاہتا تھا، کیا لکھ گیا ہوں۔ مگر جو لکھا ہے وہ پوری ایمانداری اور جتن سے لکھا ہے۔ شاید اسی لیے اب بھی لکھنے کی خواہش باقی ہے۔

[زمانۂ تحریر: 1980]

مختصر افسانہ

ایک محاورہ ہے— "جتنے منھ اُتنی باتیں۔"

اس لیے مختصر افسانے کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔
جہاں تک کہانیوں کا تعلق ہے "پنچ تنتر" کے قصوں اور "الف لیلیٰ" کی داستانوں سے لے کر بریٹ ہارٹ اور جونا بارنے تک بیچ میں ہزاروں ہی لوگ آئے اور اپنی بات، اپنے ہی منفرد طریقے سے کہتے رہے۔ کسی نے رومان کو اپنا ایمان بنایا اور تحیر کے عنصر کو کہانی کی جان قرار دیا؛ پڑھنے والے کو ایسی پٹخنی دی کہ ہوش آ گئے یا اُڑ گئے! (تعلّی کے مضمون میں ہوش آ جانا یا اُڑ جانا ایک ہی بات ہے) چیخوف کی طرح کے بھی آئے، جن کی زندگی کے صحرا میں بڑا ساتر بوزل گیا اور انھوں نے بڑے پیار، بڑی ہمدردی سے اس کی چھوٹی چھوٹی پھانکیں کاٹیں اور سب کے ہاتھ میں تھما دیں۔ لارنس نے حیات کی نیم غنودگی میں رنگ و بو کا لخلخہ سونگھا اور دوسروں کو بھی سنگھا دیا۔ جو برداشت کر گئے، ان کی تو آنکھیں کھل گئیں اور جو نہ کر سکے، وہ آج تک چھینکیں مار رہے ہیں۔
ایڈگر ایلین پو نے کہا: "کہانی کا ہر حصہ جو برق و تجلّی ہو، کاٹ دو کیونکہ وہ شب رنگ کہانی کے مجموعی تاثر کو دبا دے گا۔" اور وہ یہ بھول ہی گئے کہ ایسی کہانی بھی لکھی جا سکتی ہے جس میں دن کا رنگ غالب ہو۔ خودکشی سے چند ہی مہینے پہلے ہیمنگ وے نے کہا کہ " میں نے اپنی تحریروں میں طالسٹائی اور بالزاک، موپاساں اور چیخوف کو سمو لیا ہے۔" اور یہ امرِ واقع ہے کہ ان کی کہانیوں میں ہمیں ان سب استادوں کا ایک خوبصورت سا امتزاج نظر آتا ہے؛ البتہ اسٹائل میں کھردراپن،

کرداراور مواقع میں تشدد اُن کا اپنا تھا، کیونکہ انھوں نے زندگی کو اسی رنگ میں دیکھا تھا، جوان ہی کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ زندگی کو دوسرے کے رنگوں میں قبول کرنے والے نہ تو سومرسٹ ماہم کی کلبیت سے انکار کر سکتے ہیں، اور نہ ژیاں پال سارتر کی عصبیت سے، اور نہ ولیم فاکنر کی یاسیت اور قنوطیت سے۔

اپنے، اور صرف اپنے، نقطۂ نظر سے دیکھنے والوں کو جاننا چاہیے کہ اگر اونٹ ان کی نظر سے اونٹنی کی طرف دیکھے گا تو کبھی اس پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ آج جب الیکٹرونک مشین پر نظمیں لکھی جا رہی ہیں، کہانیاں قلم بند ہو رہی ہیں اور ARTIFICIAL INSEMINATION سے بچے پیدا کیے جا رہے ہیں تو ہماری اولاد کو افرودایتے (APHRODITE) اور دمتیری یاس (DEMETRIUS) کی داستانوں کو خوبصورت قصوں کی صورت میں یاد رکھنا ہوگا، ورنہ ان کے زمانے میں تو مرد کا سر کدو کی طرح تھا اور عورت کے کولھے اور چھاتیاں سیتا پھل کی مانند — تو گویا ہنری جیمز، کیتھرین مینس فیلڈ، او۔ ہنری اور ولیم سرویاں تک پہنچتے پہنچتے افسانے میں انفرادیت کے علاوہ رچاؤ اور گہرائی اس قدر بڑھ گئی کہ ان افسانوں کی ایک ایک سطر اپنے اندر کئی کئی افسانے لیے ہوئے تھی؛ پھر ٹیگور کی کہانیوں کی نظمیہ کیفیت، سرت چیٹرجی کی گھلاوٹ جیسے سکنجبین کی مصری، پریم چند کی سادگی اور ان کا خلوص، جو بعض وقت مہاشائیت ہو کر رہ جاتا ہے۔

غرضیکہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ جتنے منہ ان سے زیادہ باتیں — اور پھر ان میں سے ایک میرا منہ جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ اسے بڑے شوق سے دیکھیے، ہنسیے یا روئیے (تعلّی کی زبان میں ہنسنا یا رونا ایک ہی بات ہے!) لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیے کہ منہ دیکھتے رہ جانا بھی ہماری زبان کا ایک محاورہ ہے۔

ہمارے پرانے فلسفیوں کے مطابق یہ دنیا ایک تخیّل ہے۔ ہم شروع اور آخر کے انداز میں سوچنے والے، اس تخیّل کی تہہ کو نہیں پا سکتے۔ لیکن اپنے اندر اس عظیم تخیّل کی حدوں کا ایک دھندلا سا تصور باندھ سکتے ہیں۔ پھر:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اب اس خیال کو دامِ خیال میں لا کر ہم نے ایک افسانوی طرز کی سازش پیدا کر لی، جس کی

جزا افسانے کی صورت میں ملی اور سزا عمر قید کی شکل میں۔ افسانہ طویل یا مختصر — خدا کے تصور سے شروع ہوتا ہے، جو ایک سے انیک اور انیک سے پھر ایک ہو جاتا ہے۔ عجیب سازش ہے تا کہ ابتدا میں انجام چھپا ہو اور انجام میں ابتدا کی صورت ہو۔ اسی چکر کو افسانہ کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے افسانہ ایک خواب ہو جس میں ہم کھو جائیں اور اکثر اوقات جاگنے پر بھی جی چاہے کہ سرہانے میں آنکھیں دبا کر پھر سے وہ خواب دیکھیں، جس میں کسی حور نے کہا تھا: ''میں تھوڑی دیر میں آؤں گی۔'' لیکن اس کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ٹیلی فون کی گھنٹی نے جگا دیا۔ اب ٹیلی فون پر کوئی خان کہہ رہا ہے ''میں ابھی آ رہا ہوں — '' زندگی کا یہ استہزا کیا افسانہ نہیں؟

گویا خدا اور اس کے تصور کے بعد پہلا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب آدم کے پہلو سے حوا برآمد کی گئی۔ دوسرا افسانہ اس وقت لکھا گیا جب دو وجود، مرد یا عورت، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی ذات کو محسوس کرنے لگے۔ اور کہا — میں اور تو   اور پھر وہ مسکرانے، آب دیدہ ہونے لگے؛ پھر اس میں ترنم شامل ہو گیا، روشنی کی لپٹیں چلی آئیں، دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے؛ ایک بچہ اس دنیا میں لائے، جو انسان کا سب سے پہلا مختصر افسانہ تھا۔ ''میں'' اور ''تو'' کے بعد بچہ — ''وہ'' تھا۔

پھر اس افسانے میں، مدراس کی گھٹیا تصویروں کی طرح سے، خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں چلی آئیں، ایک اور بچہ چلا آیا۔ پہلا ہابیل تھا تو یہ قابیل۔ دونوں آپس میں لڑنے لگے اور یوں ہی لڑتے جھگڑتے جوان ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو مارنے مرنے پر تیار تھے۔ کبھی پیٹ کی خاطر اور کبھی عورت کے لیے، جو کہ ان کی اپنی ہی بہن تھی؛ آخر قابیل نے ہابیل کو جان سے مار دیا اور یوں انسان کی اولاد ترقی کرنے لگی۔ آدم کے بیٹوں کے مرنے پر اس وقت کی بزرگ عورت نے اپنے قبیلے کے جوان اور خوبصورت بیٹوں کو اپنا شوہر بنایا اور بوڑھے کھوسٹ شوہر کو مار مار جنگلوں میں بھگا دیا۔ یہ شاید تیسرا یا چوتھا افسانہ تھا۔

پھر انسان نے فیصلہ کیا کہ ماں بیٹے یا بھائی بہن کی شادی بقائے نسل کے لیے اچھی بات نہیں۔ جب تک انسانی قافلہ مصر کے دیوتا ''را'' کی روشنی میں رمسیس (REMSSIS) اول تک پہنچ چکا تھا۔ اُنھوں نے ایسی شادی کی مناہی کے لیے قانون بنائے، جو بہت بعد تک بھی لاگو نہ

ہوئے۔ لیکن آخر تسلط پا گئے۔ انسانی بہتری کے دوسرے قانون اور افسانے جنم لینے لگے۔ پامپائی کی تباہی کے وقت ایڈیپس اور اس کی ماں علاحدہ ہو گئے؛ جب لوٹے تو ایڈیپس جوان ہو چکا تھا اور اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا، جو روم میں رو رہی تھی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جن پر ہمیشہ بہار رہتی ہے، اور وقت جن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ روم میں دونوں ملے اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور آخر شادی کر لی۔ کہتے ہیں کہ ان سے بڑا خوش خور پورے روم میں کہیں نہ تھا۔ لیکن ایک دن، ایک شام (شامت کا اسم تصغیر) انھیں پتا چل گیا کہ وہ ماں بیٹے ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ انسانی دودھ میں سماجی تیزاب مل گیا اور وہ دونوں اس میں گھل گھل کر رہ گئے۔ اور اس ایک واقعے نے دنیا کے ہزاروں، لاکھوں افسانوں کو جنم دیا، جن میں انسانی فطرت اور اس کے اپنے بنائے ہوئے قانون میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پھر مشرق میں ایک اور عظیم افسانہ لکھا گیا جس کے کردار راجا بھرتری ہری تھے اور ان کی رانی، جو ایک نہایت ہی حسین عورت تھی۔ بھرتری اس کے گداز جسم کی طرف دیکھتے اور سوچتے: کیا ایسا وقت آئے گا جب اس کے چاند سے چہرے پر جھرّیاں چلی آئیں گی؟ چنانچہ کسی ولی نے انھیں ایک سیب دیا اور کہا— ''اس کے کھانے سے حسن لازوال ہو جاتا ہے؛ اور انسان لافانی۔'' بھرتری ہری نے رانی کے حسن کو دوام دینے کے لیے اپنے آپ پر اسے ترجیح دی۔ وہ اس حسینہ کو ہمیشہ عالمِ عالم تاب میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن رانی ایک نوجوان دھوبی سے پیار کرتی تھی اور ہمیشہ اسے تندرست اور جوان دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے وہ سیب دھوبی کو دے دیا، جو ایک طوائف پر عاشق تھا اور جو اس کی زندگی میں مسرت کے لمحے لاتی تھی۔ طوائف نے یہ سمجھ کر کہ اس کا جسم گناہ کی کان ہے، وہ سیب بھرتری ہری کی نذر کر دیا کیونکہ وہ حاکم وقت تھا اور اس کے دائم قائم رہنے سے لاکھوں، کروڑوں لوگوں کا بھلا اور طوائف کے اپنے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا تھا— بھرتری ہری نے دنیا ترک کر دی۔

اس کہانی میں کیا کہا گیا؟— کیا یہ کہ وہ شخص جسے ہم اچھا کہتے ہیں، برا ہو سکتا ہے اور جسے برا کہتے ہیں— اچھا؟ یا خالی خولی زندگی کا استہزا اور اس کے چھوٹے ہونے کی دلیل؟ یا یہ کہ ہم کسی کے بدن پر قبضہ کر سکتے ہیں، اس کی روح پر نہیں؟ شرنگار رشک کی عورت اپنے محبوب کے بازوؤں میں بوس و کنار کرتے ہوئے اپنے ذہن میں کسی دوسرے مرد کو رکھے ہوتی ہے......!

چنانچہ پہلی کہانیوں میں اخلاق اور نتیجے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ آخر انسان نے سوچا کہ ہم بچے تو نہیں جو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے پھریں اور یہ کہ کیا آدمی اس طرح کی نصیحت کو پلّو میں باندھتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے: حقیقت میرے ہی تسلط میں آئی ہے؟ چنانچہ انھوں نے تدریس کا کام درس گاہوں، تبلیغ کا مذہبی رہنماؤں کو سونپا اور سیدھی سادی کہانی سے اپنی اور دوسروں کی طبیعت خوش کرنے لگے۔ انسان کے جذبے، اس کی دلچسپی اور گھٹّی میں پڑے ہوئے اس کے تحیّر سے فائدہ اٹھانے لگے۔ جہاں کہانی ان کے لیے تفریح کا سامان تھی، وہاں ریاضی کا ایک سوال بھی، جس کا حل عام عقل کے لوگ نہ جانتے تھے اور کہانی کہنے والا چہرے پر چمک لا کر ایک فتح مندی کے احساس سے سامنے دکھائی دینے والے متحیّر چہروں کا جائزہ لیتا تھا: اور آخر اس کا انجام بتاتا تھا۔ اور لوگ حیران ہو ہو جاتے تھے۔ ایسا انجام تو انھوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کون سی کڑیاں تھیں جنھیں وہ سلسلے میں نہ لا سکے؟ کس داؤ پیچ نے انھیں مار گرایا؟ چونکہ بیوقوف اور فاترالعقل قرار دیے جانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہانی میں سے TWIST اور اس قسم کی چیزیں غائب ہونے لگیں۔ اور کہانی کہنے والے کچھ اس انداز سے کہانی کہنے لگے: ''بھائی، میرے تجربے میں تو یہ بات آئی ہے، تمھارا تجربہ کیا کہتا ہے؟'' چنانچہ اس بے سروپا کہانی کا وجود ہوا جس نے آج تک رسالوں کے ایڈیٹروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ بھی سوچتے رہتے ہیں: یہ اسکیچ ہوا یا کہانی؟ اور نہیں جانتے کہ صحافیوں نے کہانی کا دامن کتنا وسیع کر دیا ہے۔ کیونکہ قتل کی واردات کا سن وعن بیان اور کچہری کی رپورٹ بھی کہانی ہے، لیکن اس بے سروپائی کے باوجود کہانی لکھنے والے کی کہانی ایک صحافی کی کہانی سے یکسر بلند و بالا ہوتی ہے۔

کہانی کی کتنی بھی شکل بدل جائے، کہانی ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر نظم و نسق انسانی جسم کا حصہ ہیں، وہ گا سکتا ہے اور ناچ سکتا ہے تو ہمیشہ کہانی کہہ سکتا ہے، واقعات کے بیان میں بڑھا سکتا ہے اور گھٹا سکتا ہے......

اوائل کے افسانے کچھ یوں شروع ہوتے ہیں — ''ایک دفعہ کا ذکر ہے......'' ظاہر ہے کہ اس جملے کو ہم اب صرف بچوں پر استعمال کرتے ہیں، بڑے یہ فقرہ استعمال نہیں کرتے — لیکن اس قسم [کے جملوں] کا تاثر برحق ہے...... پھر ''ایک دفعہ کا ذکر ہے، مگدھ دیش میں ایک راجا تھا۔

اس کی سات رانیاں تھیں؛ اور ساتوں کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک سادھو آیا اور اس نے سب سے چھوٹی رانی (جو کہ خوبصورت اور تر و تازہ تھی) کو ایک آم دیا اور کہا— اسے کھاؤ گی تو اولاد پاؤ گی۔ رانی بہت خوش ہوئی۔ اس نے سوچا نہا دھو کر اور صاف ستھری ہو کر آم کھاؤں گی اور اس دنیا سے بامراد جاؤں گی، چنانچہ آم کو طاق پر رکھ کر وہ غسل خانے میں نہانے گئی اور جب نہا کر لوٹی تو آم غائب تھا۔''

یہ عناصر آج کی ''بے سروپا'' کہانی میں بھی ہیں۔ صرف راجا کی جگہ مزدور یا رانی کی جگہ کسی سوسائٹی گرل نے لے لی ہے۔ چونکہ محبت کے اظہار میں چند فقرے بار بار کہے گئے، اس لیے اب ان کو کہنے کا انداز بدل گیا ہے۔ پہلے چہرہ ہمیشہ خوبصورت ہوا کرتا تھا؛ اب وہ قبول صورت ہو گیا ہے۔ کچھ حقیقت پسند، یوں لکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں— ''وہ اچھی تھی اور نہ بری۔'' لیکن اس میں جو بات کشش کا باعث ہو سکتی ہے، اسے کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جو نفرت کا باعث ہو سکتی ہے، اسے بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کوئی کتنا بھی پرانی کہانی سے بچنے کی کوشش کرے: وہ اس کے بندھے ہوئے اصولوں سے بہت دور نہیں جا سکتا، ورنہ وہ کہانی نہ رہے گی۔ وہ موسیقی ہو سکے گی، نرتیہ ہو سکے گی، نقاشی ہو سکے گی، لیکن کہانی نہیں۔ آپ کہانی کی اکائی کو دہائی میں بدل دیجیے لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ انسانی اساس کا احساس بن جاتا ہے۔ اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا آئے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی کو نہیں ڈھونڈیں گے، کہانی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے آپ کو آ لے گی: اس عورت کی طرح، بچہ اس دنیا میں لائے بغیر جس کا جینا بے معنی اور لا حاصل ہے!

[زمانۂ اشاعت: جنوری 1963]

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ایک اعتراف

پادری روزاریو نے گناہ گار جاہن سے کہا— ''تم تو اعتراف گناہ کے لیے میرے پاس آئے تھے، مگر تم نے تو ڈینگیں مارنا شروع کر دیں... ...''

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایک دن مجھے گناہ گار کی صورت میں کھڑا ہونا پڑے گا اور اپنے وہ گناہ قبول کرنے پڑیں گے جو میں نے نہیں کیے۔ یا اگر کیے ہیں، تو اس لیے کہ مجھے فن کی سند حاصل ہے، جو ایک طرح سے راشٹر پتی کی معافی ہے، جو سنگین سے سنگین قتل میں بھی سرکاری گواہ کو میسر ہوتی ہے......

باپ روزاریو! میں ایک سیدھا سادہ، حلالی اور قانون پرست شہری تھا۔ اپنے پڑھنے والوں سے پیار، ان سے لاڈ کرتا تھا۔ انھیں چومتا چاٹتا تھا، حالانکہ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میں سب کو سرآنکھوں پر بٹھاتا تھا، اور اگر کہیں ان کو پیر تسمہ پا کی طرح اپنے اوپر سوار ہوتے دیکھتا تو جھٹک بھی دیتا۔ میں ایک طرح کا جمینز (Jimenez) تھا، جو اپنا دکھ سکھ اپنے پلاٹیرو (Platero) کو بتاتا ہے، جو ایک بڑا پیارا اور معصوم سا گدھا ہے اور جمینز کی بدولت اب تک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ اس گدھے کو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں، کیونکہ اپنی خدمات کے عوض وہ جمینز کو نوبل پرائز بھی دلوا چکا ہے—

گدھے کے ذکر کا برا مت مانیے، فادر روزاریو! آپ تو جانتے ہیں کہ مغرب میں گدھے کو اتنا برا جانور نہیں سمجھا جاتا، جتنا کہ ہم اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ پھر آپ تو گوا کے رہنے والے ہیں اور اب ہندوستانی ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتایئے، گدھے کی بیوقوفی ایک اسطوری بات Myth نہیں جو ہم اور آپ ہی نے مل کر بنائی ہے؟ گدھے میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ــــ وہ بوجھ اٹھاتا ہے۔ ڈنڈا کھانے پر فقط رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ مگر شکایت کا حرف تک زبان پر نہیں لاتا، جو ایک کامیاب زندگی کا راز ہے اور جس کی تلقین ہمارے روحانی پیشوا کب سے کرتے آئے ہیں، اور ہمارے نیتا اب تک کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے، باپ روزاریو! کیا میری بوجھل تحریر پڑھ کر میرے قاری مجھے مارنے دوڑتے ہیں ــــ؟ بالکل نہیں۔ ایسا ہوتا تو میں روز صبح ان کو ماٹنگا میں پان والے کی دکان اور دن کو کسی فلم اسٹوڈیو میں مل جاتا، اور شام کو کہیں ہسپتال میں اپنی پسلیاں گنتا۔ وہ ایسا نہیں کرتے، کیونکہ وہ مجھے سمجھ گئے ہیں اور میں ان کا راز پا گیا ہوں۔ قصہ مختصر، انھیں مجھے اور مجھے انھیں بیوقوف سمجھنے کی پوری آزادی تھی، جواب ان حالات میں نہیں ہے جب کہ میں ــــ جاہن ــــ گناوِ اقبال ــــ معاف کیجیے ــــ اقبالِ گناہ کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور سر جیسے گو پھٹے میں پڑا ہے۔ اگر میں بے باک طریقے سے اعترافِ گناہ کرتا ہوں تو آپ کو وہ میری ڈینگیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور اگر دبی زبان سے مانتا ہوں، تو حقیقت مونالزا کی مبہم سی مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے...... عجب مصیبت ہے نا؟

فادر روزاریو! اعترافِ گناہ کا مسئلہ میرے نزدیک بہت نازک ہے۔ میں ایک ایماندار آدمی ہوں، اس لیے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ چاہے خدا حاضر و ناظر ہو یا نہ ہو، میرا ہاتھ مقدس کتاب پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے گا کہ میں خدا کو نہیں مانتا یا کسی مقدس کتاب پر ایمان نہیں لاتا۔ خدا پر ایمان نہ لانا تو اپنے آپ پر ایمان نہ لانے کے برابر ہے۔ فادر! کیونکہ ہمارا اپنا ''آپ'' ہی خدا ہے، اور کتاب بھی میری طرح کے ایک انسان نے اپنے ارفع لمحوں میں لکھی ہے۔ میں ایسا ہی کافر ہوتا، تو اس اعترف کے سلسلے میں آپ جو خدا کے نمائندے ہیں، کے پاس ہی کیوں آتا؟ آپ بے صبر ہو رہے ہیں؟ ــــ یہ تو ڈینگ نہیں ہے۔ بہر کیف، میں کہنا یہ چاہتا ہوں

کہ گناہ پہلے ہوتا ہے اور اعتراف بعد میں۔ لیکن اپنا کیا کروں؟ میں ان گناہگاروں کی قبیل میں سے ہوں، جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے اعتراف کو اہمیت نہ دے یا ان کی طرف دیکھتا نہ ہو تو چپکے سے ایک طرف جا کر کہانی لکھ مارتے ہیں۔

پہلے میں اپنی کہانی کے کرداروں اور اس کے تانے بانے کو اپنے دوستوں پر آزماتا ہوں، باپ روزاریو! مگر ساتھ ہی یہ صریح جھوٹ بول دیتا ہوں کہ میں اسے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس جھوٹ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی حرام الدّہر اسے چرا نہیں سکتا، اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی کہانی کے اثر کا پتا چل جاتا ہے۔ اگر وہ بہت ہی متاثر معلوم ہوں اور خوب ہی سر دُھنیں، تو میں اس کہانی کو سرے سے لکھتا ہی نہیں۔ ہاں، ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا فادر، جسے چھوٹتے ہی ہر نتھو خیرا سمجھ جائے! اگر ان کے چہروں پر ناسمجھی کے نقوش دیکھتا ہوں، تو مجھے یقین آ جاتا ہے کہ میاں اب بات بنی۔ جب میں اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی ہوتی بھی بے حد کامیاب ہے، کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی، جو کہ میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔ دیکھیے تو، دنیا بھر کا آرٹ، کیا ناول اور کیا تعمیر، سب کدھر جا رہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکّر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پرواہ ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں۔ ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ اٹھتا ہوں، بالکل، میرا بھی یہی مطلب تھا۔ مگر افسوس ذہانت کے اس ویران آباد ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ دراصل کہانی ہر ایک کے لیے لکھی بھی نہیں جاتی یارو! میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی... جیو....

کیا میں پھر ڈینگیں مار رہا ہوں، فادر؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اعتراف پہلے کرتا ہوں اور گناہ بعد میں۔ اعترافِ پہلے ہو یا گناہ، لیکن ایک بات طے ہے کہ اعتراف و گناہ دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بیکار ہی آپس میں اُلجھتے رہتے ہیں۔ میں انھیں علاحدہ علاحدہ لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دونوں برابر ہی اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں، اس سلسلے میں مجھے اپنی ہی ایک کہانی یاد آتی ہے جس

میں ایک آدمی کسی مرد عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ کیا مرد اور عورت کے جھگڑے کا کوئی حل ہے، باپ روز اریو؟ کبھی ہوا ہے یا ہوگا——؟ ایک مارنے والا، اور دوسرا مار کھانے والا۔ ایک اذیت دینے والا اور دوسرا اذیت سہنے والا۔ اور دونوں اسی طرح سے خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ہم بیچ میں ماموں ہوتے ہیں؟ البتہ مرد اور عورت کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا رول بدل بھی دیتے ہیں، کیونکہ ہر مرد میں ایک عورت چھپی ہوتی ہے اور ہر عورت میں کئی مرد۔ کم از کم بھرتری ہری تو اپنے شرنگار شتک میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں——

بہر حال ان کے فضیحتے کے بارے میں ازل سے کہانیاں لکھی جا رہی ہیں، اور ابد تک لکھی جائیں گی، جن میں جھگڑا، مار پیٹ، ایذا رسانی ایک ضمنی اور مقامی حیثیت رکھیں گے، اور ہم تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی ساری رہبانیت اور اپنے تجرد کے فلسفے میں ہم اسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، جس کی نفی میں ہم اپنے بدن کے پچھواڑے کو برفاب میں ڈبوتے، درختوں پر الٹا لٹکتے اور اذیت دینے والے فاقے کرتے ہیں؟ بوکا شیو کی داستانوں میں کتنے مردوں اور کتنی عورتوں نے اعترافِ گناہ کیا اور پھر اپنی پہلی ہی فرصت میں گناہ کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ وہ سانپ کی کھال کی طرح سے ڈراؤنا ہوتا ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں کوئی ایبٹ اور فرائر، جو خود کو خدا اور کلیسا کا نمائندہ کہتا تھا، بیوقوف بن گیا۔ کیا وقت نہیں آیا فادر، کہ ایبٹ اور فرائر، ملاّ اور قاضی، پنڈت اور پجاری لوگ بیوقوف بننا چھوڑ دیں؟ میری بات چھوڑیے۔ میں اس وقت سچے دل سے اعتراف کر رہا ہوں اور بہت سے لوگوں کی طرح کنفیشن کے کان کاٹ کر، اسے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں، بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ سوائے اس حسین ابہام کے جو ہمارا خدا ہے، اور کون جان سکتا ہے؟......تو میں کہہ رہا تھا کہ میری کہانی میں وہ آدمی مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ جس طریقے سے میں اعتراف اور گناہ کو الگ الگ اور منفرد حیثیت دیتا ہوں، اسی طرح اس نے دونوں کو الگ الگ سمجھانے کی کوشش کی۔ پہلے وہ مرد کو ایک طرف لے گیا اور بڑے جوکھم کے ساتھ اسے سمجھایا بجھایا اور اس کے خون آشام غصّے کو ٹھنڈا کیا۔ پھر وہ عورت کو الگ ایک طرف لے گیا مگر آج تک واپس ہی نہیں آیا۔ ..

ہیں، فادر روزاریو؟!!

میرے لکھنے لکھانے کی ابتدا چوری سے ہوئی، باپ روزاریو! آپ گھبرائیے نہیں۔ ذرا صبر سے میری بات سُنیے۔ میں کہیں بھی اس چوری کے سلسلے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں ٹھراؤں گا۔ آپ کے اٹھے ہوئے ابرو اور چہرے کے سوالیہ نشان مجھے پریشان کر رہے ہیں، اس لیے بعد کی بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دوں تا کہ آپ کو اپنے وجود سے بھی تسلی رہے۔ میں نے چوری کی اور پھر خود ہی اپنے منھ پر دو تین چپتیں بھی ماریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے اور کوئی پاس نہیں تھا، جیسا کہ ہر کامیاب چوری میں وہ نہیں ہوتا۔ نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک طرح سے اچھا ہوا، کیونکہ کئی لوگوں میں صبر نہیں ہوتا۔ ادھر چوری ہوتی ہے، اُدھر وہ چلّانا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے دور بھاگتے ہیں، اور جب دوسرے مدد کے لیے آ جائیں، تو پھر قریب آ جاتے ہیں، اور پکڑ لیتے ہیں۔ آپ چاہے کتنی بھی معافی مانگیں مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی سرشت میں کتنا ظلم، کتنی ناانصافی ہے کہ چوری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے اور معافی بھی آپ ہی مانگیں۔

قصہ یوں ہوا فادر، کہ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر اکولا میں کہیں سب جج ہو گئے۔ کامیابی کا دروازہ ان پر کسی پاگل کے قہقہے کی طرح سے کھل گیا۔ اب ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ چنانچہ ہم لڑکوں کو جو بکھرے ہوئے تھے، اکھٹا کیا اور ایک لیکچر دینا شروع کیا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، باپ روزاریو! کہ کامیابی کے دروازے پر کھڑا آدمی اندر کیوں نہیں جاتا باہر ہی لیکچر دینا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اندر جاتے ہی اسے کامیابی کی اساس کا پتا چل جاتا ہے۔ پھر دوسرے لیکچر دیتے ہیں اور وہ غریب کان بند کرنے کی کوشش میں منھ کھول کر سنتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے کہا ''اس دنیا میں معمولی MEDIOCRE قسم کے، لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم چاہے چور بنو، لیکن اس پائے کے چور کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا تمھاری ہمسری نہ کر سکے۔''

اب اس عمر میں ہمیں کیا معلوم، فادر روزاریو؟ ہمارے نزدیک تو چور کا ایک لفظ تھا، جو بکُل روئے زمین پر گھوم کر پھر ہمارے کانوں میں چلا آتا تھا۔ ایک بچہ کیا جان پائے کہ پروفیسر کی زبان میں وہ ایک اصطلاحی لفظ تھا جس کا مطلب پردھان منتری بھی ہو سکتا ہے، انجینیر ہو سکتا ہے،

ڈاکٹر ہوسکتا ہے۔ ہم اس نئی تعلیم کو پروفیسر صاحب ہی سے شروع کرتے، لیکن وہ تین ڈاؤن کلکتہ میل سے جا چکے تھے۔ ہمیں خاص بننے کا سبق دیتے ہی وہ خود ہمیشہ کے لیے عام ہو گئے تھے۔ پھر ہم نوآموزوں کے سامنے کوئی ایسی زندہ مثال بھی تو نہ تھی۔ ہندوستان کے بھوپٹ اور امریکہ کے الکپون جن کی زمانے بھر نے عزت کی ہے، عرشۂ تاریخ پر بہت لیٹ آئے تھے۔

نوجوان ہونے کی وجہ سے مجھ میں بلا کا جوش تھا، فادر! جو کسی صبر کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ میں تو راتوں رات کسبِ کمال کرنا اور اپنا گھوڑا وہاں اوپر کہکشاں پر دوڑانا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس باگ کے پیسے تھے اور نہ رکاب کے دام۔ غالباً اسی لیے میں نے اسے پویہ ہی چلنے دیا۔ میں نے چھوٹتے ہی چوری نہیں کی، باپ روزاریو! میں جانتا تھا کہ قید ہو جانا برا سا لگتا ہے۔ پروفیسر صاحب سے کہیں پہلے ماں باپ مجھے لبے چوڑے لیکچر دے چکے تھے اور پیٹ بھی چکے تھے۔ لیکن پروفیسر زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا، اس لیے اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ چنانچہ دنیا کے ہر چور کی طرح، سرسری طور پر اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے میں نے پہلے شرافت کے سب گر استعمال کیے۔ میری آواز اچھی تھی، اس لیے میں سنگیت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ، لاہور کے گاندھرو مہاودیالیہ کی سب سے آخری بٹالین میں بھرتی ہو گیا، لیکن میرا جذبہ تھا کہ سات سُروں کی قید میں نہ آتا تھا اور آٹھویں کی اجازت نہ تھی۔ میرا گانا نوٹنکش میں آ کر گانہ، گانہ پڑھا جاتا تھا۔ میں نے ایک دو تمغے مارے، لیکن استاد بونے خاں مچھی ہٹہ والے اور امرت سر کے چونتھ رام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتا چل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کی ریاض کی دیوار کھڑی ہے اور آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور نوکِ زبان سے اسے ہموار کرنا ہوگا۔ چنانچہ میں یوں الگ ہو گیا جیسا کہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً اُٹھ کر تھوڑا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر اپنی پگڑی سنبھالتا، منہ میں کچھ منمناتا ہوا، اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انٹی امپیر یلسٹ ''جنگ'' کا زمانہ تھا، جس میں ہمارے لیڈر سوت کے گولوں سے لڑنے کا مشورہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مار کھا کھا کر انگریز کو سور بنا دو۔ مار ہی کھانا ہوتی فادر! تو میں شروع ہی سے پروفیسر کی بات پر عمل کیوں نہ کرتا؟ جب بم پٹاخہ قسم کے لیڈر کی نوکری خالی تھی، کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک کھنڈر میں بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونٹ مورنسی تو جوں کا توں

سلامت رہا، لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اُڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا باپ روزاریو! جس سے بعد میں میں نے کہانیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوئے ان گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں۔

چوری کی بات میں لٹکا نہیں رہا، باپ روزاریو! میں کہانی والا ہوں اس لیے اسے عین موقع پر، فنی انداز میں کہوں گا۔ یعنی اس وقت جب کہ آپ کا تخیر پانی نہ مانگے۔ میں نے اور بھی بہت سے پاپڑ بیلے۔ پاپڑوں میں دال کے ساتھ کالی مرچ بھی پڑتی ہے..... لیکن مجھے اب تک صرف آٹے دال ہی کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ میں نے فنِ مصوّری میں نکل جانے کی کوشش کی اور میں واقعی نکل گیا۔ ہوا یہ کہ لینڈ اسکیپ بنانے کی بجائے، میں انسانی پیکر پر ہاتھ صاف کرنے لگا اور غلطی سے وہ بھی عورت کے پیکر پر۔ اسے بنانے میں میں خود ہی اس پر عاشق ہو گیا۔ اتنے مہنگے آرٹ پیپر کو ایک طرف چھوڑ کر میں زندگی میں اسے ڈھونڈنے کے لیے چل نکلا! جس کاغذ پر میں نے اسے بنایا تھا، وہ تو اب تک گلایا، کوٹا اور پھر سے کاغذ بنایا جا چکا ہے، لیکن میں اب تک اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے بدن پر کے اس خط کی تحقیق شروع کر دی، جو عورت کو مرد سے ممیز کرتا ہے، اور اس کے دماغ میں بے پناہ فتور پیدا کر دیتا ہے۔ دیکھیے نا ایک معمولی خم سے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کے بدن میں کمر سے نیچے رانوں کی طرف جو خط جاتا ہے، وہاں ایک ہلکا سا بے بضاعت گڑھا پڑ جاتا ہے، جسے انسانی جسم کے تشریحی علم والے صرف رگوں اور پٹھوں کا اتار چڑھاؤ سمجھتے ہیں۔ نا معلوم کیسے گویا نے اپنی مشہور پینٹنگ ''ماجاوی نیودا'' میں اسے نظر انداز کر دیا؟ حالانکہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اس قسم کی باتیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن نے لکھا کہ وہ سامنے کا کھیت جس کے پیچھے سورج غروب ہوتا ہے، مسٹر لاک کا ہے لیکن نہیں وہ دراصل شاعر کی ملکیت ہے......

میں شاعر ہو گیا۔ انگریزی کے ہیروئیک میٹر میں نظمیں لکھیں، جو چھپیں بھی۔ لیکن چھپنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے کئی شاعر دوستوں کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں، چاہے ان کا ایک بھی مصرع آپ یاد نہ رکھ سکیں۔ ایک نابالغ ذہن کا مالک تتبع محض تتبع میں بعض وقت اچھی چیزیں لکھ مرتا ہے۔ انگریزی ادب کے گرے نے طفلی میں بڑا عمدا نوحہ نہیں لکھا؟ پھر، میں نے انگریزی میں لکھنا

چھوڑ دیا۔ ہاں، ہندوستان میں رہنا اور ہندوستانیوں سے بیر اچھا نہ معلوم ہوا۔ جب اردو کا رواج تھا اور اردو میں لکھنے والے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے، جیسے اب ہندی والے سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو روپ کہتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی اور اس کے علم وعروض ــــ معقولن نامعقولن سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں بے ہوش پڑے تھے، یعنی کہ میں اور شعر ــــ کہیں راستہ نہ پا کر چھوٹا سا ''سینٹ جینے'' ہو گیا۔

''سینٹ جینے'' کو آپ نہیں جانتے، باپ روزاریو! وہ آپ کی طرح کا سینٹ نہیں۔ وہ چور، گرہ کٹ، فاسق وفاجر ہے۔ عورتیں تو ایک طرف، اس نے لونڈوں میں بھی دلچسپی لی ہے، جو کہ میں نے نہیں لی۔ اس کے باوجود سارتر نے مقدس باپ پوپ کے فرائض خود پہ لے کر اسے معبود Deify کر دیا۔ ہر جگہ روک، ہر راستے کو سنگلاخ پا کر میرے بے پناہ جذبوں نے نکاس کے اور بھی بہت سے راستے ڈھونڈ لیے، جن کا تعلق کسی بھی تعمیری چیز سے نہ تھا۔ میں نے اندھیروں کی پناہ لی۔ اندھیرے کی بابت آپ نہیں جانتے فادر! پہلے خیرہ کر دینے والی روشنیوں کے بعد ایک لق ودق اندھیرا آتا ہے اور پھر ایک نرم سی، مسلسل اور مقدس روشنی، جس کا شروع ہے نہ آخر، اور جس کے پرتوں سے پوری کائنات جیتی اور سانس لیتی ہے۔ لیکن اندھیرا؟ اندھیرے کے جادو کا میں آپ کو کیا بتاؤں، باپ روزاریو! کیونکہ وہ آپ کے تنگ وتاریک حجروں میں نہیں ہوتا۔ تاریکی کے باوجود وہاں تجلی رہتی ہے۔ لیکن اپنی تاریکی خالص تاریکی ہے۔ آپ کے ہاں کا اندھیرا اُجالے سے متبادل (Mutate) ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اپنے ہاں، اندھیرے کی کوئی جگہ لیتا ہے تو اندھیرا۔ جیسے ایک صفر کو لاکھوں صفروں سے ضرب دیجیے، تو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ اس اتھاہ اندھیرے میں عقل نہیں، وجدان کام آتا ہے۔ اس میں کروڑوں اربوں دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جذبات اور ارمانوں کے چھوٹے چھوٹے پشّے اور بڑے بڑے شہ پر اڑتے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نہیں، اپنی پرواز سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ کی مدد سے اپنے سامنے روک پا کر لوٹ آتے ہیں۔ لیکن ان کی پرواز کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ ان کی بصیرت کے ہاتھ پر لاکھوں آنکھیں اُمڈ آتی ہیں، جن سے وہ راستہ ٹٹولتے اور پاتے ہیں۔ جس دن اندھیرے کی تلاش میں نکلا، اس دن

ہمارے ایک بڑے روحانی پیشوا کا جنم دن تھا، جس کی پوری امت ایک طرف خوشیاں منا رہی تھی اور دوسری طرف مصروف عبادت تھی۔ جب ایک طرف میرے پورے بدن پر لرزہ چھا رہا تھا، تو دوسری طرف ایک بڑی خوش آیند سنسناہٹ رگ و پے میں سما رہی تھی۔ چونکہ گناہ، ثواب کا مقابل ہے، فادر! اس لیے انسانی جسم و ذہن گناہ سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں، جتنی کی ثواب کی بے حرمتی ہو۔ آہ، مگر کتنی دیر کوئی اندھیرے میں رہ سکتا ہے؟ کتنی دیر اُجالے میں رہ سکتا ہے؟

کسی حکیم نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اپنی منزل کو نہ پا سکے، اس آدمی سے زیادہ بے حیائی کی زندگی گزارتا ہے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ سچ مچ، ایک تخلیقی ذہن کا مالک جب تخلیق نہیں کر پاتا تو وہ ایک عام آدمی سے بھی زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ اس انداز میں گرتا اور گرتا چلا جاتا ہے کہ اس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے، تاوقتیکہ کہیں کوئی نغمہ نہ سنائی دے جائے۔ پھر وہ معصیت کی گود میں جانے کی بجائے، اس کے پیروں پہ لوٹتا ہے، جس سے معصیت بھی موکش پا لیتی ہے   یہ سب کچھ سلیقے سے ایک شعر نہ لکھ سکنے کی بدولت ہوا، فادر روزاریو! میں نے اتنے گناہ کیے کہ میں انھیں گن بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح سے خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو، کوئی دوسری خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے جو کہ اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ خوبصورت عورت یاد آتی ہے، جس نے اپنے زعمِ حسن میں ایک فلم ڈائرکٹر کو، جس نے بے شمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا— ''یاد ہے میاں! ایک بار تم نے مجھ سے شادی کی فرمائش کی تھی؟'' ڈائرکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا— ''تب؟   میں نے کی تھی؟''

جس رات میں نے چوری کی، اس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لیے اڈی ہوئی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصے بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے، جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے۔ لیکن اس دن عجیب ہی بات ہوئی۔ ایک لمحے نے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا، اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دوپہر کا سورج تھا، اور فوراً بعد دسمبر کی اماوس۔ یہ

کہ کوئی ہزار واٹ کے ہنڈے کو آنِ واحد میں گل کر دے۔ قدرت میں بھی ہوتا ہے جب لاکھوں سر پٹخنے پر بھی مجھ سے ایک مصرعہ موزوں نہ ہوا، تو میں نے ایک پرانا رسالہ اٹھا کر، اس میں سے احتیاطاً ایک گمنام شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لیے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھاپنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس کے لیے کوئی پیسہ نہ مانگے۔ ہاں، کیونکہ اڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر ہفتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا تھا۔ میں اسے دن میں پچیس تیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا، تا کہ لوگ میری طرف دیکھیں۔ کہیں اندر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن۔

ہمارے گھر میں ایک شاعر مہمان رہتے تھے۔ انھوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل کی طرف۔ اور کچھ یوں داد دی کہ اس پرچے میں 'دزدِ سخن' کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمہ مضمون چھپا، جس میں چوری کا ماخذ بھی درج تھا۔ اب میں بازار بھی نہ جا سکتا تھا۔

چوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باپ روز اریو! چوری...... خیر ہٹائیے۔ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو بور نہ کروں گا۔ ہاں، یہ تو ہر لکھنے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا — کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑیں۔ بہر حال، ایک بات طے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرواتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو چھپانے کے لیے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری پہلی چوری سے بہت مختلف تھی۔ میرے دماغ کی انوکھی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا تو میرا مہمان شاعر بھی نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافعِ شعر تھی۔ وہ پلاٹیرو تھا، ایسا پلاٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس اُلّو کی طرح تھا، فادر! جو کاٹھ کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہو اور جسے آپ عبادت کے لیے جاتے ہوئے آناً فاناً کہیں ببول پر بیٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں اور وہ بھی۔ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ بڑے آسان طریقے سے۔ جب وہ اپنا شیو بناتے تھے تو ٹھوڑی پر ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنٹھ رہ جاتا تھا۔

دز دیخن والی رات، میں اور میرے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف ان کی چوری کے ماخوذات نکالے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سبھا کالج، امرت سر سے ایک رسالہ نکلتا تھا، جس کا نام 'شوالہ' تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یاریاں سب شوالوں ہی میں ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ جیسے میرے سب گناہ دھل گئے۔ پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لرزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ برا لکھوں گا لیکن اپنا برا کسی کا برا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا، باپ روزاریو؟ بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتدا کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔ خود انسان ہی کو دیکھیے، کیسے غلاظت میں لپٹا چلا آتا ہے اور پھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ سوائے کلیسا اور دوسرے مذاہب کی دیومالاؤں کے چند کرداروں کے، سب اسی طرح سے آئے اور کیا کچھ نہ بن گئے۔ ان کرداروں کی بھی محیر العقول پیدائش کو عقل اور عقلِ محض کی لونڈی سائنس باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں تو کروں گا۔ بلکہ میں جو کہانیاں لکھتا ہوں اور جس نے اپنے پچھلے جنموں میں اپنے وجود سے بے شمار دیومالائیں لکھی ہیں، انسان کو ایسے ایسے طریقوں سے پیدا کروں گا کہ خود میری دیومالائیں دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف دیکھیں، کیونکہ میرے نزدیک اس قسم کی عجیب الخلقت پیدائشوں میں بہت بڑا سچ ہے، جسے میں جھوٹ سچ کہتا ہوں اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں، فادر روزاریو! اسے میں سچ جھوٹ کہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ، کیونکہ کوئی چیز ثابت و سالم نہیں اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے، سوائے اس خدایا سو، سوا سو عناصر کے جو مرکب ہونے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے، مگر اس کی حیثیت بھی اس وقت بنتی ہے جب وہ میری معشوقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی ہی سب کچھ ہوتی باپ روزاریو! تو پرماتما جو پرش ہے، مزے سے اکیلا رہتا۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے پرکرتی پیدا کر لی ہے؟ کیوں ہر چیز کو نامکمل رکھا اور مرکب ہو جانے پر مجبور کر دیا؟ کیا اس لیے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سیکھے؟ واہ! کیا فن ہے؟ وہ ایستادنی عضلہ جو نر کر دیا، اس کا کچھ حصہ مادہ کو بھی کیوں وے دیا؟— میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز تکمیل کے لیے تڑپتی رہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے

جائیں، تصویریں بنیں اور تانیں اڑیں۔ اکائی کوئی چیز نہیں، فادر! وہ صرف حساب کے کام آتی ہے اور اس سے پرے ہو کر بے معنی اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے روزمرّہ میں کوئی دھڑ سے کہہ ڈالتا ہے کہ ترلوچن کو پارو سے محبت ہو گئی۔ ٹھیک ہے، ہو گئی۔ مگر ترلوچن تین یا تیسری آنکھ رکھنے کے باوجود کیوں پارو پہ قبضہ کرنا، اس سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ کیوں اس پہ جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ حسن کی تاب نہیں لا سکتا، یا پارو خود ہی مقبوض و تاراج ہونا چاہتی ہے؟ چونکہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں، اس لیے میں جوان کی محبت کو آنے والی نسلوں اور اپنی کہانیوں کی خاطر تسلیم کرتا ہوں، نفرت محبت کہوں گا، جو ترکیب میں نے ڈی. ایچ لارنس سے لی ہے۔ اسی طرح کسی اوباش کی ایک دوشیزہ سے محبت کو محبت نفرت، ان کے رشتے کو انبساط و درد کا رشتہ

ایسے ہی بلند و پست، اندھیرا اجالا وغیرہ بہرکیف میں اپنی اس چوری کو اسی صورت میں سراہوں گا، فادر! اگر آپ میری کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہوں تو، ورنہ منزل اور اس تک پہنچنے کے ذرائع وغیرہ کے فلسفے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ افسوس! آپ نے تو میری ایک بھی کہانی نہیں پڑھی۔ ایکا ایکی میری چار کہانیوں کے نام مت پوچھیے گا پلاٹیرو— میرا مطلب ہے، فادر! کیونکہ ایکا ایکی پوچھ لینے سے تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ میں نے اچھی کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ایک تو بائبل کی سیمسن اور دلائیلہ سے ٹکر لیتی ہے۔ اچھا، میری کہانی نہیں پڑھی تو کرشن چندر کی ''کنواری'' پڑھی ہے؟ مجھے وہ بہت پسند ہے۔ واقعی جنسی جذبہ انسان میں نہیں مرتا، چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا اور بیکار کیوں نہ ہو جائے۔ جنسی جذبے کا براہِ راست خالق سے تعلق ہے۔ فادر! جو ایڑا، پنگلا اور سشمن ناڑیوں کی مدد سے نیچے بدن میں آتا ہے تو بچے پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے پیچھے تیسری آنکھ کے قریب آ جاتا ہے تو افسانے۔ میں نے بھی ''کنواری'' کی قبیل کی ایک کہانی ''لمبی لڑکی'' کے نام سے لکھی، جس میں لڑکی اس قدر لمبی ہے کہ اسے اپنے قد کا لڑکا نہیں ملتا۔ اسی کڑھن میں اس کی دادی مر بھی نہیں پاتی۔ حالانکہ سامنے اس کا اپنا لڑکا، لمبی لڑکی کا باپ دم توڑ دیتا ہے۔ آخر ناٹے قد کا ایک لڑکا اس لڑکی کو دیکھنے آتا ہے جسے اٹھنے، چلنے، پھرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ ایسے میں اس کی لمبان کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر شادی ہو جاتی ہے اور پھیروں میں لڑکی کو دوہری، تہری ہو کر چلنے کی ہدایت ہے۔ کیسی بے بسی ہے جس میں وہ لڑکی اس ہدایت پر

عمل کرتی ہے مگر نہیں جانتی؟ شادی کے بعد دولہا دولہن دونوں دور آسام چلے جاتے ہیں اور جب مہینوں کوئی خط نہیں آتا تو بڑھیا کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے میاں نے اسے نکال دیا ہوگا۔ سال کے بعد ایکا ایکی وہ وارد ہو جاتے ہیں مگر اس وقت بھی بڑھیا دھپ سے ہاتھ لڑکی کے سر پر مارتی ہے، اور اسے نیچے ہو چلنے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی کہ اب تک لڑکی اور لڑکے نے ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لیا ہوگا۔ یہ کیسا ڈر تھا جس کا شروع اور آخر تو تھا، لیکن بیچ کی منزلیں غائب تھیں؟ جب بڑھیا کو پتا چلا ہے کہ لڑکی پیٹ سے ہے، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی پوتی بس گئی ہے۔ اب وہ تسلّی سے مر سکتی ہے، لیکن مرنے سے چند ہی لمحے پہلے اس کے بوڑھے، جھریوں سے اٹے چہرے پہ مسکراہٹ چلی آتی ہے اور وہ لڑکی سے پوچھتی ہے۔ ''ہائے ری منی! تیرا وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا؟'' ... پھر...... واتاورن میں وایو تو پربل ہوا اٹھتا ہے اور بڑھیا کے سرہانے رکھی ہوئی گیتا کے پنے ہوا میں اڑنے لگتے ہیں اور اس جگہ پر آ کر رک جاتے ہیں، جہاں شبد سماپت لکھا ہوتا ہے۔ ...

..... میں اس کہانی میں آپٹیکل وژن کی بات نہیں کرتا جس میں لمبی سے لمبی لڑکی لیٹے میں چھوٹی ہو جاتی ہے، بلکہ اس ترتیب اور ہم آہنگی کا قصیدہ کہتا ہوں جو انسانی دماغ ہر بے ہنگم چیز میں پیدا کر لیتا ہے۔ اس پر بھی کرشن چند کی کہانی میری کہانی سے بہتر ہے۔ ہاں فادر! میں اپنے اس ہمعصر کی تعریف محض رقابت کے جذبے سے کر رہا ہوں۔ لیکن اسے رقابت رفاقت کہتا ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی میرے ساتھ رفاقت رقابت کرتے آئے ہیں۔

حیف، کہ آپ نے کرشن چندر کی کوئی کہانی پڑھی ہے، نہ عصمت کی اور نہ منٹو کی۔ آپ تو ناچ رنگ، سنیما تماشے، قصے کہانیوں کو ایسی باتیں سمجھتے ہیں، جو آپ کو ازلی حقیقت سے پرے لے جاتی ہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ سب پاپ ہے جو ہندو فلسفیوں کے نزدیک ''پرے اور آپ'' کا مرکب ہے۔ یعنی کہ وہ چیز جو آپ کو ''آپ'' سے پرے لے جائے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں فادر! کہ میں نے ہمیشہ اس آپ سے پرے ہٹنا چاہا کیونکہ میرے نزدیک یہی انسانی حصول کی معراج ہے۔ کیا آپ نے مصری رقاصہ حلیمہ کے لچکیلے بدن کو رقص کے عالمگیر اثبات میں ہاں ہاں کرتے دیکھا ہے؟ کم از کم روسی بیلے میں مارگٹ فونٹین اور نیوریئف ہی کو دیکھ لیتے تو پتا چل جاتا کہ خالق

کا اپنی تخلیق سے کیا رشتہ ہے؟ روسی بیلے ڈانسر تو کثرتِ تعلیم کی وجہ سے اس بات کو نہیں جانتے، لیکن آپ تو جانتے ہیں؟ سونجا ہنی کو برف پہ اسکیٹ کرتے دیکھنے میں تو کوئی گناہ نہیں؟ کیسے وہ برف پہ خط اور دائرے بناتی، زندگی اور ماورا کے چکر سمجھاتی ہے؟ کچھ نہیں تو اس برف ہی کو چوم لیتے، جسے آپ پسند کرتے ہیں اور جو آپ کے جسم و ذہن کا حصہ ہو چکی ہے۔ آپ نے یہودی مینوہن کی وائلن نہیں سنی، تو کیا روی شنکر اور ولایت حسین کی ستار سنی ہے؟ وہ بھی تو روح ہی کی آوازیں ہیں۔ سبولکشمی ''میرا'' کے بھجن بھی تو گاتی ہے، جس سے آپ اپنے مطلب کی بات سمجھتے ہیں اور میں اپنے مطلب کی۔ بالا سرسوتی بوڑھی ہو گئی ہے فادر! یا گورو کرپ جوان ہو گیا ہے؟ حسین، آر، پدمسی اور گائی ٹونڈے محل نہیں بنا سکے، حالانکہ ہمارے مندر، مسجد، گرجے اور ملوں کی چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ باپ روزاریو! آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارے دیش کی ستی ساوتری بھی وہی بات کہتی ہے، جو امریکہ کی ریٹا ہیورتھ، جب وہ اپنے میاں آرسن ویلز سے طلاق لیتی ہے۔ فرانسیسی ایکٹرس یاں مورو کی اداکاری دیکھی ہے اور اس کے بعد اس کا بیان پڑھا ہے جس میں وہ کہتی ہے کہ فن کے اوج کو چھو لینے کے لیے میرے نزدیک اس ڈائرکٹر کے ساتھ سونا ضروری ہے جس کے ساتھ میں کام کر رہی ہوں؟ شیک ناچ والے بھی آپ ہی طرح سے اس بدن کو جھٹک دینا چاہتے ہیں، جو روح کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ جرمنی کی نئی بیماری چومنے دو (Let kiss) کی راہ بھی روح کے مرکز کو جاتی ہے لیکن بدن سے ہو کر۔ آپ اگر مانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں، تو پھر عیسائی کون ہے، مسلمان کون اور ہندو کون؟ پھر میری کہانیوں سے استغنا کیسی؟ تنہا آپ ہی نہیں، باپ روزاریو! جو کہانی کو مہمل بات سمجھتے ہیں، اور بھی بہت سے باپ ہیں۔ جب میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی تو میں اتنا ہی خوش تھا کہ اس دنیا کی تخلیق کے بعد خدا خوش ہوا ہوگا۔ کیا دنیائے ممکنات تھی جو میرے دماغ کے اللہ دینی چراغ نے میرے سامنے کھول دی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ گھر میں غریبی کا دور دورہ تھا۔ بڑوں میں سے فقط میرے بڈھے تاؤ جی رہ گئے تھے جو کسی طرح ہمارے نان و نفقے کے کفیل نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ ان سے اپنی چھوٹی سی زمینداری بھی نہ چلتی تھی۔ ایک دن میں نے ان سے کہا—
''آپ سب بھول جائیے، تاؤ جی! مجھے کہانیاں لکھنی آ گئی ہیں اور میں ان سے بہت پیسے کماؤں

گا۔'' میرے تاؤ آپ سے بھی زیادہ بھولے تھے، فادر روزاریو! وہ ''جپ تپ نیم سچ سنجم'' کے بہت قائل تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا— ''کیا تم زندگی بھر جھوٹ کی کمائی کھاؤ گے، جاہن؟''

جب سے میں برابر جھوٹ بول رہا ہوں فادر! لیکن اسے جھوٹ سچ کہتا ہوں۔ یہ ترکیب میں نے اپنی آسائش اور سہولت کے لیے نہیں بنائی، بلکہ میں اس کا قائل ہوں۔ آپ کے خدا کی زبان بھی خالص سچ نہیں ہے۔ وہ بھی کنایے میں بات کرتا ہے۔ اس نے کبھی سامنے آکر سچ کے طریقے سے نہیں کہا— میں ہوں— اس نے کسی قتل کے مقدمے میں گواہی نہیں دی۔ حالانکہ بعض حالات میں قتل صرف اسی نے دیکھا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے— تم ہو، اس لیے میں ہوں۔ گواہ ڈھونڈنے کے لیے دوڑ بھاگو اور اگر کوئی نہ ملے تو پیدا کرلو۔ آدمی سخت پریشان ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ آج گواہ کو پیدا کرنا شروع کیا تو وہ کتنی دیر میں پلے گا اور پل کر جوان ہوگا؟ وہ کہتا ہے، میری مملکت میں انگلیوں کی لکیریں مسکت گواہی دیتی ہیں، اینٹ پتھر بھی بولتے ہیں۔ ان کا بیان نہ لے سکو، تو ایسے ہی کان کھول کر پھرو، کیونکہ کہیں نہ کہیں قاتل کی آستین کا لہو پکار رہا ہوگا۔ اگر وکیلوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قاتل بری ہوجائے تو بھی وہ کچھ نہیں کہتا۔ ضرور پچھلی زندگی میں مقتول نے قاتل کو قتل کیا ہوگا۔ اس لیے اس زندگی میں حساب بیباق ہوگیا۔ وہ ہمیں کبھی ایک خوبصورت سا خرگوش ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور کبھی بدصورت سا خارپشت۔ یہ اس کی کہانیاں اور پہیلیاں ہیں جو ہماری سمجھ کو آزماتی ہیں اور اسے صیقل کرتی ہیں۔ پنجابی شاعر گلیریا کے مطابق، اس نے گلاب کو بیسیوں زبانیں دی ہیں، لیکن وہ چپ ہے۔ اگر بات کرتا ہے تو اشارے کی زبان میں۔ خدا کی اپنی زبان بھی تلمیح (Allusion) کی ہے اور وجود التباس (ILLusion) کا وہ خود مایا کی معرفت باتیں کرتا ہے اور کبھی ٹھیٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیلیو، منصور، سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اسی لیے مارے گئے کہ انھوں نے خالص سچ بولا اور جھوٹ سچ کی عظمت کو نظر انداز کر گئے۔ انھوں نے اپنے سامنے لوگوں کو اس سلسلے میں شہادت پاتے ہوئے دیکھا۔ مگر یہ بھول گئے کہ انسان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، لیکن سامنے کا سچ نہیں۔

آپ کھرے کھرے سچ پر یقین رکھتے ہیں، باپ روزاریو! تو لیجیے میں آپ کو کچھ سچی

باتیں اپنی کہانیوں کے سلسلے میں بتاتا ہوں۔ وہ بالکل سچی ہیں۔ دیسی گھی کی طرح خالص اور گاڑھی گاڑھی۔

میں نے اپنی کہانی ''ببّل'' میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مرد اور عورت کے بیچ خوش وقتی برحق ہے، لیکن انسانی معاشرے کا کوئی بہتر نقشہ سوائے اس بات کے نہیں بنتا کہ مرد اور عورت شادی کریں اور اس کے بعد بچوں کی ذمہ داری قبولیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جنسی فعل میں تقدیس پیدا ہوسکتی ہے، جسے دنیا کے ننانوے فی صدی لوگ گناہ اور نجس سمجھتے ہیں اور اسے درد ناک بلکہ شرمناک مجبوری گردانتے ہیں...... درباری لال ایک بچے ببّل کو اس کی بھکارن ماں مصری سے کرائے پر لے کر سیتا کو ہوٹل میں لے جاتا ہے، تو سب اسے خوش آمدید کہتے ہیں، حالانکہ اس سے ایک ہی روز پہلے کسی دوسرے ہوٹل والے نے اسے لچا لفنگا کہہ کر بھگا دیا تھا۔ ہاں جب وہ سیتا کے ساتھ ہمبستری کرنے لگتا ہے تو ببّل رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لیے دوڑتا ہے، لیکن نیم عریاں سیتا دوڑ کر بچے کو پکڑ لیتی ہے اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہے، جس نے اس کام کے لیے ایک معصوم بچے کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہے، بچے کے ساتھ، جو عورت — ماں کا غیر منفک حصہ ہے اور ایسی نظروں سے درباری کی طرف دیکھتی ہے کہ اس پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ وہ اسی منفعل حالت میں سیتا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا...... جس سچ سے میں نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، باپ روز اریو! اس میں میرے ہیرو نے وسکی پی کر اور پانچ روپے والا پان کھا کر سیتا کی اس حد تک آبروریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال لے جائی گئی اور جلاّب سے بچے کے پیٹ میں سے افیون اور اس کا اثر دور کیا گیا......

اور سچ کہوں؟ ''ٹرمینس سے پرے'' میں موہن جام وکٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پر اپنی بیوی کو پہاڑ پہ جانے کے لیے رخصت کرتا ہے۔ گاڑی چلتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی واقف کار اَچلا نے اسی گاڑی میں اپنے شوہر کو دلّی کے لیے رخصت کیا ہے۔ موہن جام، اَچلا کو اپنی کار میں لفٹ دیتا ہے اور اس طریقے سے آگ اور تیل کا گھٹیا سا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تضادات ایک

طرف گناہ کے محرک ہوتے ہیں، تو دوسری طرف سدّ باب بھی۔ اچلا، موہن جام کو زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور کہتی ہے۔۔۔ ''کیا مرد اور عورت کے درمیان اور کوئی رشتہ نہیں بنتا؟ کیا وہ بہن بھائی نہیں ہو سکتے؟'' موہن جام برافروختہ ہو کر اسے بہن کہہ دیتا ہے، لیکن۔۔۔

اُدھر موہن جام کی بیوی سومترا لوٹ آتی ہے اور اُدھر اُچلا کا شوہر رام گدکری۔ رکشا بندھن کے دن موہن جام تین ساڑھے تین سو کی ساڑی اور سو روپیہ نقد اچلا کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ اس شہر میں اپنی سگی بہن کو اس نے صرف دس روپے دیے تھے۔ اچلا اس دن صبح ہی سے بجتی بنتی رہی تھی اور اس نے جو رکشا، موہن جام کے لیے بنائی تھی، اس میں کلابتون کے علاوہ کچھ موتی ٹانکے تھے۔ موہن جام رکشا بندھوا کر، ایک سرد آہ بھرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ جبھی اُچلا کے اعضا جواب دے جاتے ہیں اور وہ اپنے میاں رام گدکری سے لپٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے۔ ''مجھ سے پیار کرو، اور، اور '' حقیقت یہ ہے کہ موہن جام اور اچلا نے باہمی سازش سے علی الترتیب اپنی بیوی اور اپنے میاں کو بھجوا دیا تھا۔ اب اچلا کے ہاں ایک بچہ ہے، جسے اُچلا کا شوہر رام گدکری اپنا سمجھتا ہے اور اس سے کھیلتے ہوئے کہتا ہے۔ ''میرا چنو، میرا منو ''

یہ نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت اور بدکاری ہی بدکاری ہے۔ نیکی کا سچ یہ ہے کہ میرے افسانے ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو اپنی حقیقی زندگی میں اتنی ''بلند کردار'' بن چکی ہے کہ اسے اپنے سوا اور کوئی آدمی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے اٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں، حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ سب اپنی پہلی فرصت میں اس سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی پوجا پاٹھ کیا کرتی ہے اور کبھی کبھی آنے والوں کو اس کی وحشت ناک ہنسی سنائی دیتی ہے۔

سچ سننے کی تاب کس میں ہے، باپ روزار یو؟ نہیں میں سچ نہ بولوں گا، یا ایسا سچ بولوں گا جو آپ کے سچ سے ارفع ہو۔ یعنی اس میں جھوٹ کی حسین سی آمیزش ہو۔ ایسا نہ کروں گا تو معاشرے میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔ لوگ مجھے مار دیں گے اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی سے بڑی کمینہ سی محبت ہے۔ میں شہادت کو پسند کرتا ہوں، بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کی ہو۔ میں اپنی پیٹھ پر صلیب اٹھاتا ہوں، لیکن اس امید میں کہ ایک دن اسے جھٹک دوں گا۔ پہلے میں بہت بے ضرر

قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا فادر! جن کا تعلق سطح محض سطح سے تھا۔ اب جب کہ میں نے انسان کے تحت الشعور میں جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس پہ لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پہ لکھتا بھی ہوں، باپ روزاریو! تو ایک ذمہ داری کے احساس کے ساتھ۔ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لیے نہیں۔ یوں مجھے اپنے گناہ، جو پوری طرح سے گناہ نہیں بن پاتے، بے حد عزیز ہیں۔ دراصل میں آپ کے پاس اتنا اعتراف گناہ کے لیے نہیں آیا، جتنا یہ بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اور گناہ کروں گا تا کہ آپ کی نوکری بنی رہے۔ میں مجبور ہوں، باپ روزاریو! جب گناہ کی گھڑی آتی ہے تو میرے جسم و ذہن بلکہ کام و دہن اسی طرح کانپنے لگتے ہیں، جیسے آپ حسنِ ازل سے دوچار ہو کر۔ میں بھی اپنے میدانِ عمل میں ایک طرح کا پادری ہو گیا ہوں۔ قاتل خود مقدمے کی سماعت کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لکھنے کے کمرے میں جو ڈیڈ پلانٹ ہے، اس نے روٹھ کر مجھ سے کہا۔ ''دو دن ہو گئے، تم نے مجھے پانی ہی نہیں ڈالا۔'' میں کیا جواب دیتا۔ میں نے شرارت سے کہا، کئی روز ہو گئے تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ وہ ہنس پڑا اور میں بھی رو پڑا۔ اس کے بعد میں نے اس کے پتوں کو چوما۔ ہاتھ سے اپنے بدن کی حرارت دی، جو کثرتِ گناہ سے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے بدن کی ہری ٹھنڈک دی۔ میرے گھر کے سامنے ایک ڈسٹ بن ہے، جہاں محلّے کے لوگ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اس میں ڈبل روٹی کا ایک سلائس پڑا تھا۔ میں کہیں اُدھر سے گذر رہا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں سے سر اُٹھا کر اس نے مجھ سے کہا'' دیکھو، دیکھو جاہن مجھے کہاں پھینک گئے ہیں؟ یہ میری جگہ نہیں ہے، جب کہ اسی سڑک کے موڑ پر، پان والے کی دکان کے پاس، کئی بھوکے گھوم رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے پروڈیوسر نے کہا ہے کہ پکچر آگے نہیں چلے گی کیونکہ ہماری ہیروئن حاملہ ہو گئی ہے۔ اب ہم اور ہمارا پورا یونٹ اگلے چھ آٹھ مہینے تک بیکار رہیں گے اور ہیروئن کی صحت کے لیے دعائیں کرنے پر مجبور، یا ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول کریں گے جو کہ ہر آدمی بیکاری میں کرتا ہے!''

سامنے ڈان باسکو اسکول کا گرجا دیکھ رہے ہیں نا؟ اس میں بجنے والے گھنٹے کی آواز بے حد خوبصورت ہے۔ میں مندر اور مسجد وغیرہ میں تو نہیں جاتا، لیکن گھنٹوں کی آواز اور اذان مجھے بہت

پیاری لگتی ہیں۔ میں ان کی بازگشت کا پیچھا کرتا ہوا اتنی دور نکل جاتا ہوں کہ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں انہی کی طرح لطیف سے لطیف تر ہوتا جا رہا ہوں۔ روح کا تو وزن نہیں ہوتا، میرا بدن بھی بے وزن ہو جاتا ہے اور میں پوری کائنات میں پھیل جاتا ہوں۔ جب میری شکل جاہن کی نہیں رہتی۔ میں وہ پرماتما بن جاتا ہوں جو 'اروپ' اور 'نراکار' ہے۔ مجھے خدا کی اس بے صفتی سے بے حد محبت ہے، کیونکہ اس کی اسی صفت سے ہم جو کہانیاں لکھتے ہیں اور تصویریں بناتے ہیں، اپنے لیے گنجائش پاتے ہیں — جیسے ہم بھی اپنے طریقے سے چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ جب میں اپنے دل کی خوبصورت گھلاوٹ میں گلیر یا کی نظم پڑھتا ہوں۔

اے اروپ! میں بھی تو روپ ہین ہوں۔
تیرے روپ کی جیوتی، میرے آکار کی سیاہی کو روپ مان اور اجاگر کر دیتی ہے۔
تیرے روپ کی جیوتی — میرا جیون آدھار ہے۔
اس کے بنا میرے وجود کا رنگ اور میرے آکار کے چتر مجھ ہی میں گم ہو جاتے ہیں......

فادر روزاریو! میں اپنی اس آگہی سے کبھی خود ہی متوحش ہو اٹھتا ہوں۔ آپ اندازہ کیجیے، وہ آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے جسے اپنی روح کے اندھیرے میں ایک ساتھ لاکھوں، کروڑوں آوازیں سنائی دیں، جو اس قدر لطیف ہو جائے کہ خود کو بھی ڈھونڈنے پر نہ پا سکے۔ جب آگہی آتی ہے تو آپ اپنی ذات میں ہزاروں معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر کثیف و لطیف چیز کا رشتہ سمجھ لیتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں، تو ایک بے بضاعت سی چیونٹی بھی استعارہ بدوش آپ کے سامنے چلی آتی ہے۔

کیا کہا، باپ روزاریو؟ آپ کلیسا چھوڑ رہے ہیں؟ نہیں فادر! خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔ میری طرح اکیلے جینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کی قبیل کے اور لوگ جی ہی نہیں سکتے، جب تک وہ کسی مذہب، فرقے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے جو بھی جھوٹ سچ بولا ہے، وہ ہر کسی کے کام کا نہیں۔ آپ نے کلیسا چھوڑ دیا تو آپ مر جائیں گے اور وہ بھی پاگل ہو کر......

مجھے اجازت دیجیے فادر!......وہ آدمی جو ایک مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا تھا اور عورت کو الگ لے جانے کے بعد آج تک لوٹا ہی نہ تھا، ایکا ایکی کہیں سے چلا آیا ہے۔ میں جا کر ذرا اس سے پوچھوں تو آخر بات کیا ہوئی؟

افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل

میں معافی چاہوں گا کہ اس مضمون کو کھولنے کے لیے مجھے اپنی ذات میں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اس لیے بھی درگزر کریں گے کہ اتنی بڑی مخلوق کی میں بھی اکائی ہوں ایک، اس لیے سب کو سمجھنے کے لیے میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنے آپ کو سمجھ لوں۔

افسانوی تجربہ کیا ہے؟ مجھے افسانہ سازی کی لت کیسے پڑی؟ اگر یہ مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پڑی، تو باقی دوسروں کو کیوں نہیں پڑی؟ کیوں نہیں میں کسی فرنانڈس کی طرح گرجے کے سامنے بیٹھا موم بتیاں بیچتا؟

فن کسی شخص میں سوتے کی طرح سے نہیں پھوٹ نکلتا۔ ایسا نہیں کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فن کار ہو کر جاگیں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں آدمی پیدائشی طور پر فن کار ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صلاحیتیں ہیں، جن کا ہونا بہت ضروری ہے، چاہے وہ اسے جبلت میں ملیں اور یا وہ ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ پہلی صلاحیت تو یہ ہے کہ وہ ہر بات کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو، جس کے لیے ایک طرف تو وہ داد و تحسین پائے اور دوسری طرف ایسے دکھ اٹھائے، جیسے کہ اس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اسے نمک کی کان سے گذرنا پڑ رہا ہو۔ دوسری صلاحیت یہ ہے کہ اس کے کام و دہن اس چرند کی طرح سے ہوں، جو منھ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آئے کہ گھاسلیٹ یا بجلی کا زیادہ خرچ ہو گیا، یا کاغذ کے ریم کے ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ

قدرت کے کسی بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقشِ ثانی کو ہمیشہ نقشِ اول پر ترجیح دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پہ کان دے — مثلاً موسیقی، اور جان پائے کہ استاد آج کیوں سُر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل گیا ہے۔ مصوری کے لیے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ وشی واشی میں خطوط کیسی رعنائی اور توانائی سے اُبھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس اڈیٹر نے اس کا افسانہ واپس کر دیا ہے، نااہل ہے!

اس کے بعد کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ (TRIGGER OFF) سکتی ہے۔ مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اُچھال دے۔ یا کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے، جس پہ اس غریب کا کوئی بس نہ ہو اور جو اسے بے سلامتی کا شکار کر دے اور وہ اپنے دل میں ٹھان لے کہ مجھے اس بے تعاون، بے رحم دنیا میں کہیں جگہ نہ پانا ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا، اس میں مدافعت کی وہ قوتیں نہیں ابھرتیں، قدرت کے پاس جن کا بہت بڑا خزانہ ہے۔

نو عمری میں یہ سب باتیں میرے ساتھ ہوئیں، اور مجھے یقین ہے کہ تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ دوسرے فنکاروں پر بھی بیتی ہوں گی۔ اکثر لوگوں کو حادثے پیش آتے ہیں اور وہ گونا گوں مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں، لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ وہ فن کے راستے سے گزرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ لیے۔ صدر ہر جا کہ نشیند، صدر است۔ انھوں نے یا تو اپنے مخصوص کام میں جھنڈے گاڑے اور یا تھک ہار کر جنت کو سدھارے۔ گویا بے عزتی اور پے در پے حادثوں کے بعد کچھ کرنے، بن کر دکھانے کے سلسلے میں اپنے ملک کے ہر اردوداں نوجوان کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں میری شادی ہو گئی تھی...... آپ میری بات سمجھیے — کوئی معشوق میرے سامنے تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو مجھے بچہ سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اگر وہ رُکے تو میری بیوی جوتا پکڑ کر اسے ہنکال دیتی تھی۔ میں نے تو یہ پڑھ رکھا تھا کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے میں چپکے سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور کرتا ہی رہ گیا۔ میں نے ہجر و وصال، وفا و بے وفائی، رقیب و محتسب کے مضمون شاعروں کے تتبع میں

باندھے، مگر وہ سب مجھے جھوٹے اور کھوکھلے لگتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ محتسب تو میں خود ہوں۔ رقیبِ روسیاہ کی کیا مجال جو فرسنگ بھی میرے گھر کے پاس پھٹکے۔ یہ تو شادی کے ان لکھے معاہدے کی دوسری مد ہے، جس کی رو سے اگر رقیب کو قتل نہیں کیا جا سکتا، حوالات تو بھجوایا جا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو فیض کی طرح رقیب کے ساتھ رشتہ پیدا کر سکتے ہیں اور اس کے افادی پہلو سے واقف ہیں۔ گویا زندگی، جو بھی تعلیم مروجہ شعر کے سلسلے میں دیتی تھی، میں اس میں کورا ہی رہا۔ اس کے برعکس میڈم زندگی نے تلافیِ مافات میں مجھے دوسرے مسئلے دے دیے۔ مثلاً خانہ داری کے مسئلے، روزگار کے مسئلے، جو کسی بھی طرح عشق کے مسائل سے کم نہ تھے۔ حالات نے ایسا جمود پیدا کر دیا اور بدن میں ایسی کپکپی کہ لاہور کے لنڈے بازار سے خریدا ہوا مرانجا مرانجا اینڈ کو کا پرانا، پھٹا ہوا گرم کوٹ بھی مجھے نہ بچا سکا۔

بس، بہت ہولی۔ اب میں اپنی بات بند کرتا ہوں، کیونکہ ''گرم کوٹ'' کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، یہ سب کچھ لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ کیا نہیں ہوا کے بارے میں انھیں مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔

افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں ــ ہے، تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن، شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔ پھر شعر، فی الخصوص غزل میں آپ عورت سے مخاطب ہیں، لیکن افسانے میں کوئی ایسی قباحت نہیں۔ آپ مرد سے بات کر رہے ہیں، اس لیے زبان کا اتنا رکھ رکھاؤ نہیں۔ غزل کا شعر کسی کھردرے پن کا متحمل نہیں ہوسکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نژاد ہونے کی وجہ سے اس میں کھردرا پن ہونا ہی نہیں چاہیے، جس سے وہ شعر سے ممیز ہو سکے۔ دنیا میں حسین عورت کے لیے جگہ ہے، تو اکھڑ مرد کے لیے بھی ہے، جو اپنے اکھڑ پن ہی کی وجہ سے صنفِ نازک کو مرغوب ہے۔ فیصلہ اگرچہ عورت پہ ہیں، مگر وہ بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی، جو نقل میں بھی اس کی چال چلے۔ ہمارے نقادوں نے افسانے کو داد بھی دی تو نظم کے راستے سے ہو کر، نثر کی راہ سے نہیں جس سے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کی ریل پٹڑی سے اتر گئی اور جو نہیں اتری تھی، تو ایسی توصیف سے متاثر ہو کر انھوں نے

خود، اپنے ہاتھوں سے اپنی لائن کے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لیے۔

یہ بات طے ہے کہ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ آخر اتنی لمبی مسلسل بحر سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں تو چاہییں ہی۔ باقی اصناف ادب، جن میں ناول بھی شامل ہے، ان کی طرف جزواً جزواً توجہ دی جاسکتی ہے، لیکن افسانے میں جزو و کل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہراول، متداول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں، تو یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔ شروع سے لے کر آخر تک لکھ لینے کے بعد پھر آپ ایک لفظ بڑھانے یا دو فقرے کاٹ ہی دینے کے لیے لوٹ سکتے ہیں۔ ایزاد و اضافے کی یہ نسبت، میں نے بے خیالی میں قائم نہیں کی، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ افسانے میں ایزاد اضافے سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ کو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہوگا، جو بجائے خود خوبصورت ہوں اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں اور یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں۔

اب میں ایک چونکا دینے والی بات کرنے جارہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اردو زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ افسانے کے سے فنِ لطیف کو اس طریقے سے سمجھ سکے یا قبول کر سکے، جیسے سمجھنا یا قبول کرنا چاہیے۔ میری اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ پیچھے مڑ کر دیکھیے کہ ہر آن آپ نے ڈکشن پہ کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے۔ اس عمل کا گراف بنایا جائے تو وہ میر، انیس اور غالب کے بعد داغ تک نیچے ہی آتا ہوا دکھائی دے گا۔ معلوم ہوتا ہے، ہم نے ''فسانۂ آزاد'' کو افسانہ یا ناول ہی سمجھ کر پڑھا۔ ہم نے اس کا مقابلہ — VANITY FAIR سے کیا ہے۔ ہم نے آغا حشر کو ہندوستانی شیکسپیر بھی کہا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے دونوں میں سے کسی ایک کو نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو فرق کو نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونا فلم اور ٹیلی وژن انسٹی ٹیوٹ میں ممتحن کی حیثیت سے جب میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا — آپ کو کون سے مصنف پسند ہیں، تو اس نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا — ''مجھے تو دو ہی مصنف پسند ہیں سر! گلشن نندہ اور شیکسپیر!''

کبھی 'ہمایوں' اور ادبی دنیا، دونوں رسالے فیاض محمود اور عاشق بٹالوی کی توصیف میں کالے تھے۔ اور آج ہم ہی افسانے کی تاریخ میں ان بے چاروں کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ہم نے افسانے میں زورِ بیان کو اس قدر سراہا ہے کہ ادب تو ایک طرف، خود ادیب کو نقصان پہنچایا ہے۔

افسانے میں اظہار کے تخلیقی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ گریز کا ہے۔ لیکن ہمارے شغب آشنا کان گریز کو عجز بیان کا نام دیتے ہیں۔ ہم ابھی تک داستان گوئی، فلسفہ رانی اور تاریخی واقعات کو آج یا کل کے کرداروں کی معرفت پیش کر دیے جانے پر سر دھنتے ہیں۔ سر دھننے سے مجھے کچھ وہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو ہم کچھ بھی کر کے دھنیں گے ہی کہ وہ ہماری عادتِ ثانیہ ہو چکی ہے۔ مگر تکلیف اس وقت ہوتی ہے، جب ہم خطیب، مورّخ اور فلسفہ بردار کو ہی افسانہ نگار کا نام دیتے ہیں۔

افسانہ کوئی سودیشی (INDIGENOUS) شے نہیں۔ ہم نے جاتک کہانیاں لکھیں۔ کتھا سرت ساگر لکھی اور ہم سے لوگ انھیں مغرب لے گئے، جہاں انھوں نے کہانی کو فن بنا دیا۔ ہیئت میں بے شمار تجربے کیے، جن سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے۔ افسانے کے فن کو چھوڑیے، کسی فن کو جانچنے پرکھنے کے لیے عالمی پیمانے پر اسے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی علاحدگی (ISOLATION) نہیں ہے۔ ملکوں اور قوموں کی حدیں نہیں ہیں۔ بشرطیکہ آپ منٹو کو موپساں اور مجھے چیخوف کے نام سے پکارنے لگیں۔ حالانکہ یہ ممکن ہے، میں خود کو کاوابا تا کہلوانا پسند کروں۔ آپ کو کیسا لگے گا اگر میں کہوں کہ رام لال اور جوگندر پال ہندوستان کے ہیزش بوہل ہیں اور قرۃ العین حیدر، ہان سویان! مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے، بشرطیکہ ہان سویان کے ہم وطن اسے اپنے دیس کی قرۃ العین حیدر کہیں۔

عجیب دھاندلی ہے نا۔ معلوم ہوتا ہے اردو اسم بامسمّا ہوتی جا رہی ہے۔ ہیزش بوہل کا ایک کردار جوجج ہے کہتا ہے:

> ''......ایسے مقدمے میں انصاف قسم کی کوئی چیز ہی نہیں، کیونکہ ملزم اس کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی آمریت ہے، جس میں انفرادی اظہار اور خلاقی سہو زمانی (ANACHRONISTIC) بات ہے......''

مذکورہ ریاضت اور عالمی پیمانے پر گرد و پیش کی آگہی کے بعد ہی افسانے پر عبور حاصل ہوتا ہے، اور جب یہ بات ہو جاتی ہے تو افسانہ لکھنے والے کے اضطرار (REFLEXES) کا حصہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف آپ کی بے ارادہ بات سے افسانے کا مواد مل سکتا ہے، بلکہ ہر موڑ، ہر نکڑ پہ

افسانے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ انھیں سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار کے ہاتھ قلم ہو جائیں۔ بہر حال افسانوی تجربے پر عبور حاصل ہو جانے کے بعد افسانہ نگار کو یونان کے اساطیری کردار، می ڈاس کا وہ لمس مل جاتا ہے، جس سے ہر بات سونا ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کا افسانہ نگار سونے کو بھی چھوتا ہے تو وہ افسانہ ہو جاتا ہے۔ گھبراہٹ کی بات اس لیے نہیں کہ اتنا سونا پا کر می ڈاس بھی بھوکا مرا تھا۔

افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا، دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے — پی. ایچ. ڈی اور ڈی. لٹ۔ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ انھیں بھول نہ سکنے کی بیماری ہے۔ میں ایک دماغی تساہل کی طرف اشارہ کرتا ہوں، جسے منٹو نے میرے نام ایک خط میں لکھا— ''بیدی! تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔'' میں سمجھ گیا کہ منٹو کا مطلب ہے— میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ مگر میں کیا کرتا؟ ایک طرف مجھے فن اور دوسری طرف زبان سے لوہا لینا تھا۔ اہل زبان اس قدر بے مروّت نکلے کہ انھوں نے اقبال کا بھی لحاظ نہ کیا۔ کسی سے پوچھا آپ اقبال سے ملے تو کیا بات ہوئی— بولے، کچھ نہیں میں، جی ہاں، جی ہاں، کہتا رہا اور وہ ہاں جی، ہاں جی، کہتے رہے۔ اب حالات میں نسبتاً آسانی ہے کیونکہ سند کے لیے ہمیں کہیں دور نہیں جانا ہے۔ پرسوں ہی ڈاکٹر نارنگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں ایک تحریک چلی ہے جو شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی پُورب سے آئی ہوئی زبان کو ٹکسالی نہیں مانتی۔ بہر حال میں نے منٹو کی تنقید سے فائدہ اٹھایا اور دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا، لیکن اس کا کیا کروں کہ وہ اِدھر اُدھر سے ہو کر پھر رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بے ادائی کی ادا، جس کی طرف منٹو نے اشارہ کیا، میر کے الفاظ میں خاک ہی میں مل کر میسّر آتی ہے۔ لیکن یہی بے ادائی اور قلم برداشتگی جہاں منٹو اور کرشن چندر میں مزا پیدا کرتی تھی، وہیں بدمزگی بھی۔ منٹو کی تنقید کی وجہ سے میری حالت عورت کی سی تھی، جو مقبوض اور تاراج بھی ہونا چاہتی ہے اور پھر اس کا بدلہ لینا بھی۔ جب میں نے منٹو کے کچھ افسانوں میں لااُبالی پن دیکھا تو انھیں لکھا— منٹو، تم میں ایک بڑی بات ہے اور وہ یہ کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور نہ

لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔

اس کے بعد منٹو اور مجھ میں خط و کتابت بند ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ انھوں نے میری تنقید کا اتنا برا نہیں مانا، جتنا اس بات کا کہ میں لکھوں گا خاک، جب کہ شادی سے پرے مجھے کسی بات کا تجربہ ہی نہیں۔ اس پہ طرفہ میں نہ صرف بھینس کا دودھ پیتا ہوں، بلکہ اسے پال بھی رکھا ہے۔ میں انھیں کیسے بتاتا کہ اگر اونٹ کا رشتہ مسلمان سے ہے، گائے کا ہندو سے، سکھ کا بھی کسی سے ہو سکتا ہے۔

افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا— اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے، لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے۔ کچھ وافر باتیں سوءِ ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آجاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فتور سے۔ تسکین کی بات صرف اتنی ہے کہ افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر اڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا۔ ہم اس میں ایزادو اضافہ کر سکتے ہیں اور اس بات پر نہ بنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ اگر ہیمنگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے، تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

اردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد گنی چنی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورے کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ہم اپنے ہی امیج کے قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔

[یہ مضمون جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے جدید اردو ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کے مسائل پر منعقدہ سیمینار میں خطبہ صدارت کے طور پر پڑھا گیا۔]

دیباچہ

[''دانہ ودام'' اشاعتِ اوّل]

شوپنہار لکھتا ہے: بہت سی کتابیں بری اور وہ مطلق لکھی ہی نہیں جانی چاہیے تھیں۔

ہم ایک مسلّم [مسلمہ؟] قنوطیت پسند کے اس دعوے کو جھٹلانے کی کتنی ہی کوشش کریں، ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ بہت سی کتابیں جو مطبعوں سے معرضِ وجود میں آتی ہیں، ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جنھیں فضیلت کے بلند ترین معیار پر رکھ سکیں اور اس کے وجوہ ڈھونڈنا چنداں مشکل نہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ مصنف کا فن غیر معمولی طور پر مشکل العمل ہے، بلکہ اسے نہایت آسان فرض کر لیا گیا ہے اور بغیر فن کی ابتدائی تعلیم واقف کاری [کذا] سے اس کی بسم اللہ کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہر قسم کے فن کے لیے محض اوزار کی ضرورت نہیں، از بس کہ لکھنے کے لیے قلم دوات اور کاغذ کی ضرورت ہے۔ یقیناً ہر ایک ہنر مند کام میں، ایک خاص شغف اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن مصنف کو اس سے بھی کہیں زیادہ، ایک بلند مرتبہ چیز کی تلاش ہے۔ اس کے اوزار محض اوزار نہیں ہوتے جن سے ایک خاص قسم کی مقصد براری ہوتی ہے۔ نہ ہی وہ مہارت ہوتی ہے جسے وہ قدرتِ اظہار کے نام سے موسوم کردے...... بھلا بتایئے تو، اگر مصنف کے پاس کہنے کے لیے ہی کچھ نہ ہو، تو اس کے ساتھ کیا گزرے۔ پس اوّلین چیز مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ اسے کچھ لکھنا ہو اور اس میں آمد ہو۔

''قلبی نظام کار کے نہایت زیرکانہ تجزیے کے باوجود ہم یہ کہیں گے، جیسا
کہ ڈناہ نے کہا ہے کہ ہمارا بلند تخیّل ...... ہمیں عطا کیا جاتا ہے۔''

(جارج ایلیٹ)

مصنف اس خاص قسم کے عطیے کے حصول کے لیے دوسرا لقمہ منھ میں نہیں رکھتا۔ ایک سینما فلم کو بغیر پورے طور پر دیکھے ہوئے گھر واپس لوٹ آتا ہے ــــ اور کبھی کبھار شدت کی برودت میں اپنے نرم و گرم بستر ے میں سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور اپنے اس عجیب و غریب ملاقاتی INSPIRATION سے ایک نہایت پُرتپاک مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ایما پر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے دولت و ثروت، شادی و غمی، کسی چیز کا خیال نہیں ہوتا۔ وہ صرف اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی پرواز، تخیّل کے ساتھ ساتھ دوڑ سکے۔ کیونکہ ''اُڑنے'' اور ''دوڑنے'' میں فرق ہے۔ اگرچہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مصنف کی طاقتیں کبھی خاموش (STATE OF COMA) ہو جاتی ہیں اور کافی سر دُھننے کے بعد اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ طاقتیں بھی حدود رکھتی ہیں اور ان ہی حدود میں ردّ و بدل ہوتا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں کسی دن اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ قوتیں جنھیں وہ خود بیدار کرنے کے لیے سر دُھنتا تھا، وہ چند ایک خارجی اسباب و علل کی وجہ سے حرکت میں آگئی ہیں اور ایک خاص کتاب، گفتگو یا نگاہ نے اس خوابیدہ فتنے کو جگا دیا ہے۔

سعادت حسن منٹو نے ''من کی من میں'' اور ''گرم کوٹ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بیدی صاحب جو لکھتے ہیں، انھیں لکھنا ہوتا ہے اور جس طرح ہندوستان کے ٹھیٹ افسانوی ادب کا آغاز گوگول کے افسانے ''لبادہ'' سے ہوا تھا، اسی طرح ہندوستان کے ٹھیٹ افسانوی ادب کا آغاز راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''گرم کوٹ'' سے ہوگا۔ مجھے بھی ان کے افسانے ''گرم کوٹ' [کو] پڑھنے کے بعد اسی شدت کی آمد نے بہت متاثر کیا۔ تخیّل کی پختہ کاری کیا ہے؟ ''شمی'' کی دو چمکتی ہوئی آنکھیں اور اس کا کافوری سفید کوٹ، جن سے وہ والہانہ محبت کرتا ہے۔ اسی میں مجبوری اور محبت کی کشمکش کو کچھ اس لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر وہ مبہم سے کلمے ــــ

''وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!''[1]

اور جب ہیرو کے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی ہے تو اس کی بیٹی پشپا ناچتی گاتی ہوئی آجاتی ہے اور کہتی ہے: مجھے استانی نے گرم بلیزر ایک گز مربع، ڈی ایم سی کے گولے گنیا ماپ کے لیے اور دوسوتی لانے کے لیے کہا ہے۔ اس وقت شمی سوائے اپنے شوہر کے گرم کوٹ کے کسی اور بات کو سننا نہیں چاہتی۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک چپت لگاتی ہے۔ ہیرو اپنی بیٹی کو بھی محبت کرتا ہے۔ اسی وقت ایک فقرہ اضطراری لے میں ڈوبا ہوا آتا ہے—

''وہ پشیامنی کا رونا، اور میرا نیا کوٹ!''[2]

اور ان دو مبہم سے فقروں کی تکرار سے ایک دنیا کی تخلیق ہوگئی ہے۔ اسی طرح ''بھولا'' بھی بیدی صاحب کی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی کہانی ہے۔ اس کی نشو و نما دیہات کی سادہ معاشرت میں ہوئی۔ بخلاف اس کے ''پان شاپ''، ''گرم کوٹ''، ''ہمدوش'' اور ''کوارنٹین'' وغیرہ کی، شہر کی فضا میں— لیکن یہ سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر ایک قابل فنکار کے نقوشِ قلم ہیں۔ صنعت نہ دیہات کا ٹھیکا ہے اور نہ شہر کی اجارہ داری۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کس بلا کی آمد کے ساتھ لکھے گئے ہیں— اور مصنف نے نفسِ تحت الشعور کی کتنی کامیاب تصویر پیش کی ہے۔

عالم گیر صداقت:

مصنف وہ انسان ہے جس پر کسی چیز کی صداقت عیاں ہوئی اور اس نے اس صداقت کو، جس حد تک دوسروں تک پہنچا دیا، اسی درجہ وہ کامیاب گنا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مصنف ایک حقیقت نگار ہے۔ اب یہ حقیقت نگاری اتنی آسان چیز نہیں جتنا کہ متصور کیا گیا ہے۔ اولین مراحل میں تو حقیقت کو پانا ایک آسان امر نہیں۔ اور پھر حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لیکن ہر وہ انسان جو عادتاً اس قسم کی مشکلات پر حاوی ہو جاتا ہے، وہ اس کی صداقت کی قیمت سے واقف ہوتا ہے، جو کہ روح میں لطافت پیدا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصنف نہ صرف ایک حقیقت نگار ہوتا ہے، بلکہ حقیقت پسند بھی۔

1۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ایڈیشن: ستمبر 1963، صفحہ 57

2۔ مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 58

ہم یہ سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ افسانہ بہ وجہ اپنے اصلاحی [اصطلاحی؟] مطلب کے، ایک صداقت کے مخالف چیز ہے، لیکن معمولی سی مثال اس بات کی مظہر ہوگی کہ افسانہ نگار کو بھی صداقت سے اتنا ہی واسطہ ہے، جتنا کہ تاریخ داں کو واقعات سے — لیکن اس کے لیے طریقہ اور ہے۔ پہلے ہم افسانہ کی تعریف ''زندگی کی ایک رمق کی تصویر'' متصور کر لیں۔ پھر یک لخت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ تصویر سچی ہے یا جھوٹی؟ وہ اپنے موضوع کی صحیح نمائندگی یا وضاحت کرتی ہے یا نہیں کرتی؟ کیا صرف ایک کیری کیچر تو بن کے نہیں رہ جاتا؟ ایک تخیل پرست مصور اپنی تصاویر میں جزئیات کو قدرت کی اسی صداقت میں سے اخذ کرتا ہے۔ پس ایک ہنر مند افسانہ نگار کیوں ایسا نہ کرے گا، کیونکہ دونوں کے لیے ایک ہی غیر ممکن الفسخ قانون ہے اور وہ یہ کہ حتی الامکان قیاس آرائی سے گریز کریں اور اپنی صنعت کو قدرت اور حقیقت کے نزدیک تر رکھیں۔ میں ایک اور مثال سے اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ فرض کر لیجیے کہ ہمارے افسانے یا ناول کے پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ ایک کردار، عنفوانِ شباب سے کچھ عرصہ پہلے اندھا ہو جائے۔ اب ایک ہنر مند کردار نگار اس شخص کی بقیہ زندگی کو محض تخیل کی مدد سے نہیں لکھے گا۔ ایک اندھے کی تمام حرکات اس شخص کے لیے، جسے اندھے کو قریب تر رہ کر دیکھنے کا موقع ملا ہو، ایک محیّر العقول طاقتوں کا سرچشمہ ہیں لیکن افسانہ نگار کو بحیثیت حقیقت نگار کے دیکھنا ہوگا کہ وہ کب اندھا ہوا۔ اندھا ہونے سے پہلے وہ دنیا میں سے کیا کیا کچھ جذب کر سکا۔ اس میں جنسی بیداری کس قسم کی شکل اختیار کرے گی اور وہ ان نقوش کے مطابق، جو کہ بچپن میں اس کے پردۂ ذہن پر منقش ہو چکے ہیں، عمل پیرا ہوگا۔ اور وہ مصنف جو بالکل نا مطابق واقعات سے اپنے صفحات کو بھرنا نہیں چاہتا، اپنے آپ کو ان حدود کے اندر رکھے گا۔ حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے بیدی کے تمام افسانے جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کے کردار وہی کہتے ہیں جو انھیں اس حالت میں کہنا چاہیے۔ وہ حرکتیں بھی ویسی ہی کرتے ہیں۔ اسٹیونسن لکھتا ہے: ''میرے افسانے حقیقت نہیں ہیں۔ میرے کردار وہی کرتے ہیں جن افعال کے وہ زندگی میں مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت کے لیے زیادہ سے زیادہ جزئیات کا مطالعہ کم نہیں۔'' اور اس قسم کی جزئیات نگاری کے اچھے نمونے ''پان شاپ''، ''دس منٹ بارش میں'' اور ''حیاتین ب''[1] میں ملتے ہیں۔

---

1. بعد کی اشاعتوں میں یہ عنوان ''وٹامن بی'' کر دیا گیا۔

حقیقت اور جزئیات نگاری کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی واقعہ لے کر اسے نوع بنوع تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھ کر ایک فہرس (CATALOGUE) بنادی جائے، بلکہ اس میں قلب و ذہن کے تاثرات اور فکر کی حکمت بھی پائی جائے۔ میرے قیاس میں اگر رسوائے عام ترقی پسند ادب اور وقائع نگاری کا صحیح مفہوم...... کوئی مصنف سمجھا ہے تو وہ بیدی ہے۔ وہ افلاس و فلاکت اور عریاں نگاری کو ہی ترقی پسند ادب نہیں کہتا۔ اس کے لیے مزدور، بھکارن، چھوٹے طبقے کے لوگوں کی زندگی (SLUM LIFE) ہی نقطۂ مرکزیہ (PIVOT) نہیں، جس کے گرداگرد وہ گھومتا رہے۔ وہ ہمیشہ تاریک پہلو ہی نہیں دیکھتا۔ جہاں وہ گرم کوٹ، کوارنٹین اور حیاتین ب میں چھے پائی روزانہ آمدنی والے ہندوستانی کو ہمدرد نگاہوں سے دیکھتا ہے، وہاں وہ ہندوستان کو رسوم و رواج (RETUALS & PAGEANTRY) اور روح کے اعتبار سے امیر اور بلند پاتا ہے۔ ''من کی من میں'' کہانی میں ''اوٹی بھرن''؛ ''چھوکری کی لوٹ میں'' ''لوٹ'' کی رسم اور ''تلادان'' میں سیتلا ماتا کی مورتی کا جلوس اس صناعی کے نہ بھولنے والے نمونے ہیں۔ لکھتا وہ عمومی بورژوائی کے طبقے کے متعلق ہے، لیکن اس طرح کہ تصویر کے دونوں پہلو سامنے رکھتا ہے۔ اگر ترقی پسند مفہوم کا ادب، پرولتاری طبقے کی تصویر اور وقائع نگاری کا مطلب ایک لڑکی اور ایک لڑکے اور پھر رومان کو پیش ہی کرنا ہے، تو یہی کیا تھوڑا ہے کہ وہ راجوں مہاراجوں کے قصے اور محبت کی فرضی کہانیاں، جو پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتی ہیں، انھیں وہ بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف زندگی کی ایک سانس لیتی ہوئی تصویر کھینچنا ہے بلکہ قطع نظر فہرس سازی اور فوٹو گرافی کے، اُس کا مقصد آفرینش اور تخلیق ہے۔ اور بیدی فن برائے فن کا مطلق قائل نہیں۔

بیدی اس قدر حساس ہے کہ عشق و محبت کی داستانیں ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ ایک رومانی وقائع نگار بھی بننا نہیں چاہتا، کیونکہ اس قسم کے قصے اتنے لکھے گئے ہیں کہ اگر اس کے سے حساس انسان میں اس کا ردِ عمل پیدا ہوا ہے، تو یہ عین قدرتی بات ہے۔ اس کے افسانے میں عورت کے رخسار کبھی بھی متقابل جنس کا شانہ نہیں چھوتے بلکہ ''دوشیزہ'' قسم کی عورت، ماسوائے ''چھوکری کی لوٹ'' کے، اس کے سب افسانوں سے حیرت انگیز طور پر مفقود ہے۔ حق تو یہ ہے کہ عورت محض عشق جتانے یا مرد کی ہوس پرستی کے آلۂ کار کے علاوہ ماں، بہن بھی ہے۔ گرم کوٹ میں

وہ عورت کو بیوی کی صورت میں دیکھتا ہے، تو پھر اس میں رومان اسی حد تک قائم ہے جس حد تک کہ بیوی کے ساتھ رومان (!) قائم رہ سکتا ہے۔ وہاں بھی ایک پاکیزہ سی محبت کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ بہت سے افسانوں مثلاً ہمدوش، ردِ عمل، کوارنٹین وغیرہ میں، عورت تصویر کو مکمل کرنے کے لیے آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ گرم کوٹ کے سے افسانے میں بیوی کی جگہ دوشیزہ کی قسم کی عورت ہوتی تو تصویر کتنی بودی ہو جاتی۔ رومان انسانی قلب کے قریب تر ہونے کے وجہ سے زیادہ ابھر کر کشاکشِ حیات کی جیتی جاگتی تصویر کو آناً فاناً مٹا دیتا۔ ''بھولا'' میں ایک عورت بیک وقت ماں، بہن، اور بہو کی صورت میں نمودار ہوتی ہے، اور وہ عالم پیدا ہوتا ہے جو اچھے سے اچھے رومان میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ عورت ایک ہی وقت میں بچے کو ہری ہر استوتر سناتی، اپنے سسر کی جوتی کو سرسوں کا تیل لگاتی اور اپنے بھائی کے لیے پیار کے جذبے میں معمور ہر روز آدھ پاؤ مکھن جمع کرتی ہے۔ ''بھولا'' اور ''گرم کوٹ'' میں گھریلو فضا کی تصویر اس حد تک کامیاب ہے کہ میں نے شاید ہی اردو کے کسی افسانے میں دیکھی ہوگی۔

طبّاعی:

شوپنہار نے ''صنفِ ادب'' اور ایمرسن نے ''حوالہ اور طبّاعی'' میں مذکورہ عنوان پر کچھ لکھا ہے، لیکن ان دونوں مصنفوں میں سے کسی نے بھی اس طاقت کا، جس کے وہ خود مظہر بلکہ استاد ہیں، تجزیہ نہیں کیا۔ البتہ کارلائل نے اپنے مضمون ''بطل پرستی'' میں ایک سے زیادہ جگہ پر اس عظیم الشان طاقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور ہمیں ان اشاروں سے شوپنہار اور ایمرسن کے طویل مضامین کی نسبت زیادہ پتا چلتا ہے۔ بات یوں ہے [کہ] طبّاعی کا مضمون، تجزیے کا شرمندہ نہیں اور اگر ہم کسی حد تک ان اوصاف کو جن سے طبّاع متصف ہوتا ہے، ایک ایک کر کے صفحۂ قرطاس پر لانے کے لیے تیار بھی ہو جائیں تو ہم کو پتا چلے گا کہ حرفِ مطلب تو ادا ہی نہیں ہوا۔ نوجوان مصنفین میں یہی ایک امتیازی قوت ہے، اگر چہ کچھ حد تک وہ خود اس کا مطلب نہیں سمجھتے ــــــ لیکن جب ہم کسی طبّاع سے ملتے ہیں، بہ الفاظِ دیگر اس کی کسی تحریر کو دیکھتے ہیں، تو وہ فوراً ہمیں عامیوں سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے خیالات میں اتنی ندرت اور زندگی ہوتی ہے کہ ہمیں دوسروں میں دکھائی نہیں دیتی۔ ہم اس کی افضلیت کو دیکھتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے

کیوں کہ عام انسان اور طبّاع میں فرق ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور عام انسان اس کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے لیے سوچتا ہے، وہ اپنے مضمون کو پکڑ لیتا ہے، اسے اچھی طرح سے گھورتا ہے اور نہیں جانتا کہ فلاں مصنّف کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ یہ اس کا کام نہیں۔ وہ خود نفسِ مضمون کی گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے اور اپنے مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ چوں کہ اس کے اندر حقیقت ہے، اس لیے وہ باہر بھی حقیقت کا مطالبہ کرتا ہے اور جب وہ ہمیں اپنے تمام خلوص (SINCERITY)[اور؟] صدق وصفا کے ساتھ دکھائی دیتا ہے تو ہم اسے شاعر، پیغمبر اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ روس میں، گور کی تمثیل واصنام کی حد تک پرستش، اسی جذبے کی مظہر ہے۔

طبّاعی اور فارمل ازم:

طبّاعی [کا] سب سے بڑا دشمن فارمل ازم (FORMALISM) ہے۔ یعنی رسوم و قیود۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ طبع انسان کو، دوسری باریک بیں آنکھ میں سے دیکھنے کی بھی عادت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے لیے خود سوچتا ہے، لیکن ہم رسوم و قیود وغیرہ میں اتنے جکڑے ہوتے ہیں کہ آسانی سے ان سے چھٹکارا پانا تو ایک طرف، ان کے خلاف سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ بعض رسوم تو ایسی ہوتی ہیں جو کہ وقتی اور مقامی طور پر اچھی ہوتی ہیں۔ کسی زمانے میں ان کا فائدہ ہوتا ہوگا، لیکن وہ اپنے معرضِ وجود میں آنے کی وجہ کے فوت ہو جانے کے بعد بھی بہت عرصے تک زندہ رہتی ہیں اور جب معاملات نہایت پیچیدہ ہو جاتے ہیں، تو ان کا تجزیہ کرنے والا بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن فارمل ازم کو اشارتاً چھیڑنا بھی، سماج برداشت نہیں کرتی۔ آخر شیلے اور ہاگ کو ''دہریہ پن کی ضرورت'' کا پمفلٹ لکھنے کے فوراً بعد ہی آکسفورڈ کے دارالعلوم سے کیوں خارج کر دیا گیا تھا؟ یہ بغاوت کا ایک چھوٹا سا جذبہ ہوتا ہے، جو ہر ایک طبّاع میں موجود ہوتا ہے۔

''بھولا'' میں بابا، بچے سے پوچھتا ہے: ''تیرے ماموں جی، تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟'' تو وہ سادگی سے جواب دیتا ہے: ''ماموں جی۔'' بچہ، قدرت کے بیشتر نزدیک ہوتا ہے اس لیے وہ دنیا کے ان رشتوں کو نہیں سمجھتا۔ یہ ایک بغاوت ہے، لیکن نہایت ہی چھوٹے پیمانے پر۔ یہ

چھوٹا سا علم'' چھوکری کی لوٹ'' میں کچھ بلند ہو جاتا ہے۔ پرسادی کی ماں بیوہ ہے، لیکن پرسادی پوچھتا ہے: ''چندو کے گھر منا ہوتا ہے — بیرو کے گھر بھی منا ہوا ہے ماں — ہمارے گھر کیوں نہیں ہوتا منا؟ —''[1] ماں جواب دیتی ہے: تمھارے پتا لایا کرتے تھے منا — وہ اب روٹھ گئے ہیں۔'' لیکن بچے کی آزاد فطرت کی اس سے تسلی نہیں ہوتی، چونکہ اس کے لیے تایا باپ کی جگہ ہے۔ وہ کہتا ہے: ''تو تایا کو کہیے نا — وہی لا دیں ہمارے گھر منا —''[2] اسی افسانے میں آگے چل کر بچہ تو SYMBOL سا بن جاتا ہے اور مصنف داخل ہو کر شادی کی انسٹی ٹیوشن پر ایک بڑی طنز کر جاتا ہے۔

> '' ..... اور لا دیتے ہیں اتنا مردہ سا کالا کلوٹا جیجا — پرماتما کے کیے میں دخل دیتے ہیں نا۔ کیوں نہیں ملو کنھیا رتنی کو لے جاتے۔ پرماتا نے آپ ہی تو میل ملا دیا تھا۔''[3]

بیدی کے نزدیک بھی عورت مرد کا ملاپ ایک حیاتیاتی مقصد کے لیے ہے۔ یوں ظاہر رہتا ہے جیسے وہ شادی کی بندش نہیں چاہتا۔ دیکھیے یہ طباع کے لیے کیسی خطرناک سرزمین ہے۔ یہ چھوٹا سا علم ''تلادان'' میں ایک غضب ناک بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہاں بچہ پھر ایک SYMBOL ہے کیونکہ بیدی حقیقت کا پرستار ہے اور بچے سے زیادہ حقیقت کے نزدیک کوئی نہیں۔ اس کا دل لاگ لپٹ نہیں جانتا اور وہ بچہ نہیں سمجھتا کہ امیروں کا تلادان ہوتا ہے، تو اس کا کیوں نہیں ہوتا۔ جس حالت میں بچے کا تلادان ہوتا ہے اور جس حالت میں ''حیاتین ب'' میں من بھری شگرفی ہوتی ہے، پڑھ کر خون کے آنسو ابل آتے ہیں۔ دھوبی کے بچے اور ماتادین کی بیوی کی شکستِ پندار ایک ماتم ہے۔ اور پان شاپ میں بین الاقوامی کاروبار کا شائق تھارولال جب دیکھتا ہے کہ اس کا کام پیٹروگراڈ، ٹمبکٹو اور ہونولولو تک وسیع ہونا تو ایک طرف رہا، وہ تو نشیبی چوک، چھاونی کے ہائی اسکول اور بیگم بازار کے نواحی تین محلوں سے باہر جانے سے بھی قاصر رہا اور قریب ہی ہے کہ بیگم بازار کی منحوس دُکان اپنی کہاوت کو دہرائے، تو وہ مایوسی کے ایک بغاوتی

---

1. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 73
2. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 74
3. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 84

جذبے کے زیر اثر، ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتا ہے اور کہتا ہے:

''......ایماندار کی خدا مدد کرتا ہے— ایمان کی کمائی— ایمان کی کمائی میں برکت— ایمان— لعنت—!''[1]

''گرم کوٹ'' میں اس بے کسی کی حد ہے اور جب وہ [یہ] الفاظ مصنف کے قلم سے نکلتے ہیں: ''میں رفعتِ ذہنی کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور ورسٹڈ کی کم۔'' تو بے اختیار اس بے کسی اور بغاوت کی تصویر کو دیکھ کر آنسو امڈ آتے ہیں۔

''تلادان'' میں طبّاع، کپڑوں کو بھی انسانی یک جہتی کی راہ میں حائل سمجھتا ہے۔ یہی کمبخت جنم سے ایک امیر اور غریب میں تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں۔ گندم کھانے کے بعد انسان میں موت کی پہلی علامت کپڑوں کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ اس میں طبّاع مصنف نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ہے بہت خطرناک، مگر بیدی بُت شکن کی سی قسم کا انسان (ICONOCLAST) ہے۔ لیکن جب ایک متروک الاستعمال فارمل ازم ایک فضا کی صورت میں ہمارے گرد و پیش چھا جاتا ہے تو اس فضا میں طبّاع کا دم گھٹتا ہے اور چونکہ ہر ایک انسان زندہ رہنا چاہتا ہے اس لیے وہ بغاوت کرتا ہے—

ایک طبّاع کا مذہب، بنی نوع انسان سے پیار کرنا ہے۔ انسانیت سے بڑھ کر کوئی عالم گیر مذہب نہیں۔ اتنی کلّیت، اتنی عمومیت، اتنی وسعت رکھنے والی آغوش کے اندر ایک اور مذہب، مذہب کے اندر ذات پات اور فرقوں کے اندر جتھہ بندیوں کو طبّاع کا ادراک قبول نہیں کرتا؛ ایک عام انسان کی بھی بہتر عقل اسے قبول نہیں کرتی۔ ''تلادان'' میں اسی مذہب کی جھلک ہے:

''..... ایشور نے سب جیو جنتو کو ننگا کر کے اس دنیا میں بھیج دیا ہے۔ کوئی بولی و ولی نہیں دی یہ نادار، لکھ پتی، مہابرہمن، بھنوٹ، ہری جن، لنگوا فرینکا سب کچھ بعد میں لوگوں نے خود ہی ایجاد کیا ہے۔''[2]

''دس منٹ بارش میں''—

''...... ماں کہتی ہے: لوہار، بڑھئی، چمڑا رنگنے والے، ایک برہمن کو چوبیس

1۔ مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 101   2۔ مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 138

قدم، چار دمن بونے والے اڑتالیس قدم، موٹا مانس کھانے والے چونسٹھ
قدم پر سے بھرشٹ کر سکتے ہیں۔ مگر میں ماں کو کہتا ہوں: ماں! ان لوگوں
کی وجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ براہمن کھیتی کی یہ لوگ باڑ ہیں—اور پھر
تھوڑی بہت برائی، سچائی کو بچانے کے لیے روزِ ازل سے زندہ ہے۔''[1]

اس آخری سطر میں کتنا فلسفہ، کتنا گہرا مطالعہ ہے۔ دنیا ایک IDEALIST کا نقطۂ نظر ہی نہیں ہے۔ برائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے انسداد کی بے سود کوشش کی بجائے، اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ انسان کمزور ہے اور اس سے انسانیت سرز د ہوتی رہتی ہے بلکہ انسان میں بربریت بھی بہت حد تک موجود ہے۔ اسی لیے اقبال خدا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے۔

روزِ حساب پیش ہو، جب مرا دفترِ عمل
آپ بھی شرم سار ہو، مجھ کو بھی شرم سار کر

اس کلیت اور عمومیت کی ایک رمق 'ہمدوش'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جب انسانوں پر مصیبت آتی ہے، تو ایک قسم کی کامریڈ شپ پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے تنے ہوئے پر ادر فارغ البالی میں وہ تنگ نظریے رکھتے ہیں، لیکن جب تلخ حقیقت سے دو چار ہوتے ہیں تو پھر وہ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے ہوئے کہتے ہیں:

'' شفا خانے کے احاطے کی چار دیواری سے باہر سب کچھ ہے۔ مگر
یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ ہے نہ عیسائی، گوڑ برہمن اور نہ
چھوت— یہاں ایک ہی مذہب کے آدمی ہیں، جنھیں بیمار کہتے ہیں اور
جن کی نجات شفا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی تمام خواہشات اور
رہی سہی قوت صرف کر ڈالتے ہیں۔''[2]

ایک سکونی تماشا گاہ:

خیال پیدا ہوتا ہے: کیا ایک سکونی تماشا گاہ (STATIC THEATRE) ممکن الوجود ہے؟ بیدی کے نزدیک افسانہ ایک سکونی تماشا ہے، کیونکہ اس میں حرکت کی جگہ کیفیات

1 مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 157   2 مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 32

ہوتی ہیں۔ یہ تھیٹر، کیفیت (MOOD) کا ہے، حرکت (MOVEMENT) کا نہیں۔ چونکہ یہ بات درست ہے کہ سب آرٹ SUGGESTION ہے، اس لیے افسانے کے کردار، چلتے پھرتے بولتے انسان سے کہیں زیادہ لستان ہوتے ہیں، بشرطیکہ سمجھنے والا فہم وفراست رکھے۔ مثلاً ''ہمدوش'' میں چند ایک بوڑھے ایک دلہن کی چوڑیوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ دولہا میاں اپنی بیوی کے منھ کی طرف ایک حاسدانہ جذبے سے دیکھتے ہیں اور بیوی سڑک کے قریب پڑے کوڑے کرکٹ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ بظاہر اس بیان میں کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی، لیکن اس میں سب کچھ ہے۔ اسی افسانے میں آگے چل کر ایک کردار کی رفیقِ زندگی مر جاتی ہے اور ایک لاٹھی اس کی رفیقِ زندگی بن جاتی ہے۔ اب وہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ اسی بساطی کی دکان کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس نے اپنی بیماری کے ایام میں چند لڑکوں کو خرید وفروخت کرتے دیکھا تھا۔ اس کے دماغ کے گوشے میں وہ تاثرات اور بیوی کی یاد اس عرصے تک محفوظ رہتی ہے، لیکن بیوی مر چکی ہے۔ اس لیے وہ لاٹھی کے لیے چند فیتے خرید کر کچھ غیر مطمئن، کھویا کھویا سا، گھر لوٹتا ہے۔

نفسِ تحت الشعور کی تشریح ''ردِعمل'' میں مقامِ اوج کو پہنچ جاتی ہے۔ جلال اپنے ادیب چچا کی آخری سطور پڑھتا ہے۔ پھر

> ''......اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی زرد، سرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر اس کی آنکھوں کے پاس کنپٹی سے چھو کر، انواع واقسام کی اقلیدی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضا میں دور ونزدیک پھیل رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سا پیدا ہوا۔ ایک غنودگی یا نیم غشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست سی رَو پیدا ہوئی اور اس نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کردے۔ یہ بے مطلب، لاحاصل خواہش کیوں پیدا ہوئی، جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک اندرونی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحے

کے (لیے) اس نے دل کے ساتھ تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کو اوندھا
کرنے کے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔ بلکہ اس قسم کے خیال
پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو کوسا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس
نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرلے گا، اس کے لیے زندہ رہنا
مشکل ہو جائے گا—— مشکل، ناممکن—— اور سب کے دیکھتے ہوئے اس
نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔ تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر
گئی۔ سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے فوراً بعد ہی
اس قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رودے۔ اس وقت جلال نے اپنی ذہنی
تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب نہ رونا اس کا
روگ نہیں۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اندرونی حکم کے
تابع کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا——،،[1]

اس کے بعد اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے۔ وہ کانپ اٹھتا ہے، اور برقی رو آنے سے پیشتر ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں سے سگریٹ کو باہر پھینک دیتا ہے—— دور بہت دور—— اس نو بیداری کی حالت کو کس خوبی سے نبھایا گیا ہے۔

تاثیر وحسنِ قبول:

بیدی کی تحریر کے حسنِ قبول اور تاثیر سے کسی کو بھی انکار نہ ہو سکے گا۔ اس کی سکونی تمثیل پر سے پردہ اٹھتا ہے تو فوراً ایک سادہ، پُر کار تصویر دکھائی دیتی ہے کہ نظر ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی۔

''دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا کس قدر مشکل
ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ان میں سے ایک تو صبح وشام گھی شکر میں ملا کر

1۔ مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 199-200

کھانا پسند کرے اور دوسرا اپنی قبول صورت بیوی کے سامنے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کانوں کا کچا بنے......'' چھوکری کی لوٹ[1] ''دھوبی کے گھر کہیں گورا چٹا چھوکرا پیدا ہو جائے تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں— ''تلادان[2]

''—ابوبکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ سا راستہ کسی کوئلے کی کان میں جا رہا ہے— ''دس منٹ بارش میں[3]

تضمین و تجدید:

بعض جگہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ فنکار نے منشی پریم چند سے کسب نور کیا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ منشی پریم چند نے اسے متاثر ضرور کیا ہوگا، لیکن بیدی کے افسانے: پان شاپ، ہمدوش، گرم کوٹ، کوارنٹین، ردِ عمل، حیا تین ب، دس منٹ بارش میں اور موت کا راز بہ لحاظ ٹیکنک اور جزئیات نگاری وغیرہ کے منشی پریم چند کے افسانوں اور ہمارے موجودہ اردو ادب سے بالکل الگ ہٹ کر ہیں اور وہ ایک نہایت شاندار مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ دیہاتی معاشرت کو تحریر کرنے کے معاملے میں بھی بیدی نے اپنے پیش روؤں پر تضمین کی ہے اور بعض بعض جگہ تجدید بھی۔ وہ جگہ جگہ اشاروں (TOUCHES) میں چابک دستی سے کام لیتا ہے۔ بھولا میں 'ستارہ' ایک نہایت شاندار ٹچ ہے۔ ہمدوش میں مولے کی مادہ کے تین بار آنے کا مقصد سوائے بجھتی ہوئی زندگی اور تخلیقِ زندگی کے مقابل کے اور کچھ نہیں۔ ''رنڈوے ہاتھ'' اور ''حیا تین ج سے تہی مسکراہٹ'' کی سی ترکیبیں بالکل نئی ہیں۔ تکرار فضا کہانیوں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ کہیں داخلیت ہے اور کہیں خارجیت۔ ''دس منٹ بارش میں'' اور ''موت کا راز'' بہت بلند پایا افسانے ہیں۔ آج سے بیس سال بعد اس مستقبل نگار کے ان افسانوں کو کوئی سمجھے گا۔ محض کاروباری نقطۂ نگاہ سے مصنف نے انھیں مجموعے میں سب سے آخر میں رکھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بیدی صاحب نے یہ افسانے

---

1. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 70 2. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 137 3. مکتبہ جامعہ ایڈیشن، صفحہ 153

POT-BOILER کے طور پر نہیں لکھے۔ شاید یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اگر میں مبالغے سے کام نہیں لیتا تو بیدی ایک COLOSSUS ہے جو حقیقت کا جوئندہ، یابندہ اور پھر منتقل کنندہ ہے۔ اِس کی تحریر میں خلوص، کلیت اور کامریڈشپ پائی جاتی ہے۔

بطور ان کے بزرگ کے، میری دعا ہے کہ وہ خوب پھلیں پھولیں اور ہمارے پس افتادہ ادب میں نئی زندگی پھونک دیں۔

[''دانہ ودام'' اشاعتِ اوّل، دسمبر 1939 یا 1940]

پیش لفظ

[دانہ و دام اشاعتِ دوم]

''دانہ و دام'' کی پہلی تقریظ اِس جنگ کی ...ویں عظیم قربانی ہے جو شاید کسی وکٹوریا اس کی مرہونِ منت نہیں۔ اس کے لیے میں صاحب تقریظ سے اظہارِ افسوس کرتا ہوں اور پڑھنے والوں سے ہمدردی۔

''دانہ و دام'' میری پہلی چند کوششوں کا مجموعہ ہے، جن میں فنکار قدرے نمایاں ہے۔ اواخرِ افسانہ میں ٹوسٹ (TWISTS) بالارادہ لائی گئی ہیں۔ پڑھنے والوں کے تحیّر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک فقرہ افسانے کے شروع میں آیا، جسے بعد کی لفاظی اور منظر کشی میں عمداً گم کر دیا گیا اور بعد میں اسے دہرا کر نہ صرف ایک توازن قائم کیا گیا بلکہ خیالات کے تسلسل سے پڑھنے والے کے جمالیاتی ذوق کو آسودہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ماحول کی تکرار، عیب اور فن کی سرحدوں پر بھٹکتی رہی۔ بارہا شوق کی بات کا یہ علم ہوا کہ 'لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر'۔ ''گرہن'' اور اس کے بعد کے افسانوں میں ایسا نہ ہوا۔ بقولِ میر:

خاک میں مل کے میؔر ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

لیکن بعد کے افسانوں میں اس قسم کا خلوص اور شدّت تاثر [پیدا؟] نہ ہوا۔ ''گرم کوٹ'' میں مقامِ اوج ایک سے زیادہ سہی، لیکن فنّی خامی بذاتِ خود کسی فنّی خوبی سے کم نہ ہوئی اور کسی نقاد

نے کہانی کی عظمت سے انکار نہیں کیا، بلکہ اسے فنّی طور پر درست کہانیوں پر فوق حاصل ہوا۔ کہانی کا کوئی معیّن کلّیہ نہیں۔ یہ زمین ہر صاحب طبع کا اجارہ ہے جس میں ہر تجربے کی اجازت ہے، کیونکہ اس میں عمل سے زیادہ نتیجے کو دیکھنا ہوتا ہے۔ کوئی قلم برداشتہ لکھ دیتا ہے تو کوئی چیخوف کے قول کے مطابق "اس طرح آہستہ آہستہ لکھتا ہے جیسے کہ حریص بھنا ہوا تیتر کھاتا ہے —— ہولے ہولے اور سوچ سوچ کر —" یعنی اگر حاصل عمل درست ہے، تو سب کچھ درست ہے۔

• بزرگوارم رشید صدیقی صاحب نے اپنے ایک گرامی نامے میں "دانہ ودام" کے بعد کی کہانیوں کے متعلق لکھا — "آپ جز و کو کل سے زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ یہ آپ کی شخصی فتح مندی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا نہ ہو کہ جز و ہی مقصد بن جائے، جیسا ہمارے اگلے شعرا کا وطیرہ تھا۔ میں فن کے کمال کا اتنا قائل نہیں، جتنا کہ فنکار کے کمال کا...... مثال کے طور پر سمجھ لیجیے کہ میں شاعری کا اتنا قائل نہیں، جتنا کہ غالب یا اقبال کا......"

"دانہ ودام" کے افسانے لکھتے ہوئے مجھے فنّی کمال حاصل نہیں تھا، لیکن فنکار بدرجۂ اتم زندہ تھا۔ اب جب کہ آہستہ آہستہ فن پر قدرے عبور حاصل ہو رہا ہے، تو فنکار موت اور زیست کے درمیان معلّق ہے اور اس حیاتیاتی کشمکش کا نتیجہ معلوم؟

15 جون 1943

پیش لفظ

[''گرہن'' اشاعتِ اوّل]

جیسے ہم کہتے ہیں کہ کسی دَور کی صحت مندی اور طاقت کا اندازہ، اُس دُور کے ادب کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے، ویسے ہی اس بات کا اُلٹ بھی درست ہے۔ یعنی ادب کی اچھائی یا برائی کا اندازہ، کسی دور کی صحت وتنومندی پر مبنی ہے۔ ہمارا ملک ایک خاص قسم کی جسمانی و ذہنی غلامی اور جمود کی حالت میں گزر رہا ہے اور وہ تمام طبعی طاقتیں جو افادی ادب کی تخلیق کے لیے ممدّ و معاون ثابت ہوتی ہیں، ابھی جمع نہیں ہوئیں۔ ہمارے ادیب، ملازمتوں اور دیگر معیّن وغیر معیّن نامساعد حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ دن میں دفتروں میں نو دس گھنٹے کام کرنے کے بعد تخلیقی ادب نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان حالات میں جب کہ ان کے دماغ کو استراحت نہیں، ان کے اعضا تھکاوٹ سے چور ہیں اور جسم کے تمام قویٰ مضمحل، تو ہمارا ان کے متعلق اپنی توقّعات کو بلند کر لینا عبث ہے۔

ایک نیا اور اہم دور، کٹھالی میں ہے۔ آندھی سے پہلے جو ایک خاص قسم کی امس ہوتی ہے، اس کا ظہور ہمارے ادب میں بھی ہے۔ اس میں کوئی بھی جنبش، کوئی بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے، بلکہ ایک خاص قسم کے تخریبی و اتلافی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن سے ہمیں قطعاً مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ترقی پسندی کے رسوائے عام نام کے تحت جو جنسی کیچڑ اچھالا جا رہا ہے اور جس سے لوگوں کو ادب کی صورت مسخ ہو جانے کا بے بنیاد اندیشہ ہے؛ ایک ایسے ہی انحطاطی

دور کی ترجمانی کرتا ہے۔لیکن ع

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

ہمیں ناامیدی اور یاسیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

''دانہ و دام'' کے بعد، میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ پیش کرتا ہوں۔ افسانوں کے اس مجموعے میں وہ تمام فطری کمزوریاں ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں لیکن میں مایوس نہیں اور بقدر ہمت آگے قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فارم کی نسبت میرے لیے نفس مضمون کا مسئلہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور جہاں تک مضمون کا تعلق ہے، وہی ادبی تخلیق زیادہ کامیاب ہوگی جو اپنے محور کے گرد گھومے، اپنے ماحول کے نزدیک رہے۔ مثلاً ہم اپنے مزدور کی زبان کا، یو پی کے مزدور کی زبان میں ترجمہ کریں تو ہماری تخلیق، ایک ناقابل معافی تصنّع کی حامل ہوگی۔ میرا ماحول اگر پنجابی ہے، اور میں پنجابی اردو لکھتا ہوں تو کوئی قصور نہیں کرتا، بلکہ اپنے خلوص کا ثبوت دیتا ہوں۔

اب میں اپنی فارم کے متعلق ایک آدھ بات کہہ دوں۔ مجھے تخئیلی فن میں یقین ہے۔ جب کوئی واقعہ، مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من وعن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ حقیقت اور تخئیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہار حقیقت کے لیے ایک رومانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد، پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا، بجائے خود کسی حد تک رومانی طرزِ عمل ہے اور اس اعتبار سے، مطلق حقیت نگاری بحیثیت فن غیر موزوں ہے۔ اس مجموعے کے پہلے افسانے [''گرہن''] کی متوازیات (PARALLELISMS) میرے مطلب کی وضاحت کرتی ہیں۔ لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفسِ مضمون کا محض ظاہری (PHYSICAL) پہلو پیدا ہوا۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا لیکن اس کے بعد میرے تخئیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کر لیا۔ ذہن و......[تخئیل]......دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت اختیار کر لی۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

رشی نگر، لاہور

10/مارچ 1942

'پیش لفظ'—ایک چادر میلی سی

امر کتھا سنتی ہوئی پاربتی اونگھ گئی۔ شیو نے دیکھا بھی، مگر بھانگ اور دھتورے کی مستی میں اپنی بات کہتے گئے، جو گپھا میں اوپر کہیں بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری کے جوڑے، پربودھ اور مئیتری نے سن لی اور امر ہو گئے۔

جگ ہی بیت گئے۔ کال کے کانٹے، پربودھ اور مئیتری کے لیے کُند ہو چکے تھے۔ پربودھ نے کہا ''اب تو وقت ہی اور آ گیا ہے، رانی! مگر تمھیں وہ دن یاد ہے جب آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو ایک پتھر سے مار ڈالا تھا؟''

''ہاں—'' مئیتری بولی۔ ''ایک بے شکل سی لڑکی کے پیچھے، جو اُن کی اپنی ہی بہن تھی۔''

پربودھ جھلا اٹھا— ''تمھیں ابھی تک نہیں معلوم— مرد اور عورت قدرت کے دو اصول ہیں۔ ان میں ذات اور رشتے کی بات ہی کیا ہے؟''

''ہاں— مگر—''

''مگر کیا—؟'' پربودھ نے مئیتری سے کچھ پرے ہٹتے ہوئے کہا ''قدرت کیا اس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس پیڑ کا جوہر، کن ہواؤں سے، کسی دوسرے پیڑ پر جا گرتا ہے؟ قدرت کا قانون افزائش نسل ہے، چاہے وہ کیسے ہی ہو، کسی سے بھی ہو—''

اس وقت پربودھ ان ہزاروں کبوتریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جو بے حد حسین تھیں، کیونکہ وہ فانی تھیں۔ ان کے گلوں کے حلقے، راتوں کے پیار سے کالے اور چمکیلے ہو رہے تھے۔ اور

انڈے روئی کے گالوں ایسے نرم، گورے اور چٹے — پربودھ جیسے خیالوں کے اختلاط سے خود تھک گیا اور بولا "عورت کی وجہ سے ہمیشہ لڑائی ہوتی رہے گی۔"

"عورت ہی کیوں؟" مئیتری چمک اٹھی "زر اور زمین بھی تو ہیں —"

پربودھ نے شہوانی نظروں سے مئیتری کی طرف دیکھا اور بولا "زمین بڑی ہے اور زر، اس سے بڑا — مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورت ہی کے دو روپ ہیں —؟"

مئیتری نے اپنی نازک سی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر پیار کی کمندیں پربودھ پہ پھینکتی، اپنا دایاں پر، پربودھ کے بائیں پر میں پھنساتی ہوئی بولی "مجھے جھانجریں لا دو نا۔ جو ایتھنز کے کھنڈر میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل پڑی ہیں — پھر میں تمہیں وہ پیار دوں گی کہ —"

پربودھ نے جھانجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے گھوں گھوں کرتے، پھولتے ہوئے اپنی چونچ مئیتری کی چونچ میں اس کے تالو تک کھبو دی اور پھر خود ہی علاحدہ ہوتے ہوئے بولا "کیا فائدہ اس پیار کا جس میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جینا نہیں، مرنا امر ہے۔" اور پھر وہ کہہ اٹھا "سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے —"

مئیتری بھی جانتی تھی کہ پربودھ اس وقت [تک] جھانجریں نہ لا کر دے گا، جب تک اس کی سوچ میں کوئی خودغرضیاں نہ ہوں گی۔

پھر پربودھ، بچھڑی صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور ان راسوں کی جو دمیتریاس نے اسکندریہ میں ایفرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رچائی تھیں۔ پھر ایڈے پس کی، جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اور جب اسے پتا چلا تو صدمے ہی سے چل بسا — ویر کُنال کی باتیں، جس کی محبوبہ اس کے باپ کے ساتھ ساجھی ہو گئی تھی اور جس کے کارن کُنال کو اپنی آنکھیں دینا پڑیں — پھر بھرتری ہری کی، جس نے حسن اور جوانی کو دائم قائم رکھنے والا سیب اپنی رانی کو دے دیا مگر رانی نے اپنے عاشق ایک دھوبی کے حوالے کر دیا، جس نے اسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا، جو ساری دنیا کا بھلا کرنے کے لیے اسے وقت کے بادشاہ بھرتری ہری کے پاس لے آئی۔

پربودھ اور منمتری نے ابد [ازل؟] سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ازل [ابد؟] دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لاقانونیت دیکھ کر منمتری بولی'' آخر کوئی تو قانون ہونا چاہیے۔'' حالانکہ وہ آپی من ست کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو نیچے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے سے بڑ پر رہتا تھا اور بے حد جوان اور لاج وردی گردن والا خوبصورت کبوتر تھا— اس لیے کہ وہ فانی تھا— اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے منمتری کا پورا بدن مہنک (مہک) اٹھا اور پیٹ میں ایک کسمساہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ من ست کی بات کچھ اسی [اس؟] انداز سے کرنے لگی، جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ مگر اس کا نام سنتے ہی پربودھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اس کے پر پھڑپھڑانے لگے۔ پربودھ کے غصّے اور لرزے کو دیکھ کر منمتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر کے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی۔ نظریں چراتی ہوئی وہ بولی'' زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں— کیا خود انھیں توڑ نہیں سکتے؟''

پربودھ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا— ''قدرت کا قانون افزائش نسل ہے، چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو— '' جلدی سے کہہ اٹھا۔

''نہیں— ''

ایک دن کسی لمبی پرواز کے بعد پربودھ اور منمتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من ست اڑتا ہوا امرناتھ کی گپھا تک پیچھے آیا تھا۔ اور پھر مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ منمتری کو اس بات کی خوشی تھی اور افسوس بھی تھا— خوشی اس لیے کہ اس کا پربودھ اب بھی اسے آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من ست فرسنگوں اس کے پیچھے اڑ کر آ سکتا تھا اور مایوس ہو کر واپس جا سکتا تھا، اور افسوس اس بات کا کہ پربودھ اسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روک سکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچتے ہی پربودھ اور منمتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سُکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پربودھ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے منمتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پر اس پر پھیلا دیے اور کہنے لگا۔

''رانی! ہم نے کتنی دنیا دیکھی ہے— کتنے جگ— کتنے دیش— پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔''

''پنجاب'' سُمترا ی نیچے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی۔ اور پھر اس نے ایک سرد آہ بھری، جسے پربودھ نے نہ دیکھا۔

''تم نے کیسے بوجھ لیا؟'' پربودھ نے ششدر ہو کر پوچھا۔ اور اس کی لمبی چونچ نے ایک سرخی پکڑ لی۔

سُمترا ی کہنے لگی ''وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی میں سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی رہتی ہے، جس کا لمس بدن میں صحت کی خارش پیدا کرتا ہے—''

''ہاں— '' پربودھ نے حامی [ہامی] بھری۔ ''اس کے پربت آسمانوں کے ہم سایے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پہ ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اس کے دریا تو ایک طرف، پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔''

''جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھگڑو۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انھیں توڑ بھی دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں، سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ اُتر پچھم سے ان پر سینکڑوں حملے ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنایا اور آلام کی سب ضربیں ان پہ لے لیں۔ انھوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزّت دے دی، پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے— وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں— عجیب کیمیاگر ہیں وہ—''

''نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جمتی ہوئی برفوں اور تپتی ہوئی ریتوں میں وہ بس سکتے ہیں، جہاں دنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں—''

''وہاں پنجابی ہی ہے، جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور برا دشمن—— جہاں بھی لوگ تمھیں ایک بلند آواز سے ہنستے، قہقہہ لگاتے ہوئے سنائی دیں، وہاں

ضرور کوئی پنجابی ہوگا، کیونکہ وہ دنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے۔ وہ جو اندر سے ہے، وہی باہر سے ___ اس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں ___''

''وہ ایک ایسا پودا ہے، رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پہ پنپ سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں ___''

''رانی! ___ پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم انھوں نے کون سی امر کتھا سنی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے۔ پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری نہیں ہوتی۔ ہاں ___ ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے ہی میں ان کا موکش ہے ___''

[تاریخ تحریر: 5/ فروری 1964]

پیش لفظ

[''سات کھیل'' اشاعتِ اول]

ان ڈراموں کے سلسلے میں مجھے ایک معذرت پیش کرنا ہے۔اس لیے نہیں کہ میں نے یہ ڈرامے لکھے ہی کیوں، بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ ان ڈراموں میں کبھی کبھی کوئی کردار گنگنا تا ہے یا قدرے فصیح معلوم ہوتا ہے—اور یا پھر ضرورت سے زیادہ سادہ ہے۔

ایک تو وجہ ظاہر ہے کہ لوگ روزمرّہ زندگی میں گنگناتے ہیں، فصیح ہوتے ہیں اور کہیں کہیں انتہائی سادگی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔لیکن چونکہ ہمارے ملک کے ناقد کی خواہش ہوتی ہے کہ کردار وہی کریں جو ٹھوس حقیقت پر مبنی ہو، اس لیے ان ڈراموں کی بلاغت اور سادگی کے لیے معذرت کی ضرورت پیش آئی ہے.....

مثال کے طور پر ٹرام میں دو آدمی باتیں کر رہے ہیں۔موضوعِ سخن کسی لڑکی کا اغوا ہو جانا ہے، جس کا مطلب ہے کہ بات ڈرامائی امکانات سے خالی نہیں، لیکن یہ ستم ظریفی بر وقت ممکن ہے کہ گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ایک اور سواری آجائے، جس نے ان ہی لوگوں کی طرح ٹکٹ کے دام دیے ہوں اور اپنی جگہ چھوڑنے سے صاف انکار کر دے یا اس ڈرامائی واقعے کے مقامِ عروج پر پہنچنے سے پہلے، راوی کچھ دیر کے لیے ایکا ایکی چپ اور اپنے مختصر سے سفر کے بقیہ لمحے سگریٹ سلگانے میں صرف کر دے (آپ جانتے ہیں بس میں ہوا تیز ہوتی ہے) یا اسے معاً خیال آجائے کہ پالسن کا مکھن، جو ابھی کسی بی کے ڈھوڈی اینڈ سنز سے خریدا تھا، کنجڑے

کے ہاں رہ گیا ہے، اور وہ گفتگو کا سلسلہ درمیان ہی میں ختم کردے...... ظاہر ہے کہ یہ سب حرکتیں اس ڈرامائی موضوع سے الگ ہٹ کر ہوں گی، اس لیے چھپ کر سننے والا EVES DROPPER جب گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے وہ قصہ بیان کرے گا، تو نہ صرف پالسن مکھن کے کھو جانے والی بات کو نظر انداز کردے گا، بلکہ اس واقعے کو اس کے منطقی اختتام سے کچھ پرے لے جائے گا۔

تو گویا ان ڈراموں کی تمام فصاحت، بلاغت، سادگی اور عیاری حقیقت سے اتنی ہی دور ہے، جتنا کہ عین ڈرامائی لمحے میں گرفتار انسان، کردار و گفتار کے اعتبار سے ایک عام انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک خاص موقعے (SITUATION) میں مبتلا آدمی ایک خاص ہی انداز کی حرکت کرتا ہے، عام انداز کی نہیں۔

[1946]

افتتاحیہ

[''گائے جا ہندوستان'']

''گائے جا ہندوستان'' دیوندر ستیارتھی کے اُن گیتوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندگردی کے بعد جمع کیے ہیں اور جنھیں آپ نے مضامین کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ صرف لوک گیتوں سے کسی خاص طبقے یا علاقے کے لوگوں کی رسوم و روایات کا اندازہ کرنا مشکل تھا، لیکن ان مضامین میں جب ہم دُکھ اور سکھ کے گیت گاتے ہوئے ہندیوں کو ایک مکمل تصویر میں دیکھتے ہیں، تو نہ صرف ہمارے معاشرتی علم اور علمِ نوعِ انسانی میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ اس مخصوص گیت کا سحر بھی ہمارے نزدیک دو چند ہو جاتا ہے۔ ان کے سادہ سے سادہ مضمون کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے، گویا ہم مذکورہ کرّے میں سانس لے رہے ہیں — ابھی کوئی مدراسی ماہی گیر، پونوسامی چیٹی، بحرِ ہند کے وسیع اور متلاطم پانیوں پر اپنا جال پھیلاتے ہوئے مچھلیوں کو بلا رہا ہے —

کوڑی دا، کوڑی دا کاو لالی

کوٹ مِٹ تِل وینڈم کاو لالی

مل کر آؤ مل کر آؤ (مچھلیو) اور میرے محافظ! مچھلیوں کی ٹولی بنا کر (میرے روبرو) دھکیل دینی چاہیے..... تو اس وقت ہمارے سامنے ایک ہندوستانی آ جاتا ہے، کالا بھجنگ، جس کے جسم پر لنگوٹی اور سر پر چٹیا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جسے آپ نے لانگ مینز گرین اینڈ کمپنی یا بلیکی اینڈ سنز کی

انگریزی پرائمروں میں دیکھا ہوگا، لیکن اب اس کی آواز بھی آپ کے کانوں میں آ رہی ہے—
کوٹ مٹ، تل دیدم کا والا لی۔ٹ اور ڑ کے حروف کی تکرار کانوں کو ناگوار معلوم ہو رہی ہے۔یوں
معلوم ہوتا ہے جیسے کول تار کے کسی خالی ڈھول میں کسی نے کنکر ڈال دیے ہیں اور اسے سڑک پر
لڑھکا دیا ہے...... پھر اسی مختلف النوع زندگی میں ہم بارہ بنکی کے دھوبی گھاٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔
وہاں دھوبی معمول کی طرح کپڑے دھو رہا ہے اور گا رہا ہے۔

دھوبی کے چھیے چار مہیریا!

اور تال چھیو رام چھیو، چھیو رام! یعنی دھوبی کو چار مہیریا (بیویاں) چاہئیں ..... چھیو! ..... بھات
کے لیے، گھاٹ کے لیے، کھاٹ کے لیے......

آج سے ستر اسی سال پہلے والٹ وہٹ مین نے امریکا کی آواز[1] سنی تھی۔اس نے بھی
گھاٹ پر دھوبی کو گاتے سنا۔گھر میں سینے پرونے کا کام کرتے ہوئے گھر کی بیوی کی آواز اس کے
کانوں میں گونجی۔اس وقت لنکن اور گارفیلڈ نے امریکنوں کے لیے ترقی کی شاہ راہیں کھول دی
تھیں۔شمالی اور جنوبی ریاستوں کی جنگ ختم ہو چکی تھی— اور امریکا فراغت کے گیت گا رہا تھا۔
اس اجتماعی گیت کو ہر کسی کے کان نہیں سنتے؛ اس کے لیے ایک اجتماعی دماغ اور ایک اجتماعی دل کی
ضرورت ہے، کیونکہ اس دل اور دماغ کو قوم کی مسرت اور فراغت کا ترجمان ہونا ہے۔

یہ اس اجتماعی دماغ کی قابلیت ہے کہ وہ دھوبی کے گیت، بیوی کے گنگنانے، لیور پر ہاتھ
رکھے ہوئے مزدوروں کی آواز کو ملا لے اور اس آمیزش (SYNTHESIS) کے بعد، اپنی
استعداد کی مدد سے ایک ایسی آواز سنے، جسے ہم قوم کی آواز کہہ سکیں۔راس کماری سے لے کر درۂ
خیبر تک اور تمو گانو سے لے کر کراچی تک گھوم پھر کر ایک کڑی ریاضت کے بعد دیوندر ستیارتھی نے
ایک اجتماعی دل اور دماغ پیدا کیا ہے، جو کہ متنوع راگ اور راگنیوں کو ملا کر قوم کا راگ ہمارے
سامنے پیش کرتا ہے۔اس کے اور اجتماع کے دل کی دھڑکن ایک ساتھ سنائی دیتی ہے اور یہ سب
کچھ آسان نہ تھا۔بعض وقت یوں معلوم ہوا کہ منزل کے سامنے آن کر تھک گئے— ''اپنی
اقتصادی حالت پر غور کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے ماضی پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔''—ایک بار

1. "I Hear America" —WALT WHIT MAN

پھر۔ گویا اس سے پہلے بھی متعدد بار ایسی جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی ہوگی اور خانہ بہ دوش ادیب کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس بار کی یہ کیفیت ''آخری تنکا'' ثابت ہو سکتی تھی۔۔۔ ''ناحق میں لوگ گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا، ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کو آدرش بنائے عمر برباد کرتا رہا'' لیکن اس کے بعد ان کے اجتماعی دل سے آواز آئی ''ان عالم گیر مصیبتوں کے پیش نظر میری تکلیفوں کی اہمیت کیا ہے؟''

اس قسم کی ریاضت اور نفس کشی اپنا بدل آپ ہے۔ جہاں ستیارتھی کو ان گیتوں کی پاداش میں اتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، وہاں انھوں نے اس سے ایک خاص قسم کا حظ بھی اٹھایا۔ لیکن ہم ترکیب ''ایک خاص قسم'' سے بہت پرے نہیں جا سکتے، کیونکہ اس میں مرگِ انبوہ کا ''جشن'' شامل نہیں ہے اور یہ حظ نفس کوشی کی حدود کبھی نہیں چھو سکتا، کیونکہ جو آواز ستیارتھی کے SYNTHETIC ذہن کو سنائی دی، وہ اس آواز سے بہت مختلف تھی، جو وہٹ مین نے سنی۔ ستیارتھی نے اپنے ملک کے طول و عرض میں گھوم کر دیکھا تو انھیں ہرے بھرے کھیت کم ہی دکھائی دیے۔ صرف اتنے ہرے بھرے کھیت نظر آئے جو ''ہرے بھرے'' کے متعلق ہمارے تصور کو زندہ رکھ سکیں، ورنہ انھوں نے ان کھیتوں میں بھوک ہی اُگتے ہوئے دیکھی۔ ع

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

بھکیا کے مارے برہا بسرے گا
بھول گئی کجری کبیر
دیکھی گوری کی موہنی صورتی
اب اٹھے نہ کر یجواماں پیر (گائے جا ہندوستان۔ صفحہ 12)

۔۔۔۔۔ بھوک کے مارے برہا بسر گیا۔ کجری اور کبیر گیت بھی بھول گئے۔ گوری کی موہنی صورت دیکھ کر اب کلیجے میں درد نہیں اٹھتا۔ یہاں دمشق کے عشق کے مقابلے میں برہا ہے۔ برہا پہلے ہی، شعر کی ایک ایسی صنف ہے، جو دکھ سے تعلق رکھتی ہے اور فراق کے تصورات اپنے ذہن میں لاتی ہے۔ وہ عشقِ محض سے زیادہ پُر درد ہے۔ اس لیے برہا کا بسر جانا ایک بہت بڑی قحط سالی

کی علامت ہے۔ پھر ہندوستان کے عشق میں کبیر کے ساتھ کجری بھی شامل ہے۔ کجری کو انسان بھول جاتا ہے۔ کبیر، مذہب اور خدا کو آسانی سے نہیں بھولتا۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر وہ آسمان کی طرف منھ اٹھا دیتا ہے، لیکن اس برہا کے اجتماعی مصنف کو اس پر بھی توکل نہیں رہا، اور ابھی یہ برہوں کا برہا کانوں میں گونج رہا ہے، تو بندھیل کھنڈ سے ''پھاگ'' کی آواز سنائی دیتی ہے:

گوانہوں ہتے سو ہو گئے
بھس لے گئی اندوار
ٹوٹے میں بلوا گئے
باڑھی میں کھکبار
جری بانے میں لکھ دو دوئی جو بنا!   [گائے جا ہندوستان۔ صفحہ 23 تا 24]

— گیہوں تھا وہ ختم ہو گیا۔ بھوسے کو جھکوا اٹھا [اُڑا؟] کر لے گیا۔ ٹوٹے (گھاٹے) میں بیل بِک گئے، بنیے کا اناج لوٹانے میں کھکبار (ہنسلی) چل گئی۔ (اب) جری بانے (جرمانے) میں میری دونوں چھاتیاں لکھ کر لے جاؤ...... ''پھاگ'' کا لغوی مطلب ہے: خوشی، آنند، عیش اور راگ رنگ۔ پھاگ ہولی کے دنوں میں کھیلا جاتا کہ خوشی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ لیکن اب بندھیل کھنڈ کے پھاگ، بیہاگ بن گئے ہیں اور دنیا کے اِس حصّے کی انسانیت اِس قعرِ عمیق میں گر چکی ہے کہ وہ اپنے دونوں جوبن پیش کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

کہیں ''سہرائی'' ناچ کر جنم بھومی سنتھال دیش میں، اساڑھ میں جل برس جاتا ہے۔ ساون میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ کندھے پر کدال رکھے، دہقان کھیت میں کھڑا نظر آتا ہے اور اس وقت وہ روتا روتا بھی رام رام کیے جاتا ہے (صفحہ 97) جہاں کہیں بھی تھوڑا سا سکھ ہے، اس پر دُکھ کی چھایا نظر آتی ہے۔ قحط ایک معمول ہو گیا ہے۔ حتّٰی کہ دھرتی کے ایک لال کا نام دُکال ہے، جس کا مفہوم ہے— قحط— گونڈوں کے بن بھجنوں میں جگہ جگہ یہ دُکال بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان گونڈوں کی تہذیب، آریاؤں کی تہذیب سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ گونڈ، آریاؤں کی آنے سے پہلے، مغربی ہند میں دراوڑوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ لوگ وسطِ ہند میں پہنچ گئے اور یہاں انھوں اپنا تسلط جما لیا اور چودھویں صدی میں انھوں نے کچھ ریاستوں کی بنیاد رکھی،

جو مجموعی طور پر گونڈ وانہ کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ان ریاستوں کے راجا اپنی پرجا کا خیال رکھتے تھے۔ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا، کے عقیدے پر عامل تھے۔ ''تب لکشمی مہان تھی''۔ جنتا کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ راجا اپنے ہی تو تھے، عیاشی کرتے تھے لیکن ان کی دولت گونڈ وانے ہی میں تقسیم ہوتی تھی اور اس سے باہر نہیں جاتی تھی۔ مرہٹوں کے حملوں کے بعد انگریزی عملداری آئی اور ملک بھر میں لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ براہِ راست گونڈ وانے کو تاج نہ کیا گیا، لیکن مہذب بنانے کا معمول شروع ہو گیا۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کو تشفی ہوئی تو میدانی علاقوں سے کچھ ہوشیار کلال آئے اور دیمک کی طرح گونڈوں کی کمائی چاٹ گئے۔ جب بیتول، چھندواڑا، منڈلا اور چاندا میں ان کی ریاستیں قائم تھیں، تب گونڈوں کے دادریہ گیتوں میں فراغت اور محبت مترنم نظر آئی تھی—

جی چاہتا ہے توے پر روٹی سینکا کروں
تجھے سامنے بٹھا کر تیرا منھ دیکھا کروں

[صفحہ 67]

یعنی روٹی بھی ہے اور اسے ''سینکا کروں'' کی فرصت اور پھر سامنے بٹھا کر منھ دیکھتے رہنے کی فراغت۔ جھونپڑیوں کی جگہ محلوں کا بھی ذکر آتا ہے:

اونچی اٹاری ہے اور اونچی ہے کھڑکی
نین تو لگا لے ذرا، او دوست، میں راجا کی لڑکی ہوں.... [صفحہ 70]

اور ظاہر ہے اس اٹاری پر جھانکتے ہوئے گونڈ نوجوان کو ''اپنی پگڑی کا خیال نہ ہوتا'' اور راجا کی لڑکی اسے ''نین لگانے'' کی دعوت دیتی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، ان کے گیت اب مغموم نغموں کے جنم داتا بن چکے ہیں—

''بئی ہر'' کے بازار میں گُڑ نہیں ملتا
''کرما'' ناچ میں گانے والوں کا سُر نہیں ملتا

[صفحہ 62]

بھوک کیا کم تھی، اس پر افلاس کا عالم کہ تن ڈھانپنے کا کپڑا نہیں ملتا۔ چنانچہ ایک دادریہ کا

مفہوم یہ ہے کہ گانو کا زمیندار بہت غریب ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنی بہن کو بیچ دیا ہے اور ایک دھوتی خرید لی ہے......[صفحہ 64] اور افلاس اور قحط کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں!

ہمارے گیتوں میں ''ہرا بھرا'' عنصر کم ہے۔ سرحدی لوگوں، بلوچیوں، راج پوتوں اور ناگاؤں کے رزمیہ گیت پیکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہن بھائیوں کے گیت میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے اور وہ بھائی بہن کی محبت کا جذبہ ہے۔ لوریاں عام طور پر واتسلیہ رس میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں سر راہے اُن میں فراوانی کی جھلک مل جاتی ہے—

بابا ہُنے آوے گا، کپاہ دی پنڈ لیا وے گا [صفحہ 258]

(بابا ابھی آئے گا اور کپاس کی گٹھری لائے گا)

بھڑولیوں کڈھاں کھنڈ، آلیوں کڈھا گھیو [صفحہ 270]

(بھڑولے سے چینی نکالتی ہوں اور طاق سے گھی)

لیکن یہ بھی پنجاب کے زراعتی ملک تک محدود ہے— 'باوا تیرا ہفت ہزاری' دادا صوبے دار، مغلیہ عہد کی یادگار ہیں۔ راج پوتانہ کے دوہے اور سورٹھے جو اَپ بھرنش کے دنوں سے ہم تک ہیم چندر کی وساطت سے پہنچے ہیں، سرتاسر محبت اور رومان میں بسے ہوئے ہیں—

با بہیانل پنکھیا ! داڑھت دے دے لون

پیو میرو، میں پیو کی، تو پیو کہے سو کون ؟

—ارے پپیہے تو زخموں پر نمک کیوں چھڑکتا ہے؟

پی (پریتم) میرے ہیں اور میں پریتم کی— تو کون جو پی پی پکارتا ہے۔

(راج پوتانہ کے دوہے۔ صفحہ 190 تا 191)

لیکن آج کے دوہے موجودہ راجپوتانے کی معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں حقائق اور تلخی کا رنگ نظر آنے لگا ہے۔ اس دیش میں پانی کی بے حد قلت ہے اور اڑوس پڑوس کے ملکوں کی کنواریاں اِس دیس میں بیاہے جانے سے ڈرتی ہیں، کیونکہ ان کی عمر عزیز پانی کی گاگریں اٹھاتے اٹھاتے گزر جائے گی۔ انھیں اس دیس سے کوئی محبت نہیں۔

بالوں بابا! دیس ڑو، پانی سندی تات
پانی کیرے کارنے، پروچھنڈے اُدھ رات

[صفحہ 179]

اے دادا! میں اس دیس کو جلا کر راکھ کر دوں، جہاں پانی کی خاطر اپنا محبوب آدھی رات کے وقت ہی الوداع کہہ جاتا ہے!

عوام کی شاعری خوبصورت ہے، بے حد خوبصورت۔ خواہ اس میں حلاوت ہو اور خواہ تلخی۔ کیونکہ ان کے اظہار میں انتہائی سادگی سے کام لیا گیا ہے اور بغیر لاگ لپٹ کے روداد بیان کر دی گئی ہے۔ پتے اور اَن ملوں کی بظاہر تک بندی میں جو اشارے اور مطالب پنہاں ہیں، ان سے ہمیں ان گیتوں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ لبوں سے نکلتے ہی دل اور جگر تک اترتے چلے جاتے ہیں اور ہمیں دیہات کے لوگوں کی سادگی، ان کی چھوٹی چھوٹی آسوں اور پیاسوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ انھیں پڑھ کر ''سلطانی اور عیاری'' کی بحث ہمارے لیے ناممکن ہو جاتی ہے۔ ان گیتوں کے بار بار مطالعے سے وہ خلیج پٹتی رہتی ہے، جو عوام کے ادب اور نخوتی ادب میں حائل ہے۔

ان گیتوں پر حالات کی چھاپ نمایاں ہے۔ یہ گیت کب بنے، کیوں بنے، کہاں کہاں پھیلے اور ان کو پھیلانے والے کون تھے؟ ان کی تحقیق سے ہمیں اس ملک اور اس خطے کی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔ ہمیں مختلف النوع لوگوں کی توہمات اور ممنوعات TOTEMS AND TEBOOS کا پتا چلتا ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام کے اسباب وعلل پر روشنی پڑتی ہے اور قانون سازوں کے لیے آسانی مہیا ہو جاتی ہے کہ وہ پیدائش، شادی، موت کے شرح، رہنے سہنے کے طریقوں، کام کاج اور معاش کے وسیلوں، فرصت کے اوقات کے استعمال اور ان تمام چیزوں سے متعلقہ رسوم و روایات کو جان کر قانون بنائیں تاکہ ملک کے آئین عوام کی زندگی سے لاتعلق نہ ہوں— اور اس کام میں ستیارتھی نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ انھوں نے ہماری کلچرل ANTHRAPOLOGY جسے ہربرٹ اسپنسر نے SOCIOLOGY کا نام دیا ہے، کا [راستہ؟] آسان کر دیا ہے۔ اس عظیم المرتبت کام کے سامنے سر جھکاتے ہوئے، مجھے مصنف کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ

کاش انھوں نے زبان کی طرف زیادہ توجہ فرمائی ہوتی اور مضامین کو کسی خاص نظریے کے تحت فراہم کیا ہوتا۔

یہ گیت امر ہیں اور لازوال۔ ان کی عظمت کے سلسلے میں میں جدید بنگال کے شاعر وشنوڈے کی ایک نظم کا حوالہ دیتا ہوں، جو اسی مجموعے سے لیا گیا ہے...... کسی زمانے میں بنگال پر نواب علی وردی خاں حکراں تھے اور ناگپور کے راجا رگھوجی روا بھونسلے کے سپاہی بار بار بنگال میں گھس آتے تھے اور بنگالیوں کی عزت اور آبرو پر حملے کرتے تھے۔ یہ لوگ ''برگ'' کے نام سے مشہور ہوئے اور ان حملوں کو بنگالی لوریوں میں ''برگی ہنگامے'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے —

چھیلے گھمالو، پاڑا اُجڑا لو	تھا سو گیا، گانو جمع ہو گیا
برگی ایلو دیشے	دیس میں برگی گھس آئے
بلبیتے دھان کھیئے چھے	بلبلوں نے سب دھان کھالیا
کھاجنا دیبو کیسے [صفحہ 207]	مالیہ کیسے دیں گے؟.....

اور اس نظم کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے وشنوڈے لکھتے ہیں —

کتنی ہی بار لٹیرے آئے، کتنی بار
ٹھگی ہی ٹھگی میں کتنے گانو اجاڑ دیے
کتنی ہی بلبلوں نے کتنے ہی دھان کے کھیت کھا ڈالے
کتنی ہی ماؤں نے 'برگی گیت' گایا
پھر بھی امر پران قائم رہے
اس جنتا کے — [صفحہ 208]

[زمانۂ تحریر 14/اگست 1946]

پیش لفظ
[''جالے'' از شمشیر سنگھ نرولا]

اردو افسانہ نگاری میں ایک ساتھ بہت سے اچھے لکھنے والوں کا معرضِ وجود میں آجانا محض ایک نباتاتی عمل نہیں، بلکہ یہ دورِ حاضرہ کی عالم گیر بے اطمینانی، اقتدار کے تزلزل اور دوسری اقتصادی ضروریات کا اقتضا ہے، اور یہ نئی پود، رات کو مٹی کے تیل کے ساتھ اپنے جسم کی فاسفورس جلاتی ہے اور اپنے جامد ماحول کو دیکھ کر خود کُڑھتی ہے اور دوسروں کو کُڑھاتی ہے—

''......اس نے اپنے دائیں بازو کو آہستہ سے اوپر اُٹھایا اور درمیانی اُنگلی سے اپنی بھوؤں کو کھجانے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گُنگنایا— ''ہندوستان میں کون بیمار نہیں؟ بہن! یہ بیماری تو زندگی کی نشانی ہے، زندگی کی نشانی، جب دم ہی نہ ہو تو بیماری کیا خاک ہوگی۔'' اس کے بعد وہ کھوکھلی، مذاق سے خالی ہنسی میں ہچکولے کھانے لگا۔''

(دو اسٹیشنوں کے درمیان)

اقتصادی بدحالی، اس پر رسم و رواج کے بندھن، جسمانی اور روحانی بیماریوں سے رہائی کی امید موہوم نے مصنف میں کس قدر تلخی کے نشتر پیدا کر دیے ہیں اور وہ بیماری کو ہی زندگی کی نشانی سمجھنے لگا ہے۔ بر سبیلِ تذکرہ ایک پُر خلوص دوست کی ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ اپنی تمام تلخی کے ساتھ اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: ہماری زندگی میں کوئی بھی جنبش نہیں، کاش!

ہمارے ملک کی گلیوں میں بم گریں تاکہ لوگوں میں کچھ حرکت پیدا ہو— لیکن 'جالے'' کا مصنف بالکل قنوطی ہے اور اس کا خیال کسی حد تک مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے کہ ایک ہندوستانی— موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں— غلامی کے جال سے مر کر ہی نجات حاصل کر سکتا ہے (مکڑی کا جالا) اور اگر کوئی آدمی، مصنف خود ہو یا ''گئو ہتیا'' کا سنیل جب 'گرام' سدھار کا کام ہاتھ میں لے بھی، تو وہ اپنا سر پھوڑ کر رہ جاتا ہے۔ بھوک، عفونت اور تصویر کا سیاہ رخ پیش کرنے کا طرز عمل جو مصنف نے اختیار کیا ہے، بِہ داماں اس بات کا خواہاں ہے کہ لوگوں کو جھنجھوڑا جائے۔ مصنف کی رسائی (APPROACH) منفی ہے۔ اپنے آپ کو بے کیفی، بیماری سے وابستہ کرتی ہے۔ ''ایک ہندوستانی کی پیدائش'' جو کہ مصنف کے افسانوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے، اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک ہندی جس غیر صحت مند ماحول میں جنم لیتا ہے، ایسا ہے—

> ''دیے کو اس کوٹھری (زچہ خانہ) میں محبوس ہوئے یہ ساٹھواں سال تھا اور یہ چارپائی، دریاں، لحاف تب بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ اب۔ اس عرصے میں اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اسے چھپن دفعہ روشن کیا جا چکا تھا۔ چھپن عورتوں نے اس کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے نئے ہندوستانی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھے تو اسی کوشش میں کام آئیں۔ چار اس اذیت کو آخر تک نہ سہار سکیں۔ اور ایک لحاف میں چھپے ہوئے بچھو کے کاٹنے سے مر گئی۔ تین بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے۔ آٹھ بچے پیدا ہونے کے چند دن بعد مر گئے۔ اور جب اس کو گل کرنے کے تھوڑا عرصہ پہلے ماں بچے کو باہر نکالا جاتا، تو وہ سوچا کرتا کہ یہ نیم جان زندگیاں باہر جا کر زیادہ دیر جیتی ہوں گی؟''

اور شمشیر سنگھ کے افسانے اس قسم کے، مقدس نفرت جگانے والے، منظروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں ''گئو ہتیا'' ''مکڑی کا جالا'' 'بیج اور پھل' [اور] 'ہسپتال میں' قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے اس نئی پود کے لکھنے والوں کے وجود ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، اسی طرح ان کے سوچنے کے طور وطریق میں بھی امتیازی شان نظر آتی ہے۔ ان میں سے کوئی، انسان اور اس کی

وساطت سے اشیا کو جانچتا ہے، تو دوسرا، اشیا اور حالات کے ذریعے انسان کا مطالعہ کرتا ہے۔ کوئی کردار کی انفرادیت پیش کر کے تصویر مکمل کرتا ہے، تو کوئی ماحول کی بے رحم عکاسی سے نقوشِ حقیقت اجاگر کرتا ہے۔ شاید ان سب میں توازن برقرار رکھنے والے کو اتمامی حیثیت دی جا سکے۔ لیکن اس وقت ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں اور اتمامی حیثیت ہے بھی ایک اضافی بات..... اردو افسانہ نگاری کے عبوری دور میں افراط و تفریط دونوں ہیں۔ جیسا کہ نئے ادب میں جنس کے بارے میں نمایاں ہے۔ لیکن کیا صرف یہی کافی نہیں کہ سب ایک روز افزوں ترقی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہیں۔ اور نہیں تو کسی مہدیِ روزگار کے لیے راہ بنا رہے ہیں۔

پہلی چیز حسنِ انتخاب ہے اور شمشیر سنگھ نرولا کے منتخبہ مضامین میں کوئی بھی عامیانہ پہلو لیے ہوئے نہیں۔ محبت کی مثلث و مسدس اس کے ذہن میں نہیں سماتی۔ آخر جو شخص کسی لفظ کے وسیع معانی FOURTH DIMENSION دیکھ لیتا ہے، وہ فوراً اس بات کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ مکڑی کا جالا ایک علامت ہے، ایسی دنیا کی جس میں بالخصوص ہندوستانی جنم لیتا ہے اور موت ہی اس کے لیے واحد ذریعۂ نجات ہے، اور سسکتی ہوئی گائے کو زہر دے کر مارنا گوارا نہیں، بلکہ اسے بھوکوں رکھ کے نفس بہ نفس اذیت سے مارنا گوارا ہے۔ 'عورت اور حسن' 'چار دن کی چاندنی' 'ٹمٹماتے ہوئے قندیل' میں مصنف کو کچھ کہنا ہے اور بات ہر جگہ کہنے کے لائق ہے اور مصنف کے حسنِ انتخاب کی داد چاہتی ہے۔

ہمارے پاس خام مواد اس کثرت سے ہے، لیکن اس کا کون [سا] حصہ استعمال کیا جائے؟ اس کے لیے ایک تجربہ پسند آنکھ کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں انتخاب سے زیادہ ضروری رد ہے۔ جہاں ہمیں اس بات کا تقاضا ہے کہ افسانہ نگار کو عملی و علمی دسترس ہو، وہاں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ بہت سی پڑھی لکھی چیزوں کو بھول سکے۔ اور نہ صرف ایک آزاد روش اختیار کرے، بلکہ بہت سی باتوں کو ان کی ذاتی خوبصورتی کی بنا پر افسانہ میں جگہ دینے سے گریز کرے، کیونکہ اس طرح ایک خاص حصہ نمایاں ہو کر باقی سب حصوں پر حاوی ہو جائے گا، اور مجموعی تاثیر کو قائم نہیں رہنے دے گا۔ اگرچہ شمشیر سنگھ نرولا کا رجحان SYNTHETIC ہے، لیکن وہ صرف اُن ہی چیزوں کو بروئے کار لاتے ہیں جن کا ان کے نفسِ مضمون سے تعلق ہے اور پھر سب کچھ اس

طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ مختلف حصوں کے ایک مضمون کی بجائے ایک ہی مضمون کے مختلف حصے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن شمشیر سنگھ کی انفرادیت، ان کی خوبی، ان کی عکس ریز آنکھیں ہیں جو ذیلی جزئیات کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ معمولی سی معمولی جنبش، بے بضاعت ترین شے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتیں اور بعض اوقات تو ایسی جگہ بھی پہنچ جاتیں ہیں جہاں ان کے افسانے کے کردار کا گزر نہیں ہوتا۔ ہم پڑھتے ہیں تو بعض وقت جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ آخر کون ہے جو پوسٹ مارٹم کیے ہوئے جسم میں شریانوں اور وریدوں کا ایک بہت بڑا حصہ دیکھ کر شانے نہیں جھٹکتا۔ لیکن جب تک ہم منظر و پس منظر اور اس سے وابستہ تمام جزئیات سے آگاہ نہیں ہوتے، ہمیں کسی عضو کے تعطّل کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں شمشیر سنگھ پوری عقل و ہنر کے ساتھ نبّاضی کرتا ہے اور پھر ہمیں جسم کے مردہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور ہم یقین کرنے لگتے ہیں کہ اس کے جسم میں روح بھی ہے—

[زمانۂ اشاعت: 1943]

پیش لفظ

[''اپنے آپ کا قیدی'']

احمد عثمانی اُن معنوں کے افسانہ نگار نہیں، جن معنوں میں افسانے کو بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہ شروع میں سلسلہ وار پیچ [دار؟] رومان یا پُر پیچ کردار نگاری اور تمت بالخیر۔ ان کے افسانے کا شروع بھی وہی ہے جو آخر ہے۔ انسان، اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو شروع ہی سے بالغ۔ ابھی اس کا رنگ روپ ہم تسلی سے دیکھ بھی نہیں پاتے کہ اس کا سر ''دھنکی ہوئی روئی'' ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی پیرانہ سالی میں سفید مؤصدیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسے جستجو کی ایجاد سے پہلے کا عہد یاد ہے۔ وہ ہمیشہ کسی منزل کی تلاش میں ہے، جو منزل بھی نہیں۔ وہ ایک موہوم اُجالے کے لیے تڑپتا ہے، جو زمان و مکاں کی گردش اُسے دے نہیں سکتی۔ انسانی جہد کا ماحصل صفر ہے، جو ہمیں نے ایجاد کیا ہے اور جو لامتناہی ہے۔

''اپنے آپ کا قیدی'' کا مصنف اپنے آپ کا قیدی ہے۔ وہ خارجیت میں یقین نہیں رکھتا۔ ایک داخلیت ہے، جو ہیئت اور مواد دونوں پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کا فرد، فرد نہیں؛ پوری دنیا کا ترجمان ہے۔ جو کب سے چلا ہے (''صدیاں بیت گئیں چلتے چلتے''؛ ''بے نام وادی کا بے معنی سفر'') وہ ابھی تک اس لایعنی سفر پر رواں دواں ہے۔ 'وہ سارتر' کا کردار ہے، جو لامعنویت کا شکار ہے اور وجودیت کے فلسفے کو جلا دیتا ہے۔ انسان ابھی تک مہذب نہیں ہوا۔ ابھی تک چوبیس گھنٹے خود کے تحفظ کا جذبہ اسے چونکا چونکا دیتا ہے، جو صدیوں پہلے تھا، جب کہ انسان غار میں رہا کرتا

تھا۔ وہ ابھی تک اپنے سائے، اپنے خیالوں سے ڈرتا ہے ("پناہ") اور نہیں جانتا کہ اس دور کی خوں ریز جنگوں اور فسادوں میں جو شخص اس کے دروازے کو تھپتھپا رہا ہے، ہاتھ میں چھرا لے کر نہیں آیا بلکہ خود پناہ کا جویا ہے!

منزل......منزل......منزل......سفر سمت "سمتیں" "آوازیں" "اندھیرا" "اجالا...... اجالا......جستجو"...... بلکہ جستجو سے پہلے کے انسان، تکرار کے ساتھ احمد عثمانی کی تحریروں میں آئے ہیں، اور اسے عام افسانہ نگار اور اس کی دنیا سے الگ کر دیتے ہیں، اور شاید اسے جدید سے جدید تر بنا دیتے ہیں۔ انھیں پڑھتے وقت آدمی اکثر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ احمد عثمانی کا سفر کیا وہی سفر ہے جس پر مصوری کا قافلہ چلا؟ کہاں تو "ریوبین" ایسا مصور، جو پیڑ کا پتہ پتہ کدوکاوش سے بناتا ہے ــــ اور کہاں "فان گوف" سورج کو بھی حلقۂ دامِ خیال بنا دیتا ہے۔ مصوری کا فن "آگے" بڑھتا ہے اور "پکاسو" کے ایک ہی خط پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ آنکھ پیٹ پر لگی ہے اور پیٹ ران ہو گیا ہے۔ انسان مٹ نہیں سکتا [انسان وہ نہیں؟] جو دکھائی دیتا ہے، بلکہ وہ ہے جسے ہمارے ذہن کی آنکھ دیکھتی ہے یوں بھی ہوا کہ مصور نے سامنے کاغذ ٹانک کر دور سے اس پر رنگ پھینکا اور وہ کوئی سی بھی ہیئت اختیار کر گیا۔ مصوری میں چونکہ اشارہ زبان ہوتا ہے، اس لیے وہاں تو اس قسم کا تجربہ زیادہ ممکن ہے۔ لیکن لکھنے کے فن میں تسلسل کے علاوہ صرف ونحو کا خیال رکھنا پڑتا ہے، ورنہ بیائی [کذا] ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس لیے احمد عثمانی کی تحریر، تحریر ہے اور نہیں بھی۔ موٹے موٹے رنگ ہیں جنھیں کاغذی پیرہن پر تھوپا اور پچارا گیا ہے۔

میں پھر تائیدی انداز میں کہتا ہوں کہ احمد عثمانی کی دنیا باقی کے افسانہ نگاروں کی دنیا سے یکسر جداگانہ ہے، جہاں منظر و پسِ منظر صرف علامتیں ہیں۔ ("بے نام وادی کا بے معنی سفر")۔ ان کا سفر کسی صوفی کی اندرونی پرواز ہے، جس میں حوصلے کے پر جل گئے۔ اب وہ مقام ہو میں داخل ہو گیا ہے، جہاں اس قدر اندھیرا ہے کہ دنیا میں کا اندھیرا اس کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتا۔ یہاں اپنا وجود کسی دوسرے کا وجود محسوس ہوتا ہے۔ پھر اس پر ایک داخلی ڈر ــــ جیسے کوئی غارِ حرا میں گیا اور جبرئیل سے اس کا سامنا ہو گیا۔ اب وہ دہشت کے عالم میں کانپ رہا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الفاظ کی قید و بند سے بے نیاز، قلم کا صوت ہی اس گمشدہ مسافر کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ وہی

صوت ہے جو تجلی ہوا، اور پھر صوت، اور آخر اپنے ہم قافیہ موت میں گم ہو گیا۔ جو موت کی ارفع شکل ہے، کیونکہ اس میں بدن کی کثافت نہیں ——روح کی لطافت ہے اور یہ موت نہیں۔

—— ''عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا''

''بگولے'' کا فن کہانی کے اعتبار سے صرف آئینہ داری ہے۔ کئی لوگ اس فن پہ یقین رکھتے ہیں، کیونکہ ان کا علم کہتا ہے کہ جب اتنے بڑے بڑے ولی، اوتار، سیاسی راہ نما اور فلسفی اب دنیا کا کچھ نہ بگاڑ سکے، تو مصنف بے چارے کی حقیقت ہی کیا ہے؟ اس کا معاشرے کے سامنے آئینہ رکھ دینا ہی عین فن ہے۔ نفسیات کے ماہر بھی یہی کہتے ہیں کہ نفسیاتی الجھن کا جان لینا اور اس کا احساس ہی اس کا علاج ہے۔

احمد عثمانی کی زبان چولی ہے اور اظہار اس کا دامن......

''کیا اجالا ہو گیا بھائی؟......'' ''وہ چاہتے ہیں کہ کوئی انجانی قوت ان کے سامنے اجالا لا کر بکھیر دے......'' ''اس کی آنکھوں کی نوکیلی روشنی سے بچنا مشکل تھا......'' ''بادل ادھر اُدھر بہہ رہے تھے......'' ''اچھے دن بھاگ رہے ہیں......''

''قندیلوں میں جلتی تاریکی'' احمد عثمانی کا افسانہ ہے، جو اس کے فن کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی شروعات ہیں [میں؟]:

''تار تار عصمت بارونق بازاروں کے بلند گنبدوں میں جا چھپی۔ دن اور رات کی تمیز اُڑ کر مریخ کے سفر پر روانہ ہو گئی......''

مریخ کیوں؟ چاند کیوں نہیں؟—— کیا اس لیے [کہ] ہمارے شاعر اور افسانہ نگار ماہ زدہ ہی رہے ہیں، اور اب تک ہیں، جو پاگل نہیں تو نیم پاگل ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ چاند کی روشنی حقیقت نہیں دکھاتی، اس پر ایک خواب آلود پردہ ڈال دیتی ہے؟—— اس لیے مریخ!......شاید مریخ کی بات اور ہے کیونکہ وہ ستارہ اضطرار کا ضامن ہے......

''جب جلتا ہوا گولا اپنی حرارت کو سمندر کی نرم و نازک لہروں کے سپرد کرتا ہے تو تھرتھراتے ہاتھ چوکھٹوں کو تلاش کرتے ہیں، کھٹ کی آواز پر سوار

دن سارے گوشوں میں مچلتا پھرتا ہے......"

گویا احمد عثمانی کی دنیا میں دن بھی کرن کرن نہیں نکلتا، بلکہ کھٹ کی آواز پر سوار چلا آتا ہے۔اسی طرح آواز میں رات زن کی صوت پر سوار چلی آتی ہوگی۔

میں تو بھائی اس نظارے سے ڈر رہا ہوں۔جیسے ستیش گجرال کی تصویریں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔احمد عثمانی کی تحریریں پڑھ کر مجھے، اپنی اصل شکل دکھائی دینے لگتی ہے، جو میں نہیں دیکھنا چاہتا۔آپ کی ہمت ہو تو بڑے شوق سے دیکھیے، مگر ایک بات کا خیال رکھیے کہ وہ شکل میری یا احمد عثمانی کی نہیں، آپ کی اپنی ہوگی۔

[تاریخ تحریر: 22 جولائی 1974]

بیدی

کے

خطوط

راجندر نواس، رشی نگر

لاہور

25/ستمبر

اوپندر بھائی!

نیم چھتے کے چھجے پر سے کل جھانک رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا، کمزور نسوں والا چھوکرا ہمارے مکان کے سامنے رُکا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چٹھی تھی، جو غالباً مجھ سے منسوب تھی۔ اس کے مشن کی نوعیت اس کی حقیقت کذائی سے ظاہر ہوتی تھی— دم چڑھا ہوا، لب خشک! (باقی صرف یہ رہ جاتا ہے— آہ سرد و جسم تر، بقول غالب) وہ تمھارا بھائی نریندر تھا۔ میں نے دیکھا اس کا مشن اس کی حقیقت کذائی کا ہمنوا نہ تھا۔ بات شاید ضرورت سے زیادہ برخورداری یا نسوں کی کمزوری تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا— سناؤ پریت نگر میں خیریت تو ہے۔ وہ صرف اثبات میں سر ہلا سکا۔ بارے تسکین ہوئی۔ ایشور جانتا ہے، جب ننھی ننھی پھنسیاں، پھوڑے اور پھر بھیانک پھوڑے بننے لگتی ہیں تو کیا کچھ ہو جاتا ہے، اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے قوتِ تصور پختہ کار ہونی چاہیے۔

یہ عین خوشی کی بات ہے کہ پریت نگر میں سکون ہے " اگر چہ ویسے وہاں پریت کرنے لائق کوئی چیز نہیں، لیکن کون کہتا ہے، کل بھی نہ ہوگی " ایک بہت فکر انگیز بات ہے۔ ہو سکے تو پریت نگر میں ایک A.R.P.SQUAD بناؤ تاکہ حملوں سے محفوظ رہو۔ نہیں تو Moral Re-armament (جو ابھی کشمیر میں متحرک ہوئی ہے) کے ممبر بن جاؤ۔ اگر چہ وائے قسمت! اس کے ناخدایان بھی صنف نازک میں سے ہیں اور میں جانتا ہوں، عورتوں کے لیے تم کمزور ہو۔

پھر بھی میں تمھارے لیے دعا کرتا ہوں اور روحانی فسٹ ایڈ سیکھ رہا ہوں۔

تم خاطر جمع رکھو، میں تمھیں Caprias بھیجوں گا۔ کہو تو کلو کے سیب درست کر کے بھیج دوں۔ ذرا ترش ہوتے ہیں، مگر زود ہاضم۔ ایک بات میں بھول گیا— تم نے لکھا ہے، سب کے ساتھ یہاں آؤ۔ شاید اس وقت میں شادی بھی کر لوں گا— شادی، یہ بھی خوب دلچسپ کہانی ہے۔ ارے بھئی تمھارے معمے مجھ سے مادی آدمی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ جب سے میں اور تم متعلق ہوئے

نوٹ: یہ خط 1939 کے اواخر یا 1940 کے اوائل کا ہے۔ (اشک)

ہیں، میں شادی شادی سن رہا ہوں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہ میں وہ دل سوز واقعہ وقوع پذیر ہونے والا ہے اور کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے لامتناہی عرصے تک ملتوی کر دیا ہے، حتیٰ کہ تمھیں خود محسوس ہونے لگا کہ یہ بھی کیا دلچسپ کہانی ہے۔

دیکھو بھائی، دو ہی باتیں ہیں۔ یا شادی کرلو۔ فوراً۔ یا پھر Stringberg ہو کر عورت سے نفرت کرنے لگو اور ہمیشہ مجرد رہنے کا اقرار کرلو۔ یہ ہو رہی ہے داد بھی بیداد بھی، مجھ سے نہیں سنی جاتی اور نہ ہاشمی اپنی جسم و جان کے باوجود سہہ سکتا ہے۔ ستونت بھی نہیں سہہ سکتی۔ شادی کے لفظ کو غلط العام فصیح مت کرو اور جلدی میں تمھیں کنواری نہ ملے تو مجھے کہو میں کہیں سے Virginal Mother کا بندوبست کردوں۔

اگر میں پنگوڑہ نہیں لایا تو تم اسے ستونت کی یا میری خودداری پر ہرگز ہرگز محمول نہ کرنا۔ بات صرف Ennui یا آلکس کی ہے۔ یہی دو چیزیں مجھے زندگی میں ناکام کرسکتی ہیں۔ میں تمھارے اس تصرّف کا دل ہی دل میں بہت احسان مند ہوں۔ اس سے پہلے بھی تمھارے اس بیس منکوں والے غیر مرئی طوقِ احسان سے گرانبار ہوں۔ پنگورہ بھی لے ہی آؤں گا۔ چھوڑتا نہیں۔

تمھاری ڈاچی کا ریویو پرتاپ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ظہیر نے کہا تھا ''شہباز وغیرہ دوسرے مسلمان پرچوں کے لیے ایک مضمون (ریویو) مجھے لکھ دو اور میں نفسِ مضمون کو اِدھر اُدھر کر کے دوسرے لکھ کر متعدد پرچوں میں چھپوا دوں گا۔'' میں نے اچھا کہہ دیا۔ امر چند بھاٹیہ کو کتابیں مل گئی ہیں، اگرچہ دیر سے ملی ہیں۔ ٹربیون میں ریویو ہو جائے گا۔ امر چند بھاٹیہ بہت نفیس آدمی ہے۔ اس سے مل کر میں محظوظ ہوا ہوں۔

ہاشمی کا پتہ ہے۔ کینٹ گارڈنز، لاہور چھاؤنی۔ احمد ندیم قاسمی، مقبول حسین کا پتہ پوچھ [کر] بھیجوں گا۔ ہاشمی چند دنوں سے روپوش ہے، جیسے کسی جرم کا مرتکب ہوا ہو۔

تم نے ستونت کے متعلق پوچھا تھا۔ بھائی وہ کمزور ہوگئی ہے۔ اس لیے مجھ سے لڑ پڑی ہے۔ ابھی ابھی ایک جھپٹ ہوئی تھی، اور وہ کمرے کے اِدھر اُدھر گھوم رہی ہے کہ یہ نامعقول، زود رنج آدمی خط کو ختم کرلے تو میں کہوں۔

''روغن زرد ختم ہو گیا ہے۔''

''بھائی کا خط آیا ہے، اس میں کیا لکھا ہے۔''

اگر اس کا تیر نہ چلا تو میں کسی نہ کسی بہانے سے اسے بلاؤں گا۔ مگر ہرگز ہرگز اس پر زیادتی کا اعتراف نہ کروں گا۔ اگر صریحاً زبردستی چل جائے تو زبردستی کو کون پسند کرتا ہے۔ میں صرف اس سے اتنا کہوں گا ــ ''دیکھو تو، اس طرح کڑھتے رہنے سے تم زرد زرد ہوتی جارہی ہو۔ پر ماتما جانے تمھیں تو پیلیا (یرقان) ہو گیا ہے۔''

پہلے تو وہ لفظ پیلیا پر ہنسے گی۔ پھر کہے گی۔ کمزور ہوتی جارہی ہوں تبھی تو تم مجھ سے لڑتے ہو۔ کھایا پیا کیا لگے گا۔ اگر اندر ہی اندر تمھارے کوسنے مجھے کھائے جائیں۔ میں کہوں گا۔ اُو پندر کمبخت (معاف کرنا) Ovaltine کی سفارش بھی کر گیا تھا۔ مگر میں بھی کتنا سست ہوں۔ نہ لاسکا۔ یہ باتیں سخت تنفر سے کہی جانے کے باوجود اسے اس بات کا یقین دلا دیں گی کہ مجھ سے رغبت ہے۔ حالاں کہ اس لفظ کی نفسیات اور Application in concrete سے میں کما حقہ واقف نہیں۔

ایک Anecdote ہے میرے پاس، جو تمھیں سنانا چاہتا ہوں۔ سن کر ہنس دو گے۔ صلاح الدین ہیں نا۔ ادبی دنیا کے رذیل قسم کے شریف انسان..... کرشن یہاں نہیں، تم یہاں نہیں۔ بقا بانے میری تعریف کی۔ کچھ عنانِ توجہ میری طرف منعطف کی۔ ایک دن دفتر سے لکھ بھیجا۔ میں ان کے ہاں گیا تو میراجی کو ایک TALK 'جہانگیر' پرسنا رہے تھے۔ تم جانتے ہو، یہ شخص ریڈیو والوں کا مہیب نقاد تھا۔ مگر انھوں نے اسی ماہ کی چوبیس کو عمدہ Bait دیا۔ وہ شخص اب خاموش ہے۔ کہتا ہے، ''وہ لوگ کافی سمجھدار ہیں۔''

پہلے حضرت نے میرے ڈرامے Tweet کی کافی تعریف کی۔ کہنے لگے، میں بھی تمھارے ساتھ انارکلی تک چلوں گا۔ خیر 'انارکلی' وہ جگہ جہاں تم نے 'کافی' کو رسوا کیا ہے، وہاں پہنچے، تو مولینا ایکا ایکی پوچھنے لگے

''تمھارے 'زُود پشیماں' پر ریویو کس نے کیا۔

''کوئی صاحب نند کشور ہیں..... ٹربیون میں!''

"تمھارے واقف ہیں۔"

میں نے غلطی سے کہہ دیا—ہاں...... معمولی طور پر......اوپندر کے ذریعے سے کہنے لگے۔

"دیکھو بھائی، ان سے ملنا۔ کہنا کہ میرا نام چوبیس کی ٹریبیون میں Selected Items دے دیں تو اچھا ہو...... یوں ہی سرسری طور پر کہنا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا!" میرا خیال تھا، میں امر چند بھاٹیہ سے مل کر اس کام کو کرلوں گا۔ اوّل تو سوا آٹھ بجے کی TALK لاہور اسٹیشن کی خود بخود ہی ان Items میں آجاتی ہے۔ پھر کہنے لگے کہ جو ریڈیو نوٹس لکھتے ہیں، ان سے کہہ دینا کہ میرے متعلق فقط ایک دو Lines لکھ دیں......

میں نے کہا "یہ بھی مشکل بات نہیں۔"

میرا خیال تھا، ان کی TALK خود بخود ان Items میں چلی جائے گی۔ مگر چوبیس کا اخبار کھولا تو مولانا نمایاں جگہ پر دکھائی نہ دیے۔ اب اُن پر نوٹس نہ نکلے تو میری ساکھ ماری جائے گی۔ عجب مخمصے میں ہوں بھائی۔ تم ہی کہو کیا کیا جائے؟

اب کوئی چیدہ بات نہیں رہی، جو تم سے کہہ دوں۔ چند دن ہوئے میں کچھ Seriousness of life سے Confront ہوا۔ چند پُر لطف باتوں کے بعد ایک درد انگیز موت کا تذکرہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اسے پس انداز کرتا ہوں۔ کسی دوسری محفل کے لیے۔

تم بھی کچھ اپنے دل کی کیفیات کہنا۔ کیا وہ کچھ ہلکا ہلکا محسوس نہیں کرتا۔ شہر کی Intrigues سے تو بچے ہو۔

منّی بہت روتی۔ نہ جانے کیوں۔ ٹانگیں اکٹھی کر رہی ہے، شاید پیٹ میں درد ہوتی ہے۔ اس کی ماں نے صبح کوئی بد پرہیزی کی ہوگی۔ کسی کے قصور کی تکلیف کسی کو۔

ہربنس، ستونت اور نریندر کی نمستے۔

تمھارا

راجندر سنگھ بیدی

راجندر نواس۔ رشی نگر

لاہور

11/جنوری 40ء

اُپندر بھائی، نمستے

آج مدّت مدید کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ پچھلا سارا ماہ تو ''دانہ ودام'' میں پھنسا رہا۔ اس کے بعد بیوی کو اس کے بھائی کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے گوجرانوالہ چلا گیا۔ کثرت کار، خوراک کی کمی کے سبب کچھ ہوا سی لگ گئی اور میں گوجرانوالہ میں چند دن بیمار پڑا رہا۔ ارادہ تھا، کچھ بال و پر نکالتا لیکن موقع نہ ملا۔ خیر۔ اتنے عرصہ کے بعد دعوت مژگاں کو جی چاہا اور آج یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔

''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' کے سالنامے تم کو پہنچ چکے ہوں گے۔ مجھے تا ہنوز ''ادبی دنیا'' نہیں ملا اور میں نے پڑھنے لکھنے کا روزہ افطار نہیں کیا۔ البتہ 'یہ انسان' کی سحری کھائی ہے اور خوب مزے سے کھائی ہے۔ میں آج کل نہ کچھ لکھتا ہوں اور نہ پڑھتا ہوں۔ ایک رمضان شریف کا ساسناٹا چھایا ہوا ہے۔ ادبی محفلوں میں یہاں کائیں کائیں تو کافی ہو جاتی ہے لیکن 'پر' کوئی بھی نہیں پھڑ پھڑاتا۔ کبھی کبھی تمھارا ذکر خیر آتا ہے، تو 'تاوقتیکہ' اور 'خوش خبری' کے سے الفاظ پر فرمائشی قہقہے پڑتے ہیں۔ یا تمھارے 'بنیا پن' کو خوب ہی پانی پی پی کر کوسا جاتا ہے۔ تمھارے دوست علیٰ اعلانیہ کہتے پھرتے ہیں کہ اشک بطور ایک افسانہ نویس کے زندہ نہیں رہے گا۔ ہے تو یہ بات طفلانہ سی کیونکہ تم کام کرتے ہو لیکن اس کے باوجود، پروپگنڈا کے طلسم کے سامری پن کو قائم رکھنے کے لیے تمھیں مہینہ میں ایک دو دفعہ لاہور کا Whirl Wind کی سی نوعیت کا دورہ پڑنا چاہیے۔ کہتے ہیں بعض بیماریاں روح کو آلائشوں سے پاک کرتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ نریندر سیٹھ، میں اور کوئی اور حضرات، ڈراما ایکٹ کی ٹیم قائم کرنے کے لیے سر دُھن رہے ہیں۔ تمھارا ایک پلے بھی رکھنا ہے۔ اجازت دو تو 'لکشمی کا سواگت' لے لیا جائے۔ پیسوں کی کوئی سبیل نکلی تو تمھارے انسٹنکٹ کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاوے گی۔ دیکھو میری اٹی۔ سٹی پہ ناراض نہ ہونا۔ میں یہ تم سے مذاق کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ در حقیقت

تمھارے اس جذبے یا جو کچھ بھی اس تحریک کا نام ہے، اُسے مستحسن نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ہاں تو اگر کوئی 'پلے' تمھارے خیال میں یعنی تم اپنی مرضی سے دینا چاہو تو مجھے لکھ دو۔ اس دفعہ ادبی دنیا کے سالنامے میں عصمت چغتائی اور چند ایک گمنام حضرات کی بڑی تعریف کی جا رہی ہے۔ پڑھنے کے بعد پتا چلے گا۔ 'کونپل' اچھی ہے یا کوئی اور فسانہ — بہر حال یار لوگ جن کی مولینا تک وساطت ہے، کہہ رہے ہیں کہ کونپل پر انعام ملا تو صلاح الدین سے جنگ ہو گی۔

''دانہ و دام'' ابھی کتابی صورت میں بانٹنے کے لیے مجھے نہیں ملی۔ صرف ایک کاپی میرے پاس ہے۔ تیار ہو جاوے گی تو بھیجوں گا۔ اس میں پنسل سکیچ جو ہے، اُس میں مَیں کیا کچھ معمر دکھائی دیتا ہوں۔ چہرے پر Furrows ہیں لیکن مجھے پسند ہے کیونکہ اس سے Fraud میں جامعیت پیدا ہوتی ہے۔

ستونت ایک دن آپ کے یہاں آپ کی بھاوج وغیرہ ملنے کے لیے گئی تھی۔ وہ لوگ سب راضی خوشی ہیں۔ یہ فقرہ کچھ زائد ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی خیر و عافیت آپ کو پہلے ہی پہنچی ہو گی۔ تاہم دُہرانا لازمی ہے کہ وہ راضی خوشی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو بہت ہی راضی خوشی ہیں، نہ جانے کیوں؟

تم شاید لاہور کے سے شہر میں آنے کے لیے کتنا ترستے ہو گے۔ لیکن میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم کوئی کام ہی نہیں کرنے دیتا۔ کسی مہمان کو رخصت کرتا ہوں تو کسی کا مہمان ہونے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ موخر الذکر بات ہے تو اچھی، لیکن وقت کے لحاظ سے دونوں قاتل ہیں اور 'آئن اسٹائن' کے نظریۂ اضافیت کو ثابت کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں جب کہ تم مجھے ملے، اس وقت سے لے کر آج تک تم نے میرے اندازے کے مطابق تین نظمیں کہہ ڈالی ہوں گی۔ ایک افسانہ مکمل کر لیا ہو گا اور دوسرا تیسری بار لکھ رہے ہو گے۔ ڈرامے کا پلاٹ تمھارے دماغ میں ہو گا۔ بس اسی بات کے منتظر ہو گے کہ کب بیٹھوں اور اُسے لکھ ڈالوں۔ میری بابت یہ ہے کہ سینکڑوں پلاٹ ہیں۔ ابھی نلیے مرغی حرام ہو رہی ہے۔

یوں دکھائی دیتا ہے جیسے پریت نگر اب تمھارے لیے مکمل سکون کا مسکن ہو گیا ہے اور تم میں احتجاج مرنے لگا ہے۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ عورت کے معاملے میں تم کمزور واقع ہوئے ہو،

میرے خیال میں تم نے یہ بات غلط کہی تھی۔ محض عامیوں سے اختلاف ظاہر کرنے کے لیے۔ یا تم نے کوئی مقوی باہ دوا کھائی ہوگی۔ وگرنہ تم خود ہی مجھے 'دونوں طرف برابر کی لگی ہوئی' کے متعلق لکھتے.............اور ـــــــ شادی؟...........!!

تمھارا

راجندر سنگھ بیدی

راجندر نواس، رشی نگر

لاہور 22/اگست 40ء

آج کل بہت اداس خاطر ہوں۔ آج ایک عجیب واقعہ نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا۔ میں ادارہ ادب لطیف میں بیٹھا تھا کہ کہیں سے گوپال متل آ نکلے۔ میں اُسی مضمون ''ادب العالیہ اور ترقی پسندی'' کے متعلق گفتگو کر رہا تھا کہ اس اثنا میں گوپال متل جو کہ ترقی پسندی کے مروجہ عقیدہ کے قائل ہیں، ان سے بحث ہو پڑی اور بحث میں، انتہائی کمزور واقع ہوا ہوں۔ اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ موقع ایسا تھا کہ مجھے کوئی دلیل ہی نہیں سوجھتی تھی اور سوجھی بھی تو بے معنی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے خفت اُٹھانا پڑی۔ اب ہنسنے کی بات یہ ہے کہ شکست خوردہ گھر آیا ہوں تو بہت دلیلیں سوجھ رہی ہیں۔ اول تو میرا دل سمجھتا ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنھیں صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے جو کہ انسان کی دلیل اور ادراک سے بالاتر ہیں۔ مثلاً انسان کو اپنے اندر ایک روح کا احساس۔ متل روح کے وجود سے انکار کرتا تھا۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں محض ایک افسانہ نگار ہوں۔ میں نے بحث کیوں کی اور پھر بحث میں بعض بہت بری باتیں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً گوپال اس بات پر بضد تھا کہ کرشن چندر نے ''نظارے' میں ترقی کی ہے اور میں کہہ رہا تھا کہ 'تنزل' کیوں کہ وہ ترقی پسندی کا ایک معینہ مطلب لے رہا ہے[1] وغیرہ وغیرہ۔

---

1. بعض وجوہ سے اشک صاحب نے اس خط کا پہلا اور آخری پیراگراف اشاعت کے لیے نہیں دیا۔ ق۔ ر

95 لاہور کینٹ

9/ مارچ 40ء

برادرم اُپندر

خط ملا۔ جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا لاہور آؤ گے تو ضرور ملو گے۔ لیکن تم آئے بھی تو بغیر ملے چلے گئے۔ یہ دور کا سلسلہ، دور کا سلسلہ ہی ہوتا ہے۔ ہم تمھارا انتظار کرتے رہے۔ میں نے اور ستونت نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ سازش کر رکھی تھی جو کسی طرح بھی گن پاؤڈر پلاٹ سے کم مہیب نہ تھی۔ لیکن اس کا حشر بھی وہی ہوا جو گن پاؤڈر پلاٹ کا ہوا تھا۔ سازشیں اکثر کامیاب نہیں ہوتیں۔ میں نے ستونت سے کہہ رکھا تھا کہ اُپندر آئے گا تو دورانِ گفتگو میں، میں پھیپھڑوں میں جان محسوس کرتے ہوئے ''خوفناک قہقہہ لگاؤں گا'' اور پھر تم بھی ایسے ہی کرنا۔ اس وقت اُپندر ہماری اس سازش سے بُری طرح محظوظ ہوگا۔ خیر۔

زین العابدین پر تم نے جو تنقید بھیجی ہے اس کے لیے بہت شکرگزار ہوں۔ مجھے بہت سی باتوں سے اتفاق ہے اور اختلاف بھی۔ جہاں تم کہتے ہو 'برودت' 'پُرمنفعت' جیسے الفاظ کیوں استعمال کیے گئے ہیں وہاں مجھے کامل اتفاق ہے اور ماحول کی وضاحت کرنے سے بھی۔ لیکن وہ ہیرامنڈی کا ماحول نہیں ہوسکتا۔ کوٹھری پُرانی ہونا ایک اور بات ہے لیکن وہ یقیناً گندی نہیں۔ وہاں متوسط الحال طبقہ کے لوگ رہتے ہیں اور میں نے لاہور میں کئی جگہیں ایسی دیکھی ہیں۔ خیر۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اعتراف کرتا ہوں کہ سب کچھ اتنا صاف نہیں ہے جتنا ہونا چاہیے۔ یہ ''آغاز زمستاں'' وغیرہ وغیرہ الفاظ دور کروں گا۔ درالامان، دارالترجمہ، سے جو لطف پیدا ہوتا ہے وہ انفارمیشن بیورو مضحکہ خیز ہے۔ اگر تمھیں اس میں مصنف کی Stream of consciousness سے اتفاق ہو تو تم مان جاؤ گے کہ دارالامان یعنی امان کی جگہ، ایک ایسی جا ہے جہاں غریب کو سزا دی جاتی ہے اور دارالترجمہ محض ایک ترجمہ گاہ ہی ہے جہاں انسانی دل کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ان باتوں سے طنز پیدا ہوتی ہے۔ وہ ''ہادی اسلام'' اور "واللہ خیر الرازقین" سب اسی قسم کی باتیں ہیں۔ ان سب کے مقابلہ میں غریب الدیار ہے کوئی دار یا دیار نہیں یہ لفظی تقابل ہے۔ یادداشت پر فراموشی کا عملِ تبخیر ایک Simile ہے جس کا مجھے

بدل نہیں ملتا، ورنہ میں خوشی سے بدل ڈالتا۔ تشبیہ ہے حسین اس لیے اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔

مجھے آخری باب کے غیر ضروری ہونے کا بھی احساس ہے۔ لیکن اگر زین العابدین کو Cubic Art یا کم از کم Square Art کے نقطۂ نگاہ سے پرکھا جائے تو کچھ بھی بُرا نہیں۔ یہ کہانی کی حدود سے تجاوز، زیادہ سے زیادہ زین العابدین کو کہانی سے مطالعہ میں بدل دیتی ہیں۔ تو چلو یہ مطالعہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ آخری باب میں طنز اپنے اوج کو پہنچ جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرے کو سالا کہتا ہے تو وہ شخص اُسے برداشت نہیں کر سکتا اور ہم اتنے شریف دکھائی دیتے ہیں کہ ہم خلد بریں میں رہ رہے ہیں۔ انسان سے فرشتے بن گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی کمزوریوں کے باوجود ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیے۔ ہمارے سماجی نظام کے ماتحت اُسے تربیت نہیں دی گئی کہ اس کی حرکات وسکنات میں نفاست ہو اور آخر کے باب میں بھی ایک شعوری رمق اور تکرار فضا کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہانی کوئی اتنی اچھی نہیں اور آخر باب کو اُڑا دینے پر بھی اچھی نہیں بن سکتی۔ اس دفعہ میں نے ایک کہانی لکھی ہے 'گھر میں بازار میں' البتہ وہ کہانی اچھی ہے اور میری بہترین کہانی ہے۔

اور تم نے نیلا لفافہ اور نیلے کاغذ کیوں لے رکھے ہیں، جن پر تمھاری نگاہ رات کے وقت کام نہیں کرتی۔ اگر رات کے وقت تمھاری نگاہ کام نہیں کرتی تو تم دن کو ہی لکھ لیتے۔ تم نے رات کو کیوں خط لکھا۔ کیا تمھیں کتے نے کاٹا تھا دوست! اسی پہ کہتے ہو کہ میری Aesthetic Sense بہت ہے۔ اسی لیے نیلے لفافے خرید رکھے ہیں جن پر نگاہ بھی کام نہیں کرتی۔ شاید تم عادتاً نیلا رنگ استعمال کرنے لگے ہو۔ تم جانتے ہو کہ جب کسی کے پاس نیلا لفافہ جاتا ہے تو وہ فوراً پہچان لیتا ہے یا لیتی ہے کہ میرے اس کا خط آیا۔ فوراً کھولتی یا کھولتا ہے۔ لیکن تم یہ سب نیلے کاغذ اور لفافے اس کے لیے رکھو، جس کے ساتھ تمھارا عجیب سا 'رومان انگیز' شادی وادی کا سلسلہ دراز ہو۔ میرے لیے تو تم گھر کے جوگی ہو اور ؎ من انداز قدت را می شناسم

میرے لیے سفید رنگ رکھو اور دن کو لکھا کرو۔ سمجھے! میرے لیے رات وقف کرنی اچھی نہیں۔

جس طرح میرے افسانوں میں 'غریب الدیار' 'عمل تبخیر' 'ایرانی نژاد' تمھیں اکھرتے

ہیں، اسی طرح تمھارے خط میں، استعفیٰ، شادی، چھٹی، پریت لڑی، سب مجھے اکھر تے ہیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ تمھیں گالیاں لکھ بھیجوں۔ بہت پیاری پیاری۔ موٹی موٹی اور بھدّی گالیاں۔ تم آرہے ہو یا نہیں۔ زمین پر گھومتے ہو یا ابھی معلق ہو۔ ناول کی موڈسن کر مجھ میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ اپنے آپ میں تو Stamina ہے نہیں لیکن دوسروں کی محنت دیکھ کر اُکساہٹ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کچھ بن نہیں پڑتا۔ وقت بھی نہیں ملتا۔ 'ادبِ لطیف' کے سالنامے کا کام میرے ہی ذمّے ہے۔ اس کے لیے جو چیز مجھے دو وہ کم از کم 'ادبی دنیا' کے مضمون سے اچھی ہو۔ اس بارے میں بھی میں کم ظرف واقع ہوا ہوں۔ کیا کروں انسان ہوں میں بھی!

دیکھو اس وقت میں تمھیں دن کو خط لکھ رہا ہوں۔ کاغذ دیکھو کیسا ہے۔ ایسا کاغذ تم چار پشتوں تک مہیا نہیں کر سکتے۔ کیسا ہلکا ہلکا رنگ ہے گلابی گلابی۔ میرے خط کا کوئی بھی منتظر نہیں ہوتا۔ وگرنہ میں اس گلابی پن کی جدت طرازی شروع کر دوں۔ کوئی انتظار کیا کرے۔ آہ — انتظار!

تمھارا

راجندر سنگھ بیدی

راجندر نواس، رشی نگر

لاہور

مورخہ 23/ جولائی 40ء

اُپندر بھائی!

جو کچھ میں نے تمھیں گزشتہ خط میں لکھا تھا تم نے اُسے بالکل سنجیدہ سمجھا۔ تم جانتے نہیں کہ میں تم سے دل لگی کرتا ہوں۔ تمھیں خط لکھنا میرے لیے ایک پُر نجات اِسکیپ ہوتی ہے کہ میں ادبی تحریر کے تمام اسلوب سے فارغ ہو کر، تمھیں سب کچھ سفلی و علوی لکھ ڈالوں۔ آخر ہم سارا دن عقل کی باتیں ہی تو کرتے ہیں۔ اسی کے قیود و بند میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

......وگرنہ تم جانتے ہو میری گھریلو زندگی ناگفتہ بہ مصائب بھری پڑی ہے، جس کا اظہار کرنے لگوں تو شاید تم بے مزہ ہو کر میرے خط کا گریبان چاک کردو۔

اور یہ اُن پانچ روپیوں پر ہی موقوف نہیں۔ کیا تمھارے اور میرے درمیان اور بہت سی بیویوں کی باتیں نہیں! مثلاً تمھاری شادی کا عنقریب '8' وقوع پذیر ہونا۔ اب تم نے مزید تفتیش کی ہے۔ اور وہ ہے — شاید میں پریت نگر جلد ہی چھوڑ دوں۔ ستونت کو تو بس تمھاری شادی سے ہی دلچسپی ہے۔ لیکن وہ بھی اِسے حور و جنات کا قصہ سمجھتی ہے۔ اور جب کبھی تم اس کے سامنے شادی کا تذکرہ کرتے ہو تو میں نہایت غور سے اس کے چہرے پر Expression دیکھا کرتا ہوں، اور وہ ویسی ہی ہے جیسے کوئی آدمی 'فسانۂ عجائب' یا 'چہار درویش' سن رہا ہو۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ان باتوں میں کچھ تو فوراً حقیقت آشنا ہو جانی چاہییں۔ مثلاً میرے روپیوں کا پرستانی قصہ اور کچھ حور و جنات کی دنیا کی طرح ہی 'رومانی' اور بوالعجبی سے بھری ہوئی رہنی چاہییں۔ مثال کے طور پر تمھاری شادی وغیرہ۔

آج کل میرے یہاں پندرہ کے قریب مہمان 'متمکن' ہیں۔ اس بیچاری کے لیے تمھارے پاس کوئی اکسیر ہو تو مجھے بتاؤ۔ وگرنہ مجھے کہیں بارہ سو ستاون صفحے کا میٹریا میڈیکا Materia Medica اور خود تشخیصِ امراض کرنا پڑے گا۔

تم نے سزا بھی مجھے عجیب دی ہے۔ مثلاً پارٹی کروں۔ یہ پارٹی وارٹی ہم نے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا ہے اور پھر جب کبھی اسٹنٹ پیش کرنا مقصود ہوگا تو یہ بھی کرلیا جائے گا۔ دوسری سزا یہ ہے کہ ستونت کے لیے کوئی ایسی چیز خریدوں جو دیرپا ہے۔ کیا خریدوں؟ آج کل اُسے ایرنگ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور میرے خیال میں 'ایرنگ' بڑا مجرب اور خواب آور نسخہ ہے۔ تیسری سزا ملتوی ہو سکتی ہے۔ نریندر کے لیے گرم کوٹ کی ضرورت چار ماہ بعد محسوس ہوگی۔ اس وقت شاید میرے پاس پیسے ہو جائیں۔ اور Last but not least، اپنے لیے ایک بلیک برڈ پین خریدلوں تاکہ میری تحریر میں روانی آجائے۔ گویا تمھیں میری تحریر کی روانی میں ابھی تک شک ہے۔ اُف اللہ!

میں چاہتا ہوں کہ میں یہ سب سزائیں پانچ روپئے میں بیک وقت بھگت لوں۔

تم نے کس طنز سے لکھا ہے۔ پانچ روپئے تمھاری خدمت نیک اقدس میں پیش کردوں گا اور پھر یہ بھائی راجندر، کے ساتھ اختتام پر' خاکسار اُپندر' یہ کچھ گول گول معاملہ ہے۔ جیسے کہ ہم ناک کی سیدھ میں سفر کرتے ہوئے پھر اُسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

میں ڈرتا ہوں کہ پاسبانِ عقل سے زیادہ دور ہوتا جارہا ہوں۔ اس لیے باقی سب خیریت ہے۔ بچّوں کو پیار۔

تمھارا بیدی

ادبِ لطیف کی 'تصویر' کراس روڈ، ڈراموں کے متعلق مضمون، نذیر کے ساتھ بات چیت یہ سب کچھ میں ذمہّ داری سے کر رہا ہوں اور کروں گا۔

راجندر

لاہور کینٹ

5/جولائی 41ء

برادرم اُپندر!

اتنی طویل اور بے معنی خاموشی کے بعد تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ تمھارے خط کے جواب میں نہیں بلکہ اپنی طرف سے۔ تم نے تو دہلی جا کر خط لکھنے کی رسم پوری کردی۔ دو لفظ لکھے اور سبکدوش ہوگئے اور پھر مجھ سے توقع کرتے ہو کہ میں ہیومر (مزاح) لکھوں اور وہ بھی طویل۔

خیر، تمھارا اور میرا رشتہ خط و کتابت کا شرمندہ نہیں۔ مجھے ایک فارسی کا شعر یاد آتا ہے جو کہ میں نے کالج کے ایام میں پڑھا تھا۔ اُسے قصداً کوٹ نہیں کروں گا کیونکہ تم فارسی سے نابلد ہو۔ فیضی کے مصرع پر اکتفا کرتا ہوں۔

؎ درمیانِ رازِ مشتاقاں قلم نامحرم است۔ یعنی مشتاقوں کے درمیان قلم نامحرم ہو جاتی ہے۔ لیکن فیضی نے بالکل بیہودہ بکا ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم خواہ مجھے سَو برس خط کا جواب نہ دو، مجھے مطمئن رہنا چاہیے۔ کیونکہ درمیانِ رازِ مشتاقاں......

اور فی الخصوص میری بیوی خط کا جواب نہ دے تو میں فوراً تیغ پا ہو جاتا ہوں۔ اس سے کہیں

یہ اخذ نہ کر لینا کہ میری بیوی اور تم میں کہیں بلحاظ شکل یا عقل کوئی مناسبت ہے۔

سُنا ہے تمھارے قلم کی جولانیاں تیز ہو رہی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ لیکن قلم کے اس گھوڑے کو اتنا سرپٹ دوڑانا کیا معنی رکھتا ہے کہ بیچارہ منزل سے کوسوں ورے ہانپتا ہوا گرے اور دم دے دے۔ میں تو بقول تمھارے اِن دنوں پس رہا ہوں اور خدا جانے کیوں مجھے بھی دن بدن احساس ہو رہا ہے کہ فنِ افسانہ تو بس ایک Excreta ہے......! اور جس دن سے مجھ پر یہ ''جینندرانہ'' کیفیت طاری ہوئی ہے، میری چیزیں بھی تمھاری جینندر کمار کی چیزوں کی طرح بس Excreta ہو کر رہ گئی ہیں۔

میں نے 'آلو' لکھا ہے۔ یار لوگوں کا خیال ہے اب 'گوبھی' لکھوں گا۔ لیکن مجھے 'کھیکوار' اور 'زمیں قند' بہت پسند ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا لکھوں؟

بطور افسانہ نگار کے میں مر چکا ہوں۔ اب تو بس رسم پوری کر رہا ہوں۔ یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی میرا راز ہے جس کا اخفا تمھارے سامنے مصلحت نہیں۔ یار لوگوں نے تو میرے چند ایک...... جو کہ میں نے کسی زمانے میں لکھے تھے اور جنھیں میں اچھا کہا کرتا تھا، اس کے متعلق یہی کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ چرائے ہوئے ہیں، یا فلاں بن فلاں بن فلاں سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ ان ہم پیشہ لوگوں کی جب یہ کیفیتیں ملاحظہ کرتا ہوں تو مجھے چیخوف کا ماسکو ہیملٹ یاد آتا ہے جس میں اُس نے اس طبقۂ علوی کے سفلہ پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اُسے پڑھ کر یہی خیال آتا ہے کہ مصنف اور اُس کی زندگی پر تین حرف۔ اُن مصنفوں پر تین حرف، جن میں تم بھی شامل ہو۔ اب تمھاری خانہ بربادی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر چہ یہ تمھاری دکھتی ہوئی رگ ہے، لیکن میں اسے چھیڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا تم نے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے یا اسے اس قدر بکھیر دیا ہے کہ تمھارے سمیٹے سمیٹا نہیں جائے گا۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور دیگر ''بزرگانِ دین'' کو میرا نمر تا سہت سلام کہنا اور پھر کہنا تم پر تین حرف۔ ستونت کو نمستے۔

تمھارا ــــــ راجندر سنگھ بیدی

راجندر نواس، رشی نگر

لاہور

27/اپریل 42ء

ڈیر اُپندر

سو تم نے میرے مختصر سے قیام میں، میری تمام خوبیاں ملاحظہ کرلیں۔ ہنگامِ رخصت تمھارے منھ سے اپنے متعلق تمام طلسم ٹوٹ جانے کی بات سن کر یک گونہ فرحت حاصل ہوئی اور صد گونہ اضطراب۔ فرحت اس لیے کہ آخر بلّی تھیلے سے باہر ہوگئی اور اضطراب اس لیے کہ کاش یہ طلسم ہوش ربا شرمندہ شکست نہ ہوتا۔

تم میاں بیوی نے جو کچھ میرے متعلق سمجھا ہے، میں اس کی تردید کی کوشش نہیں کروں گا، کیونکہ ایسا فعل عذرِ گناہ کے مترادف ہوگا۔ البتہ یہ کہنے کی گنجائش تو ہوگی کہ ۔

قابلِ دید ہے کچھ اور بھی کردار میرا

ویسے یہ بات نہیں کہ میں سرتاپا ایک عجائب خانہ ہوں۔

میں ایک نارمل آدمی ہوں، جس سے تمھیں چڑ ہے۔ میں نے ستونت اور دوسرے عزیزوں کے سامنے نارمل ہونے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہنومان کی Postures بھی اختیار کی ہیں۔ بازار جاتے ہوئے چٹکیاں بھر لی ہیں، لیکن یہاں تو کچھ گربہ کشتن روزِ اوّل کا ہی سلسلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تم سے ہنس کی چال چلتے ہوئے غریب کوے نے اپنا چلن بھی بگاڑ لیا۔

نذیر سے دے منھ (بوزن دبے پانو) میں نے تمھارے پیسوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اسی دن غریب کا چالان ہوگیا۔ اب دوبارہ موقع مناسب کی تلاش میں ہوں۔ ویسے جانتا ہوں کہ تمھارا خط اسے مل گیا تھا جس میں تحریر ہے کہ 'چٹان' لے ہی گئے تھے تو شور نہ مچایا ہوتا۔ حالاں کہ اس بیچارے نذیر نے ظہیر سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ تم ہو کہ خواہ مخواہ بھونک رہے ہو۔ خوب ہے یار، تم بھی بڑے اسٹنٹ۔

اور وہ کوشلیا؟ —— کوشلی یا جی — کب لاہور آرہی ہیں۔

یہاں ستونت بلحاظِ جثہ دُگنی ہوگئی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے سانپ نے کوئی برساتی

میڈک کھالیا ہو۔ میں نے اپنی تمام پونجی اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر صرف کرڈالی ہے۔ اب باقی ہے میرے پاس نام اللہ کا۔ اب ہم سے بڑے بڑے آدمیوں کو تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ بادبر گرفتاری ما۔

کوشلیا، ماتاجی، نریند کو نمستے

اُمیش کو پیار

جناب راشد اقبال صاحب کو آداب عرض۔

تمھارا

راجندر سنگھ بیدی

وقار عظیم سے منجانب راجندر سنگھ بیدی معذرت کردینا۔ تیتر کرشن سے پوچھنا کہ میرا ڈراما 'ٹالر قید خانے میں' رکھ لیا ہے یا نہیں۔ رسید سے مطلع کرنا۔

ر س ب

رشی نگر

لاہور

2/مارچ 43ء

ڈیر اُپندر

والد صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی۔ دلی قلق ہوا۔ شاید تمھارے والد صاحب سے براہِ راست کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن مجھے تمھارے 'ماں' کے لافانی کردار سے سخت Emotional قسم کی محبت تھی، جس کا اظہار شاید خلوصِ محض سے کچھ زیادہ دکھائی دے۔ لیکن یار کس قدر محبت زا انسان تھا وہ، جو شاما میرے اوگن چت نہ دھرو' گنگنا کر زندگی کے متعلق ہر ذمے داری سے آزاد ہو جایا کرتا تھا۔ اس نے زندگی کا ایک فلسفہ تعمیر کیا جو غلط سلط تھا، لیکن وہ حرف بہ حرف اس کے مطابق جیا اور یہ اس آہنی عزم کے سامنے ہے کہ ہماری گردن جھکی جاتی ہے...... میں خواہ مخواہ ہی اپنے آپ سے ایسے انسان کا موازنہ کرنے لگتا ہوں، تو محسوس کرتا ہوں کہ اپنی خامیوں کے اوج

تک استقرار رہنا کس قدر بڑی خوبی ہے اور ہم لوگ برخود غلط ہیں، جو اوّل تو زندگی کے متعلق کوئی طرزِ عمل ہی نہیں رکھتے (خصوصاً میں) اور جو رکھتے ہیں تو اسے تکمیل تک دیکھنے میں کتنا نیم دل سے کام لیتے ہیں......

شاید میں تمہارے دُکھے دل کو کوئی تسلّی نہیں دے رہا، لیکن مجھے تسلّی دینی بھی نہیں آتی۔ اگر میرا خط پڑھ کر تم اور بھی پھوٹ پڑے ہو، تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے چند آنسو تمہاری آنکھوں میں منتقل کر رہا ہوں—— کوشلیا سے میرا اور ستونت کا اظہار افسوس کر لینا۔

تمہارا

راجندر سنگھ بیدی

راجندر نواس، رشی نگر

لاہور

5-3-43

ڈیر اُپندر

کوشلیا کے اور تمہارے خطوط ملے۔ ان دنوں ستونت حسبِ عادت میکے گئی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح لاہور میں برف باری ہو رہی تھی۔ ہاتھ پانو شل ہو رہے تھے۔ میں نے کہا اسے لیتا آؤں، ذرا گرمی ہو جائے اور پھر اکیلے میں میرے پاس آنا شاید کوشلیا کو معیوب دکھائی دے۔ لیکن وہ نہ آئی۔

اس کے ایک دو روز بعد میں بیڈن روڈ گیا اور پتا چلا کہ شریمتی جی کے آنے کی توقع ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں کب آئیں۔ پھر میں نے جسونت سے بھی پوچھا۔ اب تمہاری عدالت میں Not Guilty پلیڈ کرتا ہوں اور زرد رو ہوتے ہوئے بھی سرخ رو ہوتا ہوں۔

جسونت بیمار ہے۔ ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا۔ مرتے مرتے بچا بیچارہ۔ یہ سب ستاروں کے کھیل ہیں۔ وگرنہ وہ بیمار ہی نہ ہوتا اور یا دوسری صورت میں راضی ہی نہ ہوتا۔

کرشن نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ آخر یہ بے اعتنائی کیوں، اگر کوئی مجھ سے قصور ہوا ہے تو اس کے لیے پُر خلوص، غیر مشروط معافی چاہتا ہوں۔ میرا کرشن کے بغیر گزارہ نہیں۔ اس سے کہہ دو کہ مجھ میں شخصی رومانیت کا جذبہ تموج میں ہے، اور پھر میں نے اس کا 'مہا انے خدا' پسند بھی کیا ہے اور کہانی کے آخر میں جہاں کرشن رادھا کے گھر جاتا ہے اور اس کے کواڑ بند پاتا ہے، وہاں پہنچ کر میرے آنسو بھی نکل آئے تھے اور پھر میں بہت دیر تک روتا بھی رہا تھا۔ اور...

بہت کرتے ہو تو اپنی شادی کا ذکر کر دیتے ہو۔ کیا داستان ہے۔ کوشلیا کے ساتھ تمھاری بن آئی۔ اس میں المیہ کا یہ پہلو کافی تشفی دہ ہے۔ کوشلیا اور گورکی کی 'خزاں کی ایک شام' کی نطاشا بیک وقت میرے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بے مہر، اداس خزاں کی ایک شام۔ تس پر اولوں کی بوچھار۔ جسم یخ کے ساتھ یخ۔ نطاشا آئی اور اس نے ایک اوندھی کشتی (علامت) کے نیچے اپنے جسم کی حرارت دے کر دنیا کے سب سے بڑے پرلتاری ادیب کو بچا لیا اور تمھیں بچانے کے خلوص میں ہماری یہ مختصری نطاشا بھی گناہ کی حدود سے گزر گئی اور اس نے ایک دوسری عورت کی زندگی کو وفورِ جذبۂ مدد سے تباہ کر کے رکھ دیا اور ابھی تک گناہ کی دانستگی کو مکمل طور پر نہیں پہنچ سکی اور 'خزاں کی ایک شام' کی اختتامیہ، پُر مطلب سطور کہتی ہے ——

"اے کاش! اس کی روح پر اس بات کا کشف نہ ہو کہ اس نے گناہ کیا ہے، کہ یہ احساس سراسر بے حاصل اور غیر ضروری ہے۔ ..."

نطاشا گورکی سے بڑی عورت تھی۔ قد میں نہیں مرتبے میں اور کوشلیا تم سے بڑی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اسے یہ خط دکھا کر ہمیشہ کے لیے، اسے میرا دشمن بنا دو۔ مجھے پسند نہیں۔ آخر تم نے میرے ڈرامے منگوانے کے لیے کرشن سے کیوں سفارش کی اور مجھے ذلیل کیا اور اب راشد کے سامنے سرنگوں کرنا چاہتے ہو۔ میں تمھاری دوستی کو دیکھ سکتا ہوں۔ سر پرستی کو نہیں۔

اور ہاں میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ لوگ استعفیٰ دیتے ہیں لیکن وہ منظور نہیں ہوتے۔ لیکن میرا استعفیٰ منظور ہو گیا ہے۔ شاید محکمہ کو میری اسی نسبت سے ضرورت نہیں، جس نسبت سے مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ اقدام محض جذباتی ہو کر نہیں کیے۔ بلکہ اس لیے کہ اب میرا دم بالکل گھٹ گیا تھا۔ میں نے سرے سے گزارے کی سبیل پر غور نہیں کیا۔ کاش میری روح پر

اس بات کا کشف نہ ہو کہ...... بھوکا مروں گا؟ اور کیا ہوگا۔ بچھو نے برڈ ملندر کو جواب دیا۔ گرمیوں میں میری کون سی خاطر ہوتی ہے، جو جاڑوں میں بھی باہر آؤں۔ میں نے زندگی میں Mediocre کو جھٹلایا نہیں۔ اس سے بغاوت کی ہے اور اپنا رشتہ یک لخت بہترین یا یک لخت بدترین سے جوڑ دیا ہے اور ایک ابدی بے اطمینانی خرید لی ہے۔ تم میرے بہی خواہ ہو۔ لیکن میں تمھاری نفریں نہیں چاہتا۔ بلکہ ایک نفرت انگیز آفریں چاہتا ہوں۔ آج پراپیگنڈے کا دن ہے۔ میں کہلوا کر تم سے آفریں لکھوا سکتا ہوں۔

تمھیں زیادہ لکھنا چاہتا تھا، لیکن کیا یہ پہلے ہی زیادہ نہیں۔

تمھارا

راجندر سنگھ بیدی

سنا ہے تم میری بھینس کا تذکرہ کرتے ہو۔ خود ہنستے ہو اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہو، لیکن خود کوشلیا کو سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھا کر چاندنی چوک اور چاوڑی میں گھومتے ہو۔ اب بتاؤ تمھارا فعل زیادہ مضحکہ خیز ہے یا میرا، اور یہ خط کرشن کو نہیں دکھانا۔ بیخ پا ہوگا۔ وگرنہ میں تمھارا خط کرشن کو بذریعہ ڈاک بھیج دوں گا۔

ستونت کی طرف سے اور میری طرف سے درجہ بدرجہ تسلیمات۔

سنگم پبلشرز لمیٹڈ

12۔ اے نشاط روڈ۔ لاہور

مورخہ 31/مئی 1946ء

برادرم اشک!

تمھارے ہر دو خط ملے۔ میں بمبئی آنے کو تیار ہوں اور غالباً جون کے پہلے یا دوسرے ہفتہ میں روانہ ہو جاؤں گا۔ کرشن کی ہدایت کہ 'بیدی کو تار دے دو' اس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر وہ میری کہانی بکوا دے تو میرا سفر آسودہ حال ہو سکتا ہے، نہیں تو میں جون کے دوسرے یا تیسرے ہفتے سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے سفر سے پہلے، میں چاہتا ہوں کہ تین چار اچھی

کتابیں چھپ جائیں اور فہرست تیار ہو جائے۔ مثلاً سماج کا ارتقاء، گائے جا ہندوستان، سات کھیل، Homage to Tagore اور Meet my People، انھیں دنوں تیار ہو رہی ہیں اور میرے عزم سفر سے پہلے بکنے لگیں گی۔

آج سلطان صاحب کو میں نے اپنی ہر کتاب کی پچیس پچیس کا پیاں تمھارے ایما پر بھیج دی ہیں اور ان کی چٹھی کا انتظار نہیں کیا۔ یہ پہلی پانچ کتابیں ایسی ہیں جنھیں ادبی طور 'ہلکی پھلکی' کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ مذکورہ بالا کتابیں 'گراں' صورت میں ہمارے کتابی معیار کو متوازن کر دیں گی اور انھیں بھی بھیج دیا جائے گا۔ ادھر ہمارا کام بہت اچھا ہو رہا ہے اور انشاء اللہ اس سے بہتر ہو گا۔

تمھارے ناول کا نام LAND SLIDE مجھے بہت پسند آیا۔ کاش اس کا اتنا ہی اچھا ترجمہ اردو میں ممکن ہو سکے۔ کسی صاحب نے 'سنگِ راہ' بتایا تھا جو مجھے پسند نہیں۔ 'کٹھ پتلیاں' نام بھی اچھا نہیں۔ فیض صاحب کے مضمون کا فیصلہ کر دو تو ہمارے حق میں بہت اچھی بات ہو گی۔

کوشل کا ایک خط آیا تھا۔ آج ہی جواب دے رہا ہوں۔ لکھا تھا ''گڈو بیمار ہے، امید ہے اس وقت ٹھیک ہو گیا ہو گا۔

مولانا صاحب کے یہاں میں کبھی نہیں گیا۔ لیکن تمھارے ڈرامے کی خاطر ان سے ملنے چلا جاؤں گا۔ احسان نہیں جتا رہا ہوں۔ مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں۔

کرشن والی بات مجھے وضاحت سے لکھو۔ شاید میں پہلے چلا آؤں۔ ایک تو اس لیے بھی کہ ہم نذیر کو Forestall کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مسودوں کی ہمیشہ اور ہر وقت ضرورت ہے لیکن Sale کا کام اس وقت ہمارے نزدیک زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ بہر حال ہمارا ادارہ سلطان پریس سے تعلقات بنانے کے عوض تمھارا شکر گزار ہے۔ اختر اور سریندر سلام کہتے ہیں۔ نریندر کو نمستے کہنا اور ہاں نریندر سے متعلق بات کا کیا بنا! کرشن سے کہو میرے خط کا جواب لکھے۔ تمھارا نام میں نے اپنے ایڈیٹوریل میں رکھ دیا ہے۔ کرشن سے بھی پوچھ کر ایک Panel بناؤں گا۔

تمھارا

بیدی

2/اپریل 1947

برادرم اشک

ان دنوں یہاں بہت ہنگامہ ہوا۔ لوگ ابھی تک ہراساں ہیں اور انھیں نہیں معلوم کہ اندریں حالات کیا کرنا چاہیے۔

تمھاری طرف سے آخری اطلاع یہ ملی تھی کہ تم اسپتال میں پڑے ہو۔ اب کیا کیفیت ہے۔ بیماری کا ۔ رہوئی یا نہیں؟ لاہور آنے میں فی الحال تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کل کی خبر خدا جانے۔

چودھری برکت علی سے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ تم نے ان کے ساتھ گرتی دیواریں کے سلسلے میں جو باتیں کی ہیں، فی الخصوص جس کا ہماری آپس کی خط و کتابت سے تعلق تھا، نامناسب تھیں۔ لیکن شاید تمھاری بندہ نوازی اسی میں ہے۔

سنتا ہوں کمیٹی میں بھی فساد شروع ہیں۔ تو بھئی اب کیا ہوگا۔ جنگ کے دنوں میں Fine Arts پہلی Casuality ہوتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے علاوہ باقی کاروبار بھی بند ہیں۔ لیڈر لوگ تو کہتے ہیں کہ "ہوگا کیا رشوگلا ہوگا"!...... یہ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ ہیں، جو انھوں نے ایک نہایت مایوس صحافی کو کہے تھے۔

واقعی جب آزادی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہم لوگ مہذب ہیں، اس لیے ہم پر زچگی مشکل گزرتی ہے، جو جانور قدرت کے نزدیک ہیں، انھیں کب نرسوں کی، آپریشن کی Louis Mountbatten کی ضرورت پڑتی ہے؟

واپسی ڈاک اپنی صحت کی بابت لکھو۔ کوشلیا کو نمستے

عزیزوں کو پیار

تمھارا

بیدی

FAMOUS PICTURES LTD.

BOMBAY

18 / مئی 1950

کوشلیا بہن! نمستے

ستونت کے نام چٹھی لکھ کر آپ نے غالباً میرا وقت حرج کرنا نہیں چاہا اور بُرا سمجھ کر آپ نے ایک دم مجھے اپنے حلقۂ احباب سے باہر نکال دیا ہے۔ پر اس بات کا کیا علاج کہ ستونت ان دنوں اسقاط کے سلسلے میں بیمار ہوئی ہے اور آپ کے خط کا جواب مجھے ہی 'دینا پڑ رہا ہے' خیر۔ وہ لکھتی بھی تو کیا لکھتی۔ وہ گورمکھی کے علاوہ اور کوئی لپی نہیں جانتی اور آپ گورمکھی نہیں پڑھیں۔

مجھے واقعی افسوس ہے کہ بیماری کے دوران میں، میں نے اشک کو خط نہیں لکھا اور آپ کے اس خط نے میرا احساسِ جرم اور تیکھا کر دیا ہے۔ لیکن اس میں تنہا میرا قصور نہیں ہے۔ اوّل تو یہ سارا سلسلہ اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب ہم آپ کے مکان واقع تیس ہزاری میں اُٹھ آئے تھے۔ اس کے بعد 'سنگم' کا قصہ آتا ہے جس میں چند ایسی باتیں ہوئیں جن کی مجھے اشک سے توقع نہیں تھی۔ لوگ اکثر اشک کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے، لیکن میرا 'اشک' ان کے اشک سے جب تک بالکل الگ تھا۔ خیر وہ بھی ایک ایسا نکتہ ہے جس پر اشک صاحب دفتر لکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بات ہو جائے تو پھر جواب اور جواب الجواب ہی رہ جاتا ہے، اور وہ آپ، وہ نازک سی چیز جس کی آپ اتنی پروا کرتے ہیں، نہیں رہ جاتی اور انسان گفتار و کردار کے سارے اسلوب کھو بیٹھتا ہے۔

لیکن — میں اس بحث سے پہلو بچاتے ہوئے بھی ایک بات ضروری عرض کر دوں اور وہ یہ کہ میں تنہا اس بات کا صفر برابر بھی ذمہ دار نہیں اشک صاحب بھی ہیں۔ کیونکہ آپ اور اشک صاحب حوادث کو اپنی ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس کا میں بھی شکار ہوں۔ 'سنگم' کے دنوں میں پنجاب میں مارا ماری شروع ہو چکی تھی جس میں میرے تاؤ قتل ہو چکے تھے۔ لاہور میں لوگوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ہر دم موت سامنے رہتی تھی۔ تپ دق اور اس میں اتنا ہی فرق تھا کہ تپ دق میں انسان کے لیے کچھ مہلت ہوتی ہے۔ ہمیں وہ مہلت نظر نہیں آتی

تھی۔ ایسی ہی عجیب حالت میں ہمیں لاہور چھوڑنا پڑا اور ہم شملہ چلے گئے اور سات آٹھ مہینے وہاں بیکار بیٹھے رہے۔ جانے کتنے دنوں فاقوں میں گزارے۔ سنگم میں کئی ایسی مشکلات تھیں جن کا میں مصلحتاً ذکر نہیں کروں گا۔ ان کے باعث میں ایک سال تک بغیر تنخواہ کے کام کر رہا تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ 'سنگم' کے لٹ جانے کی خبر آئی۔ ماڈل ٹاؤن میں اپنا مکان اور اس میں پڑی سب چیزوں کا صفایا ہو گیا۔ جب روزگار کی تلاش میں ہم لوگ گھر سے نکلے تو، طوفانِ کیفیات نے ہمارا پیچھا کیا۔ بستر اور چادریں تک بھیگ چکی تھیں۔ ڈیڑھ لاکھ پناہ گزیں انبالے کے اسٹیشن پر پڑے تھے اور ہم وہاں سے گاڑی میں دہلی پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ اڑتالیس گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ آخر دو بجے ایک ڈبے میں، دو کسی اور میں، اور میں چھت پر بیٹھ کر دہلی پہنچا۔ اس کے بعد وہی بگولا مجھے سرینگر لے گیا، جہاں بظاہر میں ایک اسٹیشن ڈائرکٹر بن گیا۔ مگر ایک دن بھی ایسا نہیں گیا جب اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر، میری کشمیر کی حکومت سے ٹکر نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے مجھے مختلف طریقوں سے عذاب دینے کی کوشش کی۔ ایک مرحلے پہ بچے اور بیوی سرینگر رہ گئے اور میں جموں پہنچ گیا۔ وہ تین مہینے وہیں پڑے رہے۔ رسل و رسائل سب کٹ چکے تھے اور دوبارہ ملنے کی سب امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ یہ لوگ بند پہ رہتے تھے جو کہ جہلم کے سیلاب کی نذر ہو گیا تھا۔ اُس پر ڈپٹی پرائم منسٹر سے جھگڑا ہو جانے کے باعث میں قید ہوتے ہوتے بچا۔ مشکل سے گلوخلاصی ہوئی۔ جب تک میں نے مادھو پور کا پل نہیں پھاندا، اپنے آپ کو حراست ہی میں سمجھا۔ دہلی گئے۔ وہاں کوئی صورت روزگار کی نظر نہیں آئی۔ رہنے کے لیے مکان نہ تھا۔ عازمِ بمبئی ہوتے یہاں پہنچ کر جو کچھ ہوا وہ اتنی لمبی فہرست ہے کہ میں گنوانے سے ہچکچاتا ہوں۔ اب مشکل سے تسکین کا سانس لیا ہے۔ کام اچھا ہے۔ اکتوبر تک میرا کانٹریکٹ ہے۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوگا۔ گزارا اچھا ہوتا ہے اگرچہ کوئی خاص مطلب نہیں ہے۔ اُوپر میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سب چیزوں کے لکھنے سے میرا ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ میں کسی کے خط نہ لکھنے کا شاکی نہیں ہوں۔

میں آپ کو نہیں بھولا۔ میں اشک کو نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ اشک میری زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ وہ میرا 'ماضی' ہے جس پر مجھے ناز ہے۔ میں ان دنوں سیاست اور زندگی کو الگ نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ کیا اشک میرے لیے صرف 'ماضی' ہو کر ہی نہ رہ جائے گا۔ کیونکہ

ان کا 'حال' میرے 'حال' سے نہ صرف الگ ہے بلکہ ہمیں ایک دوسرے سے دُور جا پھینکتا ہے۔ ان کی چند تحریکات کی اطلاع مجھے پہنچتی رہی ہے جو میرے لیے مایوس کن ہے لیکن عقائد کے اختلافات اور وہ اختلافات جو کہ مجھے اشک سے پیدا ہوئے ایک قطعی بیگانگی پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھوں گا جب کبھی آپ اور اشک بمبئی آئیں گے اور میرے یہاں ٹھیریں گے۔ میں آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں۔ یہاں ذرا تفصیل سے باتیں ہوں گی اور میں وضاحت کے ساتھ گلے شکوے کر سکوں گا اور سُن سکوں گا۔ مجھے دو سال کی متواتر کوشش کے بعد ماٹنگا میں ایک سال کے لیے ایک مکان مل گیا ہے جہاں آپ بڑے آرام سے رہ کر سیر وغیرہ کو بہ آرام جاسکتے ہیں۔

شومیِ قسمت، جگموہن سنہا ایسے وقت میں پہنچے جب کہ میں آٹھ دس روز کے لیے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی پر اپنی جان پہچان کے سب لوگوں سے انھیں ملا دوں گا۔ فینس پکچر والے پروڈکشن کا پروگرام غالباً ایک غیر معین عرصہ کے لیے ملتوی کر رہے ہیں۔

یہاں ایک پکچر 'مرلی والا' بنانے کا ارادہ ہے کوشش کروں گا اس میں انھیں کوئی رول مل جائے گو یا اندازہ کیجیے۔ یہ آپ کے خط کا جواب میری بیوی دے رہی ہے اور میں یہ سب باتیں اشک کو نہیں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ستونت کو اور آپ کو الجبرے کے Common Factor کی طرح درمیان سے اُڑ جانا چاہیے۔ گو یا یہ خط اب میرے اور اشک کے درمیان ہے ——!

خط کے اسی انداز کے انوکھے پن سے مجھے ایک اور بات یاد آئی ہے۔ امریکن بڑے ستم ایجاد ہیں۔ وہ عجیب عجیب سے Phrase گڑھا کرتے ہیں مثلاً پچھلے دنوں میں نے ایک تصویر دیکھی جس میں ایک لڑکی بظاہر کتاب لیے بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے لیکن وہ پڑھ نہیں رہی۔ اس کی تمام تر توجہ کسی نوجوان کی طرف ہے جو اس تصویر میں نظر نہیں آتا تصویر کے نیچے وہ لکھتی ہے: The girl is doing nothing with some one. اور میری بھی کیفیت یہی ہے۔

ایک اور چیز...... میں نے اتنے لمبے خط سے کچھ تو تلافی آداب ہے نا۔ لیکن غالباً یہ اشک صاحب پر ہے جو خط لکھنے کے Ethics کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ چاہنے والوں کے درمیان خط ایک ضروری سلسلہ نہیں۔ اس وقت مجھے فیضی کا وہ شعر یاد آتا ہے۔

ما اگر مکتوب نہ نوشتیم عیب ما مکن
(میں نے اگر خط نہیں لکھا تو میرے عیب مت ڈھونڈ)
درمیانِ راز مشتاقاں قلم نامحرم است
(مشتاقوں کے راز کے درمیان قلم نامحرم ہو جاتا ہے)
ستونت کی طرف سے پیار اور محبت۔ آپ کو اشک کو اور نیلا بھ کو۔

آپ کا بھائی
راجندر سنگھ بیدی

18 رمئی 1950ء کے بعد کا خط ہے۔ تاریخ نہیں لکھی ہے۔

برادرم اشک!

تم نہیں جانتے، لاجونتی کے بارے میں تمھارے خط نے مجھے کتنی تسلی دی ہے۔ جہاں تک کہانی لکھنے کے فن کا تعلق ہے، میں نے اوائل میں تمھاری تنقیدوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں، ہمارے بہت سے ترقی پسند ساتھی مل کر بھی اس ضمن میں مجھے بہت کچھ نہیں سِکھا سکتے تھے۔ اپنی اس کہانی پہ مکمل اعتماد تھا، اور نہ جانے کیوں لکھنے کے فوراً بعد مجھے تمھارا ہی خیال آیا۔ اشک ہوتا تو میں اُسے سناتا اور اس سے داد وصول کرتا۔ بہر کیف وہ داد مجھے مل گئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔

یہاں بھی ہمارے ساتھیوں نے اس کہانی کی طرف اتنی توجہ نہیں دی، جتنی توجہ کی وہ مستحق تھی۔ لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی، کیونکہ مجھے اس میں پورا یقین تھا۔ یہ عمل میرے ساتھ عرصہ سے ہوتا آیا ہے اور آخر میں، مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ مجھے اچھے اچھے لکھنے والوں سے ارفع سمجھتے رہے ہیں۔ ہنگامی دَور میں ہنگامی چیزیں تمام تر توجہ کو لے جاتی ہیں۔ لیکن بالآخر بنیادی طور پر اچھی چیز وقت کا امتحان پاس کر لیتی ہے۔ 'وہی ادب عالیہ' بنتی ہے اور باقی چیزوں کو لوگ بھول جاتے ہیں۔ آج بمبئی میں تنہا میں ان چیزوں کو Defend کر رہا ہوں جنھیں سرگرمیِ شوق میں

ہمارے دوست بھول رہے ہیں۔ مثلاً ''نظم کی فارم میں غزل گو'' مجروح سلطان پوری ایسے شعرا کی وساطت سے انقلابی Content آ رہا ہے۔ نظم کی عظمت سے مجھے انکار نہیں ہے لیکن نظم خصوصاً Blank Verse کا خاصہ ہے کہ وہ ہمارے ہونٹوں پر نہیں آ سکتی۔ ہم اُسے گاتے نہیں اور اگر ہم گیت اس لیے لکھتے ہیں کہ وہ گائے نہ جا سکیں تو میں ان گیتوں کو بڑا نہیں سمجھتا۔ میں کسی حد تک وزن کو ضروری سمجھتا ہوں۔ بحر و قافیہ کی قیدیں تو آڑ ہے۔ میرے نزدیک اور پھر اس صورت میں اشعار کو گنگنا سکتا ہوں اور وہ مجھے یاد رہ سکتے ہیں اور بوقت ضرورت میں ان کا حوالہ دے سکتا ہوں۔

میری اس دلیل کے باعث آج ٹیگور اور دوسرے شعرا کو، جن کے گیتوں کی غنائی کیفیت سے ہمارے انقلابی روگرداں ہو رہے تھے، آج پھر سے اپنا رہے ہیں۔ اگر دنیا کا سب سے بڑا شاعر 'پبلا نرودا' ٹیگور سے متاثر ہو سکتا ہے تو ہمارے ساتھی کیوں نہیں ہو سکتے۔ اپنے ادبا اور شعرا کے بارے میں باہر سے فیصلہ سننے کی نوبت کیوں آتی ہے۔ اس سارے قضیہ کی وجہ بھیڑ چال اور ایک خاص قسم کی خام کاری ہے، جو ادب عالیہ کی تخلیق کے آڑے آتی ہے۔

فسادات کے بارے میں جب بڑے سے بڑا ادیب اپنی کہانیوں میں برابر کی تقسیم کے ساتھ قتل کرتے ہیں تو کتنے Self conscious اور بے ایمان معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اخلاقی جرأت نہیں کہ دہلی یا جموں کے قتل عام میں صرف مسلمانوں کو قتل ہوتا دکھا سکیں اور شیخوپورہ کے قتل عام میں صرف ہندوؤں یا سکھوں کو۔ اکثر اپنے کردار میں توازن کو قائم رکھنے کی غرض سے ہند اور پاکستان کی سرحدوں کو بلا کسی پرمٹ کے عبور کرتے ہیں تاکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کیا جا سکے۔ یہ ان کے نزدیک لازمی ہے۔ مغویہ عورتوں کے سلسلے میں وہ عصمت دری کو نہیں بھولتے۔ حالانکہ کسی عورت کو پکڑ کر اس کے ساتھ مجامعت کر لینا گوبھی کا پھول کھا لینے سے زیادہ نہیں۔ جو چیز صدمہ پہنچاتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسانی تقدیس کا انحراف ہوا۔ بغیر کسی صائب مرضی کے ایک Violation ہوئی۔ اس جسم کی طرف متوجہ ہونا اتنا ضروری نہیں، جتنا روح اور جذبات کے مجروح اور فی الآخر قتل کی طرف دھیان دینا لابد ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے انسان کے خلاف ہوتا ہے جو جذباتی اور عقلی طور پر اس کی طرف مائل نہیں۔ وہ شکار ہے ایک جبر کا۔ ورنہ بیاہ

اور شادی کے بعد جب عورت، مرد کو اپنا اندام نہانی ایک پلیٹ پر رکھ کر دے دیتی ہے، تو لڑکی کے ماں باپ کیوں ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔ عرب ممالک میں لڑکی کا باپ خون آلود چادر مجلس میں پیش کرتا ہے، محض اس لیے نہیں کہ میری لڑکی کنواری تھی اور آج اس کا پردۂ بکارت پھٹا ہے، بلکہ اس لیے کہ اس اتصال پر زوجین اور والدین کی رضامندی ہے۔ ملائکہ اور دیوتا اس پر پھول برساتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے ہمارے ادیب بھائی ایک تلذذ کا شکار ہیں جبھی وہ جسمانی عصمت دری کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھتے۔ جبھی تو۔ جب ان کا بس چلتا ہے تو ایک بھی Extra لڑکی کو نہیں چھوڑتے اور اس کی مجبوریوں سے بے خبر، خودفریبی کے عمل میں، اس لڑکی کی رضامندی کو، اس کی واقعی رضامندی گردان کر، اس کے جسم پر سے اُٹھتے ہیں اور پونچھ پانچھ کر ایک افسانہ لکھ دیتے ہیں۔

یار! ایک مزے کی بات ہے۔ دیوندر ستیارتھی کو جانتے ہو۔ ایک دفعہ وہ رنڈی کے یہاں گیا۔ اس نے دس روپئے نکال کر اس کی مٹھی میں تھمائے اور کہنے لگا ''بہن! میں تم سے بدفعلی کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ پوچھنے آیا ہوں، تم اس نوبت کو پہنچیں کیسے؟'' ظاہر ہے وہ بے حد حیران ہوئی۔ اُس نے اُسے پیسے لوٹا دیے اور کہا—— ''کرنا ہے تو کرو، اِن بے کار باتوں میں کیا فائدہ ہے؟'' اور اس لڑکی نے اپنی ایمان داری اور خوش معاملگی کا دیوندر ستیارتھی پر نہیں، مجھ پر سکہ جما دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے اس دریا میں آدمی شناوری کرتا ہے تو اُسے بھیگنا ہی چاہیے۔ وہ جسم پر موم اور تیل مل کر کود ے گا تو شناوری کا مزہ نہیں پائے گا۔ یہ ہیں ہمارے ادیب بھائی جنھوں نے زندگی کو تنگ نگاہ سے دیکھا ہے۔ جہاں زنا کرنا چاہیے وہاں نہیں کرتے، جہاں نہیں کرنا چاہیے وہاں کرتے ہیں۔

میں بہت دُور چلا گیا۔ بات تھی لاجونتی اور سندر لال کی۔ سندر لال ایک ریفارمر تھا جو دیکھا دیکھی ''دل میں بساؤ'' کے مسئلے سے دوچار ہوا۔ لیکن زندگی کی جھیل میں کنول کے پتے کی طرح تیرتا رہا اور جھیل کے پانی کے بارے میں نہ جان سکا۔ بات سیدھی ہے۔ میں نے شروع کے فقرے سے آخر تک یہی بتایا ہے۔ اس سارے حادثے میں انسانی دل اتنا مجروح ہو چکا ہے کہ نہایت نرم سلوک بھی اُسے، اُسی شدت سے مجروح کرسکتا ہے جتنا کہ جارحانہ سلوک:——

''ہاتھ لایاں کملاں وِنی لاجونتی دے بوٹے'' کے بارے میں سندر لال کا تصوّر الگ ہے۔ محض سطحی، اور لاجونتی سے بالکل الگ، کیوں کہ وہ اسی سانحہ کا شکار ہوئی۔ لاجونتی زندگی تھی، اپنے تمام کالے سفید اور سُرخ رنگ کے ساتھ اور سندر لال کا زندگی کے بارے میں طرزِ عمل ـــ وہ طرزِ عمل تھا جو خام اور کچا ہے۔ سندر لال خود بھی ڈرتا تھا، لاجونتی کی داستان سننے سے، مبادا دوسرے آدمی کے ساتھ سونے کی داستان سننے سے اس کا Sense of possession جاگ اُٹھے۔ اس نے ایک مجروح دل کی پکار سننے سے منھ موڑ لیا۔ اس نے رونے والے کا Catharsis روک دیا۔ حالانکہ اگر سندر لال اس کی بات سُن لیتا تو لاجونتی کو کتنی تسلّی ہو جاتی۔ سندر لال ہی ایک واحد شخص تھا جس کے سامنے ہندو عورت لاجونتی جواب دہ تھی، لیکن سندر لال نے اس کی بات نہ سُن کر ـــ ایک طرح سے جواب طلبی نہ کر کے، لاجونتی کو وسوسے میں ڈال دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ لاجونتی سے ایک عام Normal سلوک کرتا۔ لیکن نہیں۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ لفظ دیوی کا مفہوم ہماری زبان میں بڑا پوتر ہے۔ چین کے کسی صوبہ میں گالی ہے اور لاجونتی اس وقت ـــ اس حالت میں ـــ اُسی چین کے صوبہ کی باشندہ تھی۔

یہ جھنڈہ لے کر ساتھ شامل ہونے کی بات یہاں بھی کہی گئی ـــ لیکن لوگ آخر میں قائل ہو گئے۔ میں آج بھی مارکسزم اور اس کے حصول کا قائل ہوں لیکن میں نہیں چاہتا، وہ اس کی غلط Application کریں۔ متحدہ محاذ کے سلوگن کے بعد جب وہ نہایت خوبصورت ویشنوی شاعری کو اپناتے ہیں تو انھیں ہمارے ادب کو بھی محدود نظروں سے نہیں دیکھنا ہوگا۔ روس سے آج کل جتنی کہانیاں آرہی ہیں، ان میں بہت سی بے حد خام ہیں۔ مانتا ہوں ایک نئے سماج کے تصوّر میں، اس کے بننے میں Production میں جو چیزیں اُبھرتی ہیں انھیں ہمدردنکتۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے لیے ایک نکتۂ نظر وضع کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے بورژوا پیشرووں نے ہیئت کے سلسلے میں ہمیں جو کچھ دیا ہے، ہم اُسے بھول نہیں سکتے۔ ہم نیا فارم، نیا Content لیں گے، لیکن پُرانے ادب، پُرانے فارم اور پُرانے Content جذب اور اخذ کر کے۔ ہم ''موپساں'' کا Content چھوڑ سکتے ہیں لیکن اس کے فارم سے فائدہ ضرور اُٹھائیں گے۔ ہم فلابیری چیزوں کے نفسِ مضمون سے متفق نہیں اور نہ ''پیرے لوئی'' کی ''افرودائتی'' کے تعیش سے۔ لیکن ہم ہمیشہ دیکھیں

گے کہ ہمارے Content میں پیرے لوئی سے زیادہ رنگینی آتی ہے یا نہیں اور یہی چیز اپنے کالیداس، ٹیگور، تلسی داس اور اقبال کے سلسلے میں آتی ہے۔

بہر حال لکھتے رقعہ، لکھ گئے دفتر۔ چہ جائیکہ یہ خط میرے اور تمھارے درمیان ہوتا، میں نے اِسے دردِ سر اور رفاہِ عام کے انداز کا بنادیا ہے۔ لیکن یہ خط میں تمھیں ہی لکھ سکتا ہوں۔

دہلی

یکم جون 1950ء

برادرم اشک اور کوشل بہن! نمستے

معاف کیجیے میں 'دمپتی' کے دونوں خطوط کا جواب ایک ہی خط میں لکھ رہا ہوں۔ محبت کی اس جنگ میں، میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اس خط کے وصول کرنے کے بعد آپ دونوں Armistice منا سکتے ہیں اور ہر سال یکم جون کو ایک بج کر ایک منٹ اور ایک سیکنڈ پر، اُن شہیدوں کی یاد میں خاموش رہ سکتے ہیں، جو لڑتے ہوئے اس جنگ میں کام آئے۔

میری شکست کی بہت سی وجوہات ہیں۔ میرے پاس Manpower کم ہے۔ آبدوز، اپنے تیر، ترکش استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن میری بیوی آپ کو نہیں لکھ سکتی۔ اس دنیا کے محاذ پر ایک Total War لڑا جاتا ہے، جس میں جسم اور ذہن دونوں کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اور ہارا ہوا آدمی کبھی یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ میرے پاس ضروری حربہ نہ تھا، اس لیے میں ہار گیا۔ یا میری فوج کی تعداد کم تھی۔ ہو سکتا ہے اس کام کے لیے میرا بڑا لڑکا تیار ہو جائے۔ لیکن فی الحال میں اُسے توپ کا بھوسہ بنانا نہیں چاہتا۔ لیکن جنگ میں چند بین الاقوامی اصول ہوتے ہیں مثلاً آپ ڈم. ڈم گولی استعمال نہیں کر سکتے۔ جنگ میں آدمی، مخالف سمت کے آدمی کو مار سکتا ہے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ایک گولی چلا دے جو جسم میں جاتے ہی پھٹ جائے اور اتنے بڑے بڑے شگاف کر دے کہ آدمی سخت اذیت میں مرے۔ یہ بات ایک لطیفہ معلوم ہوتی ہے اور مجھے اس میراثی کا قصہ یاد آتا ہے جو شکر گزاری میں سجدہ ریز تھا کہ اس کا بیٹا پیٹ میں گولی لگنے سے مر گیا ہے۔ الحمدللہ کہ آنکھ بچ گئی۔ لیکن دنیا میں ایک Mercy killing بھی ہوتی ہے۔ مثلاً پھانسی

متروک ہو چکی ہے اور اس کی جگہ بجلی کی کرسی نے لے لی ہے اور علی ہٰذا القیاس۔ اس طرح بین الاقوامی جنگ کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ سرسوں کی گیس استعمال نہیں کر سکتے اور اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ایٹمی قوت کو جنگ کے تصرّف میں نہ لایا جائے۔ گویا آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہر جنگ کے چند آداب ہوتے ہیں۔ ہیروشیما کے بعد جاپان کے لوگ ہار گئے اور میری ہار کچھ اسی قسم کی ہے، اور یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہار کی بھی قسمیں ہوتی ہیں اور کوئی ہار نہیں جو مشروط نہیں ہوتی۔

آپ کے خط میں پیسوں کا حوالہ اور کوشل کے خط میں یہ اتہام کہ میں نے ان کے جذبات کا جواب سائنس اور الجبرے میں دیا ہے اور یہ کہ ''اشک صاحب آپ کا خط پڑھ کر بے حد اداس ہو گئے۔'' غالباً انھیں رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ کسی ڈم ڈم گولی اور مسٹرڈ گیس سے کم نہیں لیکن چونکہ میرا نہ پہلے خط سے مقصد کسی قسم کی دلآزاری تھا اور نہ اس خط سے ہے۔ اس لیے میں ہار گیا ہوں۔ پہلے میرا خط سائنس اور الجبرا تھا۔ اب اُسے شاید ملٹری سائنس اور Chemistry کا ایک باب گردانا جائے، لیکن اگر میرے خلوص کو مانتے ہیں تو صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ مندرجہ بالا سب چیزیں آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے ہیں اور ان میں کوئی طنز اور اندرونی مطلب نہیں۔

بارہا میری خواہش رہی کہ میں خود بھی اور میرے سب دوست بھی سب چیزوں کو ایک بڑی Objective نگاہ سے دیکھ سکیں۔ لیکن اس بات کا تقاضا فضول ہے۔ سب سے پہلے میں ہی اپنے اندازِ نظر میں ایک خاص قسم کی فاشیت کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ اس لیے بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اپنے پوڈر کو کسی اچھے وقت کے لیے سوکھا رکھنا چاہیے۔ یہ ایسی لڑائی نہیں ہے جس کا نتیجہ ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا برآمد ہو۔''

میں نے صرف اپنی تکلیف کا تذکرہ کیا تھا، جس سے میرا ہرگز مطلب اشارتاً اور کنایتاً آپ سے پیسوں کا مطالبہ کرنا نہیں تھا۔ مجھے ہرگز کسی پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔ ''گنگ وجمن'' کے مسودے کے لیے عبداللہ ملک کو لکھا تھا، لیکن وہ قید ہو گئے اور اس کے بعد پتا نہیں چلا کہ ان مسودوں کا کیا ہوا؟ آپ کے مسودے کے ساتھ اور بھی بہت سے (غالباً) تلف ہو گئے، اس لیے یوں بھی کسی پیسہ کا حوالہ دینا فضول معلوم ہوتا ہے۔

باقی رہا میرا اور آپ کا آئیڈیالوجیکل بُعد۔ اس کے قائم رہنے پر بھی ہم ایک دوسرے کے قریب رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں کسی غلط ماحول میں رہ کر آپ کو غلط سمجھ رہا ہوں، تو یہ بھی نادرست ہے۔ بلکہ اُلٹا مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو بنیاد یہاں رہ کر میں نے مارکسزم کے مطالعے کے لیے پائی ہے، وہ بنیاد پہلے نہ تھی، اس لیے سوچنے میں خاص پیچیدگی ہوا کرتی تھی۔ اس وقت صاف سوچنے کا ثبوت میں نے ابھی تک نہیں دیا کیونکہ ابھی تک اس عبوری دَور میں ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ لکھوں گا، وہ چیز صائب ہوگی۔ انھیں دنوں میں نے ایک افسانہ 'لاجونتی' لکھا ہے۔ ''تحریر میں چھپ رہا ہے۔ اگر آپ کی نظر سے نہ گزرے تو میں ایک کاپی بھیج دوں گا۔ میرا ماحول قطعاً ادبی نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے میں یہاں بیٹھ کر آپ کو مطعون کردوں کہ آپ ایک Coterie چلے گئے ہیں، اور اپنے اردگرد آپ نے ایک Ivory tower بنالیا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ البتہ اگر یہ خبر درست ہے کہ آپ نے ترقی پسندوں کے متوازی ایک انجمن قائم کرنے کی کوشش کی ہے، تو یہ اچھا نہیں کیا۔ خدا کرے یہ خبر غلط ہو...... میں اس خط کو بہت مفصل لکھنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ پتا نہیں اس کے کیا مطلب لیے جائیں، اس لیے تیسرا صفحہ استعمال کرنے کی بجائے Margin میں گھس گیا ہوں۔ کوشلیا لمبے چوڑے خطوں سے ڈرتی ہیں (جیسا کہ انھوں نے خط میں لکھا بھی ہے) اس لیے اس خط کو ختم کرتا ہوں اگرچہ یہ بھی لمبا ہوگیا ہے۔ بقول اقبال ؎

گفتار کے آداب پہ قابو نہیں رکھتے

آپ سے کبھی ملنے کی تمنا کے ساتھ

آپ کا

بیدی

15 / جون 50ء

برادرم اشک!

رانی کھیت سے لکھا ہوا تمھارا خط ملا۔ کیا وہاں تم بحالیِ صحت کے لیے گئے ہو یا وہی پُرانا مرض عود کر آیا ہے۔ محض احتیاط کے لیے بھی چار چھ مہینے صحت افزا جگہ پر رہنا ضروری ہے۔ اپنا بھی

بے حد جی چاہتا ہے کہ بمبئی کے باہر جاتا، لیکن نوکری کے تقاضے سدِ راہ ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت سوچتا ہوں کہ ساری عمر کس کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ کیا اپنی قسمت آپ نہ بنا سکیں گے۔ اس میں محض کم حوصلگی کی بات نہیں۔ اُردو کے مصنفین کے لیے اپنے پانو پر کھڑا ہونا فی الحال سازگار نہیں۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ ''ترقی پسند مصنفین کے ہندی گروپ کے کسی آدمی سے بھی جھوٹے میں توقع کی جاسکتی ہے۔''

ڈاکٹر رام بلاس شرما کو مجھے ذاتی طور پر جاننے کا اتفاق ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت ہی ارفع Integrity کا آدمی۔ تمھارے ناول ''گرتی دیواریں'' کے بارے میں، میری ان سے بات چیت ہوئی بھی اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اس کا لفظ بہ لفظ پڑھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چوہان کی تنقید کے سلسلے میں انھوں نے تمھارے ناول کے بارے میں جو تنقیدی الفاظ کہے ہیں، وہ سرِ راہ ہیں۔

تم نے اچھا کیا جو پبلشنگ کا کام شروع کر دیا ہے، چاہے حکومت کی مدد کے ساتھ ہی کیا ہے۔ لیکن تم نے اپنے ایک پُرانے خط میں لکھا ہے کہ میں حکومت پر (اپنے ایک ڈراما میں تنقید کی) جس کی بنا پر انھوں نے ریڈیو میں نوکری آخر واپس لے لی۔ گویا بہ یک وقت یہ تعاون اور تنقید۔ ایسی باتیں ہیں جو تمھارے بہی خواہوں کو حیران کرتی ہیں۔

الگ انجمن بنانے کے بارے میں ہندی گروپ کی طرف سے اطلاع نہیں آئی، بلکہ یہ چڑیا کیفی کی زبانی پتہ چلی اور میں نے اس کی تردید کر دی ہے۔ ہر انجمن میں اچھے لوگ ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اس سے ترقی پسندی کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، اور میں نہیں سمجھتا کہ ان چند لوگوں کی وجہ سے تم اس قدر تن جاؤ کہ ساری تحریک سے منھ موڑ لو۔ تمھارا تعاون ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگر بیماری کے سبب آج تم میٹنگوں میں نہیں جاسکتے تو نہ سہی، لیکن تحریک کے اغراض و مقاصد پر یقین رکھتے ہوئے تمھیں ہمارے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا۔ صحت بنانا تمھارے لیے بہت ضروری ہے، ورنہ ایک بیمار ذہنیت، تمھاری تحریر، تمھارے خطوط، تمھارے نقطۂ نظر کا احاطہ کرے گی۔ جوں ہی جسمانی اعتبار سے تم تندرست ہوتے ہو، تمھیں نیچے آکر عوام اور عوامی تحریکوں سے

براہِ راست ناطہ جوڑنا ہوگا۔ اس ناطہ کے بغیر ترقی پسندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر کرشن یا بیدی یہ ناطہ قائم نہیں کر پاتے اور اپنی تحریروں میں اس بات کا ثبوت نہیں دیتے، تو وہ بھی ترقی پسند کہلانے کے حقدار نہیں۔ کرشن اور بیدی کی تحریروں میں جو غلط کاریاں ہیں، وہ بھی ان کی دماغی اُلجھنوں کا ثبوت ہیں۔ لیکن منزل صاف ہے، جہاں تک پہنچنے کی کوشش کرنا بہرحال ہمارا فرض ہے۔

میری کتاب 'کوکھ جلی' اس قدر بیہودہ چھپی ہے کہ مجھے اُسے تم تک پہنچاتے ہوئے بے حد شرم آتی ہے۔ اس لیے میں اُسے نہیں بھیجوں گا۔ انہی دنوں میں نے افسانہ لکھا ہے، اس کا تراشہ البتہ روانہ کردوں گا۔ کوشلیا کو میری طرف سے مزاج پُرسی کردینا اور میرا آداب کہنا۔ ستونت تم لوگوں کو بہت یاد کرتی ہے۔ نہ جانے تم نے کون سا سحر کردیا ہے کہ تمھارے ساتھ میرے اختلافات میں وہ مجھے ہی موردِ الزام ٹھہراتی ہے۔ یہ فتنہ اس کے 'پنچ گنی' میں قیام کا برپا کیا ہوا ہے۔

8ر دسمبر 1951ء

برادرم اشک!

تمھارا خط ملا۔ بارے تسلّی ہوئی کہ وہ بیماری عود نہیں کر آئی، جس کا مجھے خطرہ تھا۔ اب تمھیں اپنا حال بتاتا ہوں جو کہ تمھاری بیماری کے پیشِ نظر میں نے نہیں لکھا تھا۔

میرا ایک گردہ ماؤف ہو چکا ہے۔ جس روز مجھے پہلا حملہ ہوا تھا، گھر کے سب لوگ میری جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ لیکن ایکا ایکی ٹھیک ہوگیا۔ پچھلے آٹھ دس مہینے سے یہ حالت ہے کہ ایک مقرّرہ میعاد کے بعد درد ہوتا ہے اور پھر میں کسی کام کا نہیں رہتا۔ وہ چیز جسے تم فرائضِ شوہری کہتے ہو، کب کے ادا ہونے بند ہوگئے ہیں۔ ویسے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن ایک احساسِ شکست دامن گیر رہتا ہے۔ اب تو کسی صحت مند لڑکی کی طرف دیکھتا ہوں تو 'سر یاد آیا' والی کیفیت ہوتی ہے۔ کمر پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ میں اگرچہ لڑکیوں میں کبھی اتنا مقبول نہ ہوا تھا جتنا کہ — مثلاً تم ہوئے۔ لیکن تم جانتے ہو، ٹڈی پر ایک موسم آتا ہے جب کہ وہ پر نکالتی ہے، اگرچہ یہی اس کی موت کی دلیل ہوتی ہے۔

بمبئی میں آئے مجھے قریب چار سال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں باہر ہی نہیں گیا۔ بھائی کی شادی ہوئی تو دس دن کے لیے باہر نکلا اور اس کے بعد پھر یہیں۔ یہاں آنے پر پہلی بیماری جو

دامن گیر ہوتی ہے، وہ مرطوب آب وہوا کی وجہ سے ریاحی تکلیف ہے۔ پیٹ میں ہروقت ہوا رہتی ہے۔ ایک دفعہ تو یہ تکلیف بھی اتنی بڑھ گئی کہ پان تک ہضم ہونا بند ہو گیا۔ مشکل سے اس پر قدرت پائی کہ اسٹوڈیو کی گندی خوراک اور بے احتیاطی، جو میری طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی، گردے کی تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اب یہ عالم ہے کہ اسٹوڈیو میں اپنا پانی لے کر جاتا ہوں۔ بھولے سے بھی باہر کچھ نہیں کھاتا۔ کسی زمانے میں سیٹھوں کی طرح توند نکل آئی تھی اور بہت پردے ڈھک گئے تھے۔ فارغ البالی کا شبہ ہوتا تھا۔ اب حالات نسبتاً بہتر ہونے کے باوجود بدنامی ہوتی ہے، اس لیے ارادہ ہے کہ ایک آدھ ماہ کے لیے بمبئی سے باہر چلا جاؤں۔ ہربنس میرا چھوٹا بھائی بریلی چھاؤنی میں اگیزکٹو آفیسر لگ گیا ہے۔ کرسمس کی چھٹیوں میں اس کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ اگر وہاں پہنچا، الٰہ آباد لازماً آؤں گا اور ہم دونوں بیٹھ کر کچھ یادیں تازہ کرلیں گے۔

اُپندر، یہاں کے نامساعد حالات کے پیشِ نظر بعض وقت مجھے یہ سوچنا پڑتا ہے، میں نے بمبئی میں آکر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ لکھنا پڑھنا سرے سے چھوٹ گیا ہے۔ صحت ہے، تو یہاں کے غارت گر آب وہوا کی نذر ہو چکی ہے۔ اس پر یہ نہیں کہ کوئی بنک بیلنس بن گیا ہو۔ جو آتا ہے، خرچ ہو جاتا ہے۔ کوئی مکان نہیں، موٹر نہیں۔ اگرچہ یہ دونوں چیزیں میری زندگی کا مقصد نہ تھیں اور نہ ہیں۔ لیکن میں سوچتا ہوں، میں اس کے سوا کرتا بھی کیا۔ مجھ سے (موجودہ ہندوستان میں) ناخواندہ آدمی کی اور کھپت کہاں تھی۔ یا شاید یہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ لیکن اس میں درستی کا شائبہ بھی ہے۔ تمھاری بات الگ ہے۔ تم نے ہندی پر عبور حاصل کرلیا تھا، جو تمھارے آڑے آئی، لیکن میں...... جب تک گزارہ ہوتا ہے، نبھائے جاؤں گا۔ بقول غالب ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اور یوں ہم سمجھتے ہیں، ہمارے پاگل پن میں ایک ادا ہے......
کوشلیا کو نمستے کہنا، ستونت تمھیں آداب کہتی ہے۔

تمھارا

بیدی

داگدی بنگلہ

کھنڈالا

1954ء

پیارے اشک

بمبئی میں تھا، جب تمھارا خط ملا۔

بمبئی کے متواتر قیام نے بوڑھا اور بیمار کردیا۔ لہٰذا صحت کی غرض سے کھنڈالہ میں مقیم ہوں۔ ایک آدھ ہفتہ رہ کر بمبئی لوٹ جاؤں گا۔ ''آخر بچہ مولیا تو ہتّی بہناں۔''

دلّی میں تم سے ملاقات نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔ خدا کی شان ہے، ایک ہی بستی میں بسنا اور صورت کو ترسنا۔ مجھے تمھارا پتہ ہوتا تو خود دوڑ کر مل آتا۔ تین چار روز اور رہنے کا ارادہ تھا، مگر دلّی کی تندرست آب و ہوا راس نہ آئی۔ تم ہنسو گے، مگر یہ صحیح ہے کہ بمبئی پہنچتے ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ یعنی شمالی بیماریاں رفع دفع ہو جاتی۔ جنوبی بیماریوں کا تو کوئی علاج نہیں۔ اب کھنڈالا آزما رہا ہوں۔ حالات یہ ہو گئے ہیں کہ پنجاب میں رہتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ خالص گھی کھاتے ہیں تو کھانسی ہو جاتی ہے۔ پھل کھائیں تو گردے میں پتھر بڑھ جاتے ہیں، یخنی مرغا سوءِ ہضم کے علاوہ معدے میں تیزابی مادہ بڑھا دیتا ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں کرد!

دُلاری — میری بہن تپ دق کے عارضے میں پڑی ہے۔ ارادہ تھا کہ اسے ساتھ لیتا آؤں اور پنچ گنی یا پراج کے سینی ٹوریم میں داخل کردوں۔ خود چھٹی لوں اور نگہداشت کروں۔ ساتھ لکھنے لکھانے کا عمل جاری رکھوں (چاہے فلمی تحریر ہو) مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے بہنوئی بدگمان تھے۔ پھر تیسرے درجے کی بیماری۔ کبھی گھبرا کے بچّوں کے لیے تڑپنے لگے، تو پھر کیا کروں۔ لہٰذا اپنے ایک دوست سہگل کے توسط سے مہرولی کے ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ اطلاع آئی ہے کہ روبہ صحت ہے۔

ہربنس کبھی کلکتے نہیں گیا۔ اس کے بارے میں تمھاری اطلاع نادرست ہے۔ البتہ وہ

نوٹ: خط مفرّس ہو گیا ہے۔ یہ مروّجہ ہندی کے خلاف ردّ بھی سمجھنا۔ بیدی

ڈلہوزی میں ایگزکٹو آفیسر لگا ہوا ہے۔ کبھی ارادہ ہو تو تم اس کے پاس رہ سکتے ہو۔ اسے اچھا خاصا بنگلہ ملا ہوا ہے۔ آدمی پڑھا لکھا، ملنسار، مہمان نواز ہے۔ اگرچہ نواز کا Suffix میں نے تمھیں مدِ نظر رکھ کے نہیں لکھا۔ تم نے لکھا تھا کہ اس سال کے آخر میں بمبئی آنے کا ارادہ ہے۔ کیا ہوا اس ارادے کو؟ آجاؤ تو موسمِ گل کرلیں۔

تمھاری طنز بجا ہے۔ میں نے ناول لکھ رکھا ہے۔ چند ہی دن میں اسے ختم کرسکتا ہوں۔ طوائف اور پٹھان کے مابین پچھلے آدھے کا سودا ہے۔ پتہ نہیں وہ دن کب نصیب ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں نے 'دیوالہ' نام سے ایک کہانی لکھی ہے۔ اپنی نظر میں اچھی ہے۔ اگر تمھاری نگاہ سے نہیں گزری تو اس کی ایک نقل بھیج دوں۔ اب تو پچاس فی صدی فلم ساز کشمیر کے پس منظر کی کہانیاں فلما رہے ہیں اور درجنوں لیکھک کشمیر کے ماحول میں رسے بسے ناول لکھ رہے ہیں۔ تم لکھ رہے ہو، خوشی ہوئی۔ میرا بھی ارادہ تھا۔ سوچتا ہوں، اس مرگِ انبوہ میں شامل ہو جاؤں تو انا کو تسکین پہنچے۔ خیال تازہ رہے، ہم بھی لکھنے والے ہیں...... لیکن یہ سب ایک کشمیر کے کیوں پیچھے پڑے ہیں۔ غالب کا شعر ہے۔

تھیں بنات النعش گردوں، دن کے پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

میرا فلموں کا کاروبار ایسا ویسا ہی ہے۔ فلمی پروڈیوسر ہوگیا ہوں، لیکن بنک بیلنس سو روپے سے تجاوز نہیں کرسکا۔ امدادِ باہمی کے انداز کا ایک یونٹ قائم کیا ہے۔ منافع بنٹ جائے گا۔ لیکن اگر تصویر کامیاب ہوگئی، تو کم از کم ایک ایسا ادارہ ہوگا جس میں سے عزت کی روٹی مل سکے گی اور سال میں ایک دو تصویریں لکھنے کے بعد ادبی کام کرسکوں گا۔ یہ بات شاید پھر تمھیں خیال و وہم و جنوں نظر آئے۔ لیکن تم مجھے جانتے ہو۔ چھوڑنے والا میں بھی نہیں۔ تم نے جو راستہ اختیار کیا وہ شارٹ کٹ تھا۔ میرا لانگ کٹ کا ہے۔ مگر راستہ ضرور ہے۔ دوسرے تو میں کسی کو جوابدہ نہیں۔ سب میرا تمت الخیر لکھ بیٹھے ہیں۔ ایک تم ہو جس کے سامنے مجھے عذرداری کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے فلمی کام کو کبھی اپنا ملجا نہیں سمجھا۔ یہ ایک بہانہ ہے طورِ ادب پر پہنچنے کا۔ اگر تمھیں بھی میری بات صدق پر دکھائی نہیں دیتی تو مجھے افسوس ہوگا۔ ان دنوں میری کچھ تصویریں کامیاب

ہوئیں۔ مجھے درجنوں کانٹریکٹ آفر ہوئے۔ لیکن میں نے موڑ دیے۔ بس اپنے ادارے کے لیے لکھوں گا اور کسی کے لیے نہیں۔ جب میرے پاس ادبی مشاغل کے لیے وقت بچ سکے گا۔ تصویر 'گرم کوٹ' چل گئی تو زیادہ تو نہیں البتہ اتنے پیسے میسّر ہو جائیں گے کہ Wolf at the door بھگایا جاسکے اور پھر کام کا کام کیا جاسکے۔

بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ نریندر مجھ سے ایک فٹ لمبا ہے۔ تعجب ہے کہ باپ اپنی اولاد کو پھلتے پھولتے دیکھتا ہے، تو ساتھ میں اسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ بھئی تم اپنا بوریا بستر گول کرو اور جگہ خالی کرو، نئی پود کے لیے۔ 18 سال کی اس کی عمر ہے۔ یہی عمر میری تھی، جب میرے والد وفات پا گئے تھے۔ بہرحال منّی پندرہ برس کی ہے۔ ابھی اکاون میں ہمیں نے ہربنس کی شادی کی تھی۔ اب چار پانچ سال میں، رسمی زبان میں ایک لڑکی کو ''دروازے سے اُٹھانا'' پڑ گیا۔ اپنے ہاتھوں سے اتنی شادیاں کی ہیں کہ میں اور میری بیوی — دونوں شادی اکسپرٹ ہو گئے۔ سمدھی سے جتنی ڈپلومیٹک گفتگو کرسکتا ہوں اتنی شاید ہی کوئی کرسکتا ہو — تمھاری طرح کی نہیں — دو پاٹ۔ یعنی بات کرو تو لڑکے والا اپنا لڑکا گھر لے جائے......

ایک اور بات، میں نے تمھارے لڑکے اُمیش کو بمبئی میں دیکھا ہے، جب وہ اس حالت میں تھا کہ تم تک اپنی خبر بھجوانا پسند نہ کرتا تھا۔ میں نے سوچا، دیکھ لوں یہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔ اس بات کو مہینے گزر گئے۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے؟ اگر تم چاہتے ہو کہ اس سلسلے میں کچھ کروں، تو مجھے لکھ بھیجو۔ میں نے اس کی بہت منّت سماجت کی کہ میرے گھر آئے، مگر ایک آدھ بار کسی کام کے سلسلے میں آیا اور پھر شکل نہیں دکھائی دی۔ یہ بات نہیں کہ وہ تمھیں یا کوشلیا کو بُرا سمجھتا ہے۔ وہ کوشلیا کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ سب الزام اپنے اُوپر لیتا ہے۔ تمھارے بارے میں سوچتا ہے کہ تم اس کے لیے بہت بڑے ہو۔ یعنی معنوی طور پر۔ گویا اس کی اپنی طبیعت میں سیلانی پن ہے۔ وہ اپنی افتاد سے خود ڈرتا ہے۔ یعنی گھر کا آرام، عیش وعشرت میسّر آنے پر بھی پتہ نہیں کب طبیعت میں سرکشی پیدا ہو جائے اور وہ اَن ماپے سمندروں کو ماپنے چل نکلے۔ گھر سے بھاگ آنے کا اس کے پاس اس سے زیادہ معقول کوئی عذر نہیں۔ اگر اس سلسلے میں کچھ کرنا ہو تو مجھے لکھو۔

کوشلیا کی طبیعت اب کیسی ہے۔ وہ بیمار ہو کر اب اور کیا رہ گئی ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی

نے کنہیا لال کپور کے بارے میں لکھا تھا— وہ دُبلا ہو گیا ہے۔

ستونت بھی بیمار ہے۔ Anaemia کی شکایت ہے۔ اسے بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ یہاں پیار اور جھگڑے کا بھونڈا سا امتزاج ہے۔ بیوی کے بغیر یہی پتا نہیں چلتا، جوتا کہاں رکھا ہے، چنانچہ منانا بھی پڑتا ہے۔ ستونت اور بچے تمھیں آداب کہتے ہیں۔ کوشلیا کو بھی۔

تمھارا

بیدی

24/ مارچ 66ء

پیارے اشک

جب کوشلیا پہنچی تو میں کھنڈالا میں تھا،

یہ کھنڈالا پہنچنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ پُشی کا پتا کرنا تھا اور تمھیں اس کی اطلاع دینا تھی۔ میں دراصل بوڑھا ہو گیا ہوں اور مجھے کوئی بھی بات یاد نہیں رہتی۔ جو یاد رہتی ہے، اسے بھی بھلا دینے میں میری بیوی میری مدد کرتی ہے۔ پھر تمھارا یا کوشلیا کا مجبوری میں ایسے سہو کے لیے معاف کر دینا بھی اسی قسم کے بڑھاپے کی نشانی ہے!

نریندر شوٹنگ کے لیے کلّو چلا گیا ہے۔ باقی کے بچے بھی یہاں نہیں ہیں۔ صرف ہم دونوں ہیں۔ خیال تھا کہ ہمیں دونوں ہوں گے تو کوئی جھگڑا نہ ہوگا۔ زندگی کا کوئی پروگرام وضع کر سکیں گے۔ لیکن اس نحوست کو بھول گئے جو بتیس سالہ ازدواجی زندگی کے بعد من کے چہرے پہ چلی آئی ہے۔

سنا ہے تم بدستور بیمار ہو۔ کیوں نہیں اس بیماری کو جھٹک دیتے؟ بیماری تو بعض وقت اپنے آپ کو تندرست فرض کر لینے سے بھی چلی جاتی ہے۔ کوشلیا کہہ رہی تھیں کہ تم نے ہردوار میں کوئی جگہ دیکھی ہے۔ ہردوار جانے کے لیے پہلے تو ماں کو زندہ کرنا پڑتا ہے یا بچے ہردوار جاتے ہیں، الگ خود تو نہیں جاتا۔

کل کوشلیا کو سرن، کرشن چندر، مجروح وغیرہ کے ملوانے کے لیے لے گیا تھا۔ سرن کی

بجائے مسز سرن ملیں۔ مجروح گھر پر نہیں تھے۔ کرشن اور ان کی سلمٰی ملیں۔ تجربہ اچھا نہیں رہا، یا ویسے ہی اب ہم لوگوں کے دل میں کوئی گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ سب کے سب گلیشیر ہو گئے ہیں۔ بیوی کی تنہائی کا ذکر کیا تو کرشن کہنے لگا کہ کوئی کتا پال لو اور بیوی کو نہ بتانا۔ میں نے کہا، میں نے پالا ہوا ہے اور بتایا بھی نہیں! مسز سرن نے مجھے کہا، آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ میں نے کہا، صرف مصروف ہوں، آدمی کہاں؟ وہ بہت خوش ہوئیں۔ میں اب اس منزل پہ پہنچ گیا ہوں جہاں اپنے سکھ ہونے کی نہیں، صرف ہونے کی عذرداری کرنا پڑتی ہے۔ غالب مجھ سے ایک قدم نیچے تھے —

ع میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

میں نے آج اس قدر زیادہ خط لکھے ہیں کہ اُمیش کے خط کا جواب نہیں دے سکتا۔ میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا۔ مجھے انعام ملنے کی خبر پہ اس نے 'یاہو' کہہ کر اُچھلنا چاہا۔ میں نے اس کا خط پا کر اُچھلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

اُمیش، بما، گڈا، پنڈت شریتاب کو ہمارے پیار۔ مسز ڈیوی کو آداب

تمھارا

بیدی

پیارے اُپندر

میں تمھیں خط نہیں لکھ سکا۔ معافی چاہتا ہوں۔ اس کی تاویل اگرچہ بیکار بات ہے، تاہم کرتا ہوں، کہیں غلط فہمی نہ ہو جائے۔

میں مرزا غالب کی ریلیز کے سلسلے میں دہلی گیا تھا اور آتے ہی مجھے بمبئی سے باہر جانا پڑا۔ تین چار روز ہوئے لوٹا، تو تمھارے خط دیکھے۔ میں ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ستونت کے نام چٹھی پہنچ گئی اور مجھے شرمسار ہونا پڑا۔ یہ دو چار دن بھی کوتاہی نہ کرتا، لیکن تصویر 'گرم کوٹ' (جسے میں پروڈیوس کر رہا ہوں) تکمیل پا گئی اور میں اسے موجودہ صورت میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ کل رات اس کی صورت بنی ہے اور میں تمھیں لکھ رہا ہوں۔

اس عرصے میں، تین چار بار اُمیش سے ملاقات ہوئی۔ میں اسے اسٹوڈیو ملنے گیا اور وہ بھی

اتنی ہی بار گھر آیا۔ بے حد شرمیلا ہے۔ گھر میں آتا ہے تو پہلے چوروں کی طرح باہر کھڑا رہتا ہے۔ اس موقع کی تاک میں کہ اِدھر اُدھر کا کوئی آدمی تو نہیں ہے۔ بہت کوشش کرتے ہیں کہ کھلے، مگر نہیں کھلتا۔ تاہم اسے معمولی چند کپڑے بنوا دیے ہیں اور نقد پیسے وغیرہ بھی دے دیے ہیں اور اس کے الٰہ آباد جانے کی بات کر لی ہے۔ ویسے تو میں اسے سیدھا الٰہ آباد بھیج سکتا ہوں۔ مگر اپنا لالچ ہے کہ کوشلیا آئیں گی تو ان سے مل لیں گے۔ وہ یہاں کچھ دیر گھوم لیں گی۔ مجھے علم ہے وہ بمبئی کو ناپسند نہیں کرتی ہیں۔ بلکہ بمبئی میں آنے کے بعد الٰہ آباد کی سردی کے مقابلے ایک طرح کی تفریح کا احساس ہوگا۔ اگر تم انھیں اس لیے بھیج رہے ہو کہ امیش کو ساتھ لے کر الٰہ آباد جائیں اور وہ امیش کے سفر خرچ اور کپڑوں کی کفیل ہو جائیں تو یہ سوچنا نادرست ہے، کیوں کہ یہ میں بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میری یہ خواہش ہے کہ کوشلیا یہاں آئے، بلکہ خط میں یہ پڑھ کر کہ کوشلیا کہیں بھی رہ سکتی ہے، مجھے دُکھ ہوا۔ شاید میری طرف سے جواب نہ آنے پر تم نے عجیب طرح کی باتیں سوچیں۔

بہر حال میں بحرِ طویل میں لکھنے کا عادی نہیں۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ تم میرے اس پیار اور ستونت کے اس پیار کو سمجھتے ہو، جو ہمیں تم سے اور کوشلیا سے ہے۔ انسان بدلتا ہے۔ میں اس قدر پُر تکلف بھی نہیں رہا کہ گھر میں آنے والے کسی شخص کی تکلیف بلحاظ رہائش اور خوراک وبالِ جان کر لوں۔ فی الخصوص جب کہ کوشلیا اپنے گھر کی ہیں۔

کوشلیا کے آنے کی تاریخ لکھ بھیجنا، تا کہ میں اُس دن انھیں اسٹیشن پر لینے چلا جاؤں اور انھیں مکان ڈھونڈنے کی دقت نہ ہو۔ اشک اگر تم بھی آسکو تو اپنی عید ہو جائے۔ اگر تم زیادہ بیمار نہیں ہو، تو ضرور آ جاؤ۔ خدارا —— میری تم سے درخواست ہے۔ تھوڑا سا خرچ اور ہو جائے گا۔ مگر ہم سب کتنے خوش ہوں گے۔ آب و ہوا کی تبدیلی ہو جائے گی۔ تم کسی طرح خسارے میں نہیں رہو گے۔ گڈّے کو میری اور ستونت کی طرف سے پیار۔ کوشلیا کو نمستے۔

تمھارا

بیدی

بمبئی

15/دسمبر 1967ء

پیارے اشک!

اس وقت صبح کے تین بجے ہیں۔ گھر میں للّو کے سوا کوئی نہیں۔ آہستہ آہستہ سب مجھے چھوڑ گئے ہیں۔ بہو اور نریندرا اپنے فلیٹ واقع باندرہ میں ہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھر اور بیوی مہینے بھر سے اُدھر پنجاب کے چکّر کاٹ رہی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ کہیں بھی کوئی کنوارا لڑکا ہو، تو کسی بھی کنواری لڑکی سے اس کی شادی کر دے یا کروا دے۔ جتنی دیر میں وہ لوٹے گی کچھ اور لڑکیاں جوان ہو چکی ہوں گی۔ اس کام میں وہ بھول جاتی ہے کہ اس کے اپنے گھر میں ایک ازلی کنوارا بیٹھا ہے— میں! حالانکہ وہ مجھ سے مروّت برتنے کے قابل ہی نہیں رہی۔

روز، لیٹ ہونے کے باوجود میری نیند صبح تین بجے کھل جاتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ میرے دماغ پر کسی بات کا بوجھ ہے۔ بلکہ ایسے ہی، کسی قسم کا بدنی یا ذہنی خلفشار نہ ہونے کی وجہ سے۔ پھر دن بھر کسی تھکن کا احساس نہیں ہوتا اور نہ تنہائی کا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دل اس لیے قوی ہو چکا ہے کہ پے در پے موتوں کے بعد بیشمار کچوکے لگے ہیں۔ دماغ اس لیے توانا ہے کہ اس نے کشاکش کی بے حد کسرت کی ہے۔ نامراد اس لیے نہیں ہو سکتا کہ...... یہ کافکا قسم کے لوگ ہوتے ہیں جنھیں موت ڈراتی ہے۔ ہمارے فلسفہ نے ہمیں اس فکر سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔ حالانکہ ٹاٹا اسپتال کے ڈاکٹر بورجز نے مجھے کہا ہے کہ پان کھانا بند کر دو کیونکہ گال کے اندر کینسر کے شدید آثار ہیں۔ اس وقت یہ بیماری جس منزل پہ ہے، اس کا بہت ہی خوبصورت سا نام ہے ''لیوکو پلاکیا'' خدا جانے یہ میرے اندر کب سے پلا کیا۔

انسان کسی نہ کسی بیماری سے مرتا ہے، تو یہی سہی۔ یہ ضروری نہیں کہ بدکار آدمی کو اس قسم کی Fatal بیماری لگے۔ سوامی رام کرشن پرم ہنس بھی اس سے سرگباش ہوئے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے دوسروں کے گناہ خود لے لیے تھے...... کیا میں نے نہیں لیے! میں ایک مہاتما،

رشی منی ہوتا جارہا ہوں، تم جو کہ خود بھی ایک عظیم آدمی ہو، کوئی ایسا نسخہ بتا سکتے ہو جو انسان کو عظمت سے بچا سکے۔

میں نے اپنی فلم 'دستک' شروع کر دی ہے۔ اوّل تو اظہار کے خیال سے اور پھر اس ارادے سے بھی کہ بیٹے اور بیوی پر ثابت کردوں گا...... اور جیسے جیسے میری چیز ثبوت کے قریب پہنچ رہی ہے، مجھے ثابت کرنے کا شوق ہی نہیں رہا۔

میں نے اس خیال سے ڈرامے لکھے تھے کہ انھیں ایک بار پھر لکھوں گا۔ یہ آج سے بیس پچیس برس پہلے لکھے تھے۔ اس لیے زبان میں بے حد ثقالت ہے، مثلاً 'رخشندہ' کے مکالموں میں۔ اگر ترجمے میں، ہنر صاحب سلاست لا سکتے ہیں تو ہو، مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ تم اپنی نگرانی میں خود ہی یہ کام کر دو تو میری یہ کتاب چھپ جائے گی۔ مجھ پر مدار کیا تو پڑی رہے گی۔ مدام۔ اس پر میری طرف سے کسی شکریے کی امید مت رکھو۔ کیونکہ یہ تمھارے میرے ایسے بیوقوفوں کے لیے کہا گیا ہے— ''نیکی کر اور کنویں میں ڈال''۔ نہیں نہیں کہیں سچ مچ ہی مسودہ کنویں میں نہ پھینک دینا!

کرشن چندر دل کے عارضے سے نکل آیا ہے۔ میں اس کے یہاں باقاعدہ جاتا رہا ہوں۔ بیماری میں اس نے مجھے بہت یاد کیا۔ اس نے مجھ سے بہت معافیاں مانگیں۔ نہ معلوم کیوں۔ پھر میں نے مانگیں۔ نہ معلوم کیوں۔ ایک بات جس نے مجھ پر میری پتھر دلی ثابت کر دی، وہ یہ ہے کہ بیماری کے دوران کرشن چندر رانچی کے مقتولوں کو یاد کر کے روتا رہا ہے!

یار! کیوں نہیں تم میرا بھی ایک 'سانس مرن' چھاپ لیتے۔ تم نے کہا بھی تھا کہ تمھارے خطوط چھاپوں گا۔ کچھ خط ہو جائیں گے اور چند مضامین۔ 'آئینے کے سامنے' اور 'اعتراف گناہ' وغیرہ جو بُرے نہیں ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میں کیسا پیکن ہوں، جو اخلاق اور توبہ اور خشوع و خضوع سے بھی گزر گیا ہے۔ دراصل مجھے زندگی کا پتا چل گیا ہے۔ لیکن کسی کو بتاؤں گا نہیں۔ بتادوں گا تو وہ مجھ سے بھی اچھا لکھنے لگے گا اور پھر مجھے ہی مصیبت پڑے گی۔

کل بڑے مزے کی ایک بات ہوئی۔ اپنی کسی ضرورت سے میں فلم اسٹار ڈیوڈ کے یہاں چلا گیا، جو بے حد حاضر جواب آدمی ہے اور لطیفہ گو۔ اس کے سامنے نہ کسی کی دال گلتی ہے اور نہ گوشت پکتا ہے۔ اس کے یہاں آرٹسٹ اچریکر کا ایک نیوڈ لگا تھا، جسے دیکھ کر میرے گردے میں

درد ہونے لگا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ اسے آرٹسٹ نے خیال سے بنایا ہے یا موڈل سے، تو ڈیوڈ نے کہا ''مجھے نہیں معلوم''۔ چنانچہ پریشان ہوکر میں نے اس سے پوچھا، کہ تم گھنٹے بھر کے لیے اسے مجھے مستعار دے سکتے ہو؟ اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میں نے کہا۔ ویسے لے لینا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ شاید اس نے یہ سوچا کہ یہ جانور بھی زندگی اور حُسن میں تمیز نہیں کرسکتا۔

'سانس مرن' میرے لیے وہی کام کرے گا جو سمادھی یوگی کے لیے کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں ایسی چیزیں چھپیں، کہ ہندی پڑھنے والوں کو مجھ سے اور نفرت ہو جائے اور میں کچھ ناول لکھ سکوں۔

مزید براں مجھے 'ایک چادر میلی سی' کی دس اور باقی میری کتابوں کی پانچ پانچ کاپیاں بھجوادو۔ کبھی کبھی مجھ پر 'خود احتسابی' کا دورآ تا ہے۔ میں نے دلّی میں پرکاش پنڈت کو بھی لکھا ہے اور دعا دی ہے کہ تمھارے بچّے جئیں۔ ایسے بچّے جو فیملی پلاننگ اور مرد کے تجرد کے باوجود عورتیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔

کوشلیا نے مجھے ٹیکہ بھیجا تھا۔ میں نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے معافی۔ معافیاں مانگ لینا۔ کبھی فرصت میں لکھوں گا۔ شاید میں جواب نہ لکھ کر بھائی بہن کے رشتے کا استحکام آزمارہا ہوں۔ یا پھر کچھ بھی نہیں آزمارہا۔ میں انھیں لکھتا تو، مگر اب نیند لگ رہی ہے۔ بہو، بچّوں، سندیپ اور اُمیش کو پیار۔ میں نیند کی حسین آمد آمد میں تھکتا جارہا ہوں۔

تمھارا

بیدی

سیٹھیا سدن۔ مٹنگا۔ بمبئی 19

20 رستمبر 1951ء

پیارے اشک!

بھائی! معاف کرنا۔ وہ موعودہ خط لٹک گیا۔ بات دراصل کچھ بھی نہیں تھی۔ میں تمھارے شکریے کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا اور بس۔

اکتوبر میں میرا پروگرام دلّی کی طرف جانے کا ہے۔ اگر بمبئی سے چھوٹا تو وعدہ کرتا ہوں کہ الٰہ آباد ضرور آؤں گا۔ اپنی ''موکش'' کے لیے۔ زیادہ دن رہنا تو شاید نہ ہو سکے، بس ایمان تازہ کر کے چلا آؤں گا۔ یقین مانو اشک! جتنا میں تمھیں کم لکھتا ہوں، اتنا ہی زیادہ یاد کرتا ہوں۔ کوئی سنسکاری بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے، پچھلے جنم میں ضرور تم میرے کوئی عزیز ہو گے۔ چچیرے یا تتیرے بھائی۔ بہن یا ماں ہو نہیں سکتے (شاستر ودھی انکول، براہمن کے گھر میں جو بالک جنم لیتا ہے وہ پچھلے جنم میں بھی پُرش ہوتا ہے، پرنتو نیچ جات کا۔ اچھے کرم کرنے سے تب وہ براہمن کے گرہ میں چلا آتا ہے) سالے یا بہنوئی بھی نہیں ہو سکتے، کیونکہ تمھارا مجھ سے لین دین بہت ستھرا ہے۔

کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ میرے ہاتھوں تمھارا کلیان ہوتا ہوگا، جس کے بدلے میں اب تم میرا کر رہے ہو۔ ترجمہ تم خود ہی لکھ لو!

ادھر میرے بھی مکان کا تصفیہ ہو گیا ہے۔ مُنّی کی شادی کے بعد اس تصفیہ پہ پہنچنے کے لیے مجھے دو ہزار روپے مقدمے پر کے خرچ کے علاوہ بھرنے پڑے۔ بہت مشکل آن پڑی، لیکن آخر میں سب ٹھیک ہو گیا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں، جیسا کہ 'پروگریسو' کہتے ہیں، 'مر نہیں سکتا' البتہ ڈھیٹ ہو سکتا ہے۔

تم ان سارے جھمیلوں کے باوجود کیسے لکھ لیتے ہو۔ یا تمھیں کوئی نیورس ہے، جیسے لیکوریائی مریضہ مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی، ایسے ہی تم لکھے بغیر نہیں رہ سکتے، اور مرد بھی۔ تم نے اِبسن اور اونیل چُنے ہیں۔ ذرا خیال رکھنا۔

تم نے بھی تو بمبئی آنے کا ارادہ کیا تھا، اُسے گول ہی کر گئے۔ نومبر سے موسم اچھا شروع ہوتا ہے۔ سمندر سے برسات کا گدلا پانی نکل جاتا ہے اور ایک ٹھنڈی ٹھنڈی سی نیلاہٹ بڑی فرحت دیتی ہے۔ رات کو کروڑوں کی تعداد میں مائیکروب لہروں کے ساتھ مچلتے ہیں، تو اُن کی چمک ایک نہایت عظیم ایپک کے حاشیے معلوم ہونے لگتی ہے۔ جُوہُو، جہاں میں نے ایک کمرہ لے رکھا ہے، چوری کی شراب کا گڑھ ہے۔ کوئی پیے یا نہ پیے، فضا میں رَسے بسے ہوئے نشے سے سرشار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لوگ یہاں اکثر عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ تمھاری میری عمر کے آدمی کو

کون پوچھے۔ ''کیوں صاحب! مال چاہیے......'' تو یہ فقرہ سن کر ہی پوری صحبت کا لطف آ جاتا ہے!
اب بھی نہ آؤ، تو تمھاری کاروباری مصروفیت پر تین حرف!

کوشلیا کیوں بیمار ہو گئیں۔ مہان ڈاکٹر اَجنیک نے جو صحت کی بحالی کے گُر بتائے تھے، شاید انھوں نے استعمال نہیں کیے۔ بعض وقت ''بدنی سہل انگاری'' صحت سے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ خدا انھیں ہدایت دے۔ اب کے جب میں کوشلیا سے ملا تو وہ بہت بدلی ہوئی تھیں، معلوم ہوتا تھا جیسے کشمکشِ زندگی نے ان سے کچھ منفرد انداز چھین لیے۔ یوں بھی جب کوئی انسان تھوڑے سے احسان کا زیادہ شکریہ ادا کرے تو معلوم ہوتا ہے، اسے انسان کی نیکی اور شرافت پر زیادہ یقین نہیں۔ یا یوں کہہ لو کہ لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ آخری بات مجھے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کا اندازہ کرتے ہوئے میں واقعی کوشلیا کے حق میں جذباتی ہو جاتا ہوں۔ خدا انھیں صحت دے اور عزیزوں کی ناشکر گزاری سہہ سکنے کی طاقت!

تمھارا

بیدی

ستونت بیچ میں ''الہ آباد خط لکھ رہے ہو، میرا بھی نمستے لکھ دینا'' کہہ کر کہیں غائب ہو گئی ہے۔

بیدی

سیٹھیا سدن۔ ملنگا۔ بمبئی 19

23/ مارچ 1959ء

پیارے اشک!

میں نے مکان تبدیل نہیں کیا ہے، بلکہ پہلے پتے کو مختصر کر لیا ہے۔ وہ پتا لمبا اور فحش تھا۔ میں تو اُس سے نالاں تھا ہی، دوست لوگ اُسے Primitive کہتے تھے۔ دوسرے وہ اس پتے پر تار دینے سے گھبراتے تھے۔ دیتے بھی تھے تو اس کے مصارف اپنی کمپنی سے وضع کرتے۔ ایک نے مذاق مذاق میں (یہ افسانہ طرازی نہیں) تار کے پیسے مجھ سے رکھوا لیے۔ میں نے پانچ کا نوٹ دیا،

اس امید میں کہ باقی کے پیسے لوٹا دے گا...... پھر ایک دن ہمارا مالک مکان جو پیشے کے اعتبار سے اسٹور یا ہے، آیا اور اپنے نام کا پتھر ''سیٹھیا سدن'' لگوا گیا۔ کیونکہ اس نے سٹے میں اسی ہزار روپئے جیت کر سوسائٹی سے مکان چھڑوا لیا تھا۔ لیکن ابھی چند ہی دن ہوئے، وہ کم بخت ڈیڑھ لاکھ روپئے ہار آیا ہے۔ لیکن تم فی الحال خط سیٹھیا سدن کے پتہ پر لکھنا۔

ایک تو دنیا پہلے ہی بے ثبات ہے، لیکن تمھارے خط سے اور بھی فانی نظر آنے لگی۔ تمھارے پتے کے آدمی کو میں کہوں کہ بھائی گھبراؤ نہیں۔

کوشلیا کی بیماری کا پتہ چلتے ہی میں نے تمھیں بمبئی چلے آنے کے بارے میں لکھا تھا، لیکن تم شاید کسی تکلف کا شکار ہو گئے۔ یہاں آ کر آب و ہوا نہیں تو باتیں تبدیل ہو جاتیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں تم اور کوشلیا بیٹھتے ہو، تو کس قسم کی باتیں کرتے ہو۔ ایسے میں، میری اور ستونت کی باتیں تمھاری تفریح کا سامان ہو سکتی تھیں۔ اس پر طرفہ علاج۔ بمبئی میں ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر پڑا ہے۔

میری دوسری کتاب جب بن پڑے چھاپ دو۔ تمھارا یہ کہنا ہے، ایک کتاب سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے خط میں ڈرتے ڈرتے، کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ میں سمجھ رہا تھا میری طرف سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ تم نے اپنے خط میں یہ الزام اپنے اوپر لے کر ایک ایسی کاروباری بیوقوفی کی ہے جس سے میری بہت تسلی ہوئی۔ مجھے جاپانی فلم ''روشولون'' کا وہ منظر یاد آتا ہے جس میں ''ڈاکو'' اور ''سمورائی'' ڈر کے مارے ایک دوسرے سے ''لڑ'' رہے ہیں۔

تمھیں اور کوشلیا کو یہاں بلوانے کے سلسلے میں مجھے ایک اور ترکیب سوجھی ہے۔ اگرچہ اس عقل کی بات میں میرا کچھ قصور نہیں۔ مُنّو کی شادی 21 رمئی کو ہونا قرار پائی ہے۔ مُنّو کو تم نے پچھلے یا اس سے پچھلے سال دیکھا تھا اور تم کہہ گئے اتنی چھوٹی عمر میں اسے کیوں 'قصابوں' کے حوالے کر رہے ہو؟ کہتے ہیں کہ کوئی پودا اتنی تیزی سے نہیں بڑھتا جتنا کہ اسکول کی لڑکی، اور اپنی مُنّو تو اب کالج کی لڑکی ہے، جو اکیسویں سال میں قدم رکھ رہی ہے اور پھر بقول ستونت۔ ''لڑکا انجینئر بھی ہے اور سکھ بھی!''

اب تو تم لوگ آؤ گے ہی۔ ضابطے کا دعوت نامہ بعد میں بھیجوں گا۔ ابھی تم صرف اتنا بتا دو

اِس پریمیر شو میں تمھارے لیے کتنی سیٹیں رکھوں۔

میرے لکھنے لکھانے کا عمل خطوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اگر چہ پچھلے دنوں میں نے ایک طویل مختصر افسانہ "اپنے دُکھ مجھے دیدو" کے نام سے لکھا تھا جو کہ "نقوش" لاہور میں چھپا ہے۔ شاید تمھاری نظر سے گذرا ہو اور تمھیں اس میں کوئی خاص بات نہ دکھائی دی ہو۔ لیکن اشک! یہ میرا پہلا افسانہ ہے، جسے لوگ بالکل ہی سمجھ گئے ہیں، ورنہ وہ مجھے چٹھیوں کے طومار نہ بھیجتے۔ (جو بات میری افسانہ نگاری کے اوائل میں نہ ہوئی اور جس میں لڑکیوں کی چٹھیاں بھی ہیں۔ ہاں!)

پھر میں نے روس کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کے سلسلے میں ایک اور افسانہ "تامارا" لکھ مارا ہے، جسے میں بھی نہیں سمجھتا اور اس لیے مجھے پوری تسلّی ہے...... بہر حال میں اپنے حالات کے پیش نظر ICBM کی رفتار سے جا رہا ہوں۔ اگر چہ دیکھنے والوں کو یہ رفتار بہت سست معلوم ہوتی ہے۔ مجھ سے ڈرو! کیونکہ میری اور تمھاری ادبی دوڑ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہے، جس میں، میں کچھوا ہوں (تم اس کے برعکس سمجھتے ہو تو مجھے لکھو)۔

کاش میں یہاں فلموں ہی کا کچھ بگاڑ سکتا (ایک فلم شروع کی ہے جس سے مقصد پیسے بُرد (کذا) کر کے مُنّو کی شادی کرنا ہے۔ ورنہ اپنی بچت پر رہا تو خود بھی کنوارا رہ جاؤں گا، نان ونفقہ کی کشمکش کوئی بھی سنجیدہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ کچھ گلے شکوے، جو تم جیسے عزیز دوستوں کے ہیں، صحیح ہیں۔ لیکن تم زندہ ہو، صحبت باقی ہے۔ نتیجہ بہتر ہی ہوگا۔ ابھی میں صرف اپنی پگڑی سنبھالنے کی فکر میں ہوں۔ راشد والی خودی کی قندیل تا حال بجھی نہیں۔ گرد و پیش جو ہو رہا ہے، خاصا دل شکن ہے۔ کبھی کبھی مسکرا کے اقبال کا شعر پڑھ لیتا ہوں۔

بمتاعِ خود چہ نازی کہ بہ شہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسّمِ ایازے

کوشلیا کو ہم "دم پتی" کی طرف سے نمستے اور عزیزوں کو پیار۔ بہت بہت۔

تمھارا —— بیدی

ان کاغذوں کے دبیز ہونے اور ان پر میرے نام اور پتے کے ایمبو رنٹڈ ہونے سے میرے تموّل کے بجائے افلاس کا اندازہ کریں۔

سیتھیا سدن۔ ماٹنگا بمبئی 19
فون:472273
13/اپریل

پیارے اشک!

میں کسی فلمی کام کی وجہ سے مدراس چلا گیا تھا۔ جہاں سے قریب ایک ماہ بعد لوٹا۔ اس لیے تمھارے خط کا جواب جلدی نہ دے سکا۔

میں نے یہاں کے روسی دوستوں اور دتی میں ہیڈ آف دی کلچرل ڈیپارٹمنٹ کو ایک ذاتی چٹھی لکھی ہے، تمھاری رائلٹی کے سلسلے میں۔ مجھے امید ہے تمھارا کام ہو جائے گا، اگر چہ اس میں کچھ دیر لگے گی۔ میں اس کا پیچھا کرتا رہوں گا۔ تم مجھے کاغذات بھیج دو، جو میں ان تک منتقل کر دوں گا۔

اب تمھاری صحت کیسی ہے۔ میں بھی اس قدر Shatter ہو چکا ہوں کہ دس پندرہ دن کے لیے کسی صحت افزا جگہ پر بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ یوں میں اِدھر اُدھر کئی جگہ گیا ہوں لیکن تم حیران ہو گے کہ جب سے میں نے زندگی شروع کی ہے (1933 میں) میں پوسٹ آفس میں ملازم ہوا تھا، اس وقت سے اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں کام کاج بھول کر پندرہ دن کے لیے کہیں تفریحا نکل گیا ہوں۔ اگر کہیں گیا بھی ہوں تو کسی کام کے سلسلے میں۔ اعصاب پر یہ بوجھ لے کر اور اب تو اندر کی طنابیں بالکل ٹوٹ چکی ہیں، اگر تم میرے یہاں آسکتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ عندلیب اور مل کر آہ وزاریاں میں بھی تفریح کا ایک پہلو ہے، اگر چہ تفرج کا نہیں۔

میں نے پچھلے دنوں بہت لکھا ہے۔ لمبی لڑکی، ببل، جوگیا، بلی کا بچہ، ٹرمینس کے پرے، افسانے لکھے ہیں اور کچھ مضامین۔ تین کہانیاں اور — ''اے گلو یوں نہ کھلو'' چشمۂ بد دور، مکمل کر رہا ہوں۔ ایک مضمون ''آئینے کے سامنے'' اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اب ''ملتے ہوئے چہرے'' کے عنوان سے اپنے بیٹے نریندر پر لکھا ہے، جو کہ ساریکا ہندی (مئی) میں چھپ چکا ہے۔ اس وقت مجھے بھی یہ شدت سے احساس ہے کہ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن پچھلی تصویر کے گھاٹوں کی وجہ سے میں بمبئی سے باہر نہیں جا سکتا۔ مالی حالت اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ کیا

بتاؤں۔ ڈر کے مارے تمھیں زیادہ لکھا بھی نہیں کہ بیوقوف کہو گے۔ اگر میں واقعی بیوقوف نہ ہوتا تو کسی کے مجھے بیوقوف کہنے کا بُرا نہ مانتا۔

تم نے کوشلیا کے بارے میں نہیں لکھا۔ ان کی بھی تو صحت کچھ ایسی ہی ویسی رہتی ہے۔ یہاں ہندی اور اُردو کے ادیبوں کی کچھ ایسی گُٹ بندی ہوگئی ہے کہ ہر ایک، ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہے۔ صورتیں ہی ایسی نکل آئی ہیں کہ بیزار ہونا ہی چاہیے۔ لیکن صورت سے آدمی بیزار ہے، کم از کم کسی کے کام سے تو خوش ہو اور اُسے پڑھے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ کسی کی ایسی تحریر پڑھ کر ان کے چہرے پر اور تکدّر چلا آتا ہے۔ چونکہ مجھے یقین ہو رہا ہے، دن بدن (؟) لکھوں گا اور ان سالوں سے بہتر لکھوں گا۔ اس لیے ایک دن میں نے انھیں Dr Axel Muathe کا وہ فقرہ کہہ ہی دیا جو کہ انھوں نے اپنی کتاب Story of Fan Michell کے آخر میں لکھا تھا I was dead and I did not know۔ میں نے کہا، تم سب مر چکے ہو اور نہیں جانتے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہوگا، اس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو۔ لیکن جیسے مجھے کوئی جینے سے نہیں روک سکتا، اسی طرح ان کو کوئی مرنے سے نہیں روک سکتا۔

اور ہاں، اوم پرکاش، (راج کمل) نے کہا تھا کہ اب چونکہ ''ایک چادر میلی سی'' کے لائبریری ایڈیشن...... تم اُسے اُن کے یہاں پاکٹ ایڈیشن میں چھپوالو۔ اشک سے پوچھ لو، جن کی کتابیں پاکٹ بُک ایڈیشن میں انھوں نے چھاپی بھی ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

کہانیوں کے تراشے اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ بعد میں فراہم کر کے بھیج دوں گا۔

یار! میری ہندی کی کتابیں کسی ایک دکان پر بھی تو نہیں ملتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ہندی گرنتھ رتنا کر والے میری ہندی کی کتاب ''دیوالہ'' کے نام تک سے واقف نہیں۔ کیا تم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو۔ زحمت نہ ہو تو میری تینوں کتابوں کی دس دس کاپیاں میرے حساب میں ''دفتر'' کی معرفت بھجوا دو۔ کہانیوں کا نیا مجموعہ تیار ہے۔ ڈراموں کا کچھ کر سکتے ہو؟ کوشلیا کو نمستے۔ عزیزوں کو پیار۔ ستونت نمستے کہتی ہے۔

تمھارا

بیدی

18، بلڈنگ
بالمقابل ڈان ہائی اسکول گراؤنڈ
ماٹنگا۔ بمبئی 19
20/اپریل 1955ء

برادرم اشک!

تمھارا خط ملا۔ میں شرمسار ہوں۔ 'کوکھ جلی، گرہن' وغیرہ نہیں بھیج سکا۔ خیال تھا تصحیح کر کے بھیجوں۔ چونکہ وہ ہوئی نہیں ہے اور یہ کام اٹک گیا ہے۔ بہرحال کل بذریعہ پوسٹ پارسل روانہ کردوں گا۔

ہنر کا خط مجھے ملا۔ میں نے آج ہی اُسے لکھا ہے کہ تنگدست ہوں (جو کہ حقیقت ہے) ورنہ میں ضرور خط پاتے ہی بھیج دیتا۔ تمھارے خط سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے اُسے سو روپے دیے ہیں۔ اگر میرے ایما پر دیے ہیں تو میں تمھیں بھیج دوں گا۔ ورنہ تم ہنر سے پوزیشن صاف کر لینا۔ لیکن اس ترسیل میں دو تین روز لگیں گے۔ تمھاری تنگدستی میں تمھیں پریشان کیا ہے۔ یہ صرف اپنی مجبوری کی وجہ سے ہے۔

کوشلیا سے کہہ دو، میں نے منفل ہاسپٹل کے بیس روپے چکا دیے ہیں۔ تم نے حساب بھیجنے کے بارے میں لکھا ہے۔ میرا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ حساب بھیجوں، لیکن اب میرے لیے چارہ کار نہیں۔ اس لیے بھیج دوں گا۔ ''گرم کوٹ'' کی وجہ سے اپنے ادارے کو ستر ہزار کا گھاٹا پڑا ہے۔ لمیٹڈ ادارہ ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر تو کوئی خسارہ نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنی محنت کی رقم بھی رائیگاں گئی۔

فلمی دنیا کو تم جانتے ہو، گرتے کو اور لات لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کام کرتا ہوں، لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں اور پیسے روک لیتے ہیں۔ اچھی تصویر بنانے چلے تھے۔ اُلٹا اگلے کام سے بھی گئے۔ اب نہ 'جائے رفتن نہ پائے ماندن' والی بات ہے۔ اگر میں ادبی کاروبار کرنے کی کوشش بھی کروں تو اس کے لیے پیسے چاہییں۔ کاروبار کے لیے نہیں تو کم سے کم اپنے آپ کو اور بال بچوں کو سپورٹ کرنے کے لیے۔

پوشی نے بیکار سب لوگوں کو پریشان کیا ہے۔ جو پیسے اُسے دینے کے لیے کہے گئے تھے، وہ ہم نے دے دیے تھے، لیکن خود کوشلیا نے مجھے کہا تھا کہ باقی پیسے اس کے ہاتھ میں نہ دینا۔ اب اس میں میرا کیا قصور! رہی کام کی بات۔ سروس مل جانا اتنا آسان نہیں ہے اور پھر پوشی جس قسم کی حرکتیں کرتا ہے، کیا ان کے پیشِ نظر میں اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں!

ہاں شاید لے بھی لوں۔ اگر میرا ساتھ پڑے تو۔ مجھے یقین ہے اس کی مالی اعانت، دس پندرہ، بیس سے اُوپر کی نہیں۔ لیکن اگر وہ میرے پاس آ کر طلب کرے تو میں دے بھی دوں۔ اتنا نابالغ نہیں ہوں کہ اسے پیسے دے کر، اپنے آپ کو ساہوکار سمجھنے لگوں گا۔ کوشلیا بمبئی آئے تو خوامخواہ تردّد کا شکار ہوگی۔ ویسے اگر زیندر کو رکھنے کے لیے آنا چاہیں، تو بڑے شوق سے آئیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اُن کی بے حد عزّت کرتا ہوں اور مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔

پھر ہنر یاد آ گیا۔ اگر وہ کہتا ہے کہ بیدی کی زبان مشکل ہے، تو پھر ریٹ ساڑھے آٹھ آنے کر دو۔ ستونت، تمھیں اور کوشلیا اور ماتا جی کو آداب۔ گڈے کو پیار۔

تمھارا

بیدی

اندرجیت ابھی تک یہیں ہے۔ لیکن زیندر اور پُشی کے اس قصّے میں اس بیچارے کا قطعاً کوئی قصور نہیں۔ اگر اس نے کچھ کیا بھی ہے تو مدد کی ہے۔ زیندر کو داخل کرانے کے سلسلے میں دھوپ میں دوڑا بھاگا ہے۔ اگر اس محنت کا اُسے یہ محنتانہ ملے تو تعجب ہے۔ رہی اس کے بڑے بول کی بات۔ میرا خیال ہے کہ پُشی اور اس کی بیوی نے اس کی باتوں کو 'پرورٹ' کر لیا ہے۔ اندرجیت خود حالات سے اُکتایا ہوا یہاں آیا ہے۔ قریب دو مہینے سے یہاں ہے اور بُری طرح دُم دبائے ہوئے۔ کاش میرے بہتر حالات میں آتا تو میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔ وہ اپنی لڑائی خود ہی لڑ رہا ہے۔ اگرچہ کچھ مشکوک طریقے سے۔

پُشی نے پیچ و تاب کھا کر ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ اگر وہ آتا تو کپڑوں کا بندوبست کر دیتے۔ اب میں خود ہی یہ سب کروں گا۔ لیکن ان سب باتوں سے تم پریشان مت ہونا— ''اِٹ از اوکے اِن دا گیم۔'' اگر سب لوگوں کا کردار ایسا ہی ہو جیسا کہ ہم چاہتے ہیں، تو شاید لکھنے

کے لیے کچھ بھی نہ ملے۔ پس ثابت ہوا کہ تم اسی طرح ان سب باتوں پر ہنس دو جیسا کہ ہمیشہ ہنسا کرتے ہو۔

پیار

تمھارا —— بیدی

سیٹھیا سدن

مٹنگا۔ بمبئی 19

پیارے اشک!

تمھارے آنے کی اطلاع پا کر میں نے جالندھر میں وکیل کو تار دیا۔ اس امید میں کہ وہ میرے مقدمے کی تاریخ ایک ماہ کے وقفہ پہ ڈالے گا۔ لیکن اس کمینے نے 5/ اکتوبر کی تاریخ ڈلوادی۔ گویا نہ تو میں پہنچ جا سکا اور نہ اب رہ سکا۔ میں 2/ یا 3/ اکتوبر کو دتی جا رہا ہوں۔ اور 6/ کو لوٹ آؤں گا۔ غالباً میں الہ آباد سے ہوتا ہوا نہ آسکوں گا، کیونکہ پہلے ہی یہاں کے پروڈیوسر مجھے چھٹی نہیں دے رہے ہیں۔ پچھلا پورا برس 'فاقوں' میں گذر گیا اور اب جا کر کچھ حالت استوار ہوئی ہے۔ اس لیے میں ان کی ناراضی کا کوئی چانس نہیں لینا چاہتا۔ تم میرے دوست ہو، میری مجبوریوں کو سمجھو گے۔

واپسی پر، دتی سے روانہ ہوتے ہوئے، میں بمبئی پہنچنے کی ٹھیک تاریخ، تم کو بذریعہ تار لکھ دوں گا اور پھر تم پہنچ جانا۔ یہاں آنکھوں کے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ایک باناجی ہیں اور دوسرے تیلنگ۔ باناجی اور تیلنگ چڑھ کے الفاظ نہیں، بلکہ ان کے نام ہیں۔

ستونت سے تم لوگوں کی باتوں کا پتا چلا۔ یعنی کہ خیر و عافیت کا۔ میں سمجھتا تھا میں ہی خط لکھنے میں سُست ہوں لیکن یہ جان کر خوشی ہوئی اور تسکین بھی کہ مجھ ایسے اور بھی ہیں۔ مثلاً میں نے کہانیوں کا مجموعہ بذریعہ رجسٹری بھیجا مگر اُس کی رسید تک نہ آئی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ چھپ رہا ہے یا التوا میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں نے ایک اسسٹنٹ رکھا ہے۔ اس سے بہت محنت کروا کے میں نے کتاب ترتیب دی تھی۔

ستونت تم سب کا بڑے پیار سے ذکر کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آؤ اور ہمارا بھی ذکر

الہ آباد میں پیار سے کرو۔ میں بھی مدتوں سے بھرا بیٹھا ہوں اور تم آؤ گے تو رونے لگوں گا اور بتاؤں گا۔ دُور سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تمام خیر خیریت کی خبر افواہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً یہ کہ تم نے کوئی آشرم کھولا ہے، جس میں لوگوں کی شادیاں کراتے ہو۔ خاص طور پر ان لوگوں کی جن کی زوج یا زوجہ سے نہ بنتی ہو۔ یعنی تم محبت کی مثلث، چوکور، مسدس اور مخمس، سب پر حاوی ہو۔ کسی عورت ـــ لڑکی کی شادی سے پہلے حاملہ ہو جانے کو تم اخلاقی جرم کے بجائے سماجی سمجھتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ اس میں سے بچّے کے بجائے ناول نکلے گا . . !!

میں زندگی کے ''ڈیڈ اینڈ'' پر پہنچ گیا ہوں۔ یعنی کہ آپ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میں فلموں سے نکلنا سرے سے چاہتا ہی نہیں۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں جو بیکاری آئی، اس میں سب عزیزوں کے پول کھل گئے۔ جن لوگوں کو میں سہارا سمجھتا تھا، انھوں نے اپنی لاٹھی کھینچ لی اور میں دھڑام سے گرا۔ دیکھنے میں یہ سب سمجھدار اور ہوشیار نظر آتے ہیں اور واقعی یقین ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی بچ ہے تو ہم ہیں۔ چنانچہ اب میں اور کنٹریکٹ کرنے جا رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے I am condemned to become rich، ورنہ میرا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ امیر ہونے کے عمل میں کوئی ناول ہو گیا تو فبہا، نہیں تو اللہ اللہ اور خیر صلاً۔ غریب ہونے کی سب کوششیں ناکام اور بیہودہ ثابت ہوئیں۔

تمھارا

بیدی

سیٹھیا سدن۔ ملنگا بمبئی 19

یکم مارچ 63ء

پیارے اشک!

مجھے موہن راکیش (جی) کی معرفت پتا چلا کہ تم بیمار رہے ہو اور تشویش اس بات کی ہوئی کہ ان کے بیان کے مطابق تمھاری بیماری عود کر آئی ہے۔ خدا کرے تکلیف معمولی ہو، ورنہ میرا تمھیں یہی مشورہ ہے کہ تم بمبئی چلے آؤ۔ یہاں I S C U S کی وساطت سے میرے ڈاکٹر بالیگا کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں، جنھوں نے اچھے سے اچھے معالج کو دکھانے کے سلسلے میں

استعمال کرسکتا ہوں۔ اگر بمبئی کی مرطوب ہوا تمھاری بیماری کو راس نہ بھی ہو، تو پونا تک بہت اچھا بندوبست ہوسکتا ہے۔ اول تو میں تمھاری تکلیف کے کوائف سے واقف نہیں۔ اگر تم مجھے واپسی ڈاک لکھ سکو تو میں دریافت کرکے فی الفور جواب دوں گا۔

مجھے معاف کردینا۔ مدت مدید سے میں تمھیں خط نہیں لکھ سکا۔ تصویر کے بعد میری پریشانیوں میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ہر خط میں رونا مجھے نامناسب معلوم ہوا۔ اس کے بغیر اور میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ راکیش جو تمھارے پاس آرہے ہیں (آچکے ہیں) وہ شاید تمھیں کچھ میرے بارے میں بتائیں۔ جو وہ کہیں گے، اس میں سے پچیس تیس فیصدی تو ٹھیک ہی ہوگا۔

بات یہ ہے کہ آدمی میں اپنے آپ کو دیکھنے کی طاقت نہیں ہے۔ جو دوسرے اسے دیکھتے ہیں، وہ اصل آدمی ہے۔

آج سے چار مہینے اکیس دن پہلے تک میں سمجھتا تھا، میں بہت اچھا آدمی ہوں۔

مجھے دوسرے Complexes کے ساتھ Persecution کا کامپلیکس پیدا ہوتا جارہا ہے۔ میں اپنے سامنے اپنے آپ کو پاگل ہوتے دیکھ رہا ہوں، لیکن کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کی زندہ نشانی یہ ہے کہ مجھے دوسرے سب پاگل نظر آتے ہیں۔ تمھارے علاج کے بارے میں، جو کچھ میں نے لکھا ہے، پاگل پنے کی بات نہیں—! اب میں وہ فقرہ دُہرا رہا ہوں جو لوگ جانتے ہوئے بھی بکتے چلے جاتے ہیں۔ کاروبار۔ پندار۔ ''جان ہے تو جہان ہے، دوست''...... اور یہ بات بالکل ٹھیک ہی ہے۔

کیسے لوگ بیوقوفی سے عقل کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے بھی وہ مشورہ دیتے ہیں کہ فلم ولم کا چکّر چھوڑو۔ میں پوچھتا ہوں، فلم کا چکّر چھوڑوں تو کہاں جاؤں؟ کوئی ایسا کاروبار بتاؤ جو میرا اتراسی ہزار کا قرض اُتار سکے۔

دراصل مجھے یہ اس وقت چھوڑنا چاہیے تھا، جب پہلی بار تم نے مجھے ایسا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن جب میں نے تمھاری بات نہ مانی۔ اب تم خوش ہوگے کہ میں پچھتا رہا ہوں۔ اُپندر ناتھ اشک اور آنولے میں کیا فرق ہے، جو کھانے کے بعد یاد آتا ہے۔

اپنی طرف سے میں تمھاری مزاج پرسی کرنے چلا تھا لیکن ہنسانے میں بہک گیا۔ کوشلیا کیسی ہیں۔ عزیزوں کو ہمارے پیار دینا۔ کوشلیا کو نمستے۔ ستونت نمستے کہتی ہے۔ مجھے وہ کہہ چکی ہے۔ خط کا جواب جلدی دینا۔ اگر کسی وجہ سے جلدی نہ لکھ سکو تو کوشلیا سے کہنا، مجھے سب حالات سے آگاہ کریں۔

تمھارا— بیدی

راگون پروڈکشن

ٹی۔نگر۔ مدراس 17

17/ جولائی 1963ء

پیارے اشک!

میں گیارہ کی صبح کو مدراس پہنچا۔ اس کے ایک دن پہلے مجھے تمھارا خط مل چکا تھا۔ جب بھی میں نے فرصت سے کسی کو خط لکھنے کی کوشش کی ہے، میرا حشر یہی ہوتا ہے کہ اہتمام میں معمول بھی رہ گیا۔

تم نے مجھ پہ جو مضمون لکھا ہے، وہ مجھے بے حد پسند آیا۔ مجھے یاد ہے جب میری آنکھوں میں آنسو چلے آئے تھے اور بار بار میں نے سوال کیا تھا کہ میں اس قدر محبت کا مستحق ہوں! اس میں کسی قسم کے سُقم کا مجھے تو احساس نہیں ہوا۔ اُلٹا متوازن کرنے کے لیے ہمارے نقاد، جو بھی کچھ آدمی کے خلاف لکھ دیتے ہیں۔ (جو اُس پر اتنا ہی عائد ہوتا ہے، جتنی کہ تعریف) تم نے وہ بھی نہیں لکھا۔

اس ضمن میں مجھے کئی ایک خط آئے، جس میں تمھارے مضمون کی تعریف کی تھی۔ ایک خط تو اس نوعیت کا بھی تھا، جیسے وہ مضمون میں نے لکھا ہے اور اس میں یہ بھی تھا کہ اشک صاحب بہت بڑے آدمی ہیں، اگرچہ تم نے اپنے مضمون میں مجھے بڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بڑی لکیر کے ساتھ ایک چھوٹی کھینچ دی جائے تو اول الذکر اپنے آپ بڑی ہو جاتی ہے۔

میری دلچسپی کی ایک اور چیز بھی تھی، اس میں ایک جگہ تم نے لکھا ہے کہ پہلے مجھے اپنے آپ

میں یقین نہ تھا، اب ضرورت سے زیادہ ہی یقین ہو گیا ہے۔ میں نے اس بات کو ناپسند نہیں کیا لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس کی وضاحت چاہوں گا۔ تعریف کے عادی کان اور نظریں اس قدر شہوانی ہو جاتی ہیں کہ کوئی چیز بھی خلاف نہیں سننا چاہتیں۔ لیکن تمھارے سلسلے میں یہ مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ میں نے ہمیشہ تمھارے مشورے کو بڑے احترام سے سُنا ہے اور اس پر عمل کرنے کا بھی جتن کیا ہے۔ چونکہ خود کو اپنے عیوب کا پتا نہیں چلتا اس لیے میں چاہوں گا کہ تم میری تنقیص کرو۔

رہی کملیشور کی بات تو یقین مانو، وہ خط اگر چہ میں نے اُسے لکھا ہے، لیکن وہ لوگ جو اپنے آپ کو ادیب کہلواتے ہیں، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ روئے سخن مالک کی طرف تھا جس کے بیسوں خط آئے تھے۔ لیکن پھر اس ضمن میں معافی و بیان کا ایک بھی نہ آیا۔ اگر میں نے اس خط میں کچھ ایسا انداز اختیار کر کے معافی ''منگوالی'' تو پھر اس میں میرے ''شیمی'' ہونے کی کیا بات ہے؟ میں نے کبھی نہیں سمجھا۔ کملیشور نے معافی مانگی ہے۔ میں ایک ساتھی ادیب کی حیثیت سے اس کا احترام کرتا ہوں اور مجھے کچھ امید نہیں۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ ذیل کی زیادتیاں کی ہیں۔

1۔ اوم پرکاش کے پانچ خط آئے کہ تم کرشن پر لکھو۔

(میں نے لکھنا شروع کیا۔ دس صفحے لکھ چکا تھا)

2۔ پھر خط آئے کہ عباس پر لکھو۔

(میں نے لکھنا شروع کیا اور آٹھ نو صفحے لکھے، جواب بھی میرے پاس ہیں)

3۔ پھر خط آیا کہ نہیں کرشن پر ہی لکھو۔ اور تکون، کرشن، عباس اور بیدی کی ہوگی۔ پھر عباس کے بارے میں

چنانچہ میں نے سب چیز کو ایک طرف ڈال دیا اور سوچا کہ فیصلہ کر لیں۔ پھر کچھ کروں گا۔

4۔ اس کے بعد پھر کرشن نے مجھ پر کیوں نہیں لکھا (اگر چہ بہتر صورت پیدا ہوگئی کہ تم نے مجھ پر قلم آرائی مان لی) لیکن اُن کی طرف سے اس بات کی کوئی جوابدہی نہیں۔

5۔ میری کہانی کے سلسلے میں جو کچھ کیا، وہ تمھارے سامنے ہے۔ اگر چہ اُسے اکسپلین کر دیا گیا کہ وہ مدیرہ صاحبہ کی ناتجربہ کاری کا نتیجہ تھا اور میں مطمئن ہو گیا۔

میں یوں بھی کملیشور سے وعدہ کر چکا تھا کہ کہانی کا قضیہ برطرف، میں دو تین روز میں

مضمون بھیج رہا ہوں۔ جب خفگی کی کوئی بات نہیں تھی۔ خاص طور پر جب کہ کملیشور کا خط مجھے مل چکا تھا۔ لیکن چوتڑوں کا زور لگانے کے باوجود میں آرٹیکل کو مکمل نہ کر پایا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں عباس کو اچھی طرح نہیں جانتا۔ یعنی اتنی اچھی طرح کہ اس پر ایک مضمون مکمل کرسکوں۔ تم پہ لکھنے کے لیے (جس کے بارے میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ جانتا ہوں) اتنا وقت لینا پڑا اور جب بھی مضمون نامکمل رہا، تو عباس صاحب کے بارے میں، میں کیسے لکھ سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں نے لکھنا تسلیم کرلیا تو میری غلطی تھی۔ مجھے اس وقت سوچنا چاہیے تھا۔ لیکن بعض وقت آدمی الفاظ کا مطلب پوری طرح ذہن میں اتارے بغیر اقبال کرلیتا ہے۔

پھر تمھارے ایما پہ میں نے لکھنا شروع کیا، لیکن اس کے باوجود اُسے پورا نہ کرسکا۔ اس کے بیچ میں پچھلی فلم کا قرضہ (جو ایک اب ساٹھ ہزار رہ گیا ہے) اتارنے کے لیے، میں بمبئی اور مدراس کے بیچ بٹ گیا۔ اپنے بُرے دنوں سے نکلنے کے لیے، میں نے دن رات ہاتھ پیر مارے اور اب تک مار رہا ہوں۔ ان غیر شخصی مصیبتوں کے علاوہ شخصی مصیبتیں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں، تمھیں میں نے لکھا ہی تھا۔ اس کے بعد ایک دن کسی جھگڑے کے بعد ستونت گھر سے چلی گئی۔ اس کے بعد خیر پتا چل گیا اور لوٹ آئی۔ اس نے معافی بھی مانگ لی لیکن میری یہ حالت ہے کہ میں اب تک صدمہ زدہ ہوں۔ کسی سے بات کرتا ہوں تو زبان میں لُکنت چلی آتی ہے۔ آج ہی یہاں کے ایک پروڈیوسر نے کہا ”بیدی صاحب! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ پچھلے چند مہینوں سے میں آپ کو اور ہی طرح کا آدمی پاتا ہوں۔“

اگر اس نیم پاگل پن کے بارے میں، میں کسی کو نہیں لکھتا تو اس کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ میں کسی شخص سے منحرف ہوگیا ہوں۔ وہ کیوں یہ نہیں سوچ سکتا کہ فلاں آدمی بنیادی طور پر اچھا ہے، ضرور کوئی خاص بات ہوگئی ہوگی۔ ذہن کی چند حالتوں میں آدمی جان سے بھی گذر جاتا ہے۔ وہاں ادب کی کیا حقیقت ہے۔

تم تو جانتے ہو، ادیبوں میں کس قدر گروپ بندی ہے۔ سردار جعفری اور کرشن ہی تو ان کے سربراہ ہیں (اُردو میں) اندازہ کرو، اگر یہاں پہنچ کر کسی نے کرشن کا پتا بھی پوچھا ہے، تو میں گاڑی میں بٹھا کر اُسے کرشن کے یہاں لے گیا ہوں اور اس سے گل خپ چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔“ احساسِ

کمتری'' کے ان چند لمحوں میں مجھے یہ خیال آیا کہ میں بیسوں بار اس شخص کے یہاں گیا ہوں۔ اُسے کیوں خیال نہیں آیا کہ میں دادر سے گذر رہا ہوں، بیدی قریب رہتا ہے۔ چلو اس کے یہاں سے ہوتے جاؤ، اور جب میں نے اس سے اس امر کی شکایت کی تو اس نے مجھ سے باہر بھی ملنا جلنا قطعاً ترک کر دیا۔ میں 53ء سے اپنے ماٹنگا والے مکان میں ہوں اور سیکڑوں بار کسی میٹنگ کے بہانے یا ایسے ہی عباس صاحب کے یہاں گیا ہوں۔ پچھلے دنوں انھیں اپنی فلم کے سلسلے میں مالی اعانت کی ضرورت پڑی۔ وعدے کے باوجود، اپنے حالات کے پیشِ نظر میں تو انھیں کچھ نہ دے سکا، البتہ اپنے دوست سہگل سے ہزار روپئے دِلوا دیے، (اُدھار نہیں) اور جب میں نے سہگل سے ملوانے کے لیے عباس صاحب کو اپنے یہاں دعوت دی، تو انھوں نے پوچھا'' جانتے ہو تم رہتے کہاں ہو؟''

تو یہ ہیں ہماری دوستیاں۔ میں اس دوستی کا عادی ہوں جو میری تمھارے ساتھ تھی (ہے) جس میں جب تمھارا جی چاہتا تھا تم اٹھ کے میرے پاس چلے آتے تھے اور میں تمھارے پاس۔ میرے دوست سہگل لکھ پتی ہیں۔ مل کے مالک۔ لیکن جب بھی آتے ہیں میرے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ تمھاری اور کوشلیا کی نظر میں، بمبئی کا تصور کرتے وقت کوئی اور شخص ہوتا ہے! یوں ہی الہ آباد تمھارے علاوہ میرے لیے ہندوستان کے نقشہ پر صرف ایک شہر ہے!

میں ان لوگوں سے اس بات کا متقاضی بھی نہیں۔ لیکن پچھلے دنوں مجھے چند بہت بڑی مایوسیاں ہوئی ہیں۔ اسی طرح میں بار بار ہندی ادیبوں کے یہاں گیا ہوں، لیکن میرے یہاں کوئی نہیں آیا۔ یہ بہانہ کہ تم گھر پر کس وقت ہوتے ہو، عبث ہے۔ ہندی ادیبوں، خاص طور پر ایڈیٹروں کے ذہن کے کسی کونے میں یہ جذبہ ہے کہ وہ اب حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے کملیشور نے بھی یہ خط لکھا کہ میں نے انھیں بڑا شیبلی ٹریٹ کیا ہے۔ اگر آپ نے کوئی غلطی کی اور اس کی معافی مانگی (طلب کیے جانے کے بعد) تو پھر اس بدسلوکی کی بات کیا ہے؟ عوض اور معاوضہ کا کیا گلہ۔ اس میں سوائے 'ہٹلریت' کے اور کچھ نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہندی اور اس کے ایڈیٹر قسم کے لوگ واقعی محسوس کرنے لگے ہیں کہ وہ دوسروں کے نان ونفقے اور شہرت کے ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ ہماری (ان کے پاس پہنچ جانے کے بعد) عزّت کرتے ہیں تو اس لیے کہ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجھ

سے نوآبادیاتی اس سامراجی طرزِ عمل کو بہت شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ میں بڑی سختی سے اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے کملیشور کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ البتہ مضمون باوجود تقاضوں کے نہیں بھیج سکا، جس میں میری مجبوری ہے اور اِس کے لیے میں صدقِ دلی سے معافی مانگتا ہوں۔ اب تک نہیں مانگی تو صرف اس لیے کہ آخر دم تک مجھے یقین تھا کہ میں آرٹیکل مکمل کر سکوں گا۔ تمھارے کہنے پر میں بیٹھا بھی، لیکن مجھ سے نہ ہو سکا۔

گھر اور باہر کے جملہ حالات کے پیشِ نظر میری ذہنی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اگر میرے دُم ہوتی تو ٹانگوں میں دَبی ہوئی دکھائی دیتی۔ میں آج کل کسی سے لڑنا نہیں چاہتا۔ فوراً ہتھیار ڈال دیتا ہوں اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہر کسی سے اپنے ہونے کی معافی مانگتا پھرتا ہوں۔ جب مدِ مقابل چلا جاتا ہے تو پھر سوچتا ہوں، میں نے کس بات کی معافی مانگی۔ لطف یہ ہے کہ دوسروں کو بھی نہیں معلوم کہ وہ مجھے اس قدر رذیل کیوں کر رہے ہیں۔

میرے اس احساس کو کوئی نام دینے کی کوشش نہ کرنا۔ برتری، کمتری، پرسی کیوشن وغیرہ میں ان سے بہت پَرے ہوں۔ چھٹپٹاتے زندگی کا وہ بنیادی تضاد میرے سامنے چلا آیا ہے جس میں بُدھ نے اپنا سب کچھ تیاگ دیا اور جس میں زمانۂ جدید کے مصنف بے راہرو ہو گئے۔ کامو بیٹنک وغیرہ دھو کے کو اس حد تک تسلیم کرتا ہوں جس حد تک وہ مجھ سے کوئی کہانی یا ناول لکھوا سکے اور دعا کرتا ہوں کہ یہ عظیم المرتبت جھوٹ مجھ پر کبھی عیاں نہ ہو۔

میں بھی چاہتا ہوں، چند دن کے لیے زندگی کے بیشمار اور بیکار لمحوں میں سے چند اپنے بنالوں، پچھلے تیس سال کی بار برداری میں ایک دن بھی تو نہیں آیا کہ میں تفریح کے خیال سے کسی پُر فضا جگہ پر چلا گیا ہوں۔ ــ نہیں ساحل تیری قسمت میں اے موج۔ چنانچہ مدراس نکل آیا ہوں۔ یہاں ایک ساحل ہے جو اور ہی اشارے کرتا ہے۔ اُبھر کر جس طرف دل ہے نکل جا۔

تمھارا

بیدی

بمبئی

20/جنوری65ء

پیارے اشک!

کیسے ہو؟ ابھی خط لکھنے کی منزل تک نہیں پہنچے؟ آنکھیں؟ انگوٹھا؟ دل؟ سب کیسے ہیں؟ تمھارے بمبئی آنے کے سلسلے میں شکر و امتنان کا اظہار کروں یا اس درد کا جو تم میرے سینے میں چھوڑ گئے؟

یہ وہ منزل ہے کہ الیاس بھی گم، خضر بھی گم
ہائے آوارگیِ شوق کدھر سے گذرے؟

اس شعر میں تمھارے جذبات و احساسات کے علاوہ اپنے جذبات کا اظہار بھی کر رہا ہوں۔ بے حیا ہوئے بغیر میرے لیے زندگی ناممکن ہے۔ تمھارا کیا ہے؟ تم تو خالی حوصلے سے سب چیزیں بٹھا جاتے ہو۔ مجھے بیسیوں مثبت و منفی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً میں سوچتا ہوں، کیا کم حوصلگی کو فن کے اوج پر نہیں پہنچایا جا سکتا؟

یہ حالت ہو گئی ہے کہ ایک تصویر میں میرے دانت نکل آئے ہیں۔ اپنے بارے میں خود نہ لکھ سکو تو لکھوا بھیجو!

تمھارا

بیدی

بمبئی

28/اگست

پیارے اُپندر ناتھ، میو جئے!

بھائی، میں تم اور کوشلیا دونوں سے (دست بستہ) معافی چاہتا ہوں۔ میں نے اتنی دیر تمھارے خطوں کا جواب نہ دیا۔ دلّی سے یہاں آنے پر، پروڈیوسر لوگ بنا ہاتھ دھوئے میرے پیچھے پڑ گئے۔ بہت دوڑا بھاگا۔ کہلوایا ''میں گھر پر نہیں ہوں'' — گھر پر جو آدمی آپ نے دیکھا، وہ میں نہیں، میرا بھائی تھا۔ مجھے 'مگرین' کا سر درد ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے میری ایک نہ مانی۔

کتاب کا مواد بھیجنا میری ہی دلچسپی کی چیز تھی، لیکن تم اندازہ کرتے ہو جب آدمی ہاتھ اُٹھا کر خود ہی اپنے آپ کو بددعا دیتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ میں بری حالت میں ہوں، اس سے تو مجھے کہیں عشق ہو جاتا تو اچھا تھا۔

فی الخصوص کوشلیا کے خط کا جواب نہ دینا اور بھی بڑی حماقت ہے کیونکہ انھوں نے بمبئی آنے کے بارے میں لکھا تھا۔ جواب نہ دینے سے قطع نظر، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ''یہ گھر آپ کا ہے''۔ ''مجھے یقیناً آپ کے آنے سے خوشی ہوگی'' وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ باتیں حقیقت ہیں لیکن اگر لکھ دی جائیں تو جھوٹ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں پھر کوشلیا اس لیے نہیں آئیں کہ میں نے انھیں ایسا خط نہیں لکھا؟ تمھارے ساتھ اتنی دیر رہ کر کچھ تکلف تو چھوڑ ہی چکی ہوں گی۔

''دانہ ودام''، ''گرہن''، ''کوکھ جلی'' تینوں کتابوں کی غلطیاں نکالی ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں ترتیب کی (کذا) ملحق کر کے بھیج دوں گا۔ (دروغ برگردنِ راوی)

دلّی میں تم سے مختصر ملاقات کا بہت لطف آیا۔ ایک خاص قسم کا ایمان تازہ ہو گیا۔ باقی تو سب ٹھیک ہی تھا۔ بنارسی داس چترویدی مجھ سے بھی زیادہ بیوقوف معلوم ہوتے تھے۔ سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے۔ ہنستے تھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے ہنسی کہیں زمین پہ گر گئی۔ جینندر کمار شکل سے یوں نظر آتے تھے، جیسے ابھی نوبل پرائز ملا کہ ملا۔ چندر گپت ودّیا اَلنکار ''یہ کس کا کتا ہے''۔ ڈاکٹر آنند! ''آرٹ بڑا کہ بھینس۔''

اور بیچ میں مچھلی کی اولاد۔ بری۔ دیت نامی۔ کورین مصنف۔ پتا نہیں تقریباً بند آنکھوں سے زندگی کو کیسے دیکھ لیتے ہیں، اور آخر میں تم۔ ہاہاہا! اور ان سب کے بیچ میں مَیں۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟

تمھارا ــــــ بیدی

میں ابھی ابھی پنڈت سدرشن کو مل کر آرہا ہوں۔ اندازہ کرو تمھیں خط لکھنے سے ایک گھنٹہ پہلے انھوں نے ایک ''کوسین'' لکھا ہے! اور میں نے قتل کا! پیسے کی رسید مل گئی شکریہ۔ تم دَمیَنتی کی صحت کیسی ہے؟ آج کل میں بے حد مصروف ہوں۔ بیدی

سیٹھیا سدن
ماٹنگا۔ بمبئی 19
20/جنوری 1966ء

پیارے اشک!

باقر مہدی ملے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے اس لیے خفا ہو کہ میں نے تمھیں انعام ملنے کے سلسلے میں مبارکباد نہیں دی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے مبارکباد دی تھی۔

ان انعاموں کے بارے میں تم جانتے ہی ہو۔ ان اکاڈمیوں کے انعامات سے لے کر نوبل پرائز تک سب ایسے ہی ہیں۔ مجھے خوشی سے زیادہ افسوس ہے کہ اس سے پہلے تمھیں کیوں نہیں نوازا گیا۔ حالانکہ تم بہت پہلے ڈیزرو کرتے تھے۔ خدانہ کرے، اگر کہیں میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے (جو نہیں آئے گا— اور اس میں کہیں کسی دبی ہوئی خواہش کا اظہار بھی نہیں) تو میں کیا کروں گا؟ دراصل مجھے انعام لینا نہیں آتا!

میری بچی گڈی کی شادی، دلّی میں 27-26 کو ہو رہی ہے۔

اطلاع دے رہا ہوں تا کہ تم شامل ہو سکو، کوشلیا اور عزیزوں کے ساتھ۔ میری بیوی کو تو تم جانتے ہی ہو!! جی چاہتا ہے کہ کوئی اونرشپ فلیٹ بیوی کے نام کر کے خود 'بھارت درشن' کے لیے نکل جاؤں۔ تم ایسے دوست جو مجھ پر اعتقاد کر بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔

میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

اس کے باوجود 'بھارت درشن' کے لیے نکل کھڑا ہوا تو تم لوگوں کا کیا ہوگا؟ کیا ہوگا میری بیوی کا؟

شادی کے سلسلے میں اس وقت مجھے پیسوں کی بے حد ضرورت ہے۔ میں نہیں جانتا تمھارا کیا حال ہے؟ میری کتابوں کے نوسو (کذا) روپے بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ اس پر میں فرمایش کرتا ہوں اور تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر کسی طرح سے کچھ ممکن نہ ہو سکے تو مجھے سب کے جمع ہو جانے کی خوشی ہوگی۔

لڑکی بیاہی جائے گی کسی طرح سے۔

ان سب باتوں سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مجھے ہندی میں اور زیادہ چھپنا چاہیے اور اس کا نظام تم ہی کر سکتے ہو۔ میں ویسے تو رائٹر نہیں ہوں کیونکہ نہ تو میں بھارتی سے ملتا ہوں اور نہ بندر گپت ودّیا اَلنکار سے۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ پردہ داری آخر کسی وجہ سے تو ہے۔ میرا جی چاہتا تو میں بھی گھٹیا لکھ سکتا تھا۔ کرشن چندر کی طرح سے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

تمھیں دوسرا خط لکھوں گا، جس میں شادی کے بارے میں تفاصیل ہوں گی۔ اس وقت اس پر اکتفاء کرتا ہوں کہ کیا تمھارے حالات اجازت دیتے ہیں کہ میری اعانت کر سکو؟

کوشلیا کو نمستے۔ عزیزوں کو پیار۔

تمھارا

بیدی

میٹھیا سدن

ماٹنگا۔ بمبئی

26/جنوری 70ء

پیارے اشک!

میں معافی چاہتا ہوں۔ تمھارے خط کا جواب نہیں دے سکا۔ میں نے چٹھی ٹائپ بھی کر کے رکھی، اس مضمون کی کہ کوئی بھی قیمت کتاب کی رکھ دو۔ کیسے بھی بیچو، بکوا دو۔ لیکن اُسے پوسٹ ہی نہ کر پایا۔

یہ فلم 'دستک' جو میں بنا رہا ہوں، اس نے مجھے خاصا پریشان کیا ہے۔ تسلّی کی بات ہے تو صرف اتنی کہ بڑی اچھی تصویر بنائی ہے۔ اُسی انداز سے، جس طرح سے میں ایک کہانی پر محنت کرتا ہوں۔ اس کی وجہ سے میں مالی پریشانیوں میں پڑ گیا ہوں۔ صحت الگ خراب ہو گئی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں جن کا مجھے پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔

جس غرض اور جس مقصد سے میں نے یہ کام شروع کیا تھا، اُسے پورا کر کے رہوں گا۔ ان

میں سب سے بڑا مقصد ہے گھر اور باہر اپنے امیج کو Salvage کرنے کا۔

ہنر صاحب نے مجھ سے کچھ پیسے مانگے تھے۔ دو خط بھی لکھے ہیں، لیکن میں خاموش رہا۔ انھوں نے 'شاہکار' میں میری 'تصویر' کا اشتہار دیا تھا۔ میں چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ صاحب میری کہانیاں آپ نے لے کر چھاپی ہیں۔ ایک اشتہار کیا ان میں وضع نہیں ہوتا۔ لیکن بات رسالے کی اعانت کی تھی اور میں نے وعدہ کر لیا۔ چونکہ میں اس وقت باہر کا کوئی بھی خرچ اپنے اوپر لینے کے قابل نہیں ہوں، لہٰذا تم سے کہتا ہوں کہ میرے حساب میں ایک سو روپیہ ہنر صاحب کو دے دو۔

مفصل خط لکھوں گا ذرا تسکین پانے پر۔ کوشلیا جی کو میری نمستے اور عزیزوں کو پیار۔

تمھارا

بیدی